

بہنوں کا اپنا ماہنامہ

مارچ 2017

# شعاع

Pakistanipoint.com

Waqar  
Gzeem

بہنوں کا اپنا ماہنامہ

# شعاع

باقی و مدیر اعلیٰ محمود ریاض

مدیر — رضیہ جمیل

مدیر منظم — افتخار ریاض

مدیر قاعدی — امت الصبور

فنانہ ٹیلی فون — شاہین رشید

اشتراک — خجالت جیلانی

خط و کتابت کمیٹی

ماہنامہ شعاع

37 - اردو بازار، کراچی

رکن آل پاکستان نوز ہجیر سوسائٹی  
رکن کونسل آف پاکستان نوز ہجیر ذیلیہ نغز

MEMBER  
APNS  
CPNE





284	امت الصبور	272	رضیہ جمیل
288	خالہ جیلانی	266	ادار
290	ادار	282	واصفہ سہیل
		268	شگفتہ جاہ
		271	خالہ جیلانی

ماہ 31 جولائی 2017  
جلد 60 نمبر 7

خط و کتابت کا پتہ: ماہنامہ شعاع، 37 - اُردو بازار، کراچی۔

رضیہ جملہ غلوں میں شریک رہیں۔ پھر کھانا کھا لیں۔ کیا - ۱۰۰ فی پی آر سی ایچ این سین سو ایچ کیو  
Phone: 32721777, 32726617, 021-32022494 Fax: 0092-327266872  
mail: shuaa@khawateendigest.com website: www.khawateendigest.co



265 حمایت علی شاعر نظم  
265 خمار باد و تنکوی غزل



17 سیر احمد  
26 شاہین رشید  
22 وہاج خان  
30 یاسین اقبال



34 صائمہ اکرم  
236 عفت سحرگاہ  
254 نبیہ عزیز



184 سیر احمدیہ  
100 مصباح علی سید

در سالانه یک یکتا رجسٹری

پاکستان (سالانہ) ---- 700 روپے  
ایشیا، افریقہ، یورپ ---- 6000 روپے  
امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا ---- 7000 روپے

[illegible]



## ہدایت اور علم

حضرت ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے،  
نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

”اس ہدایت اور علم کی مثال جس کے ساتھ اللہ نے مجھے بھیجا اس بارش کی مانند ہے جو کسی زمین پر برسی۔ چنانچہ اس (زمین) کا ایک حصہ عمدہ تھا۔ اس نے پانی کو اپنے اندر جذب کیا اور گھاس اور دیگر مقدار میں دیگر جڑی بوٹیاں اگائیں۔ اور اس کا ایک حصہ سخت تھا (جوانی کو فوری طور پر جذب نہیں کرنا) اس نے پانی کو اٹھا کر لیا۔ تو اس کے ذریعے سے اللہ نے لوگوں کو نفع دیا۔ انہوں نے خود بھی پیا جانوروں کو بھی پلایا اور کھیتوں کو بھی سیراب کیا۔ اور وہ بارش زمین کے ایک اور حصے کو بھی پہنچی جو چٹیل تھا (ایسا ہموار اور صاف جہاں پانی ہی نہ تھہرے) جس نے پانی کو اٹھا کر اٹھا کوئی گھاس اگائی۔ چنانچہ یہی مثال اس شخص کی ہے جس نے دین میں سمجھ حاصل کی اور اس ہدایت سے اللہ نے اسے نفع پہنچایا جس کے ساتھ اللہ نے مجھے بھیجا۔ پس اس نے خود بھی علم حاصل کیا اور دوسروں کو بھی سکھایا اور اس شخص کی مثال جس نے اس کی طرف سر اٹھا کر بھی نہ دیکھا (اعراض و گریز کیا) اور نہ اللہ کی اس ہدایت کو قبول کیا جس کے ساتھ اللہ نے مجھے رسول بنا کر بھیجا۔“ (بخاری و مسلم)

فوائد و مسائل : 1۔ اس سے معلوم ہوا کہ علم کے اعتبار سے لوگوں کی تین قسمیں ہیں: ایک وہ لوگ ہیں جو قرآن و حدیث کا علم حاصل کرتے ہیں اور اس پر عمل کرتے اور دوسروں کو بھی اس کی تعلیم دینے کے علاوہ اس علم سے مزید استنباط و استخراج کر کے قرآن و

حدیث کے فیض کو زیادہ سے زیادہ نام کرتے ہیں، یہ سب سے بہتر لوگ ہیں۔

دوسرے وہ لوگ ہیں جو علم تو حاصل کرتے ہیں لیکن اس سے استنباط و استخراج کی استعداد نہیں رکھتے، اس قسم کے اگرچہ ان کو خود بھی اور دوسروں کو بھی فائدہ پہنچتا ہے، تاہم ان کا فیض پلٹ قسم کی بہ نسبت کم ہے۔ اس اعتبار سے یہ دونوں قسمیں محمود ہیں۔ (جیسا کہ مثال کا بھی مقصود ہے)

تیسرے وہ لوگ ہیں جو قرآن و حدیث کے علم سے اعراض و گریز کا راستہ اپناتے ہیں نہ خود اسے سنتے اور پڑھتے ہیں جس سے انہیں فائدہ ہو اور نہ اسے سیکھ کر دوسروں تک پہنچاتے ہیں کہ وہ فائدہ اٹھا سکیں۔ یہ لوگوں کی بدترین قسم ہے۔ ہر مسلمان کو کوشش کرنی چاہیے کہ اس کا شمار پہلی دو قسموں میں سے کسی ایک قسم میں ہو۔

## ہدایت کی طرف بلانا

حضرت سہل بن سعد رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے فرمایا:

”اللہ کی قسم! تیرے ذریعے سے کسی ایک آدمی کو اللہ تعالیٰ کا ہدایت دے دینا تیرے لیے سرخ اونٹوں سے بھی بہتر ہے۔“ (بخاری و مسلم)

فائدہ : ”سرخ اونٹوں سے بہتر ہے“ یہ ایک تمثیل ہے، ہر بہتر چیز کے لیے۔ سرخ اونٹ عرب میں بہت بیش قیمت ہوتا تھا۔ اس میں دعوت الی اللہ کی فضیلت اور لوگوں کو ہدایت کی طرف بلانے کی ترغیب

ہے۔ تاہم اس کے لیے پہلے ضروری ہے کہ انسان خود بھی ہدایت کے راستے سے آگاہ اور واقف ہو، اس لیے قرآن و حدیث کا علم حاصل کرنا نہایت ضروری ہے کہ اس کے بغیر ہدایت و رہنمائی کا فریضہ انجام ہی نہیں دیا جاسکتا۔

حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

”میری طرف سے لوگوں کو (احکام الہی) پہنچا دو اگرچہ ایک آیت ہی ہو اور بنی اسرائیل سے بیان کرو، اس میں کوئی حرج نہیں اور جو مجھ پر جان بوجھ کر جھوٹ بولے وہ اپنا ٹھکانا جہنم میں بنالے۔“ (بخاری)

فوائد و مسائل : 1۔ اس میں ایک تو قرآن و حدیث کا علم حاصل کرنے اور پھر اسے آگے پھیلانے کی تاکید ہے جس کو تھوڑا یا زیادہ جتنا بھی علم ہو، وہ اس کی تبلیغ ضرور کرے اور لوگوں تک احکام الہی پہنچائے۔ یہ نہ سمجھا جائے کہ تبلیغ و دعوت تو صرف ملاء و اور سند یافتہ لوگوں ہی کا کام ہے بلکہ ہر شخص اپنے علم کی حد تک اس کا مکلف ہے، حتیٰ کہ کسی کو کسی ایک آیت ہی کا علم ہے، یعنی کسی ایک علم الہی ہی سے وہ آگاہ ہے تو اس کی ذمہ داری ہے کہ لوگوں کو بھی اس سے آگاہ کرے۔

2۔ اس میں بنو اسرائیل سے بیان کرنے کی ہوا اجازت ہے، اس سے مراد صرف بعض وہ واقعات اور قصے ہیں جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمائے ہیں اور وہ صحیح احادیث میں موجود ہیں۔ اس کا مقصد ہر قسم کی اسرائیلی روایات بیان کرنے کی عام اجازت دینا نہیں ہے، جیسا کہ عام طور پر اس سے یہ مفہوم اخذ کیا جاتا ہے۔

3۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف جھوٹی بات منسوب کرنے پر سخت وعید ہے۔ جس کا تقاضا یہ ہے کہ احادیث کی تحقیق اور چھان بینک نہایت ضروری ہے۔ اور جو حدیث بے سند ہو یا اس کے سلسلہ سند میں

متنہم یا کاذب راوی ہوں، یعنی شدید ضعف کی حامل ہو تو ایسی روایت کو حدیث رسول کے طور پر پیش کرنا سخت جرم ہے۔ ضعیف روایات کے مختلف درجے ہیں لیکن ان درجات کا علم اسلئے رجال اور اصول حدیث پر گہری اور وسیع نظر کے بغیر ممکن نہیں اور ایسے اصحاب علم جو علوم حدیث پر ماہرانہ نظر رکھتے ہوں، بہت ہی قلیل ہوتے ہیں۔

## جنت کا راستہ

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ”جو شخص علم (دین) کی تلاش کے لیے کسی راستے پر چلے تو اللہ تعالیٰ اس کے لیے جنت کا راستہ آسان فرمادیتا ہے۔“ (مسلم)

فائدہ : علم سے مراد دین، یعنی قرآن و حدیث کا صحیح علم ہے جو فقہی تعصب کی عینک کے بغیر حاصل کیا جائے، ورنہ فقہی تعصب علم کو بھی حجاب اکبر بنا دیتا ہے۔

## اجر عظیم

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ ہی سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”جو شخص ہدایت کی طرف بلائے گا، اس کو ان تمام لوگوں کے برابر اجر ملے گا جو اس ہدایت کی پیروی کریں گے اور یہ پیروی کرنے والوں کے اجر میں کوئی کمی نہیں کرے گا۔“ (مسلم)

فوائد و مسائل : اس حدیث کا اگلا حصہ یہ ہے: ”جو گمراہی کی دعوت دے گا تو اس کو ان تمام لوگوں کے گناہوں کے برابر گناہ ہوگا جو اس گمراہی کی پیروی کریں گے اور یہ ان گمراہی کی پیروی کرنے والوں کے گناہوں میں کوئی کمی نہیں کرے گا۔“

اس میں خیر کی دعوت دینے والوں کے لیے بڑی خوش خبری اور شر کی دعوت دینے والوں کے لیے سخت



### صدقہ جاریہ

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ ہی سے روایت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”جب انسان مرجا جائے تو اس کے عمل کا سلسلہ ختم ہو جاتا ہے مگر تین چیزوں کا ثواب اسے ملتا رہتا ہے۔ صدقہ جاریہ اور وہ علم جس سے فائدہ اٹھایا جائے اور نیک اولاد جو اس کے لیے دعائے خیر کرتی رہے۔“ (مسلم)

فائدہ : 1- عمل کا سلسلہ ختم ہو جاتا ہے۔ کا مطلب ہے کہ اس پر اجر و ثواب ملنا بند ہو جاتا ہے، تاہم تین عمل ایسے ہیں کہ موت کے بعد بھی ان کا ثواب میت کو پہنچتا رہتا ہے۔ صدقہ جاریہ، جیسے مرنے والا مسجد و مدرسہ، اسپتال اور سرائے وغیرہ بنا جائے تو جب تک لوگ ان سے فائدہ اٹھاتے رہیں گے، میت کو ثواب پہنچتا رہے گا۔ علم، جس سے فائدہ اٹھایا

جائے، کا مطلب ہے، دوسروں کو علم سکھانا یا تالیفات و تصنیفات کے ذریعے سے علم پھیلانا۔ جب تک اس کا سلسلہ تلمذ قائم اور کتابیں محفوظ و موجود رہیں گے اور لوگ ان سے برابر فائدہ اٹھاتے رہیں گے تو ان کا اجر بھی استوا یا مصنف کتاب کو ملتا رہے گا۔ اولاد کی نیک تربیت بڑی ضروری ہے تاکہ وہ مرنے کے بعد صحیح طریقے سے اپنے والدین کے حق میں دعائے خیر کرتی رہے کیونکہ اولاد کی دعا والدین کے حق میں مفید ہے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ ہی سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا۔

”دنیا ملعون ہے اور جو کچھ مسلمان اس میں ہے وہ بھی ملعون ہے، سوائے اللہ تعالیٰ کے ذکر اور اس کے متعلقات کے اور عالم یا متعلم کے۔“ (اسے ترمذی نے روایت کیا ہے اور کہا ہے یہ حدیث حسن ہے۔) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (کے فرمان) وما والاہ کا

مطلب ہے: اللہ کی اطاعت (ایسے امور بجالانا جن میں اللہ کی اطاعت و فرماں برداری اور اس کی قنوت کا پہلو ہو۔)

فوائد و مسائل : 1- اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ واقعی دنیا اور اس کا ساز و سامان ملعون ہے بلکہ دنیا کا وہ مال و متاع ملعون ہے جو انسان کو اللہ کی یاد سے غافل کر دے یا اس کے لیے ملعون ہے جس کو دنیا میں اللہ یاد ہی نہ آئے۔

2- اسے کتاب النعم میں اس لیے بیان کیا ہے کہ علم دین کا حاصل کرنا نہایت ضروری ہے تاکہ انسان کو علم ہو کہ فلاں بات یا کام اللہ کی رضا کا اور فلاں اس کی ناراضی کا باعث ہے، اسی لیے اس میں عالم اور متعلم کو مستثنیٰ کر دیا گیا ہے۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

”جو شخص علم کی جستجو میں نکلتا ہے تو وہ لوٹے تک اللہ کی راہ میں (شمار) ہو گا۔“ (اسے ترمذی نے روایت

کیا ہے اور کہا ہے یہ حدیث حسن ہے۔)

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ”مومن بھلائی سے ہرگز سیر نہیں ہوتا، یہاں تک کہ وہ اپنی آخری منزل جنت میں پہنچ جاتا ہے۔“ (اسے ترمذی نے روایت کیا ہے اور کہا ہے یہ حدیث حسن ہے۔)

حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

”عابد پر عالم کی فضیلت ایسے ہی ہے جیسے میری فضیلت تمہارے ایک اونٹنی آدمی پر۔“ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”بے شک اللہ تعالیٰ اس کے فرشتے اور آسمان و زمین کی مخلوق، حتیٰ کہ چوہنی اپنے بل میں اور مچھلی تک (پانی میں) لوگوں کو بھلائی سکھانے والوں پر (اپنے اپنے انداز میں) رحمت بھیجتے اور دعائیں کرتے ہیں۔“ (اسے ترمذی نے روایت کیا ہے اور کہا ہے یہ حدیث حسن ہے۔)

فوائد و مسائل : 1- عالم سے مراد قرآن و حدیث کا عالم ہے جو فرائض و سنن کی پابندی کے ساتھ تعلیم میں مصروف رہتا ہے۔ اور عابد سے مراد وہ شخص ہے جو اپنا زیادہ وقت عبادت الہی میں گزارتا ہے۔ اس کے نوافل اور کثرت ذکر کا فائدہ چونکہ اس کی اپنی ذات تک محدود رہتا ہے، جب کہ عالم کے علم کا فیض دوسرے لوگوں تک بھی پہنچتا ہے، اس لیے وہ عابد پر بہت زیادہ فضیلت رکھتا ہے۔

صلوٰۃ کی نسبت اللہ کی طرف ہو تو معنی ہوتے ہیں: رحمت بھیجتا، فرشتوں کی طرف ہو تو معنی ہیں: مغفرت کی دعا کرنا اور دوسری مخلوق، انسان و حیوان کی طرف ہو تو معنی ہیں: دعا و التجار کرنا۔ گویا معلم خیر پر اللہ تعالیٰ رحمت بھیجتا ہے، فرشتے اس کے لیے مغفرت طلب کرتے ہیں اور دوسری مخلوق اس کے حق میں خیر کی دعائیں کرتی ہے۔

اس میں عالم کی فضیلت اور علما کی توقیر و تکریم کا بیان ہے۔

حضرت ابو ذر و اعر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا:

”و فتنس ایسے راستے پر چلے جس میں وہ (دین کا) علم تلاش کرے، تو اللہ تعالیٰ اس کے لیے جنت کا راستہ آسان کر دیتا ہے اور فرشتے طالب علم کے لیے اس کے سامنے آتے ہیں اور اس کے دل پر رکھ دیتے ہیں اور اس کے دل پر آسمان و زمین کی ہر مخلوق، حتیٰ کہ چھیلیاں بھی اس کی دعا کرتی ہیں اور عالم کی فضیلت عابد پر فضیلت حاصل ہے اور علما انبیاء کے وارث ہیں اور انبیاء نے اپنے ورثے میں دینار اور درہم نہیں چھوڑے، وہ تو (دین کا) علم ہی ورثے میں چھوڑ کر جاتے ہیں۔ چنانچہ جس نے وہ علم حاصل کیا، اس نے (شرف و فضل کا) ایک برا حصہ حاصل کر لیا۔“ (اسے ابو داؤد اور ترمذی نے روایت کیا ہے۔)

فائدہ : اس میں بھی گزشتہ حدیث کی طرح علم دین حاصل کرنے کی فضیلت اور علما کے شرف و احترام کا بیان ہے۔ فرشتوں کے پر رکھ دینے کا مطلب ہے کہ وہ اپنے پیروں کو بند کر کے بیٹھ جاتے ہیں، جیسے علم و ذکر کی دوسری محفلوں کو وہ گھیر لیتے ہیں۔

### لوگوں تک پہنچانا

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا۔

”اللہ تعالیٰ اس آدمی کو تروتازہ رکھے جو ہم سے کوئی بات سنے، پھر اسے اسی طرح دوسروں تک پہنچا دے جس طرح اس نے سنا۔ اس لیے کہ بہت سے ایسے لوگ جن کو بات پہنچائی جائے، (پہلے) سننے والے سے زیادہ یاد رکھنے والے ہوتے ہیں۔“ (اسے ترمذی نے روایت کیا ہے اور کہا ہے یہ حدیث حسن صحیح ہے۔) فائدہ : اس میں جہاں علم کی فضیلت کا بیان ہے، وہاں دعوت و تبلیغ کی ترغیب بھی ہے۔

### آگ کی لگام

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”جس سے علم دین کی کوئی بات پوچھی جائے، پھر وہ اسے چھپائے تو قیامت والے دن اس کو آگ کی لگام دی جائے گی۔“ (اسے ابو داؤد اور ترمذی نے روایت کیا ہے اور ترمذی نے کہا ہے یہ حدیث حسن ہے۔) فائدہ : اس سے معلوم ہوا کہ مسائل کو دین کی صحیح بات نہ بتلاتا سخت کبیرہ گناہ ہے جس پر جہنم کی شدید وعید ہے۔

### اللہ کی رضا

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ ہی سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”جو شخص وہ علم جس سے اللہ کی رضامندی طلب

## گیت درویش

سیر احمد

حرام۔

باب آیا تو میں نے کہہ دیا۔ ”تمہارے سوال کا جواب مل گیا ہے۔ اسلام سے پہلے اور اسلام کے بعد کسی مذہب نے ”رزق حرام“ کی ممانعت پر اتنا زور نہیں دیا جتنا اسلام نے دیا ہے۔ اگر تم ”رزق حرام“ کھاؤ گے تو تمہاری آنے والی اولاد میں دیوانگی کے اثرات پیدا ہو جائیں گے۔“

میری یہ بات سن کر باب نے کہا۔ ”میں رک جائیں۔“ کہہ کر وہ چلا گیا۔

مغرب کی آذان ہو رہی تھی تب وہ واپس اندر آیا اور کہنے لگا۔ ”ہاں تو اب میں مسلمان ہو گیا ہوں۔“

درخت کی روشنیوں میں بھگت گئیں البتہ اس میں سے سارنگی کی آواز آرہی تھی۔ میرے نالوں ”راجہ گدھ“

کا پہلا معجزہ یہ واقعہ ہے۔ پھر صبح چل قدمی کے لیے چھت پر نئی توہاں ایک کتاب رکھی تھی جس کی جلد پر

مونا مونا ”راجہ گدھ“ لکھا تھا۔ میں نے قلم اٹھایا اور مجھے نہیں پتا کتاب کیسے لکھی گئی۔ (راجہ گدھ ایک

مینے کے عرصے میں لکھی گئی تھی)

کچھ قلم کار ادب کا باب ہوتے ہیں اور کچھ پوری کتاب۔ کچھ ادب کے باب لکھتے ہیں اور کچھ ابواب۔

بانو قدسیہ کا شمار ان ہی چند لوگوں میں ہوتا ہے جو خود کتاب تھے اور کہتے ہی ابواب لکھ گئے۔ جس دور سے

بانو قدسیہ نے لکھنا شروع کیا اس دور کے لکھنے والوں کے قلم ہجرت، معاشرہ، انسانی نفسیات، محبت، بدلتی

اقدار، نئی نسل اور پرانی نسل کی کشمکش کا احاطہ کر رہے تھے۔ لیکن بانو قدسیہ نے نہ صرف نئے موضوعات پر

نئے انداز سے قلم اٹھایا بلکہ انہوں نے ادب میں ”اللہ اور بندے“ کے تعلق اور محبت کے اظہار پر مبنی وہ

ایک سادہ درویش۔ جس کے ہاتھ میں زمرہ جڑی

انگوٹھیاں ہیں نہ گلے میں موتی جڑی ملائیں۔ نہ ہاتھ کی تسبیح اس کے دلی ہونے کی گواہی دیتے کو موجود

ہے۔ نہ قلندرانہ جوغہ اور کشکول درکار ہیں کہ اوڑھ کر ہتھام کر وہ درویش بٹکے اور ”حق ہو“ کی صدا میں لگائے

وہ چار دیواری میں رہتی ہیں۔ قلم کو روشن کر کے لفظوں کو عیاں کرتے، وہ ”رزق حرام“ کی پرزور

ممانعت کرتے، رزق حلال کو اسلام کی اساس قرار دیتے ”راجہ گدھ“ لکھتی ہیں۔

”حکومت کے ایک روکر گرام کے تحت باب (book) جو ایک روایتی امریکی شخص تھا ہمارے گھر

رہا۔ باب مجھ سے پوچھا کرتا۔ ”ہاں تو اب مجھے بتائیے کہ اسلام کس طرح دوسرے

مذہب سے بہتر ہے؟“

چونکہ میں انٹری تھی تو میں کہتی۔ ”مسلمانوں کا یقین ہے کہ اللہ ایک ہے۔“

وہ کہتا۔ ”تو کیا یہودیوں کا خیال ہے کہ اللہ تین ہیں

میں بارمان لیتی۔ چند دنوں تک مجھ سے اسی طرح سوال کرتا رہا۔

کچھ دن گزرے تو مجھے غصہ آنے لگا۔ عصر کے قریب کا وقت تھا۔ شام کو ڈرائنگ روم

کے پردے ہٹا کر بیٹھی تھی۔ ہمارے لان میں ایک درخت ہوتا تھا جسے سندری کہتے ہیں۔

سندری کے درخت سے سارنگی بنائی جاتی ہے۔ میں نے دیکھا کہ سندری کے درخت میں یک دم بقیان جل

انہیں اور وہ خوب روشن ہو گیا۔ اور اس میں سے آواز آنے لگی۔ ”رزق حرام۔۔۔ رزق حرام۔۔۔ رزق

## کام کا آغاز

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ ہی سے روایت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

”ہر اہم کام جو اللہ کی حمد و ثناء سے شروع نہ کیا جائے ناقص اور بے برکت ہے۔“ (یہ حدیث حسن ہے۔

ابوداؤد وغیرہ نے روایت کیا ہے۔)

فائدہ: ایک دوسری روایت میں ہے کہ جس اہم کام کی ابتدا بسم اللہ سے نہ کی جائے، وہ بے برکت

ہے۔ بہر حال ہر کام کے آغاز میں اللہ کا نام لینا یا اس کی حمد کرنا دیگر دلائل کی روشنی میں مستحب ہے۔

## صبر

حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

”جب کسی بندے کی اولاد فوت ہو جاتی ہے تو اللہ تعالیٰ اپنے فرشتوں سے فرماتا ہے: تم نے میرے

بندے کی اولاد (کی روح) کو قبض کیا ہے؟“

تو وہ کہتے ہیں: ”ہاں۔“ چنانچہ اللہ فرماتا ہے: ”تم نے اس کے دل کا پھل قبض کیا ہے؟“

وہ کہتے ہیں: ”ہاں۔“

تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ”میرے بندے نے کیا کہا؟“

وہ کہتے ہیں: اس نے تیری حمد بیان کی اور اتنا اللہ و اتنا الیہ راجعون بڑھا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: تم میرے

بندے کے لیے جنت میں ایک گھر بنا دو اور اس کا نام بیت الحمد رکھو۔“ (اسے امام ترمذی نے روایت کیا ہے اور کہا ہے یہ حدیث حسن ہے۔)

فائدہ: اس میں مصیبت کے وقت صبر کرنے اور اللہ کی حمد کرنے کی فضیلت کا بیان ہے۔ خاص طور پر

اولاد کی دائمی جدائی کے صدمے پر جزع و فرح اور بے صبری کا مظاہرہ کرنے کی بجائے اللہ کی رضا و تقدیر پر صبر

و شکر کرنا بڑے اجر و ثواب کا کام ہے۔

کی جاتی ہے، اس لیے حاصل کرے تاکہ اس کے ذریعے سے دنیا کا ساز و سامان حاصل کرے، تو وہ قیامت کے روز جنت کی خوشبو بھی نہیں پائے گا۔“

(اسے ابوداؤد نے صحیح سند سے روایت کیا ہے۔)

فائدہ: اس میں اس امر کی ترغیب ہے کہ علم دین صرف اللہ کی رضا کے لیے حاصل کیا جائے اگر دنیا حاصل کرنے کا مقصد پیش نظر ہو گا تو یہ بہت برا جرم

ہے کہ دین کا عالم جنت کی خوشبو تک سے محروم رہے گا۔ ہاں بغیر قصد و نیت کے دنیا مل جائے تو اور بات ہے،

وہ انسان کے لیے نقصان دہ نہیں۔

## عالم کی وفات

حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا:

”اللہ تعالیٰ علم اس طرح نہیں اٹھائے گا کہ اسے لوگوں (کے سینوں) سے کھینچ لے، لیکن وہ علم کو علما کی

وفات کے ذریعے سے اٹھائے گا۔ یہاں تک کہ جب وہ کسی عالم کو پاتی نہیں رکھے گا تو لوگ جاہلوں کو سردار بنا

لیں گے۔ چنانچہ ان سے سوال کیا جائے گا تو وہ بغیر علم

کے فتویٰ دیں گے۔ اور (لوں) خود بھی گمراہ ہوں گے اور دوسروں کو بھی گمراہ کریں گے۔“ (بخاری و مسلم)

فوائد و مسائل: 1 یہ قرب قیامت کی ایک علامت کا بیان ہے کہ علمائے دین ناپید ہو جائیں گے

اور جاہل لوگ سردار بنیں اور امام بن جائیں گے جن کو قرآن و حدیث کا علم ہی نہیں ہو گا اس کے باوجود وہ

مفتی اور مجتہد بنے ہوں گے اور اپنے فتوؤں اور خود ساختہ مسئلوں سے اپنے ساتھ دوسرے لوگوں کی بھی

گمراہی کا باعث بنیں گے۔

2۔ اس میں جہاں اس امر کی ترغیب ہے کہ علمائے دین زیادہ سے زیادہ تیار کیے جائیں وہاں اس کی بھی

تائید ہے کہ جاہلوں کو دین کا پیشوا بنانے سے اجتناب کیا جائے۔



نومبر 1928ء کو فیروز پور، پنجاب (انڈیا) میں پیدا ہوئے والی بانو، اپنی والدہ اور بھائی کے ساتھ ہجرت کر کے لاہور آئی تھیں۔ گورنمنٹ کالج لاہور میں ایم اردو کی کلاس میں ان کی ملاقات اشفاق احمد سے ہوئی۔ انہوں نے اپنی پہلی کہانی یا نچوس کلاس میں لکھی تھی جو بعد ازاں ”درماندگی شوق“ کے نام سے شائع ہوئی۔ اشفاق احمد نے ہی بانو قدسیہ کو لکھنے رہنے پر متاثر رکھا۔ ممتاز مفتی بھی یہ کہا کرتے تھے کہ یہ چوہما چو کا چھوڑ اور بس لکھا کر۔ یقیناً ”دونوں مرد حضرات یہ بھانپ چکے تھے کہ ”بانو قدسیہ اور اس کا قلم“ کیا ہے۔ اشفاق احمد کا کہنا تھا کہ ”شروع میں بانو قدسیہ کی اردو ٹھیک نہیں تھی۔ لیکن پھر بانو کی ہی اردو اتنی اچھی ہو گئی کہ اس نے مجھے پیچھے چھوڑ دیا۔ ہم دونوں میں فرسٹ آنے کا مقابلہ چلتا رہتا تھا اور بانو فرسٹ آجایا کرتی تھی۔“

بانو قدسیہ نے جب ڈرامہ لکھنا شروع کیا تو انہیں اس فیلڈ میں رینڈ سینٹر کہا گیا۔ انہوں نے عورتوں کی نفسیات، جذبات ان کی سانس کی، نچلے طبقے کی نمائندگی، ایلیٹ کلاس کے کیا کس کو کچھ اس مفرد انداز سے لکھا کہ دیکھتے ہی دیکھتے ادب کی طرح ڈرامہ اندیشی

ادائی ہوتی ہے۔ روحانیت ایک ایسا موضوع ہے جسے پڑھ کر، سمجھ کر، طے کر کے نہیں لکھا جاسکتا۔ روحانیت وہ ندی ہے، جو لکھنے والے میں نہ بنے، وہ اس میں ڈوب کر نہ لٹے تو وہ خواہ مخواہ اس میں قلم بھگو کر، کچھ لفظ تو شاید ٹھیک لکھ سکتا ہے۔ لیکن اس کو کھلے جسم میں ”روح“ نہیں پھونک سکتا۔ کیونکہ حقیقت آشکار نہ ہو، تو اس کی عکاسی بھی محال ہوتی ہے۔ اس لیے یہ کہنا بے جا نہیں ہو گا کہ بانو قدسیہ کی ذات میں وہ ندی (شاید دریا یا سمندر یا اسے بھی زیادہ) تھی تھی جس میں ڈوب کر انہوں نے وہ تحریریں نکالیں، جو صرف قلم کی روشنائی، سوچ کی پرکاری سے نہیں بنی جاسکتیں۔ ”راج گدھ“ ایک ایسا ناول ہے جس کا شمار اردو زبان کے لن چند ناولز میں ہوتا ہے جو اپنی اشاعت سے

اب تک کسی بھی دوسری کتاب سے زیادہ خرید اور بچھا جا رہا ہے۔ جو برٹش لائبریری میں دنیا بھر کی بہترین کتابوں کی محدود فرسٹ میں، اردو سیکشن میں سب سے اوپر ہے۔ یہی ناول سی ایس ایس نصاب میں شامل ہے۔

بھی۔“ (تنگی دل) ”شاد تو اچھے وقتوں میں کبھی نہ بولی تھی، اب کیا بولتی۔ ایسی رو میں تو ازل سے چپ ہوئی ہیں۔ انہوں نے اپنی ساری باتیں، روز قیامت کے لیے روک رکھی تھیں۔ (بڑا بول)“

بانو قدسیہ نے کبھی بھی محبت کو لولی نہ بنا کر، بیکار مسیحا کر پیش نہیں کیا۔ انہوں نے محبت کی اسی حقیقت کی عکاسی کی، جو جوڑ کا پانی بھی رہی اور آبشار کی بوچھاڑ بھی۔

”سن آمد! ہر انسان چاہے وہ مرد ہو، چاہے عورت، اندر سے وہ رب ہے۔ چھوٹا سا رب۔ ہر رب کی آرزو ہے کہ کوئی ایسا بھی زندگی میں آئے جو اس کی ذات کے ساتھ کسی اور کو شریک نہ ٹھہرائے۔“ (مشک

(ناف)

اس کی محبت ایسی حرف ساز تھی کہ میری ساری عبارت جو بے معنی تھی، ولاؤ پر غزل بن گئی پھر جو پڑھتا گیا، سوز گداز سے بھر گیا۔ (بانو) شروخی کی نمائندہ سطر۔ ”ہم دونوں اس طرح چپ چاپ بیٹھے رہے، جیسے ذہنی سے پہلے رہزن کم ختم رہتے ہیں۔“ (بانو)

بانو قدسیہ نے، کہانی کاری، کردار نگاری، ناول نگاری کی سدھ بدھ کچھ اس انداز سے بدلی کہ اس میں کئی جہتیں متعارف کرادیں۔ انہوں نے اکثر گرامر کے قواعد کو، زبان کے بیان کو فراموش کیا تو ”اردو ادب“ کو ایک نیا انداز بھی دیا۔ کہا جاتا ہے کہ بانو نے مرد بن کر لکھا، اور یہ بھی کہ بانو نے مردانہ بول سے آگے جا کر لکھا۔ لیکن درحقیقت بانو نے صرف ”بانو قدسیہ“ بن کر لکھا۔ وہ کبھی بھی مردوں سے مقابلے میں نہیں رہیں، نہ ہی اپنے ہم عصروں سے۔ کیونکہ شاید وہ بھی اچھی طرح سے سمجھتی تھیں کہ مقابلہ تعمیر میں تو ہو سکتا ہے لیکن تخلیق میں نہیں۔ تخلیق تو وہ عہد ہے جو ہر تخلیق کار، اپنی ریاضت سے قائم اور ادا کرتا ہے۔ اس میں تکرار نہیں ہوتی، صرف

تحریریں لکھیں جو ان سے پہلے کسی نے نہیں لکھی تھیں۔ انہوں نے خدا اور انسان پر قلم اٹھایا۔ جیسے کہ

”شاید ابلیس کا گناہ فقط تکبر ہے، لیکن میرا خیال ہے کہ تکبر کا حاصل مایوسی ہے۔ جب ابلیس اس بات پر مصر ہوا کہ وہ مٹی کے پہلے کو سجود نہیں کر سکتا تو وہ تکبر کی چوٹی پر تھا لیکن جب تکبر ناکامی سے دوچار ہوا تو ابلیس اللہ کی رحمت سے ناامید ہوا۔ حضرت آدم بھی ناکام ہوئے، وہ بھی جنت سے نکالے گئے لیکن وہ مایوس نہیں ہوئے ابلیس نے دعا کر رکھا ہے میں تیری مخلوق کو تیری رحمت سے مایوس کر دوں گا۔ ناامید“ مایوس لوگ میرے گردہ میں داخل ہوں گے۔ اللہ جانتا

ہے کہ اس کے چاہنے والوں کا انخا ممکن نہیں۔ وہ کنویں میں لٹکائے جائیں، آگ پر جلانے جائیں، صلیب پر لٹکیں، لیکن وہ مایوس نہیں ہوں گے۔“ (ابن آدم)

بانو قدسیہ کو اگر انسانی نفسیات کے بنیائے پر ”کمال فن“ کا درجہ دیا جائے تو ہرگزبالغہ نہیں ہو گا۔ انہوں نے مرد، عورت، باب، بھائی، شوہر، معاشرتی انسان، گناہگار، قاتل، چور، ظوائف وغیرہ سب کو کچھ ایسے بیان کیا کہ کرداروں کا ظاہر باطن تصویر میں ڈھل کر سامنے آ گیا۔

”اس کی چپ“ اس کا گونگا بن، اس کے مزین برت سب ماں کو ستانے کے لیے ہوتے تھے۔ اباب کی چپ میں بڑی چال تھی۔ میں اباب کی طرح چپ نہیں تھی، میری چپ خویلی کے صدر دروازے کے قدموں میں گرے ہوئے اس قفل کی مانند تھی، جسے بچھلی رات چور دروازے کے کندے سے اتار کر پھینک گئے ہوں۔ ایسا تالا بہت کچھ کہتا ہے، لیکن کوئی تفصیل بیان کرنے سے قاصر رہتا ہے۔“ (تہذیب اداسی)

”ساری عمریں خود ترسی کا شکار رہا۔ تو میں نے اپنا یہ جذبہ ضائع کیا۔ میں رشتے توڑتا، ان کا الزام دوسرے کے سر دھرتا رہا ہوں۔ میں بے وفا بھی تھا اور دھونس

بار، نئے معنی دیتی ہیں۔ وہ رکتی نہیں، بہتی ہیں اور انہیں لکھنے والا، ایسا حقیقی تخلیق کار ہوتا ہے جو اپنی پسند پر نہیں ”حکم خداوندی“ پر لکھتا ہے۔ وہ اپنی حقیقت کو تسلیم کرتا ہے، اس پر پر ختمیں چڑھانا نہیں چلا جاتا۔

”مجھ پر آشکار ہوا کہ ابھی میں بڑی عام سی زندگی میں معمولی طور پر زندہ ہوں۔ مجھے اعزاز یا ک خوشی ہوتی ہے اور میں اتنی بڑی نہیں ہوں جس قدر میرے قارئین نے سمجھ رکھا ہے۔ مجھے تعریف کی خواہش اور اپنے لیے تالی بخنے کا انتظار رہتا ہے۔ سب سے بڑا تعجب مجھے یہ ہوا کہ آپ لوگوں نے یہ شبہ ڈال رکھا تھا کہ میں درویش صفت ہوں لیکن انعام کے ساتھ جو رقم نصیبی ہے اس نے یہ پول بھی کھول دیا۔ یقین کیجئے کہ ابھی مجھ میں وہ قوت پیدا نہیں ہوئی کہ بازار سے تو گزرے پر خریدار نہیں تھے۔

جہاں تک اردو کی خدمات کا سوال ہے تو یقیناً جانچے یہ بھی ایک مغالطہ ہے۔ میں نے اردو کو کلباڑا بنا کر اپنے لیے ہی لکڑیاں کالی ہیں۔ میرے اندر کی تو حرص ہی مجھے سوائے اپنے کسی اور کی خدمت کرنے نہیں دیتی۔ پھر اردو کی خدمت کا جھنڈا لے کر کیسے چلوں؟“ (بانو قدسیہ)

اور میں میرا حمید۔ میرا کہنایہ ہے۔  
”جو لکھ دیا گیا، وہ تاریخ ہو چکا۔ جب جب پڑھا جائے گا، پڑھنے والا اسیر ہو گا۔“

میں بھی ان کی انفرادیت کی دھاک بیٹھ گئی۔ ان کے ڈرائے ”آدھی بات“ کو کلاسک کا درجہ حاصل ہے۔ ایک انڈین ڈائریکٹر پروڈیوسر کا کہنا تھا کہ وہ بانو قدسیہ کے ڈراموں کی کیسٹ اپنی ٹیم کو دکھایا کرتے تھے تاکہ وہ ان جیسا اسکرین پلے، جملے، اور اسکرپٹ لکھنا سیکھ جائیں۔

بانو قدسیہ کو بہترین پلے رائٹ کا گریجویٹ ایوارڈ، تاج ایوارڈ، ستارہ امتیاز، کمال فن اور کئی دوسرے ایوارڈز سے نوازا گیا۔

ایک بار بانو قدسیہ سے اسٹیج پلے لکھوایا گیا۔ پہلے شو سے پہلے تک لوگوں کی آراء انہیں کہ بانو جو ایک بوڑھی سی خاتون ہے، فلسفیانہ باتیں کرتی ہے، مزاح ٹرینڈ ٹھیکر کا ڈرامہ کیسے لکھ پائے گی۔ شو ناکام ہو جائے گا۔ لیکن پھر جب پہلا شو ہوا تو لوگ حیران رہ گئے کہ مزاح کی پچویشن اتنی نفیس، اور ایسی منفرد بھی ہو سکتی ہے۔ ڈرامہ بے حد کامیاب رہا۔

ایسا لکھاری جو وقت کے ہماؤ کے ساتھ ساتھ بنے، اور ایک نہیں لکھتی ہی نسلوں کے دلوں، دماغوں تک رسائی حاصل کرے۔

اور ادب کی حقیقت کی راز کی باتیں ہر دور میں آشکار کرتا چلا جائے، وہ عام لکھاری نہیں ہوتا۔ اس کی تحریریں ہر نسل سے ہمکلام رہتی ہیں، ہر دور میں بولی سمجھی پڑھی جاتی ہیں۔ وہ ایک معنی نہیں رکھتیں، ہر

## رفعت سراج کو صدمہ

مایہ ناز مصنفہ رفعت سراج کے والد محترم محمد سراج الدین صاحب مختصر سی علالت کے بعد اس دار فانی سے رحلت فرما گئے۔

ان اللہ وانا الیہ راجعون

سراج صاحب انتہائی مختفی، خوددار اور بااخلاق انسان تھے۔ انہوں نے اپنی المیہ کی طویل علالت میں بڑی مستقل مزاجی اور ہمت سے ان کا ساتھ دیا۔ بچوں کی عمدہ تربیت میں ان کا بڑا حصہ تھا۔ ان کی دائمی جدائی رفعت سراج اور دیگر اہل خانہ کے لیے بہت بڑا سانحہ ہے۔ ہم رفعت سراج کے غم میں برابر کے شریک ہیں اور اللہ تعالیٰ سے دعا گو ہیں مرحوم کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام سے نوازے اور اہل خانہ کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ (آمین)

قارئین سے دعائے مغفرت کی درخواست ہے۔



بندھن

## وہاج خان ہلالہ ثینیہ و ہاج خان شاہین رشید

شادی ایک مقدس فریضہ ہے ہر عاقل و بالغ کو اپنی مرضی سے اپنی پسند سے شادی کرنے کا اختیار اللہ تعالیٰ نے دیا ہے لیکن اس کے باوجود جو اولاد والدین کی مرضی اور پسند سے شادی کرتی ہے اس پر اللہ کی خاص رحمت برسی ہے۔ وہاج خان اس فیملی کا ایک معتبر نام ہے۔ لوگ ان کے کام کو پسند کرتے ہیں۔ ”سرگودھا“ کے رہائش پذیر کام کے سلسلے میں کراچی آتے ہیں۔ کیونکہ یہ بلائے جاتے ہیں۔ اچھا فنکار ملک کے کسی بھی کونے میں ہو اگر ڈائریکٹر کی ضرورت ہے تو اسے ضرور ملاتے ہیں۔

”بندھن“ کے اس مشہور و معروف سلسلے میں آج ہمارے مہمان وہاج خان اور مسز وہاج خان ہیں۔

”کیا حال ہے وہاج صاحب؟“

”اللہ کا رحم ہے“

”کیا مصروفیات ہیں آج کل؟ کام کیسا چل رہا ہے؟“

”مصروفیات کافی ہیں۔ اور کام بھی اچھا چل رہا ہے۔“

”کچھ بتائیے اپنی مصروفیات کے بارے میں؟“

”جی آج کل میں ”جیو“ کے دو سیریلز کر رہا ہوں۔ ”خان“ اور ”سوریا“ خان“ کے ڈائریکٹر ”علی فیضان“ ہیں اور سوریا کے ”ناشی بھائی“ دونوں بہت اچھے پروڈیوسر ہیں اور دونوں میں میرا کام بہت اچھا ہے۔ ایک احمد کامران کا پہلے کر رہا ہوں۔ اور کچھ کام ابھی پائپ لائن میں ہیں۔ تنویر جمال صاحب سے بھی ایک سیریل پہ ڈسکشن چل رہی ہے اور ایک نئے پروڈکشن ہاؤس کے ساتھ بھی بات چیت چل رہی

ہے۔ ”فیملی لائف کیسی گزر رہی ہے۔ بچے ماشاء اللہ کیا کرتے ہیں؟“

”فیملی لائف ماشاء اللہ بہت اچھی گزر رہی ہے۔ بیگم اور بچے آپ کو بتا ہی ہیں کہ ”سرگودھا“ میں ہوتے ہیں۔ اور بڑھ رہے ہیں۔ سب سے چھوٹا بیٹا جس کا نام ”احمد“ ہے اسے شوق ہے اداکاری کا جس طرح میں اپنے بچپن میں بولتا رہتا تھا کہ مجھے ایکٹر بننا ہے۔ اسی طرح وہ بھی بولتا رہتا ہے کہ مجھے ٹی وی پر آنا ہے۔ مجھے کراچی جانا ہے اور ماشاء اللہ شرارتی بھی ہے اور مجھے اس میں ٹیلنٹ نظر بھی آتا ہے۔ بی بی وانیہ کو میڈیا سے تو کوئی خاص لگاؤ نہیں ہے۔ البتہ اسے پینٹنگ کا شوق ہے اور بہت اچھی کرتی ہے۔ اسے ٹیچر بننے کا بہت شوق ہے۔ فصام میرا بیٹا بہت شرارتی ہے۔ ڈانس کرنا اور فلمیں دیکھنا اسے پسند ہے۔ احمد اس فیملی میں آسکتا ہے مگر اس کی پرہیزی متاثر ہوگی۔ اور ویسے بھی سارا کام کراچی میں ہوتا ہے۔ ہاں کسی کمرشل کی آفر آئی یا کسی ڈرامے میں بہت اچھا رول ملا تو ضرور کرے گا۔ وانیہ ماشاء اللہ کلاس 4th میں ہے۔ فصام کلاس ٹو میں ہے احمد پلے گروپ میں ہے لیکن اس نے تین ماہ میں اپنا سلیبس (کورس) پورا کر لیا ہے تو اس کی میڈیم اسے اچھی کلاس کی تیاری کردار ہے۔ اللہ اسے نظردے سچائے (آمین)

”بہت خوب۔ تمہیں کیسی ہیں۔ مزاج پہلے جیسا ہے یا کچھ تبدیلی آئی ہے؟“

”جی۔۔۔ بیگم ٹھیک ٹھاک ہیں اور مزاج میں تبدیلی تو وقت کے ساتھ آئی ہی ہے، کیونکہ ہم بڑے ہو رہے

ہیں۔ روزانہ یا ہفتے وار اپنا موازنہ کریں تو ایسا لگتا ہے کہ ایک ہفتہ پہلے تو ہم چھوٹے تھے اور اب ہم بڑے ہو گئے ہیں۔ شادی سے لے کر اب تک کا موازنہ کرنا ہوں تو ایسا لگتا ہے کہ شادی کے وقت تو ہم بچے تھے اب ہم بہت بڑے ہو گئے ہیں۔ اسی طرح ہمارے بچے بھی بڑے ہو رہے ہیں۔“

”بیگم کیا کر رہی ہیں۔ آج کل۔۔۔ گھرواری یا کچھ اور بھی؟“

”بیگم کو ”ہومیو پیتھک“ ڈاکٹر بننے کا شوق ہو رہا ہے اور اس کی وہ پرہیزی بھی کر رہی ہیں۔ ایک سمسٹر پالی رہ گیا ہے پھر وہ ”ہومیو پیتھک“ ڈاکٹر بن جائے گی۔ مجھے تو یہ سب کچھ اتنا پسند نہیں۔ میں تو کتنا تھا کہ کسی اور مقصود میں ماسٹر کر لوں۔ اس میں نہ کچھ کرسکے مگر اس کا شوق تھا، کیا کر سکتے ہیں۔ ویسے اسے لیڈر بڑو تھیک کا بھی شوق ہے تو ہو سکتا ہے کہ مستقبل قریب میں وہ بوتھیک کھول لے۔ اور گھر واری تو ماشاء اللہ وہ بہت اچھی طرح نبھا رہی ہے۔“

”ماشاء اللہ سے شادی کو کتنے سال ہو گئے ہیں اور آپ کی زندگی کے سب اہم کام اپریل میں ہوتے ہیں۔ اس کے بارے میں بھی کچھ بتائیں نہیں؟“

”شادی کو ماشاء اللہ گیارہ سال ہو گئے ہیں اور ہماری شادی 22 اپریل کو ہوئی تھی۔ اپریل کی کہانی کچھ یوں ہے کہ میں 25 اپریل کو پیدا ہوا، شادی بھی

اپریل میں ہوئی۔ پہلی فلم بھی 4 اپریل کو ریلیز ہوئی تھی اور جب میں نے شو بز جوائن کیا تب بھی اپریل کا مہینہ تھا۔“

”واہ۔۔۔ ہمیں معلوم ہے کہ آپ کی شادی اربن تھی۔ تفصیل آپ بتائیں؟“

”آپ لیکن کریں میں نے اپنی بیوی کو شادی کے دن ہی دیکھا تھا۔ شادی سے پہلے کچھ واقعات ایسے ہوئے تھے کہ میرا دل بہت بھجا بھجا سا رہتا تھا۔ پھر والد صاحب کے انتقال نے مجھے اور بھی زیادہ افسردہ اور حساس کر دیا۔ ہر وقت اداس اور پریشان رہتا تھا تو والدہ نے کہا کہ شادی کر لو۔ پسند ہو تو بتا دو میں نے کہا کہ جہاں آپ مناسب سمجھیں، کر دیں۔ مگر یہ خیال رکھیے گا کہ لڑکی بڑھی لکھی ہو۔ کہ کل کو ہمارے بچے ہوں تو ان کی تربیت اچھے انداز میں ہو۔“

”پھر ”مل“ کی پسند آپ کو پسند آئی؟“

”جی۔۔۔ بہت ماشاء اللہ میری بیوی ٹھینہ نہ صرف بڑھی لکھی ہے بلکہ خوب صورت، ذہین اور سکھ بھی ہے۔ میں بہت خوش ہوں اپنی ازدواجی زندگی سے۔“

”گلدے۔ لیکن فرض کریں سب کچھ اس کے برعکس ہوتا تو؟“

”فقہیسی۔۔۔ تو شاید زندگی اچھی نہ گزر رہی ہوتی اور مجھے سمجھو نا کرنا پڑتا۔ لیکن جچ پوچھیں تو مجھے اپنی



ای کی پسند بر بھروسا تھا۔

”آج کے دور میں ”ماؤں“ کی پسند پر کون بھروسا کرتا ہے، بڑی بات ہے کہ آپ نے بھروسا کیا۔“

”سب کو ”ماں“ کی پسند پر بھروسا کرنا چاہیے۔ وہ جب ہماری تربیت اتنی اچھی کر سکتی ہیں۔ ہماری پرورش کے لیے تکلیف اٹھاتی ہیں تو کیا ہماری لائف پازنٹر کے لیے وہ کوئی غلط فیصلہ کریں گی؟ ایسا نہیں ہو سکتا۔ بانی تو سارے کھیل قسمت کے ہیں۔ برا ہو جائے تو اس میں ہمارے بڑوں کا کوئی قصور نہیں ہوتا۔“

”گویا کامیاب ازدواجی زندگی کے لیے والدین کی پسند کو ترجیح دینا چاہیے۔“

”بالکل“ میرا یہی خیال ہے۔ کیونکہ ہم جب کسی لڑکی سے محبت کر رہے ہوتے ہیں اس سے جھوٹ بول رہے ہوتے ہیں۔ بہت کچھ بڑھا چڑھا کر بتا رہے ہوتے ہیں اور خُب شادی کے بعد جیسے سامنے آتا ہے تو پھر لڑائی جھگڑے شروع ہو جاتے ہیں۔ اور نوبت علیحدگی تک آ جاتی ہے۔“

”بات تو بالکل ٹھیک کہی آپ نے۔ آپ نے شینہ کو شادی کے دن دیکھا۔ پھر کیا پایا انہیں؟“

”بہت اچھا“ بلکہ بہت زیادہ اچھا۔ بہت اچھی بیوی بہت اچھی بہو اور بہت اچھی ماں ہے۔ ایک مکمل بیوی والی تمام خوبیاں اس میں موجود ہیں۔“

”اچھی زندگی کے لیے پیسہ کتنا ضروری ہے؟“

”بہت زیادہ ضروری ہے اور میں تو یہ کہوں گا کہ شادی ہی اس وقت کرنی چاہیے جب آپ کے پاس پیسہ ہو۔ کیونکہ شادی کے بعد مڑکی ذمہ داریاں بہت بڑھ جاتی ہیں۔ فیملی بن جاتی ہے، اخراجات میں بہت اضافہ ہو جاتا ہے اور پیسہ جیب میں نہ ہو تو زندگی بہت نف ہو جاتی ہے۔“

”بیکم فضول خرچ اور شکی مزاج ہیں؟“

”میں فضول خرچ ہوں۔ بیکم تو اچھی خاصی کفایت شعار ہیں۔ مجھے اچھا موباں لینے اور گھر سے باہر کھانا کھانے کا شوق ہے۔ اور شروع شروع میں شکی

مزاج تھیں۔ مگر اب ایسا کچھ نہیں ہے۔“

مسز شینہ وہاج

”جی شینہ کیا حال ہے آپ کا؟“

”الحمد للہ۔“

”ماشاء اللہ شادی کو تقریباً گیارہ سال ہو گئے ہیں۔ اتنے سالوں میں کیا تبدیلی آئی آپ میں اور وہاج صاحب میں؟“

”مجھ میں کیا تبدیلی آئی یہ تو وہاج ہی بتا سکتے ہیں اور وہاج ہی کیا تبدیلی آئی تو میں یہ ہی کہوں گی کہ وقت کے ساتھ ساتھ ان کی محبت میں اضافہ ہی ہو رہا ہے اور اب پہلے سے زیادہ میرا خیال رکھتے ہیں۔“

”یہ تو بڑی اچھی بات ہے۔ ورنہ یہ جس فیلڈ سے تعلق رکھتے ہیں۔ سر پر خطرے منزل لاتے ہی رہتے ہیں؟ کیوں ایسا ہی ہے؟“

”ایسا شادی کے شروع شروع دنوں میں اور پھر کچھ عرصہ اور محسوس ہوا لیکن جیسے جیسے وقت گزر گیا، میرے شکوک و شبہات ختم ہوتے گئے۔ کیونکہ نہ صرف میں نے انہیں اپنی فیملی کے ساتھ بلکہ اپنے ساتھ بھی بہت مخلص پایا ہے۔ اس لیے اب کسی قسم کا شک نہیں کرتی۔“

”آپ ہو میو پیٹھک ڈاکٹر بن رہی تھیں۔ ہو گئی پڑھائی مکمل؟“

”جی۔ جی۔ ایک ہی سمسٹر رہ گیا ہے۔ پھر ان شاء اللہ ہو میو پیٹھک ڈاکٹر کملاؤں گی۔ مجھے پیشہ سے ہی ہو میو پیٹھک ڈاکٹر بننے کا شوق تھا۔“

”شینہ کچھ اپنے بارے میں بتائیے۔ اور یہ بھی بتائیے گا کہ آپ دونوں کے رشتے میں شوہر نے راہ ہموار کی یا کچھ رکاوٹ درپیش ہوئی؟“

”اپنے بارے میں آپ کو بتاؤں کہ ہمارا تعلق گجرات سے ہے۔ ہمارے والدین کا انتقال ہو چکا ہے۔ ہم سات بہن بھائی ہیں۔ میں نو مارچ کو پیدہ ہوئی اور بہن بھائیوں میں میرا نمبر سیکنڈ لاسٹ ہے۔ اور جہاں تک رشتے کی بات ہے تو شوہر رکاوٹ بنا مگر اتنا

نہیں کہ ہمیں مشکلات کا سامنا کرنا پڑا ہو۔ بس گھر والوں نے تھوڑا سا اعتراض کیا اور پھر اللہ کا شکر ہے کہ مان گئے۔“

”بڑی چکا چوند کر دینے والی لائف ہے شوہر۔ آپ کا دل چاہا اس طرف آنے کو؟“

”نہیں۔ نہیں۔ میرا تو کبھی بھی دل نہیں چاہا اس فیلڈ میں آنے کو۔ اور شادی کے کچھ عرصے تک تو میں ان کے ساتھ شوٹ پہ جاتی تھی۔ مگر پھر جب ماشاء اللہ بچے ہو گئے تو میں نے جانا چھوڑ دیا۔ اور ویسے اگر میں ارادہ بھی کرتی تو شاید مجھے اجازت بھی نہ ملتی۔ کیونکہ ان کے گھر کا ماحول اس ٹائپ کا نہیں ہے کہ لڑکیاں اس فیلڈ میں کام کریں۔“

”آپ بڑھ بھی رہی ہیں اور گھر واری بھی۔ بچوں کی تربیت بھی۔ تو کیا وہاج صاحب تعریف کرتے ہیں اور آپ کا ساتھ دیتے ہیں؟“

”تعریف تو بہت کرتے ہیں اور بچوں کی تربیت میں بھی حصہ لیتے ہیں اور جب گھر آتے ہیں تو بچوں کو بھی بہت ناگم دیتے ہیں۔ چونکہ شوٹ کی وجہ سے زیادہ تر لڑاچی رہتے ہیں تو جب بھی سرگودھا آتے ہیں، ہم سب کے ساتھ بہت اچھا وقت گزارتے ہیں۔“

”غصے کے تیز ہیں یا دھیمے مزاج کے ہیں؟“

”غصے کے تیز ہیں۔ اور کبھی کبھار آتا ہے مگر بہت تیز آتا ہے اور ان کی یہ اچھی عادت ہے کہ گھر میں شور شراباچانے کے بجائے گھر سے باہر چلے جاتے ہیں۔ اور جب موڈ ٹھیک ہو جاتا ہے تو پھر گھر آ جاتے ہیں۔“

”صلہ میں پہل کون کرتا ہے؟“

”زیادہ تر صلہ میں پہل وہاج ہی کرتے ہیں۔ مگر میری بھی کوشش ہوتی ہے کہ طوالت نہ پکڑے۔“

”گھر کا بجٹ تو آپ کے ہاتھ میں ہی ہوگا؟ اور اپنے ہاتھوں سے پکائی ہیں لکھنا وہاج صاحب کے لیے؟“

”نہ کہہ کا باقاعدہ بجٹ نہیں بننا۔ جتنی ضرورت ہوتی ہے اسی حساب سے خرچ کرتے ہیں۔ اور جہاں تک لکھنا پکانے کی بات ہے تو انہیں میرے ہاتھ کا پکا

ہوا کھانا بہت پسند ہے۔ اس لیے میں ان کے لیے زیادہ تر خود ہی پکاتی ہوں۔“

”کیا پسند ہے آپ کے ہاتھ کا پکا ہوا؟“

”میں ماش کی دال۔ مٹن کڑاوی بہت پسند ہے۔ کھانے کے کافی شوقین ہیں۔ مگر ہاتھ روک کر کھاتے ہیں کہ کہیں موٹانہ ہو جاؤں ظاہر ہے شوہر کے آدمی ہیں۔ خیال تو رکھنا پڑتا ہے۔“

”ہنی مون کے لیے کہاں گئی تھیں۔ اور رونمائی میں کیا ملتا تھا آپ کو؟“

”ہنی مون کے لیے کراچی آئے تھے کیونکہ کراچی میں ان کی شوٹ تھیں اور چونکہ میں پہلی بار کراچی آئی تھی تو مجھے یہی ہنی مون اچھا لگا۔ رونمائی میں انہوں نے مجھے ”سمنوے کا لاکٹ“ دیا تھا۔ 22 اپریل ہماری شادی کا دن ہے اور ہم اس دن کو ضرور مناتے ہیں۔ کہیں باہر کھانا کھا کر اور ایک دوسرے کو گفت دے کر۔“

”شوہر کے بندے ہیں۔ فیشن کے تو دلدادہ ہوں گے؟“

”نہیں اتنے کوئی خاص نہیں۔ لیکن یہ ضرور دل چاہتا ہے کہ جب یہ گھر آئیں تو میں انہیں اچھے لباس اور میک اپ میں ملوں۔ اس لیے میں بھی اپنا خاص خیال رکھتی ہوں۔“

”لڑکی اور لڑکے کے لیے شادی کس حد تک ضروری ہے؟“

”میرے خیال میں شادی بہت ضروری ہے۔ ایک تو شریعت خداوندی ہے پھر لڑکی ہو یا لڑکا۔ لائف پارنٹر کے بغیر زندگی گزارنا تھوڑا مشکل ہو جاتا ہے۔ زندگی گزر تو جاتی ہی ہے لیکن لائف پارنٹر سے زندگی زیادہ حسین ہو جاتی ہے اور پھر فیملی بن جاتی ہے۔ بچوں کے ساتھ زندگی مزید حسین ہو جاتی ہے اور اپنی تخلیق کی پرورش کرنے میں بہت مزہ آتا ہے۔“

اور اس کے ساتھ ہی ہم نے اس جوڑے سے اجازت چاہی۔ اس شکر یہ کے ساتھ کہ انہوں نے ہمیں وقت دیا۔

# دستک

## شاین رشید

ہم بہت کام کر رہے ہیں یا لوگ ہمیں پسند کر رہے ہیں۔ اور یہ اتفاق بھی ہے کہ سب کے ساتھ میرے ڈرامے ایک کے بعد ایک آن ایر ہو گئے۔

”منت“ کا کیا رسپانس ہے۔ آپ کو زیادہ کون سا اچھا لگتا ہے یا مرضی؟

”دونوں بہت اچھے ہیں۔ ایک دوسرے سے بہت مختلف ہیں اور دونوں کا رسپانس بہت اچھا رہا۔

”مرضی“ تو اب ختم ہو چکا ہے البتہ ”منت“ آن ایر ہے۔

”نئے آنے والے سیریز کون سے ہیں؟“

”کافی ہیں جو ابھی انڈر پروڈکشن ہیں۔ ایک سیریل ”عشق وے“ بہت جلد آن ایر ہونے والا ہے اور اس میں میرا کردار بہت اچھا ہے۔ محبت، نفرت اور حسد کی کہانی ہے۔ اس میں میں ایک ایسی لڑکی کا کردار ادا کر رہی ہوں جسے اپنی دوست کے منگیتر سے محبت ہو جاتی ہے اور اس محبت میں وہ اتنی آگے بڑھ جاتی ہے کہ اپنی دوست کی دشمن ہو جاتی ہے۔“

”فلموں میں اپنا سکہ کب جمانا ہے۔“

”ابھی نہیں۔ ابھی میں ڈراموں میں بہت مصروف ہوں۔ ویسے بھی ابھی مزید اپنے آپ کو میچور کرنا چاہتی ہوں۔ پھر فلموں کی طرف توجہ دوں گی۔ ویسے آفرز کافی آ رہی ہیں۔ مگر ابھی سب کو منع کر دیا ہے۔“

”فیما بڑھ جاتے تو معاوضے بھی بڑھ جاتے ہیں ایسے آپ کے خیال میں۔“



## رباب شاہی

”کہا حال ہے؟“

”الحمد للہ!“

”منت مرضی“ اور دیگر سیریز آج کل اسکرین پر آپ کا ہی راج ہے؟

”جی۔ اللہ کا بڑا کرم ہے۔ کام تو ہم اتنا ہی کرتے ہیں جتنا شاید ہر آرٹسٹ۔ مگر جب وہ کام ایک کے بعد ایک آن ایر ہو جاتا ہے تو لگتا ہے کہ جیسے ہم ہی ہم ہیں۔“

”سب خان کے ساتھ کافی کام کر رہی ہیں آپ؟“

”بس اتفاق ہے۔ شاید ڈائریکٹرز یہ سمجھتے ہیں کہ

”معاوضہ تو ہر کوئی اپنے حساب سے ہی دیتا ہے۔ البتہ وہ لوگ یا وہ فنکار جو فلم کرنے کے بعد کسی ڈرامے میں بک کئے جاتے ہیں۔ وہ اپنی مرضی کا معاوضہ مانگتے ہیں۔ اس لیے ڈائریکٹرز کا رجحان ان کی طرف کچھ کم ہو گیا ہے۔ اب وہی فنکار زیادہ بک کیے جا رہے ہیں جو صرف اور صرف ٹی وی پر یا ٹی وی کے ڈراموں میں کام کر رہے ہیں۔“

”آپ بچپن میں کس نوعیت کے پروگرام کرتی تھیں؟“

”بچتے ہوئے۔۔۔ بچپن میں ڈرامے نہیں کرتی تھی۔ بلکہ بچوں کے پروگرام کی میزبانی کیا کرتی تھی، جیسے ”کم شوز ہو گئے“ جیسے کوئی اہم تہوار ہوا۔ بچوں کا۔۔۔ پھر جانوروں کے حوالے سے ایک ڈاکومنٹری پروگرام کی میزبانی دو سال تک کی۔ تو بس اس طرح سلسلہ چلا رہا۔“

”پھر گپ کیوں آیا۔۔۔“

”جب ٹیل ایج ہوئی ہے تو برائلیٹی میں چنچ بہت تیزی سے آتا ہے پھر مجھے تعلیم بھی مکمل کرنی تھی سو گپ آئی۔“

”آپ تو بچپن سے شو بزنس وابستہ ہیں۔ پھر ”ہنپا“ میں داخلہ لینے کی ضرورت کیوں پیش آئی؟“

”جی ”ہنپا“ میں ایڈمیشن کی ضرورت اس لیے پیش آئی کہ میں اداکاری کو باقاعدہ سکھنا چاہتی تھی۔ بے شک مجھے اپنے آپ پر اعتماد تھا کہ میں سب کچھ کر لوں گی۔ مگر پھر بھی میں سکھ کر اس فیلڈ میں آنا چاہتی تھی۔ اور اب میں دوسالوں سے باقاعدہ اداکاری کر رہی ہوں۔“

”ہنپا“ میں آپ کے استاد کون تھے؟

”طلعت حسین۔ راحت کاظمی اور ضیاء الدین صاحب ہمارے استاد تھے، اور یہی میرے رول ماڈل بھی ہیں۔ میرے سینئر بھی ہیں اور ہم سب کے لیے جنت بھی ہیں۔“

”فلموں کے اسکرپٹ پڑھ کر انکار کیا یا ویسے ہی آپ نے انکار کر دیا۔“

## خواتین ڈائجسٹ

مارچ 2017ء کے شمارے کی ایک جھلک



”حسن الماب اور۔۔۔“ ساثرہ رضا کامل ناول،

”عشق مجھ کو“ مصباح نوشین کامل ناول،

”ہم صورت گر کچھ خواہوں گے“ نیرناز کا ناول،

راشدہ رفعت، ام ایمان قاضی اور سہیہ جید چوہری

کے ناول،

قرۃ العین سکندر، سیرا حنا گل، شازیہ لطیف ہاشمی،

ناوید جہانگیر، سیدہ رحمت رباب اور حنا ہار کے افسانے،

باصلاحیت فنکار ”ماہادارنی“ سلاطین،

”کرن تمیز“ سے باتیں،

”خاموشی کو کہاں ملے“ قارئین سے سروے،

”حرف سادہ کو عنایت ہو! اعجاز کا رنگ“

مصنفین سے سروے،

”کرن کرن روشنی“ احادیث نبوی ﷺ کا سلسلہ،

نفسیاتی ازدواجی انجمنیں حدان کے مشورے اور دیگر

مستقبل سلسلے شامل ہیں،

خواتین ڈائجسٹ کا مارچ 2017ء کا شمارہ آج ہی خرید لیں



”ملک سے باہر جانے کا آپ کا اتفاق ہوتا رہتا ہے۔ ایسا اب بھی ہمارے ڈرامے پسند کیے جاتے ہیں۔“

”بالکل جی۔ بالکل ملک سے باہر ہمارے ڈرامے پسند کیے جاتے ہیں۔ کیونکہ ہمارے یہاں بہت اچھا کام ہو رہا ہے۔ ہر شعبے میں۔“

”کچھ سینئرز کا کہنا ہے کہ کمائیوں میں یکسانیت آگئی ہے۔ کوئی نیا پن یا نئی اسٹوری سامنے نہیں آ رہی۔ ایسا ہے؟“

”بالکل ایسا ہے۔ ملتی جلتی کمائیاں ہوتی ہیں جو ابھی بھی بورت بھی پیدا کر دیتی ہیں۔ اگر نئے رائٹرز کو موقع دیا جائے تو یکسانیت دور ہو سکتی ہے۔“

”نئے رائٹرز۔ اب تو کافی آ رہے ہیں؟“

”ہاں آتے رہے ہیں۔ مگر اور بھی آنے چاہئیں۔ ہمیں اب ایسے رائٹرز کی ضرورت ہے جو لوگوں کی دلچسپی کو بدل دیں اور ابھی تک ایسے رائٹرز سامنے نہیں آئے ہیں جو سوچ کو بدل دیں۔“

”مضمونیات کی وجہ سے کوئی ایسا کام جو آپ ہر وقت نہ کر سکتی ہوں۔ جس کا شکوہ سب کو ہو؟“

”چوں کہ بہت زیادہ مصروف رہتی ہوں تو اپنے دوستوں کو نہ تو فون کالز کر سکتی ہوں۔ نہ ان کے فون کا جواب دے سکتی ہوں اور نہ اس ایم ایس کر سکتی ہوں۔ اس کی وجہ سے اکثر سچی ناراض رہتے ہیں اور میں شرمندہ ہوتی رہتی ہوں۔“

”ہاں تو جب فارغ ہوا کریں تو جواب دے دیا کریں؟“

”فارغ وقت بہت کم ملتا ہے اور جب ملتا ہے تو بڑا دل چاہتا ہے کہ میں اپنی نیند پوری کر لوں۔ کیونکہ انہی صورت کے لیے اچھی نیند کی بہت ضرورت ہے۔ باہر مجھے مطالعہ کا شوق ہے، میوزک کا شوق ہے، ڈراموں کا شوق ہے ان مسائل کو بھی دیتی ہوں۔“

”ڈراموں کے ملبوسات کا کریز ہے؟“

”نہیں، بالکل نہیں، جو لباس دل کو اچھا لگے

”کون سا ڈراما شہرت کا باعث بنا۔ جو آپ کو فی ویسک لے کر آیا؟“

”نور مقصود صاحب کا ڈراما تھیر“ ہونے چوہ اگست“ اور ”آنگن ٹیرھا“ نے مجھے شہرت دی، مجھے پہچان دی، اور اس کے بعد ایک فلم ”سیا“ کی آخر آئی۔ اور اس میں بھی میرے کام کو بہت زیادہ پسند کیا گیا۔“

”گھر والے خوش ہوئے۔“

”جی۔ بہت زیادہ اور گھر والوں کی سپورٹ کی وجہ سے ہی میں اس مقام پر ہوں۔ ان کا پیار ان کی حوصلہ افزائی ان کی سپورٹ نے مجھے حوصلہ دیا۔“

”اس فیلڈ میں اگر خوش ہیں۔“

”جی بہت زیادہ کیوں کہ مجھے جنون کی حد تک شوق تھا اس فیلڈ میں آنے کا اور اداکاری کا۔ وقت نے میرا ساتھ دیا اور میں کامیاب ہوئی۔“

”2009 میں تھیر سے آغاز کیا، 2013 میں فلم میں کام کیا اور پھر وی کا رخ کیا ذریعے سے آنے کی وجہ؟“

”ذریعے آنے کی وجہ یہ تھی کہ میں تھیر میں مصروف تھی۔ اور اس انتظار میں بھی تھی کہ فی ویسک والے خود بلائیں۔ سو جب مجھے بلایا گیا میں پہنچ گئی۔“

”پھر بسلا ڈراما؟“

”میرے ہم دم میرے دوست۔“ پھر ”موسم“ اور موسم تو دوبارہ آج کل ان ایئر بھی ہے۔ ایک ڈرامے کی کامیابی نے مزید ڈراموں کے لیے راستہ ہموار کر دیا۔ ”صنم“ کی مقبولیت بہت زیادہ ہی ہے۔ ایک تھوڑی سی نفسیاتی لڑکی کا کردار ہے اس میں۔“

”اپنا فیوچر کس میں دیکھتی ہیں۔ مائنگ وداکاری فلیم تھیر؟“

”یہ تو سوچنا پڑے گا لیکن میرا خیال ہے مجھے زیادہ سوچنے کی ضرورت نہیں ہے۔ کیونکہ میں اپنا فیوچر اداکاری میں دیکھ رہی ہوں اور آپ بہت جلد مجھے ڈائریکشن کی فیلڈ میں بھی دیکھیں گی۔“

”اسکرپٹ بڑھ کر انکار کیا۔ کیوں کہ میں سوچ رہی تھی کہ اگر بہت اسٹونگ قسم کا اسکرپٹ ہو گا تو پھر انکار نہیں کروں گی، مگر مجھے کمائی کچھ زیادہ جان دار نہیں لگی سو میں نے انکار کر دیا۔“

”کام کون سا دلچسپ ہے۔ میزبانی کا یا اداکاری کا؟“

”اداکاری میں زیادہ مزہ آ رہا ہے۔ میزبانی میں زیادہ وقت نہیں لگتا تھا۔ مگر اداکاری میں بہت ٹائم لگتا ہے مگر یہ کام ایسا ہے کہ بندہ انجوائے کرتا ہے اور کہیں بورت کا احساس نہیں ہوتا۔“

”اور تھکن؟“

”جی تھکن تو بہت ہوتی ہے۔ محنت بھی ہے مگر رزلٹ بھی تو اچھا ملتا ہے۔“

**حیم فاروق!**

”ہیلو کیا حال ہے؟“

”جی تھک“

”صنم میں آپ کا رول بہت عمدہ ہے کیا رپائس ہے؟“

”شکریہ، جی بہت اچھا رپائس ہے۔ بہت مختلف کردار ہے اس لیے لوگ پسند بھی کر رہے ہیں۔“

”آج کل کیا فلمی سرگرمیاں ہیں؟“

”بہت اچھی، میں اس وقت کئی فلموں میں بک ہوں، مگر اس بارے میں ابھی کچھ بتانا نہیں چاہتی۔ اب جب سب کچھ مکمل ہو جائے گا بتا دوں گی۔“

”اور ڈرامے؟“

”ڈرامے تو چل ہی رہے ہیں۔ آپ دیکھ ہی رہی ہیں۔ بس اللہ تعالیٰ اپنی مہربانیاں رکھے تو سب کچھ ٹھیک ہے۔“

”پہلی انٹروی تھیر ماڈرما تھا؟“

”پہلی انٹروی تھیر میں دی۔ جب تعلیم سے فارغ ہوئی تو دل چاہا کہ کچھ کروں، اداکاری کا بہت زیادہ شوق تھا، تو تھیر کا رخ کیا۔ آڈیشن دیا اور کامیاب ہو گئی۔“

”2009 کی بات ہے جب تھیر میں آئی اور آڈیشن میں کامیابی کے بعد کئی ڈراموں میں کام کیا۔“





... اسراں بنا۔ نہ منگنی دھوم دھام سے ہوئی اور نہ ہی امائی۔ والد صاحب بڑے مذہبی معصوم و صلوة کے پابند انسان تھے۔ سادہ بندے تھے اور سادگی پسند کرتے تھے۔ اس لیے نہ دھوکا بجی نہ شہنائی سادگی سے نکاح ہوا اور سادگی سے رخصتی (اللہ اللہ تے خیر صلا)۔

س: ”منگنی کتنا عرصہ رہی؟“  
ج: ”پانچویں یا چھٹی جماعت میں تھی جب منگنی ہوئی اور میٹرک کے پیرپیش میں ایک ماہ رہ گیا تھا کہ میرے سر جو بیرون ملک ملازمت کرتے تھے۔ اچانک چھٹی پاکستان آ گئے اور افراتفری میں شادی ہو گئی۔ چونکہ گراچی سے بیاہ کر لاہور گئی تھی۔ میٹرک کے پیرپے دیں نہ پائی۔“

س: ”جیون ساتھی کے حوالے سے تصور؟“  
ج: ”میں چونکہ شاعری کرتی تھی تو مزاج بھی بڑا شاعرانہ تھا۔ ہوا کے سنگ اڑتا پھولوں سے انگلیاں لڑنا بارشوں میں بھیگنا اچھا لگتا تھا۔ جیون ساتھی کے والے سے بھی ایسا ہی تصور تھا کہ میرے جیسا ہو۔ مگر ناب یہاں تو وہ حساب تھا کہ یہاں کسی کو بھی کچھ ب آرزو نہ ملا۔“

تمام کرزز کا مشترکہ خیال تھا کہ اتارو کھا اور سڑیل بندہ ہمارا شوہر ہوتا تو ہم کب کے بھاگ چکے ہوتے۔ مگر جناب ہم نے ان کا ہاتھ چھوڑنے کے لیے تھوڑا پڑا تھا۔ میرے شوہر میرے تصور کے مطابق نہیں تھے۔ باوجود کوشش کے وہ میرے جیسے نہ ہو سکے تو میں نے ہی ہار مان لی۔ ”سدا سے عورت ہی ہار مانتی آئی ہے۔ اور میں نے خود کو ان کے مطابق ڈھال لیا اور اپنے رب کی رضا میں راضی ہو گئی تو اس مہربان رب نے ان کے لیے میرے دل میں محبت بھی ڈال دی۔“

س: ”شادی کے لیے قربانی؟“  
ج: ”قربانی نہیں جناب قربانیاں کہیں سب سے بڑی تو قربانیاں ایک تو تعلیم اور دوسری رہائی اور دوسرا میرا عشق جو کتابوں سے تھا۔ مجھے جتنا عشق کتابوں سے تھا انہیں اتنی ہی چڑھی۔ میرے ہاتھ میں کتاب نہ انہیں برداشت ہی نہیں ہوتی تھی۔ بس زندگی یوں

بڑھ کر جی جیسے بوتھے پر ویڈنگ کرنے والوں جیسے گھوٹے لگوا لیے ہیں۔ میں جھٹ سے کہتی ”نانی آپ نے دیکھا نہیں فلاں فلم میں شبنم اور بابہ نے بھی ایسی ہی عینک لگائی ہے۔“ نانی بڑبڑاتی در فٹے منہ شبنم نے باجرہ دانوں بولی تھی تے کام بولی تھی۔ (لخت ہو شبنم، باجرہ انعام بھی اٹکے، کام بھی اٹکے)

شرارتیں کرنا پسندیدہ مشغلہ تھا، میری امی جب بھی مجھے اسکول داخل کروانے جاتیں۔ میڈیم یہ کہہ کر انکار کر دیتیں۔ یہ لڑکی پڑھنے والی نہیں اس کی آنکھوں سے شرارت چھلکتی ہے۔

تھوڑی سی چھڑے باز قسم کی لڑکی تھی۔ ایک دفعہ پانی بھرتے ہوئے محلے کے ایک لڑکے سے ٹھکڑا ہوا۔ بات بات پائی تک پہنچ گئی۔ بالوں سے پکڑ کر ایسی کٹ لگائی کہ اسے میدان چھوڑ کر بھاگنا ہی پڑا۔

خط لکھنا بھی پسندیدہ مشغلہ تھا۔ خط بڑے دلچسپ انداز میں لکھا کرتی تھی۔ ہمارے سامنے والا گھر ملک صاحب کا تھا۔ ان کی بیٹی پنجاب کے دور دراز گاؤں میں بیاباں ہوئی تھی۔ ملکانی ہر ہفتے مجھ سے اپنی بیٹی کے لیے خط لکھوا کر کرتی تھیں۔ آہ کے درختوں سے بھرا ہوا ان کا بڑا سا گھر ان کے گھر کا بڑا سا لکڑی کا دروازہ ہفتے میں ایک بار میرے لیے کھلا کرتا (میں گیٹ دوسری کٹی میں تھا) میں بڑی شان سے قلم کاغذ تمام کر محل جیسے گھر میں داخل ہوتی۔ بڑا اسپیشل پروڈکٹ ملتا۔ اور جب ان کی بیٹی کے نام خط لکھ کر سنائی تو ملکانی جی جذبات میں آ کر میرا منہ چوم لیتیں اور کہتیں۔

”صدے تھیواں، میری دھی نے تان میرا دل کھول کے خط وچ رکھ دیتا ہے۔“  
(صدے جاؤں میری بیٹی نے تو میرا دل کھول کر خط میں رکھ دیا ہے۔)

س: ”رشتے میں مرضی؟“  
ج: ”ہمارے ہاں لڑکیوں سے مرضی نہیں پوچھی جاتی۔ ابو کی خواہش تھی کہ اپنی بہن کے ہاں رشتہ میں جبکہ امی چاہتی تھیں ان کی بہن کے ہاں میرا شہوتہ ہو۔ بڑی کھینچا نانی کے بعد امی جیت گئیں اور خالہ کی کا گھر

## جب تجھ سے نانا

یاسین اقبال

س: ”شادی کب ہوئی؟“

ج: ”10 مارچ 1985ء۔“

س: ”شادی سے پہلے کیا مشاغل تھے؟“

ج: ”رسائل اور ریڈیو پروگرامز میں لمبے لمبے خطوط لکھنا۔ نظمیں لکھنا، پڑھنا پڑھنا اور ڈھیر سارا پڑھنا کتابوں سے عشق تھا۔ بہت چھوٹی عمر سے تمام شائع ہونے والے رسالے زیر مطالعہ رہے۔ ہمارے بڑوں میں باقی فاطمہ زہرا جیں کا گھر تھا وہ افسانے لکھا کرتی تھیں۔ اس زمانے میں ان کے گھر بچوں اور بڑوں کے ڈھیروں رسالے آیا کرتے تھے۔ وہیں سے بچوں کے رسالے پڑھتے پڑھتے کب بڑوں کی کتابوں تک آن پہنچے کچھ کتابیں ہی چلا۔ پھر اتنے رسالوں سے بھی ہمارا اپنیٹ نہیں بھرتا تھا۔ ابامزور آدمی تھے۔ گھر میں غموت تھی۔ کتابیں خرید کر تو میں پڑھ سکتے تھے۔ محلے کی لائبریری سے کرائے پر ناول ڈوا مجسٹ اور عمران سیریز حاصل کرتے۔ میرے ساتھ ساتھ میرے چاروں بھائیوں کو بھی لت لگ گئی پھر ہم پیسے ملا کر خریدتے اور باری باری پڑھتے۔ میرا ایک بھائی تو پڑھنے میں اتنا ست تھا کہ ہم مل کر اس کا ریکارڈ لگاتے کہ کتنے کچے پڑھتا ہے۔ جنون کا تو یہ عالم تھا کہ جب بچہ ٹائیپوں سے بھلایا جاتا تھا۔ ہمیں تندور کی روٹی لپٹے اخبار سے بھلایا جاتا۔ میں اور میرا چھوٹا بھائی چھت پر سونے کے بہانے چاند کی روشنی میں بڑھا کرتے اور پھر ہماری عینکوں کے نمبر بڑھتے ہی چلے گئے۔“

”نانا! اماں تو پچاس سے پکڑ کر خوب (کٹ) لگائیں اور کہتیں۔“

”نہ کرے! امیرا ستیا ناس جائے موٹی موٹی کتابیں

س : ”سرال میں مقام؟“

ج : ”میں نے اپنی زندگی کے مشکل ترین 25 سال اپنے تین بچوں کے ساتھ ایک چھوٹے سے کمرے میں گزارے ہیں۔ سرال میں ساری زندگی گزارنے کے بعد ایک کمرے سے دوسرا کمرہ نہیں ملتا (بھولے بادشاہ ہوا! کسی مقام دی گل کر دے اور) آپ سب نے سنا ہوگا ”سرال سرال ہوتا ہے خالہ جی کا گھر نہیں۔“

س : ”پہلے بچے کی پیدائش؟“

ج : ”نا تجربہ کاری اور کم عمری کے باعث شادی کے دس ماہ بعد پیدا ہونے والا بیٹا چند سائیں ہی لے سکا۔ بہت باتیں سنیں۔ کسی نے کہا۔ فلاں کا پہلا بیٹا مر گیا تھا۔ دوبارہ ساری زندگی بیٹے کی شکل نہیں دیکھی یا یوں کہ پہلا بچہ مر گیا اب پتا نہیں دوبارہ اولاد ہوگی بھی یا نہیں۔ مگر میرا اللہ بڑا مہربان ہے۔ اگلے دس ماہ بعد پھر میرے ہاں بیٹا ہوا صحت مند اور بہت خوب صورت پھر اور پتلے اللہ نے مزید بیٹے اور بیٹی سے نوازا۔ اے اللہ میں تیرا شکر کیسے ادا کروں تو کتنی محبت کرنے والا اور مہربان ہے۔“

س : ”جوائنٹ فیملی پسند ہے یا علیحدہ؟“

ج : ”جوائنٹ فیملی اچھی لگتی ہے اگر محبت سے سب مل جل کر رہیں تو بہت اچھا لگتا ہے مگر آج کل کے جو حالات ہیں تب وہ محبتیں کہاں ہیں۔ اب تو سگے بھائیوں کی آپس میں نہیں جتنی علیحدہ رہنا ہی اچھا ہے۔“

س : ”شادی شدہ بہنوں کے نام کوئی پیغام؟“

ج : ”کسی سے توقعات وابستہ نہ کریں۔ اللہ پر ہی کامل یقین رکھیں۔ اللہ ہی سے مدد طلب کریں۔ صبر سے کام لیں۔ صبر وہ سواری ہے جو کبھی ٹھوکر نہیں کھاتی۔“

س : ”غیر شادی شدہ بہنوں کے نام کوئی پیغام؟“

ج : ”خوش رہیں اور خوش رکھیں۔ ماں باپ کی خوب خدمت کریں۔ شادی کے بعد یہ موقع نہیں ملتا۔ خاص طور پر لڑکیوں کو۔“

آلو کا حلوہ بنایا۔ سب ہی نے بہت پسند کیا۔“

س : ”میکے اور سرال کے ذائقے میں فرق؟“

ج : ”میکے اور سرال کے ذائقے میں کوئی فرق نہیں پایا۔ میکے میں امی بناتی تھیں اور سرال میں میں خود بناتی تھی۔ اور آپ نے سنا ہی ہوگا۔ سرال کی روٹی بڑی مہنگی اس میں سو فیصد سچائی ہے۔“

س : ”سرال میں کن باتوں پر تعریف ہوئی اور کن پر تنقید؟“

ج : ”ایک چپ اور سو سکھ والی بات پلے سے باندھ لی تھی۔ دل جلانے والی باتوں پر جلتی کر دیتی تو بہت تھی۔ بہت روٹی بھی تھی مگر چپ رہتی تھی۔ اکثر یہ جملہ سننے کو ملتا تھا ”کچھ بھی کہہ لو“ اگے سے جواب نہیں دیتی۔“ ابھی دل خوش بھی نہ ہو پاتا تھا کہ ایک کونے سے آواز آتی۔ ”کھنی اور مہسنی ہے۔“ اگر یہ تعریف ہے تو ایسی تعریف تو اکثر دینا شروع ہوتی ہی رہتی تھی۔ پہلے بچے کی پیدائش پر وزن کافی بڑھ گیا تھا۔ اس پر بڑی تنقید ہوئی تھی۔

س : ”سرال سے وابستہ توقعات کس حد تک پوری ہوئیں؟“

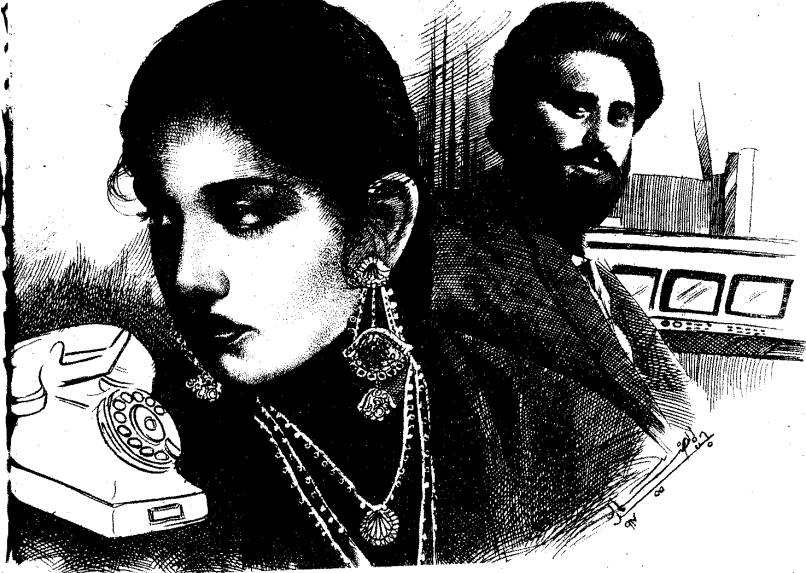
ج :

وہ سب سوال جو میری سمجھ سے باہر ہیں میں جاگ جاگ کے ان کے جواب سوچتی ہوں پلیٹ کے دیکھتی ہوں جب راہ وفا کی طرف تو عمر بھر کے دکھوں کا حساب سوچتی ہوں میری سرال سے وابستہ دو اہم نام اس اور ش یعنی

ساس اور شوہر برسوں بیتے اس دنیا سے رخصت ہوئے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے جو اس دنیا سے چلے گئے ان کے متعلق کچھ مت کہو وہ اپنے کیے کا بدلہ پا چکے اس لیے نو کمٹنس۔“

اللہ ان کے درجات بلند کرے۔ ان کی مغفرت کرے۔ میرے ساتھ مل کر سب آئین ضرور کہیں کیونکہ جب ہم دنیا سے چلے جائیں اور ہمارے لیے دعائے مغفرت کی جائے تو ہم پر آئین کسی جائے۔

میرے اللہ! ہم بہت گناہ گار ہیں تیری رحمت کے پھر بھی طلب گار ہیں۔



صائمہ اکرم چیمبرلی



خاقان علی۔ نو شادیاں کی ہیں پہلی بیوی شادہ بیگم سے دو بیٹیاں انابہہ اور طوبی ہیں۔ بیٹے کے لیے انہوں نے ندرت بیگم سے دوسری شادی کی، لیکن ان سے کوئی اولاد نہ ہو سکی۔  
خاقان علی کی بہن فوزیہ اور ان کے شوہر ایک فضائی حادثے میں چل بے تو ان کے دونوں بچے فیروہ اور ارسل کی بارش ندرت بیگم نے کی ہے۔ فیروہ کو لگائی، بھائی کی عادت ہے۔  
ان کے گھر کے سامنے جنگل ہے جہاں طوبی اور در شوار استخوان میں کاسپانی کے لیے برگد کے درخت پر دھاگا باندھنے رات کو جاتی ہیں اور شاہ میرا نہیں چھو لیتا ہے۔ شاہ میر گھروالوں کے سامنے ان کا بھانڈا پھونکتا ہے جس کی بنا پر ان کو گھر سے بہت ڈانٹ پڑتی ہے۔  
طوبی کا نکاح بہان سے ہو چکا ہے، لیکن بہان کا سر دودھ سے افسردہ کرتا ہے۔  
فیضان بیگم فیض انڈسٹری کی ایک معروف شخصیت تھیں۔ دو شادیاں نہ کام ہو چکی تھیں۔ آج کل وہ تیسرے شوہر سے جان بچانے کے چکر میں تھیں۔ معروف پورٹریٹ سیف الرحمن کے ساتھ ان بہان جا رہا تھا۔  
پہلے شوہر سے ان کی دو بیٹیاں تھیں، بڑی شہزادہ نے اعلا تعلیم کے لیے انہوں نے باہر بھجوا دیا تھا۔ رویصہ چھوٹی تھی اور اس کی اہلیاں سے بالکل نہیں جنتی تھی۔ ان کے آئے دن کے اسکینڈل اس نے بے لگے مسئلہ بنتے تھے۔  
اس نے خود کسی کی دھمکی دے کر شہزادہ کو پاکستان آنے پر مجبور کر دیا۔ شہزادہ کی آمد فیضان بیگم کو شدید ناگوار گزری۔ شہزادہ پاکستان آئی تو ایک برائی فون کال نے اسے ڈسرب کر دیا۔ طوبی اور در شوار غلطی سے برابر اے کے میں داخل ہوئیں تو پتا چلا کہ جو گھر چھلے ایک ماہ سے خالی پڑا تھا۔ وہاں محمد ہادی آجکا ہے۔ محمد ہادی فاریسٹ آفیسر ہے۔ تعلق ایک امیر اور اعلا تعلیم یافتہ گھرانے سے ہے۔ وہ اپنے دوست سعد کو بھی اپنے بچنے میں لے آیا ہے۔

شہزادہ غیر معمولی حصے کی مالک نہیں تھی لیکن حالات کی تلخیوں نے اس کی شخصیت کو مضبوط بنا دیا تھا۔ اس کے اعتدال نے اس کی شخصیت کو دل کشی عطا کی تھی۔

نہیں میں ایک عورت اور مرد ستر کر رہے تھے۔ ان کے ساتھ ایک بچہ بھی تھا۔ عورت اور مرد کو احساس تھا کہ موت ان کے تعاقب میں ہے ان کے تمام گھروالوں کو مار دیا گیا تھا۔ گاڑی ایک اسٹیشن پر رکی تو ماں نے فیصلہ کیا کہ بچے کو کسی جگہ چھوڑ دے، تاکہ اس کی جان بچ سکے۔ اس نے بچے کو ایک بیچ کے بچے رکھ دیا اور خود ترین کی پہری پار کرتے ہوئے حادثہ کا شکار ہو گئی۔

میرپاؤس میں مختتم علی اور خاقان علی کا خاندان آباد ہے۔

مختتم علی خان ایم این اے ہیں ان کے تین بیٹے دواج، بہان اور شاہ میر ہیں۔ بیٹی ایک سی ہے جس کا نام در شوار ہے۔

تختہ علی کا بیٹا ویاہن شادی شدہ ہے، لیکن گھر کی ملازمہ مندل پر بری نظر رکھتا ہے۔ رو میصر نے گھر میں شدید توڑ پھوڑ کی اور ٹینا بیگم سے شدید نفرت کا اظہار کیا۔ شہزاد اسے باہر نفسیات کو دکھانے کا مشورہ دیتی ہے۔  
در سو اور طوطی محمد ہادی کے بنگلے میں جاتی ہیں اور درخت پر چڑھ کر خوبانیاں توڑتی ہیں۔ محمد ہادی سختی سے پیش آتا ہے تو در سو اسے دھمکی دیتی ہے۔ ان دونوں کے درمیان جھگڑا جاتی ہے۔  
ٹینا بیگم شہزاد کے ساتھ ایک آستانے پر جاتی ہیں۔ واپسی پر گھر کے گلے ٹوٹے ہوئے ملتے ہیں۔ ان کے تیسرے شہر بارون رضایتا ہے کہ رو میصر نے پھر ایک بڑا کام انجام دیا ہے۔ وہ فیصلہ دیتے ہیں تو ٹینا بیگم کا سر گوم جاتا ہے۔

### تیسری قسط

اس خبر کو سننے کے بعد وہ انتہائی پریشانی سے کسی میزائل کی طرح اپنی گاڑی اڑاتی ہوئی شایمار کلب سے نکلے۔ غائب دماغی کے عالم میں اس نے گاڑی کی ہیڈ لائٹس تک آف نہیں کیں، دماغ میں بگولے کی طرح ایک ہی فقرہ گردش کر رہا تھا۔

”روی کو پولیس نے ارسٹ کر لیا ہے، مفور کے الزام میں۔“  
”وہ کسی کا قتل کیسے کر سکتی ہے؟“ شہزاد کا دل یہ بات ماننے کو تیار نہیں تھا۔  
”پولیس کو یقیناً کوئی غلط فہمی ہو گئی، ورنہ روی اتنی بہادر تو نہیں ہے۔“ اس نے خود کو تسلی دینا چاہی۔  
”لیکن پولیس شک کی بنا پر کسی لڑکی کو کیوں گرفتار کرے گی؟“ دماغ میں ایک اور سوچ ابھری۔  
”یقیناً“ کچھ نہ کچھ ضرور ہوا ہو گا۔“ اس سوچ کے آتے ہی اس نے گاڑی کی رفتار لا شعوری طور پر بڑھا دی۔

ایک سو دس کی رفتار سے گاڑی چلاتی وہ ایک چوک پر پہنچی، اس نے دوسرے دیکھا، سنگٹن کھلا ہوا تھا۔ اس کا خیال تھا وہ بجلی کی سی تیزی سے وہاں سے گزر جائے گی لیکن ابھی وہ کچھ فاصلے پر ہی تھی کہ سبز سنگٹن زرد ہو گیا اور اس کے آگے موجود گاڑی ایک دم رک گئی اور وہ جوبنی طور پر اس کے لیے تیار نہیں تھی، ایمر جی بریک کے باوجود اس کی گاڑی ٹھاہ کر کے اگلی گاڑی سے جا ٹکرائی۔

”اؤف!“ شہزاد نے انتہائی شرمندگی سے اپنا سر پڑا۔  
وہ جانتی تھی غلطی سراسر اس کی اپنی تھی۔ زیادہ اسپید کی وجہ سے وہ گاڑی پر اپنا کنٹرول نہیں رکھ پائی، جس کی وجہ سے یہ حادثہ ہو گیا۔ آگے والی گاڑی سے کوئی فکر مندا انداز سے نیچے اترا، اس کی نیچے کار کا ہمر ٹوٹ چکا تھا۔

”محترمہ“ اپنی گاڑی ایک سائیڈ پر کریں۔“ ٹریفک وارڈن ہاگ گراس کہاں آیا۔  
”آئی ایم سوری“ میں مسہلتی کچھ ڈسٹرب تھی، اس لیے بروقت بریک نہیں لگا سکی۔“ اس نے نیچے اترتے ہی اپنی غلطی کا اعتراف کیا۔

وہ کوئی چھبیس ستائیس سال کا نوجوان تھا۔ اس نے بڑے قفل سے اس کی معذرت سنی تھی۔ اس نے ایک نظر میں شہزاد کی گاڑی کا بھی معائنہ کیا، وہاں بھی اچھا خاصا ڈنٹ پڑ چکا تھا۔

”آپ لوگ طے کر لیں، اب کیا کرنا ہے۔“ پولیس کا ٹیشیل اپنی جان چھڑا کر دوبارہ چوک میں جا چکا تھا۔  
”یکسپریس سلی سوری“ میری وجہ سے آپ کی گاڑی کا ہمر ٹوٹ گیا۔“ شہزاد نے دل ہی دل میں نقصان کا تخمینہ لگایا۔

”اس اوس کے۔“ دوسری جانب سے کمال بے نیازی کا مظاہرہ ہوا، شہزاد نے الجھ کر اس کا چہرہ دیکھا۔ وہ اس کا مطلب سمجھ نہیں پاتی تھی۔

”پلیز نوٹ دوسری، آپ کا جتنا نقصان ہوا ہے، میں ابھی پے کر دیتی ہوں۔“ شہزاد نے اپنی گاڑی کی اگلی سیٹ پر لٹھا اپنا ہینڈ بیگ اٹھا یا۔

”اس کی ضرورت نہیں، نقصان تو کسی سے کہیں پر بھی ہو سکتا ہے۔ میں ٹھیک کر دالوں گا خود ہی۔ ٹیک کیئر۔“ وہ برٹش انگلش لہجے میں بڑی روانی سے انگلش بولتا ہوا اسے حیران کر گیا۔ اس سے پہلے کہ وہ اس سے مزید کچھ کہتی، ٹینا بیگم کی سیل فون پر آنے والی کال نے اسے اپنی طرف متوجہ کیا۔ وہ سیل فون کان سے لگا کر ایک طرف ہوئی۔

”شیری! کہاں ہو تم۔“ دوسری طرف ٹینا بیگم سخت جھنجھلائی ہوئی تھیں۔  
”مام! آئی ایم جسٹ کمنگ۔“ پلیز نوٹ۔“ اپنی پیشانی مسلتے ہوئے اس نے انہیں دلاسا دیا۔

”ہری اپ گاڑی کی ضرورت ہے مجھے۔“ ان کے لہجے میں پریشانی کا عنصر نمایاں تھا۔  
”ڈونٹ وری مام! ری ایکس، آئی ایم کمنگ۔“ اس نے دھجھ سے کماور کال منقطع کر دی۔  
”دیکھیں مسٹر۔“ وہ جیسے ہی کال بند کر کے مڑی، اسے دھچکا لگا۔ وہ اسے حیران کر کے ہوا کے جھوکے کی طرح جا چکا تھا۔ سخت کی ایک لہر لحظہ بھر کو ابھری اور پھر فوراً ہی معدوم ہو گئی۔ وہ پیشانی پر آئے پسینے کے قطروں کو ساف کرتی ہوئی دوبارہ گاڑی میں بیٹھ گئی۔

”بھلا اس انسان تھا، جو ایسے ہی چھوڑ گیا۔“ وہ دل ہی دل میں منہوں ہوئی۔  
بیس منٹ کے بعد اس کی کار اپنے بنگلے کے پورٹیکو میں داخل ہوئی جہاں پہلے سے دو گاڑیاں کھڑی تھیں۔ وہ اقبل پھل ہوتی دھڑکنوں کو سنبھالتے ہوئے نیچے اتری اور گھر میں ہونے والی غیر معمولی ہانچل سے اسے اندازہ ہوا کہ کھر کے سب ہی مکین، اس خبر سے آگاہ ہو چکے تھے۔ ورنہ یہاں اتنی صبح سویرے جانگنے کا کوئی رواج نہیں تھا۔ سردیوں کی نرم دھوپ بنگلے پر پھیل چکی تھی۔

وہ لاؤنج کا شیشے کا دروازہ دھکیل کر اندر داخل ہوئی، باورچی خانے میں کھڑے خانہ سال نے جھانک کر باہر دیکھا اور اسے سلام کر کے واپس مڑ گیا، اسی وقت ملازمہ چائے کی ٹرائی لیے پکن سے نمودار ہوئی۔

”کون آیا ہے؟“ شہزاد نے لوازمات سے لدی ہوئی ٹرائی کو دیکھ کر پریشانی سے پوچھا۔  
”ہارون صاحب“ ملازمہ کی اطلاع پر اس کے اعصاب تن گئے۔

”اور دوسری گاڑی کس کی ہے؟“ اس کے چہرے پر بے زاری کے تاثرات نمودار ہوئے۔  
”کوئی وکیل صاحب ہیں شایید۔“

”اپنا ٹھیک ہے، جاؤ اور نام کو بتا دینا“ میں آگئی ہوں۔“ وہ مضطرب انداز میں سیڑھیاں چڑھ کر اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ جیسے جیسے وقت گزر رہا تھا۔ اس کی پریشانی بڑھتی جا رہی تھی۔ وہ لباس تبدیل کر کے بالوں میں برش لانے لگی۔

”نہجہ مام سے ملنا چاہیے، پتا نہیں روی کی کیا چویشن ہو۔“ اس نے برش ہیڈ پر پھینکا اور تیزی سے کمرے سے نکلے۔

ابھی وہ لاؤنج کی سیڑھیوں پر پہنچی ہی تھی کہ ڈرائنگ روم کا دروازہ کھلا، ٹینا بیگم کے پریشان چہرے کے پیچھے ہارون رضا ہاتھ میں سگار پکڑے ایک طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ برآمد ہوئے۔ انہیں دیکھ کر شہزاد کا حلق تنگ



کڑوا ہو گیا۔

”کہا تھا تا تمہاری یہ بیٹی کوئی نہ کوئی کارنامہ ضرور سرانجام دے گی، دیکھ لو، ایسا ہی ہوا۔“ اعصاب شکن خاموشی میں ہارون کا مسخرانہ لہجہ یٹینا بیگم کو بہت ناگوار گزر رہا تھا۔ ”میں خست ناپسندیدگی سے دیکھا۔“ ”تو کیا کر دیں، شوٹ کر دیں!“ اسے یا پھانسی پر چڑھا دیں؟“ انہوں نے مضطرب و ہواشت کی آخری حدوں کو عبور کرتے ہوئے سختی سے کہا۔

”جان چھڑاؤ اپنی شادی کر کے اس کی۔“ شہزادہ کو اس بے وقت کی راگنی پر کوفت ہوئی۔

”فار گاڈ سک ہارون! یہ کوئی موقع ہے ایسی باتیں کرنے کا۔“ وہ بری طرح جھنجھلا گئیں۔

”باتیں تو ابھی بہت ہوں گی ہمارے سوشل سرکل میں، میڈیا تک خبر پہنچنے دو ذرا۔“ ان کا چہرہ اس سے پہلے اتنا بد صورت نہیں لگا تھا شہزادہ کو۔

”واٹ دا ہیل ہارون، اگر کوئی اچھی بات نہیں کر سکتے تو منہ بند رکھو اپنا۔“ یٹینا بیگم نے بھی بد لحاظی کے سارے ریکارڈ توڑے۔ وہ اس صورت حال میں بھی انتہائی تک سب سے تیار تھیں۔ شہزادہ میڑھیاں اترتے

ہوئے ان کی تیار نوٹ کر چکی تھی ہارون رضائے انہیں جواب دینے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ شہزادہ کو دیکھ کر لحاظ کر گئے۔ بے بسی بھی یٹینا بیگم کی اس بیٹی کا سرد انداز انہیں اپنی حدیں رہنے پر مجبور کر دیتا تھا۔

”السلام علیکم! شہزادہ نے سر کو ہلکی سی جنبش دے کر انہیں بادل خواستہ سلام کیا۔

”والسلام“ وہ بھی مختصر جواب دے کر گہری پینے لگے۔

”تھمنکس گاڈ، شیری! تم آگئیں، چلو ذرا میرے ساتھ۔“ انہوں نے پیڈ بیگ سے اپنے بے حد قیمتی گانگو نکال کر بڑی نفاست سے نشو و نما سے اس کا شیشہ صاف کیا۔ ان کی بات پر ہارون رضا ایک دم بے چین ہوئے۔

”اب کہاں جارہی ہو صبح چھاپہ مارے؟“ ان کی مسکراہٹ طنزیہ اور لہجہ آگ لگانے والا تھا۔

”قریبی لاء ایسوسی ایشن کے آفس۔“ انہوں نے بڑی تمکنت سے کسی راج ہنس کی طرح گردن اٹھا کر جواب دیا۔ اس وقت سیاہ رنگ کے ساتھ سوٹ پر ہلکے پادامی رنگ کی شال اوڑھے وہ خاصی باوقار لگ رہی تھیں۔

”واٹ؟“ وہ انتہائی خفگی اور بے زاری سے کھڑے ہوئے۔

”اور وہ جواباً بر خاقان آیا بیٹھا ہے ڈرائنگ روم میں۔“ بے حد کھیلپی نظروں کے ساتھ انہوں نے اپنی بیگم کو دیکھا جو انہیں اس وقت جوئے کی نوک پر بھی رکھنے کو تیار نہیں تھیں اور کسی زمانے میں یٹینا بیگم کی اسی ادا پر فریفتہ ہو کر انہوں نے اپنے تین جوان بچوں کی موجودگی میں نہ صرف ان سے شادی کی بلکہ جوش جذبات میں ایک ماربل فیکٹری بھی حق مرہیں لکھ دی تھی جس پر وہ اب اکثر پچھتاتے تھے۔

”یہ بابر خاقان، یہ لڑے گا میری بیٹی کا کیس۔“ انہوں نے سلگتی نظروں سے اپنے شوہر کو دیکھا اور چنچ کر بولیں۔

”ہاں، اچھا خاصا تو ہے۔“ خود پر قابو پا کر وہ راتھل سے گویا ہوئے۔

”یہ اچھا خاصا ہے؟“ انہوں نے طنزیہ انداز میں اپنی بھنوس اچکا گئیں۔ ”مجھ سے بات کرتے ہوئے میں دفعہ انکا یہ یہ ذفر کو رٹ میں جا کر کیا خاک دفاع کرے گا رومی کے کیس کا۔“

”تو پھر بولو اب کیوں تھا اسے۔“ ہارون رضا کا مزاج بگڑا۔

”مجھے کیا پتا تھا اتنا ایڈیٹ ہو گا تمہارا بابر خاقان، چائے پلا کر فاسع کرو اسے۔“ یٹینا بیگم نے بے زاری سے سر جھٹکا۔

”ب سب کچھ تمہیں خود ہی کرنا تھا تو میری نیند کیوں برباد کی صبح صبح۔“ ان کے ضبط کا پتا نہ چھلک گیا اور یہ بھی وہ مزاجاً خاصے تنگ مزاج تھے تب ہی تو ان کی اور یٹینا بیگم کی ہر وقت ٹھنی رہتی تھی۔

”مجھے کیا پتا تھا کہ تم اپنے جیسا نمونہ اٹھا کر لے آؤ گے میرے پاس۔“ شہزادہ نے اس فضول بحث پر کوفت بھرے انداز میں گھڑی کی طرف دیکھا۔ ٹائم تیزی سے گزر رہا تھا۔

”سیف الرحمن جیسے اسٹریٹنگ سورسز تو ہیں نہیں میرے پاس۔“ ان کے جلتیہ انداز پر یٹینا بیگم کے چہرے پر زہن پھلکا۔

”وہ تو پوری ایک لاء فرم ہائز کر لے گا کھڑے کھڑے تمہاری بیٹی کے لیے۔“ ہارون کی طرف سے اس قدر براہ راست جملے کی توقع نہیں تھی انہیں اور شہزادہ کی موجودگی میں تو یہ فقرہ ایک کوڑے کی طرح ان کے اعصاب پر برساتا تھا۔

”میرا خیال ہے مجھے بھی کسی ”کام“ کے بندے سے ہی رابطہ کرنا چاہیے، تم جیسے تو محض اپنا اور دوسروں کا ٹائم ہی اسٹ کر سکتے ہیں۔“ ان کی جوابی کارروائی نے ہارون رضا کو مشتعل کیا۔

”شٹ اپ۔“ وہ ایک دم دھماڑے شہزادہ نے ناگوار سے ہارون رضا کی طرف دیکھا۔ ان کی خوابیدہ آنکھیں غصے کی زیادتی سے مزید سرخ ہوئیں اور ویسے بھی ”عادی“ پینے والوں کی طرح ان کی آنکھوں میں گلابی پن تو ویسے ہی جھلکتا تھا۔ اس وقت تو وہ کسی کوٹے کی طرح دھبہ رہی تھیں۔

”ہو نوٹ اپ۔“ وہ اسی طنطنے سے گویا ہوئیں جو ان کے مزاج کا حصہ تھا۔

”کو نو دا ہیل۔“ وہ بے زاری سے ڈرائنگ روم کی طرف بڑھے۔

”اپنے اس گدھے کو بھی لے جاؤ ساتھ، جسے ہانکنے کے لیے لے آئے تھے صبح صبح۔“ یٹینا بیگم نے بے زاری سے سر جھٹکا۔

”نام پلیز۔“ کل ڈاؤن۔“ شہزادہ نے بے تاثر انداز میں انہیں مخاطب کیا۔ وہ لاروائی سے کندھے اچکا کر شیشے دار وازہ کھول کر باہر نکلیں۔ پورے ٹیکو میں کھڑی اپنی گاڑی کی طرف بڑھیں، ابھی ان کی نظر اس ”ڈیٹ“ پر نہیں

پڑی تھی جو آج ہی شہزادہ ہر سے تنگی کی طرح سجا کر لائی تھی۔

\*\*\*

مری ایکسپریس دے پر اس وقت بے تحاشا رش تھا۔ ایک گھنٹہ ٹریفک جام میں پھنسنے کے بعد محمد ہادی کی گاڑی ان شہر میں داخل ہوئی اس نے سکون کا سانس لیا۔ مری میں عام دنوں میں ہی گاڑیوں کا جوم رہتا تھا لیکن

اب ایڈر پر تو یہ صورت حال خاصی گھمبیر ہو جاتی تھی۔ اس کے سیل فون کی گھنٹی بجی، دوسری طرف مسز عالیہ قربی تھیں۔

”بی ماما۔“ اس نے فوراً ہی کال انیڈ کی۔

”کمر پہنچے ہو تم۔“

”نہیں، بندہ سے بیس منٹ لگیں گے مزید۔“ اس نے کلائی میں بندھی گھڑی دیکھ کر اندازہ لگایا۔

”ہاں، پھر چنیتے ہی گل خان کو کتنا بچ پا کس سے سارے سالن نکال کر فریز کر دے۔“ ان کے محبت بھرے انداز میں

”اور کوئی حکم؟“ وہ شرارتی انداز سے گویا ہوا۔

”کسٹومیک اینڈ بھی ضرور آتا، میں اپنے ہاتھوں سے کونگ کر کے دوں گی تمہیں۔“

”ان شاء اللہ“ اب فون بند کریں۔ سامنے ٹریفک وارڈن کھڑا ہے، چالان کر دے گا میرا۔“ اس نے جلدی سے فون بند کیا اور سی ڈی پلیئر چلایا۔ اپنی پسند کا میوزک سنتے ہوئے وہ جیسے ہی اپنے گھر کے سامنے پہنچا، اس کا دماغ بھک کر کے اڑ گیا۔

کوئی سیاح اپنی گاڑی عین اس کے گھر کے گیٹ کے سامنے کھڑی کر کے جا چکا تھا۔ کوفت اور بے زاری کا اس پر بڑا بھرپور حملہ ہوا تھا۔ اس نے ایک طرف گاڑی کھڑی کی اور سامان باہر نکالا، اما نے اچھا خاصا بڑا ٹفن اس کے ہمراہ کر دیا تھا۔

وہ جیسے ہی اپنے گھر کے چھوٹے گیٹ سے سیڑھیاں اتر کر نیچے جانے لگا، اس کی نظر میراؤس پر پڑی، جہاں کرکٹ کا میچ زوروں پر تھا۔ درشمار گینگ نے ایک طوفان بد تمیزی برپا کر رکھا تھا۔ وہ اتنا کھیل نہیں رہی تھیں جتنا شور مچا رہی تھیں۔

”ان لڑکیوں کو بھی سکون نہیں ہے۔“ وہ بے زاری سے سیڑھیاں اترنے لگا۔

”اوہ چھٹا!“ ساتھ والے لان سے ایک دم شور مچا ہوا۔

اس سے پہلے کہ ہادی سراٹھا کر شاہد آفریدی کی جاگھیں کو دیکھتا، ایک بھاری بھر کم سی گیند اڑتی ہوئی آئی اور

میزائل کی طرح اس کے ہاتھ میں پکڑے ٹفن سے ٹکرائی اور ٹفن ہاتھ سے چھوٹ کر نیچے لان میں جا گرا۔ سرسوں کا ساگ، ٹھیر اور حلیم تینوں کے ڈبے زمین بوس ہو کر اب آپس میں شیر و شکر ہو چکے تھے۔

”اوہ فوس۔“ ہادی کا صدمے سے برا حال ہوا۔ اما کی سارے دن کی محنت اس وقت مٹی میں مل چکی تھی۔ ”مارے گئے۔“ درشمار، طوبی اور نیرہ دوپوارے سے جھانکتے ہوئے یہ منظر دیکھ چکی تھیں۔ اسی لمحے ہادی نے سر اٹھا کر اوپر دیکھا۔

”ڈرا نیچے تشریف لائیں۔“ اس کی پیشانی کی عمودی لکیریں گہری ہوئیں۔ اس نے اپنے اندر کے ایلٹے ہوئے لاوے کو بے قیاس باتیں ہوتے ہاتھ سے درشمار کو نیچے آنے کا اشارہ کیا۔

”سوری، ٹائم نہیں ہے ہمارے پاس۔“ وہ منڈیر سے جھانکتے ہوئے شوخی سے گویا ہوئی۔

ایک آن دیکھی غصے کی آگ نے ہادی کے وجود کا احاطہ کیا۔ اسے لگا جیسے اس نے مزید ضبط کی کوشش کی تو یہ آگ اس کے سارے وجود کو جلا کر بھسم کر دے گی، وہ کچھ سوچ کر پلٹا اور اب تیز تیز چلتے ہوئے اس کے قدم میراؤس کی طرف تھے۔

درشمار کی سمجھ میں پہلے کچھ نہیں آیا مگر جیسے ہی اس نے ہادی کو اپنے گیٹ کی طرف جاتے دیکھا، اس کے دماغ میں خطرے کی گھنٹی بجی۔ وہ ہنی کی سی تیزی سے قلاچیں بھرتی ہوئی نیچے اترتی۔

”بھگاؤ، وہ سڑل آ رہا ہے ہمارے گھر۔“ درشمار کی بات پر ان دونوں کو کرنٹ لگا اور اگلے ہی لمحے وہ بجلی کی سی سرعت سے اندر کی طرف بھاگیں لیکن آج شاید ان کے ستارے گردش میں تھے۔

محمد ہادی جیسے ہی ان کے گیٹ پر پہنچا، برہان کی لینڈ کروزر وہاں آ کر رکی، انہوں نے حیرانی سے سامنے کھڑے لڑکے کو دیکھا، جس کا چہرہ غصے کی زیادتی سے ممتا رہا تھا۔ وہ انتہائی مناسب لفظوں میں اپنا شکایت نامہ جمع کروا کر دوبارہ گھر پہنچا تو سامنے ٹفن کی برہادی کا منظر دیکھ کر اس کا خون دوبارہ اسے کھول اٹھا۔

ہال کمرے میں تاجدار بیگم نے ایک دفعہ پھر عدالت سجا رکھی تھی۔ درشمار، طوبی اور نیرہ ایک لائن میں سر جھکائے کھڑی تھیں اور تاجدار بیگم کے ساتھ بیٹھے برہان لالہ کابل نہیں چل رہا تھا کہ ان تینوں کو پکھلے سے لٹکا دیتے۔

”توبہ! توبہ! اقرب قیامت کی نشانیاں ہیں، اب گھر کی جوان جہان بچیوں کی شکایتیں لے کر لڑکے آئیں گے، ان بچوں سے۔“ تاجدار بیگم انتہائی غصے سے انہیں کھورتے ہوئے بولیں۔

”نیرا بھم کیا ہے تم لوگوں کے ساتھ۔۔۔؟“ برہان دلی آواز میں غرا۔

”اکی ایم سوری لالہ، ہم نے جان بوجھ کر نہیں کیا تھا ایسا۔“ درشمار نے ان کی ملامتی نظروں سے گھبرا کر اب دیا۔

”ضرورت کیا تھی بھلا، مسٹنڈوں کی طرح یہ گیند مٹا کھینے کی۔“ تاجدار بیگم چڑ کر بولیں۔

”اتنی شرم آ رہی تھی مجھے، اپنے گھر کی خواتین کا ذکر کسی غیر مروت کے منہ سے سن کر۔“ برہان غصے سے ٹہلنے لگا۔

”منہ توڑ دیتا تھا اس شکایتی ٹٹو کا۔“ درشمار کی زبان پھسلی۔

”تم تینوں کی ٹانگیں نہ توڑ دوں، تاکہ ارد گرد کے لوگوں کی زندگیاں سکون سے گزریں۔“ وہ اپنے غصیلے جذبات کا ہوا پار کھم کھم کر بے لک لہجے میں بولتے ہوئے ان تینوں کی روح فنا کر گئے۔

”نیرہ تو زندگی عذاب کر رہی ہے، ان لڑکیوں نے، آج تو صاف صاف بات کروں گی ان کے دواجی سے نور محل میں رکھیں انہیں پاس، پتا چلے انہیں بھی انسانوں کی طرح کیسے رہتے ہیں۔“ تاجدار بیگم کی دھمکی نے ان تینوں کا

رہا، ماسکون بھی برباد کر دیا۔ ”ایسا سوچتا ہو گا وہ بھلا ماس، شتر بے ماری کی طرح چھوڑ رکھا ہے اپنے گھر کی خواتین کو۔“ برہان غصے سے ٹہلنے لگا۔

”اور جو ہم سوچتے ہیں اس کہنے کے بارے میں اسے پتا چلے تو گولی مار لے خود کو۔“ درشمار نے دل میں سوچا۔ ”شراکتیز جملہ کم از کم برہان لالہ کے سامنے بولنے کا رسک نہیں لے سکتی تھی اتنی تو عقل تھی اس میں۔“

”دوبارہ تم تینوں میں سے کوئی مجھے سامنے والے لان میں نظر آیا تو نور محل نہیں بڑی حویلی بھجوا دوں گا گیلا سے کہہ کر۔“ برہان کے دھمکی آمیز انداز پر ان تینوں نے دل کرایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ بڑی حویلی جانے کا

نہہ رہی ان تینوں کے لیے بڑا خوفناک تھا۔ ایک تو ملتان کی گرمی اور اوپر سے اپنے فارم ہاؤس کے پاس بنی حویلی کے اس پاس کوئی چرند پرند بھی نظر نہیں آتا تھا۔ اس لیے بڑی حویلی ان سب کے لیے کسی قید خانے سے کم نہیں تھی۔

اسی وقت انا بیہ جانے کی ٹرے لیے ہال کمرے میں داخل ہوئی، اس نے کن اکھیوں سے سامنے کرسی پر بیٹھے ہال کو دیکھا۔ سرمئی کھر کے کرتا شلوار میں وہ ٹھیک کی آستینوں کو کمنیوں تک موڑے، گھنٹی موچھوں کے نیچے سامنے ایوں کے ساتھ بہت شاندار لگ رہے تھے۔

”کھائے۔“ وہ اتنی آہستگی سے بولی تھی کہ برہان بمشکل ہی سن پائے۔

”نیرہ! وہ نہیں ہے۔“ وہ درشتی سے کہتے ہوئے کھڑے ہوئے اور کسی سے بھی مخاطب ہوئے بغیر کمرے سے نکل گیا۔ اس بے رخی پر انا بیہ کا دل ایک دم ٹوٹا اور آنکھیں نمکین پانی سے بھر گئیں۔

”نیرہ! یہی بڑا ظلم کیا۔“ درشمار نے لکاسا گنگنا کر جانے کا گپ اٹھایا۔

”نیرہ! یہی بڑا ظلم کیا۔“ درشمار نے لکاسا گنگنا کر جانے کا گپ اٹھایا۔

”نیرہ! یہی بڑا ظلم کیا۔“ درشمار نے لکاسا گنگنا کر جانے کا گپ اٹھایا۔



”ان سے کہیں پولیس ڈپارٹمنٹ چھوڑ کر کوئی ٹھیلہ لگا کر بیٹھ جائیں، اگر وہ ان چیزوں پر دھیان نہیں دیں گے تو کون دے گا؟“

”دیکھیں مہر سہگل، آپ اچھی طرح جانتی ہیں، ہم لوگ بے بس ہیں، اور وہی کرنا ہوتا ہے جس کی آرڈر ملے ہیں۔ آپ پلیز کوئی اچھا وکیل ہائر کر کے اپنی بیٹی کا دفاع کر لیں۔“ ایس ایچ او نے نرمی سے انہیں مشورہ دیا، ویسے بھی ٹینا بیگم کے اختیارات کا اندازہ انہیں بھی ہو گیا تھا۔

”مام، یہ ٹھیک کہہ رہے ہیں، ہمیں نکلنا چاہیے۔“ شہر زاد نے میز پر رکھا ہوا ہینا سیل فون اٹھایا اور فیصلہ کن انداز میں کھڑی ہوئی۔

ٹینا بیگم پولیس اسٹیشن سے نکلیں تو اچھی خاصی فکر مند تھیں۔ شہر زاد نے ڈراماٹک سیٹ سنبھالتے ہی بیک مرر سیٹ کیا، رومبھہ خوف زدہ انداز میں بالکل سکڑی ہوئی پچھلی سیٹ پر بیٹھی تھی۔

مام کو کافی کالز آ رہی تھیں اور چونکہ شہر زاد انہیں اچھی طرح سمجھا کر لائی تھی اس لیے رومی کے ساتھ ان کا رویہ خاصا ہنسرت تھا۔ انہوں نے جیسے ہی اپنی کال ہند کی شہر زاد نے رومبھہ کو مخاطب کیا۔

”تم کیا پہلے سے جانتی ہو روڈ حیل محمود کو؟“

”نہیں۔“ وہ اضطراب کی کیفیت میں اپنے ہاتھوں کے ناخن چبا رہی تھی، شہر زاد کو ہلکی سی گھن محسوس ہوئی۔

”پھر وہ تمہارے پیچھے کیوں آیا؟“ وہ حیران ہوئی۔

”میرا بھڑا ہو گیا تھا اس کے ساتھ کلب میں۔“ اس نے سر جھکا کر شرمندگی سے کہا۔

”تمہیں ضرورت کیا تھی کلب جانے کی۔“ ٹینا بیگم نہ چاہتے ہوئے بھی بول پڑیں۔ ان کی دخل اندازی شیری کو سخت ناگوار گزری تھی۔

”مام پلیز۔“ شہر زاد کے تنہا ہی لمحے پر وہ سنبھل کر بیٹھ گئیں۔

”جھگڑا کس بات پر ہوا تھا؟“ اس نے اگلا سوال کیا۔

”وہ بدتمیزی کر رہا تھا میرے ساتھ۔“

”پھر تم نے اس سے کیا کہا؟“

”غصے میں آکر پھڑپھار دیا تھا۔“ اس نے ہلکا سا جھجک کر کہا اور ٹینا بیگم نے غضب ناک نگاہوں سے اسے گھورا لیکن خاموش رہیں۔

”اس کے بعد کیا ہوا؟“ شہر زاد بالکل پرسکون انداز میں اس طرح پوچھ رہی تھی جیسے وہ اسے کسی فلم کی کہانی سنا رہی ہو۔

”پھر وہ ہمارے پیچھے آگیا، اس کے ہاتھ میں پستل تھا اور اس نے مجھے مارنے کی کوشش کی۔“ رومی کا لہجہ بھرا گیا۔

”وہ فوس؟“ وہ تھوڑی سی بے چین ہوئی۔

”وہ مجھے اور کزنہ کو فالو کرتے ہوئے اچانک ہی ہماری گاڑی کے سامنے آگیا اور ٹرسٹ می شیری، ہم نے جان بوجھ کر ہٹ نہیں کیا اسے، وہ خود اپنی غلطی سے ٹکرایا تھا۔“ رومبھہ نے گہرا کر اپنی بہن کو صفائی دی۔

”کزنہ جانتی ہے اسے پہلے سے۔“ اس نے کچھ سوچ کر اگلا سوال کیا۔

”ہاں۔۔۔ اسکول میں کلاس فیلو رہ چکا ہے وہ اس کا۔“ رومبھہ نے سر جھکا کر شرمندگی سے کہا۔

”اور تم اس کے باپ کی کمپنی دیکھو، کیسے اپنی بیٹی کو مکھن میں سے بال کی طرح نکال کر لے گیا۔“ ٹینا بیگم کا

”اس نے گھڑی ہوئی۔“

”میرا ہاؤس میں اس وقت خلاف معمول بڑی خاموشی طاری تھی۔ تاجدار بیگم اپنی ملازمہ صندل کو چھوڑنے اور نکل گئی ہوئی تھیں اور شارقہ بیگم صبح سے اتنا بیہوش کے ہمراہ ملازمین سے اسٹور کی تفصیلی صفائی کرنے میں مگن تھیں۔ اس وقت سب ہی کی شامت آئی ہوئی تھی۔ پرانا کاٹھ کبڑ، غیر استعمال شدہ برتن، اور پرانے اخبارات لے بنڈل سب ہی کچھ وہاں بکھرا ہوا تھا۔

”اللہ معاف کرے، دنیا جہاں کا کباڑ جمع کر رکھا ہے یہاں۔“ شارقہ بیگم نے گرد سے بچنے کے لیے دوپٹا ناک پر رکھا ہوا تھا۔

”آدھی دہائی تو ان رسالوں اور اخباروں کی ہے۔“ ملازمہ رشیدہ نے ایک بنڈل لا کر زمین پر رکھا۔

”استغفر اللہ! یہ کیا ہے؟“ شارقہ بیگم منہ بنا کر پیچھے ہٹیں۔

”در شہوار، اور طوطی کے ڈائجسٹ اور فیشن میگزین۔“ انابیہ نے تھوڑا سا جھجک کر کہا۔

”شکر ہے میری نمبرہ کو ایسا چکا نہیں۔ ویسے تو ساری بات تربیت کی ہوتی ہے۔“ ندرت امی اللہ جانے کس کونے سے نکل کر سامنے آگئی تھیں۔

”ہاں، تب ہی پوزیشنیں لے لے کر بنڈی پورڈ کی چھت بھاڑ رکھی ہے اس نے۔“ ان کی سوکن جل کر بولیں۔

”ان شاء اللہ، زلزلہ آنے والا ہے، دیکھ جئے گا، اچھے بھروسے پاس ہوگی۔“ انابیہ کو ندرت امی کی لاعلمی پر رشک آیا۔ وہ چاہتے ہوئے بھی انہیں نہیں بتا سکی کہ زلزلہ آچکا ہے کیونکہ اس کی اپنی بہن ایک مضمون میں اڑ گئی تھی۔

”رشیدہ، اٹھاؤ یہ سب، اور پھینک دو دی میں۔“ شارقہ بیگم کے اگلے حکم پر انابیہ بوکھلا گئی۔ وہ جانتی تھی کہ در شہوار اور طوطی کی ان رسالوں میں جان بھی اور انہوں نے اپنی پسندیدہ تحریروں والے شمارے سنبھال کر رکھے ہوئے تھے۔

”مامی، در شہوار بہت شور مچاے گی۔“ انابیہ نے محتاط انداز میں کہا۔

”مچاتی رہے۔۔۔“ انہوں نے کمال بے نیازی کا مظاہرہ کیا۔ ”ویسے خیر تو ہے، یہ لڑکیوں کی بولتی کیوں بند ہے آج۔“ انہیں گھر میں پھیلے غیر معمولی سناٹے کا اچانک احساس ہوا۔

”در شہوار کے روم میں ہیں شاید۔“

”پھر کوئی نئی کھیمپک رہی ہوگی وہاں، ان کو کون سا سکون ہے۔“ ان کے جل کر بولنے پر انابیہ کو ہنسی آگئی۔

”میں ذرا دیکھوں، خاقان صاحب نے دوپہر میں فون کرنے کا کہا تھا۔“ ندرت امی، اپنی سوکن شارقہ بیگم کو



سنانے کے لیے دانستہ اونچی آواز میں بولتی ہوئی اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئیں۔  
 ”اس عورت کا کھٹیا پن ساری زندگی ختم نہیں ہو گا۔“ شاردہ بتیکم کو غصہ آگیا۔

”آپ چھوڑیں انہیں، جا کر بچن دیکھیں، تانی اماں آنے والی ہوں گی۔“ انابیہ نے ان کی توجہ دوسری جانب مبذول کی۔

”تم یہ سالا کباڑ اٹھواؤ، ورنہ گھر آتے ہی جھٹانی صاحبہ کاموڈ آف ہو جائے گا۔“

وہ بڑبڑاتی ہوئی بیڑھیاں اتر کر نیچے چلی گئیں۔ انابیہ نے سکون کا سانس لیا اور سب سے پہلے ان ڈائجسٹوں کے لیے ایک محفوظ ٹھکانہ تلاش کرنے کے لیے ادھر ادھر نظر پڑا۔ اس کے بعد اسے لعزتی اجلاس میں شرکت کرنا بھی جو اس وقت درشمار کے کمرے میں بڑی دھوم دھام سے منایا جا رہا تھا۔



میراؤس کے فرسٹ فلور پر واقع درشمار کے کمرے میں اس وقت واقعی ”شام غم“ منائی جا رہی تھی۔ کمرے میں زیرواٹ کا زردیلمب جل رہا تھا اور کاہٹ پر سفید چادریں بچھا کر ان پر گاؤ تکیے رکھے ہوئے تھے۔ سائیڈ میز پر اگر تکی دہک رہی تھی، جس نے کمرے کی فضا کو اپنی خوشبو سے معطر کر رکھا تھا۔ گاؤ تکیے سے ٹیک لگائے وہ تینوں سیاہ رنگ کے سوٹ پہنے غم کا اشتہار بنی بیٹھی تھیں۔ سی ڈی ہلڈو میں حامد علی بیلایا کی آواز میں ”کافی“ کے بول کمرے کے ماحول میں اداسی کے مزید رنگ بھر رہے تھے۔

مائے	نی	میں	کنوں	اکھال۔
درو	چھوڑے	داحال	نی۔	
دکھال	دی	روٹی	سولال	دا
آہیں	دا	پالن	بال	نی۔
مائے	نی	میں	کنوں	اکھال۔

سفید رنگ کی چاندنیوں کے عین درمیان میں درشمار کے لیپ ٹاپ پر ایف ایس سی کے رزلٹ کی ویب سائٹ کھلی ہوئی تھی، جسے وقفے وقفے سے اس امید پر چیک کیا جا رہا تھا کہ شاید امتحانی نتائج میں کوئی معجزانہ تبدیلی آجائے۔ ”شام غم“ ان تینوں کی کسارت آنے کے غم میں متعقد کی گئی تھی۔

”تم مانویانہ مانو اس کہنے کی بددعا لگی ہے ہمیں۔“ درشمار نے رنجیدہ لہجے میں انکشاف کیا۔

”کس ”کہنے“ کی؟“ ”میرہ نے منہ بنا کر ایسے پوچھا جیسے اس کے پاس کینول کی پوری لسٹ موجود ہو۔

”ایک ہی تو ہے، وہ غیبت ہمارا ہسیا ہے، پخل خور۔“ درشمار تڑپ کر بولی۔ برہان لالہ کی شام میں کی ہوئی بے عزتی کا دکھ بھی تازہ تھا۔

”اللہ کرے وہ بھی فیل ہو جائے اپنے سارے سیکشن میں۔“ طوبی نے دیکھی دل سے بددعا دی۔

”بے وقوف لڑکی! وہ اپنی ایجوکیشن کھپٹ کر کے آیا ہے، جب میں بددعا تو کوئی ڈھٹک کی دے دو۔۔۔۔۔“ ”میرہ نے منہ نہاتے ہوئے ہنسی کی۔

”اللہ کرے اس کی شادی ہو جائے کسی جھینگ لڑکی سے“ اور وہ ساری زندگی یہی سمجھتا رہے کہ وہ اسے دیکھ رہی ہے جسکے وہ اس کے دوست کولاس مار رہی ہو۔ ”طوبی کی اگلی بددعا پر ”میرہ کو نہ چاہتے ہوئے بھی ہنسی لگتی۔

”دانت تو ایسے نکال رہی ہو جیسے بورڈ میں ٹاپ کیا ہو۔“ طوبی نے جل کر بالکل تانی اماں کے اسٹائل میں طعنہ دیا۔

”تم اپنے لپہو ہڑکا“ کی بورڈ“ رکھو یہاں میں ابھی ”ٹاپ“ جاتی ہوں۔۔۔“ ”میرہ بول کر ہنسی۔

”اے گھر کا اس جوک کرنے کے بجائے فیل ہونے کی وجوہات ڈھونڈو۔“

”قی بات تو یہ ہے، مجھے تو بابائے قوم قائد اعظم کی آہ لگی ہے، وہ جو جود کے بجائے اٹھارہ نکات لکھے تھے ناں، وہ

کے پائے میرے۔“ ”میرہ نے اپنے فیل ہونے کی سب سے بڑی وجہ ڈھونڈ لی۔

”اور مجھے کیسٹری کی میم ڈیک کی جن کی پورا سال انگلیں اتاری تھیں میں نے ٹیکٹ پین پین کر۔“ طوبی نے

”ایک سے اپنے کناہ کا اعتراف کیا۔ ان دونوں کی دیکھا دیکھی، درشمار بھی اٹھ کر بیٹھ گئی۔

”اب اس بات ہے، تم لوگ مانویانہ مانو، مجھے اس غیبت ہادی کی آہیں لے ڈوبی ہیں۔“ درشمار نے اپنا ہاتھ

”اسٹائل میں آہ بھر کر مزید اضافہ کیا۔

”اللہ! وہ چاہتا ہو یورشی جائیں گے، ڈھنگ اور اسٹارٹ لڑکوں کے ساتھ بڑھ کر اپنے خاندان کا ٹیم روشن

”کے۔“ ”ابن افسوس صد افسوس دل کے ارمان آنسوؤں میں بہہ گئے۔“ درشمار کی اداکاری عروج پر تھی۔

”باری بن ایتنے سرد موسم میں ٹھنڈی آہیں بھر کر مزید ٹھنڈک میں اضافہ مت کرو۔ میری تو پہلے ہی چار

”اپنی خدا خواستہ نمونیا نہ ہو جائے۔“

”طوبی نے منہ نہاتے ہوئے درشمار کی وارڈروب سے ایک شال نکال کر اوڑھی۔

”اے پر ہلکی سی دستک نے اس نے ان تینوں کو بے زار کیا۔ آہستہ سے دروازہ کھول کر ارسل اندر داخل

”اواز کی جیب میں ہاتھ ڈالے اس نے انتہائی حیرانی سے کمرے کا ناقدانہ انداز میں جائزہ لیا۔

”کس فلم کا کٹنگ لگا رکھا ہے یہاں۔۔۔“ اس نے ابھرا چکا کر پوچھا۔

”اے جے کا۔“ طوبی نے جل کر جواب دیا۔

”ہلو پھر اس خوشی میں شاہ میرے بات کرو، کیونکہ تم تینوں کے نمبروند جارہے ہیں۔“ ارسل نے اپنا سیل فون

”س کی طرف بڑھایا۔ طوبی کو کرنٹ لگا، وہ جانتی تھی کہ اس موقع پر اس کا فون زخموں پر مزید نمک چھڑکنے کے

”میان و سباق سے واقف تھا۔

”ہاں ہاں بات کرو طوبی، میرا پوچھیں تو کہہ دینا، ٹریکولائزر لے کر سو گئی ہے۔“ درشمار نے جلدی سے کشن

”اللہ! ہوں پر رکھ لیا۔ اس نے دل ہی دل میں اسے سوگالیاں دیتے ہوئے کال اینڈنگ کی۔

”فرمائیے؟“ ”وہ منہ کر بولی۔

”سنائے، تندہی یاو مخالف نے سارے ہی عقاب اڑا دیے ہیں۔“ دوسری طرف اس نے بڑے معنی خیز انداز

”میں توجہ نہ لگایا۔

”گرے ہیں شاہ سوار ہی میدان جنگ میں۔۔۔“ طوبی نے بھی ڈھٹائی کا مظاہرہ کیا۔

”لیکن یہ شاہ سوار تو ایسے گرے ہیں کہ کوڑے لگنے ہی تڑوا لیے۔“ ”چچ“

”شاہ میری شرارتی آواز اس

”نے تن بدن میں آگ لگا گئی۔

”مہیں کیا تکلیف ہے۔۔۔؟“ اس کے ضبط کا بندھن ٹوٹا۔

”میں نے تو افسوس کے لیے فون کیا ہے اور ایک درخواست بھی دی ہے اپنے ”نو آئی سی“ کو کہ میرے گھر میں

”اتین کی ایک کثیر تعداد جامعہ فیل ہو گئی ہے اس سلسلے میں ایک لعزتی اجلاس میں شرکت کے لیے مجھے تین

دن کی چھٹی دے دی جائے۔ ”دوسری طرف اس کاموڈ خاصا خوشگوار تھا۔  
 ”مٹھ کرے چھٹی کے بجائے تمہیں انڈیا کے بارڈر پر بھجوا دیں۔“ طوطی جل کر بولی۔  
 ”تم اگر ساتھ دینے کا وعدہ کرو تو تین ماہوں سات سمندر پار تیرنا ہوا چلا جاؤں۔“ شاہ میر نے اسے شوخی سے مزید چڑایا۔

”نفع ہو جاؤ تم اپنی منحوس شکل لے کر۔“ اس نے غصے میں فون بند کر دیا۔  
 ”کیا ہوا؟ کیا کہہ رہا تھا؟“ اس نے انجان بن کر پوچھا۔  
 ”ایک خبیث انسان اپنی خباثت ہی دکھا سکتا ہے۔ بائے گاؤ، در شہوار، اتنا کمینہ اگر میرا بھائی ہوتا تو میں پہلی فرصت میں خود کشی کر لیتی۔“ طوطی نے کہیں کا غصہ کہیں اتارا۔  
 ”میں بھی سیوسلی میکی سوچ رہی ہوں، آن رہا ہن لالہ نے اور اب میرا دھیان بہت مایوس کیا ہے مجھے۔“ اس نے اپنی تینھی ناک چڑھا کر طوطی کے ساتھ یک جہتی کا عظیم مظاہرہ کیا۔  
 ”شنا ہے رزلٹ آگیا ہے تم لوگوں کا۔“ اس نے بولوں پر بھیجی جاندار مسکراہٹ ان تینوں کا دل جلا گئی۔  
 ”ہاں آپ کی کسرہ گئی تھی، آپ بھی پوری کر لیں۔“ فیل بھی تو انسان ہی ہوتے ہیں، ایسا کون سا گناہ کر دیا ہے ہم نے جو آپ لوگ ہاتھ منہ دھو کر باجماعت پیچھے پڑ گئے ہیں ہمارے۔“ در شہوار بانو چڑھا کر میدان میں اتر آئی۔  
 ”ارے رے۔ میں نے تو کچھ نہیں کہا۔“ اس نے ایک دم بوکھلا گیا۔  
 ”ارادہ تو یہی لے کر آئے تھے نا۔“ در شہوار نے ناک چڑھا کر کہا تو وہ ہنس پڑا۔  
 ”ارادہ تو میرا یہ تھا کہ دکھی لوگوں کا غم غلط کرنے کے لیے مال روڈ سے جا کر گرما گرم ہاٹ اینڈ سار سوپ پیا جائے۔“ اس نے بات پر ان تینوں نے مشکوک نظروں سے اسے گھورا۔  
 ”کیا ہو گیا ہے، ایک ہینڈ سم بندے کو اتنا گھور کیوں رہی ہو۔“ اس نے مصنوعی پریشانی سے پوچھا۔

”یقین نہیں آ رہا، اتنا رحم دل، فیاض اور کھلے دل کا بندہ میراؤں میں ہی رہتا ہے۔“ در شہوار کی بات پر وہ بے ساختہ مسکرایا۔  
 ”میرا بھائی ہے تو ادھر ہی رہے گا نا میرے ساتھ۔ دیے اللہ کا شکر ہے، میرے بھائی میں دکھی انسانیت کا خاصا جذبہ ہے میری طرح۔“  
 ”نیمروہ نے ہمیشہ کی طرح دوسروں کا کرڈٹ لینے کی کوشش کی جو اسے اچھی خاصی مہنگی پڑی کیونکہ در شہوار کا کٹن اس کا دلچا اچھا خاصا ہلا کر اس کے ٹھکانے پر واپس لا چکا تھا۔

\*\*\*

”بڑی دیر کی مہراں آتے آتے۔“  
 وہاں بڑے معنی خیز انداز میں سیل فون پر بات کرتے ہوئے کچن میں داخل ہوئے۔ برتن دھوتی صندل کا دل بری طرح سے دھڑکا۔ اس نے لاشعوری طور پر اپنا دہنٹا ٹھیک کیا اور بظاہر خود کو مصروف ظاہر کرنے کے لیے پانی کا تل چلا دیا اور جلدی جلد پلٹیں دھونے لگی۔  
 وہ فوراً محل پر گز نہیں آنا چاہتی تھی، لیکن اس کی بھوری تھی کہ اس کے والدین اور باقی بہن بھائی بھی میراؤں کے خاندانی ملازم تھے اور وہاں انکار کی توقع نہ تھی، کوئی نجاش نکلتی ہی نہیں تھی۔  
 ”میں بھی دھو بیڑی رہی تھی، تمہیں یہ نظر ہماری۔“ وہ ہلکا سا گنگناٹے ہوئے فرنچ کھول کر کھڑے ہو گئے، لیکن صندل کو ان کی نظریں اپنے وجود کے آریار اترتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔

کی طبیعت ایک لمحے میں درست کردی، کچھ دیر پہلے کا سارا نشہ اڑ چھو ہو گیا۔  
 ”آپ بے فکر رہیں، کھل ہی چلا جاؤں گا۔“ انہوں نے اپنی طرف سے پھرتی دکھائی۔  
 ”کل نہیں، آج اور ابھی جانا ہو گا۔“

”اوہ اچھا۔ میں۔ ٹکٹ کنفرم کروالوں۔“ انہوں نے وہاں سے کھسکا چاہا۔  
 ”سب کچھ کنفرم ہو چکا ہے، ٹکٹ لکٹ لے کر رابر پورٹ پہنچ جائے گا، کچھ ضروری ڈاکو منٹس بھی ہیں اس کے پاس۔“ انہوں نے سنجیدگی سے مزید کہا۔ ”اور سنو سارے معاملات نبھانا کر آنا، یہاں کوئی آگ نہیں لگی ہوئی، جسے بجھانے کو اگلے ہی دن دوڑے آؤ۔“ واجی کی بات پر صندل کے حلق سے ایک پرسکون سانس خارج ہوئی۔  
 اس نے دل ہی دل میں اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ادا کیا۔

”جی ٹھیک ہے۔“ انہوں نے خفت زدہ انداز میں سر جھکایا۔  
 ”اور تاجدار! تم ذرا آؤ میرے کمرے میں، کچھ ضروری بات کرنی ہے۔“ انہوں نے تاجدار بیگم کی طرف دیکھ کر سنجیدگی سے کہا۔

”کیوں نہیں باباجان۔“ انہوں نے فوراً تاجدار کی کامظاہرہ کیا اور ان کے پیچھے چل پڑیں۔  
 میر وہاں بے مزکر صندل کی طرف دیکھا، جو اس وقت خاصی پرسکون انداز میں کھڑی تھی، وہاں کے اس طرح گھورنے پر وہ پوہلا کر واش ٹین میں بڑے برتن دھونے لگی۔  
 ”ذرا آکر بیٹنگ کرو، باقی کام بعد میں کر لیتا۔“ ان کے اگلے حکم پر صندل کی روح فنا ہوئی۔  
 ”جی اچھا۔“ وہ دل ہی دل میں بل تو جلال تو بڑھتی ہوئی ان کے بند روم میں داخل ہوئی، سامنے فارحہ بھابھی کو دیکھ کر اس نے شکر کا کلمہ پڑھا اور جلدی سے میر وہاں کی الماری سے کپڑے نکال کر اپنی جگہ رکھنے لگی۔



”تم بڑی بھابھی ہو اس کی۔ سمجھاؤ بے وقوف کو، دو دو جوان بیٹیوں کا باپ ہے وہ۔“  
 میر حاکم علی کے منہ سے نکلنے والے اس فقرے کو سن کر تاجدار بیگم پر گھڑوں پانی پڑ گیا۔ ان کے تو گمان کی آخری سرحدوں پر بھی نہیں تھا کہ وہ ان سے کیا بات کرنے کے لیے اپنے کمرے میں بلا کر لائے ہیں۔  
 نور محل کا سب سے بہترین کمرہ ان کی رہائش گاہ کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ شاہ بلوط کی لکڑی کا بھاری فرنیچر، ایرانی قالین، دیواروں پر خوب صورت پینٹنگز اور چھت پر لگا قیمتی فانوس ان کے کمرے کی خوب صورتی میں اضافہ کر رہا تھا۔

اس وقت وہ آج کا تازہ اخبار پکڑے بھاری بھر کم صوفے پر بیٹھے تھے، جب کہ تاجدار بیگم ان کے سامنے والے سنگل صوفے پر سر جھکائے بیٹھی تھیں۔ وہ میر حاکم کی سنگی جھنجھکی تھیں اسی لیے سب سے زیادہ ان کے قریب بھی تھیں۔

”باباجان! آپ کیوں ٹینشن لے رہے ہیں؟“ وہ تھوڑا سا جھجک کر بولیں۔  
 ”تنگ آگیا ہوں میں اس کے آئے دن کے اسکیڈنڈر سے، بندہ اپنی عمر اور جوان اولاد کا ہی لحاظ کرتا ہے، گھر میں دو دو بیویاں ہیں اس کی۔“ ان کی پیشانی کی لکیں گہریں گہری ہوئیں۔

”ہاں خاقان کو سوچنا چاہیے اس بات پر، ساری زندگی یہی طور طریقے تو نہیں رہ سکتے۔“ انہوں نے محتاط انداز میں جواب دیا۔

”اس کے سوچنے سمجھنے والی حس تو عورتوں کے معاملے میں اگر ختم ہو جاتی ہے، ایسی بھی کیا شوقین مزاجی، بندہ

باہنا نہ ان کی عزت اور وقار کو ہی داؤ پر لگا دے۔“ وہ غصے میں آکر شلنے لگے۔  
 ”نہیں اس لیے کہا ہے کہ تمہاری بات پھر بھی سنتا ہے اور تھوڑی بے تکلفی بھی ہے، تم بڑی بھابھی اور ماں انا۔“ وہ ان میں اس لیے بات نہیں کرنا چاہتا کہ ہمارے درمیان جو لحاظ کا پردہ ہے، وہ سلامت رہے۔“ انہوں نے اندر سے تنگ انداز سے اپنی بات کی وضاحت کی۔

”جی باباجان! میں کو شش کروں گی اس سے بات کرنے کی۔“ تاجدار نے انہیں تسلی دینے کی ناکام کوشش کی۔  
 ”لو شش نہیں کرنی، سمجھانا ہے اس بے وقوف کو، تھوڑا عقل سے کام لے، اب دیکھو ذرا، یہ اخبار بھر رہا ہے اس کی رنکین داستان سے، استغفر اللہ! اب یہ وقت بھی آتا تھا کہ میر حاکم کا بیٹا، ایک ٹھوڑا کلاس گلوکارہ کی زلفوں کا ایر ہو جائے۔“ ان کا چہرہ غصے کی زیادتی سے سرخ ہوا۔

”واقعہ یہ تو بڑی غلط بات ہے۔“ تاجدار بیگم اپنے سر کی نبض شناس تھیں اور ان کا موڈ دیکھ کر ہی بات لگتی تھیں۔

”اور اس سے کہو انا بیہ کی رخصتی کا کچھ سوچے اور تم بھی بات کرو بہان سے، گیا ٹھان کر بیٹھا ہے وہ دل میں؟“  
 وہ اپنے مخصوص دو ٹوک انداز میں گویا ہوئے۔

”بہان ابھی دو سال کی مہلت مانگ رہا ہے۔“ انہوں نے ہلکا سا جھجک کر کہا۔  
 ”دو سال بعد کون سے سینک آگ آئیں گے اس کے سر پر؟“ ”نت“ بھی تو شادی کرنی ہے تو ”اب“ کیوں نہیں؟“ وہ ایک دفعہ پھر شلنے لگے، تاجدار بیگم نے دیکھا، اس بدھاپے میں بھی ان کی چال میں خاصی مضبوطی تھی۔

”آپ پریشان نہ ہوں، میں بات کروں گی بہان سے۔“ انہوں نے ہلکا سا جھجک کر کہا۔  
 انا تو وہ جی جانتی تھیں کہ بہان کو سمجھانا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ وہ اندر ہٹ دھرمی میں بالکل اپنے واجی پر تھا۔ تب ہی تو دونوں کی آپس میں نہیں بنتی تھی۔ اسی وقت میر حاکم کے میل فون پر کال آئی۔

”تم جاؤ، اس ٹایم پر پھر بات کریں گے۔“ ان کے اگلے حکم پر تاجدار بیگم نے سکون کا سانس لیا، ورنہ آج تو سر جی کے تئو ران کے جی ہاتھ پیر پھلا رہے تھے۔ وہ جلدی سے ان کے کمرے سے باہر نکل آئیں۔



نینا باؤس پر لگتا تھا کسی آسیب کا سایہ ہو گیا تھا۔  
 نینا اس گھر کے کینوں سے روٹھ گئی تھی اور دو ہیام پر وحشت میں جھلا کر دینے والے سائے کا راج تھا۔  
 رات کا نہ جانے کون سا پر تھا۔ شہزاد کو شیش بدل بدل کر تھک گئی تھی، لیکن نینا آنے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی۔

شیش محمود کے بیٹے کی اس اچانک موت نے دونوں گھروں کی بنیادوں کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ روحیل کا خاندان ان صورت بھی انہیں بخشنے کو تیار نہیں تھا۔ آنے والے لمحوں کا خوف کسی آکاس تیل کی طرح سب کو بکڑنے لے لیا تھا۔

میراؤ سنلتی ہوئی لاؤنج کی طرف نکل آئی، کاؤچ پر نیم دراز نینا بیگم کسی سے فون بات کر رہی تھیں۔ ان کے ہاتھ پر پہلی پریشانی کو اس نے دور ہی سے بھانپ لیا تھا۔ وہ جلدی سے میز چھوٹا کر گریپے آئی، نینا بیگم نے اسے دیکھ کر لون بند کر دیا۔

”کیا ہوا مام؟“ شہزاد کو ان کی آنکھیں گیلی ہوتی محسوس ہوئیں۔  
 ”محمود احمد تو رخی شیر کی طرح پورے شہر میں دندنا مام پھر رہا ہے اور کسی کی بات سننے کو تیار نہیں۔“  
 ”ظاہر ہے مام، ان کے بنگ بیٹے کی اچانک دھمکے ہوئی ہے اور یہ بڑا بچہ ل ساری انکشن ہے۔“ شہزاد خاصی حقیقت پسند تھی، اپنی رائے کا اظہار وہ بڑے مضبوط اور ہموار انداز میں کرتی تھی۔  
 ”میں مانتی ہوں، لیکن یہ ایک حادثہ تھا اور وہ یہ بات ماننے کو تیار ہی نہیں۔“ انہوں نے اسی بگڑے بگڑے انداز میں کہا۔

”ہمیں کورٹ میں یہ بات ثابت کرنا ہوگی۔“ وہ سنجیدگی سے گویا ہوئی۔  
 ”اس بے وقوف لڑکی نے تو اچھی خاصی آزمائش میں ڈال دیا ہے۔“ نینا بیگم ٹھیک ٹھاک آزرہ تھیں۔  
 ”ہمیں کٹزہ کے فادر سے بات کرنی چاہیے۔“ شہزاد نے محتاط انداز میں کہا۔  
 ”تمہارا کیا خیال ہے، وہ ہماری بات سننے کا کسی کی کمینگی کی وجہ سے سارا الزام میری بیٹی پر آ رہا ہے، ایک نمبر کا خبیث انسان ہے وہ۔“ انہوں نے غصے میں ایک گھٹیا قسم کی گالی دی۔  
 ”ہمیں کنوئیں کرنا چاہیے انہیں، اس طرح تو رومی بری طرح سے پھنس جائے گی۔“ شہزاد کی بات پر وہ تلخ انداز میں مسکرائیں۔

”تمہارا کیا خیال ہے، وہ لو کا پٹھان مان جائے گا جبکہ اسے پتا بھی ہے کہ گاڑی اسی کی بیٹی ڈرائیو کر رہی تھی۔“  
 ”لیکن وہ اتنا بڑا کیسے جھوٹ بول سکتے ہیں؟“ وہ تنگ کر گویا ہوئی۔  
 ”جھوٹ بولنے کے لیے کون سا لہجہ جوتے بڑے ہیں، اس نے تو پولیس کی نفی تک کو چند گھنٹوں میں اپنے ساتھ ملا لیا ہے۔ پتا نہیں کیا بنے گا اس کیس کا پتہ پوچھو تو مجھے سخت ٹینشن ہو رہی ہے۔“ شہزاد کو ان سے بے تحاشا ہمدردی محسوس ہوئی۔ اسے پہلی دفعہ احساس ہوا، وہ رومبھد کے معاملے میں کتنی فکر مند تھیں۔  
 ”آپ نے کسی سے بات کی؟“ شہزاد چاہتے ہوئے بھی سیف الرحمن کا نام اپنے لبوں پر نہیں لاسکی۔  
 ”ہاں۔“ انہوں نے ہٹکے ہٹکے انداز سے اپنے بالوں کا گول مول سا جوڑا بنایا۔

”پھر؟“ شہزاد نے سوالیہ نگاہوں سے ان کی طرف دیکھا۔  
 ”لیکن جسٹس محمود کے ہاتھ بھی چھوٹے نہیں ہیں۔ مجھے تو ڈر ہے رومی کی ضمانت بھی کینسل نہ ہو جائے۔“  
 ”بی ریلیکس۔۔۔ ان شاء اللہ ایسا نہیں ہوگا، آپ جا میں اور تھوڑا رستہ کریں، اس معاملے کو صبح سمجھتے ہیں۔“  
 شہزاد نے نرمی سے ماں کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر دلاسا دیا، وہ بھی شاید ذہنی طور پر بری طرح سے تھک چکی تھیں۔  
 اس لیے اس کی بات مان کر اسے کمرے کی طرف چلی گئیں۔

کچھ دیر وہ پوکی لاؤنج میں ٹپٹکی رہی۔ اس کے اپنے اعصاب بری طرح تھک چکے تھے۔ وہ اس کیس کے تمام پہلوؤں پر غور و فکر کر چکی تھی۔ کیس سے بھی نکلنے کا کوئی راستہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ کاؤچ پر لیٹ گئی، داغ میں لاتنا ہی سوچوں کا ہجوم تھا۔  
 اچانک سیل فون کی گھنٹی کے ساتھ ہی اس کا دل بھی بے ہنگم انداز میں دھڑکا۔ ”ہم زاد“ کا النگ کے الفاظ کم از کم اس وقت بڑے نہیں لگتے تھے اسے۔

”کیسی ہیں آپ؟“ وہ اپنے مخصوص بھاری مگر انانیت سے بھرپور لہجے میں اس سے پوچھ رہا تھا۔  
 ”ٹھیک ہوں۔“ اس نے ایک لمبا سانس بھینچ کر کہا۔  
 ”آپ کو اگر پتا چل جائے کہ آپ جھوٹ بولتے ہوئے کتنی ہونٹ لگتی ہیں، تو یقین مانیں، آپ زندگی میں کبھی

”اے!۔۔۔ اس کے ملکہ بھلکے انداز پر شہزاد کے ہونٹوں پر ایک ہمسم سی مسکراہٹ ابھری۔  
 ”ہاں، آئندہ کوشش کروں گی کہ ایسا نہ کروں۔“ اس نے بھی فوراً ہی ہتھیار ڈال دیے، ویسے بھی وہ اس بات سے لڑنے کے موڈ میں نہیں تھی۔  
 ”اس گاڑی والے کو فکر تو بہت زور سے ماری تھی آپ نے؟“ اس کی اگلی بات پر شہزاد کو کرٹ لگا اور وہ فوراً

”آپ کی گاڑی تھی کیا وہ؟“  
 ”اماری ایسی خوش قسمتی کہاں۔“ وہ اپنے مخصوص انداز میں ہنسا۔  
 ”اس کا مطلب ہے کہ آپ بھی وہیں کیس آس پاس تھے؟“ اس نے فوراً ”اندازہ لگایا۔  
 ”ہم زاد تو پیشہ انسان کے ساتھ ہوتا ہے۔“ اس کا معنی خیر انداز شہزاد کو ہلکی سی کوفت میں جتلا کر گیا۔ ”آپ اس بات کو کبھی فارغ ہو کر ڈسکس کریں گے، یہ بتائیں رومبھد والے پر ایلم کا کیا بنا؟“ اس کی اگلی بات پر

”ہم شاک لگا۔“  
 ”آپ کو کس نے بتایا؟“ اس کے منہ سے پھسلا۔  
 ”آپ نے شاید بیوی نہیں دیکھا، جسٹس محمود کی فیملی سارے چینل پر یہی تو روتا رو رہی ہے۔“ اس کی اطلاع شہزاد کو دہلا گئی۔

”ایا کہہ رہے تھے وہ لوگ؟“ اس نے ہلکا سا جھجک کر پوچھا۔  
 ”ایا، دنیا جہاں کے کرپٹ بیٹے کی موت کو کیش کروانے کے علاوہ اور کیا کر سکتے ہیں وہ۔“ ہم زاد کے منہ سے  
 ”اے! الی اگلی بات پر وہ بری طرح جوئی۔  
 ”آپ جانتے ہیں رومبھد کو؟“

”کون نہیں جانتا؟“ وہ طنزیہ انداز میں گویا ہوا۔  
 ”بہت نہنگیو رہو پویشن تھی اس کی اپنے سوشل سرکل میں، ایک نمبر کا ڈر کر جوئے باز، فلرٹ اور اپنے باپ  
 لے سورسز کا منفی استعمال کرتا تھا، ساری دنیا جانتی ہے یہ بات۔“ وہ شہزاد کی معلومات میں اضافہ کرتے ہوئے  
 اسے مزید پریشان کر گیا۔

”لیکن رومی نے اس کا مرڈر نہیں کیا، وہ ایک حادثاتی موت تھی۔“ اس نے ہلکا سا جھجک کر اپنی بہن کی صفائی

”ای۔“  
 ”میں جانتا ہوں۔“ اس کے منہ سے نکلنے والے یہ الفاظ شہزاد کے اندر توانائی کا ایک جہان بھر گئے۔  
 ”ایان دنیا نہیں جانتی۔“ وہ مایوسی سے گویا ہوئی۔  
 ”تو یہ ثابت کرنا تو آپ کے باپ ہاتھ کا کام ہونا چاہیے، رومبھد سہل، غیر شر شہزاد کی چھوٹی بہن ہے، کسی  
 ما۔۔۔ لی کی نہیں۔“ وہ اسے شدید دینے والے انداز میں بولا تھا۔  
 ”مطلب؟“ وہ سمجھ تو گئی تھی، لیکن پھر بھی انجان بن گئی۔

”آپ یس تو آپ کے کیریئر کا اشارت ہے، آجائیں میدان میں بہت سی چیزیں مل جائیں گی۔“ وہ اسے ایک نئی راہ ہمارا تھا۔  
 ”ایان میں نے ابھی لائنس کے لیے اپلائی نہیں کیا۔“



”کیا مشکل ہے؟ اپنے ڈاکو منتس اسکین کر کے بھیجیں مجھے ایک ہفتے میں مل جائے گا۔“ وہ ہنسا۔  
”لیکن اس کا تو ایک باقاعدہ پروسیمجو ہوتا ہے ایک مہینے کا نام لگتا ہے شاید؟“

”جب پاکستان میں ایک بندہ اپنے سوز استعمال کر کے ایک اہم کیس میں سے اپنی بیٹی کا نام نکلوا سکتا ہے تو شہزاد سسٹل اپنا ایک لائسنس کیوں نہیں بنوا سکتی جبکہ اس سے کسی کو کوئی نقصان بھی نہیں پہنچے گا۔“ شہزاد کو پہلی دفعہ اندازہ ہوا کہ اس کی معلومات بالکل سچی اور ہو چورک مکمل تھا۔

”ٹھیک کہہ رہے ہیں آپ۔ صبح سے بات کر دی گئی۔“ وہ کافی حد تک متفق ہو گئی تھی۔

”میری آفر صبح تک برقرار ہے۔“ وہ خوش دلی سے مسکرایا۔

”پہلے اپنے سیل فون سے بات کرنے کا حوصلہ تو پیدا کر لیں، پھر آفرز بھی دے دیجئے گا۔“ شہزاد کے اس طنز پر وہ ہنسا۔

”اگر اپنے نمبر سے بات کرنے سے آپ کو خوشی ہو سکتی ہے تو نمکسٹ کال اسی سے کر لیں گے۔“

”اس کا مطلب ہے نمکسٹ کال کبھی نہیں آئے گی۔“ شہزاد کے جوابی حملے پر اس کے حلق سے نکلنے والا قہقہہ بوجا جان وار تھا۔

”ہم زانیہ سب کچھ ہو سکتا ہے، لیکن بزنس نہیں۔“ وہ بڑے مزے سے بولا۔

”چلیں اگلی کال بتا دے گی۔“ شہزاد نے مسکراتے ہوئے فون بند کر دیا وہ اسے جوئی امید دلا چکا تھا اسے آج رات اس پر تفصیل سے سوچنا تھا۔ کم از کم اسے یہ مشورہ خاصا معقول اور مناسب لگا تھا۔

\*\*\*

”ہادی یار! اچھا نہیں کیا تم نے اس گینگ کے ساتھ۔“

سعد رات کے اس وقت محمد ہادی کے ساتھ مال روڈ پر مشرقت کر رہا تھا دونوں کے ہاتھوں میں کشمیری چائے کے ڈسپوزیبل کپ تھے ہادی اسے اپنی صبح کی کارروائی بتا چکا تھا جو سعد کو بالکل اچھی نہیں لگی تھی۔

”تمہیں کس چیز کا غم ستا رہا ہے؟“ ہادی نے بلکے ہلکے انداز میں اسے چھیڑا۔

”اچھی خاصی زندگی، رٹکین، بنی ہوئی تھی۔ نسوانی ہنسی کی آوازیں، جیسے کیساؤں میں گھینٹاں بج رہی ہوں۔“

دل کو چھو لینے والی شرارتیں جس سے کم از کم مجھے تو زندگی حسین لگنے لگی تھی۔“ سعد چلتے چلتے رکا اور ٹھنڈی آہ بھر کر بولا۔

”تو تمہارا کیا خیال ہے؟ اتنی سی شکایت پر باز آجائیں گی وہ؟“ ہادی استہزائیہ انداز میں گویا ہوا۔

”تم نہیں جانتے ہو میراؤس کے موٹے گھٹوس ہیں سوائے اسل کو چھوڑ کر اس میں پھر بھی کچھ انسانیت نظر آتی ہے مجھے۔“ سعد کی معلومات پر اسے حیرانی ہوئی۔

”تم نے تو لگتا ہے میراؤس کے مردوں پر مقالہ لکھ رکھا ہے۔“ ہادی ایک دفعہ پھر چلنے لگا، مال روڈ پر رات کے اس وقت بھی خاصا رشت تھا باری کیو، اس کیم کمانی اور فریج فراز کی دوکانوں پر لوگوں کا ایک ہجوم تھا۔

”تمہاری اس شکایت پر ان بے چاروں پر اچھا خاصا ”بین“ لگ گیا ہو گا اور کیا پتا گھر میں نظر بندی کے احکامات بھی آگئے ہوں، ابھی تو شام میں اتنی دیرانی تھی لان میں۔“ سعد نے منہ بنا کر چائے کا خالی کپ ڈسٹ بن میں ڈالا۔

”مبارک ہو! ایسا کچھ نہیں ہوا۔“ ہادی کی طنز پر مسکراہٹ پر اس نے الجھ کر اس کی طرف دیکھا۔

”تینوں محترماں، ایک جلوس کی شکل میں آ رہی ہیں سامنے سے۔ یہ شکلیں تمہیں لگتی ہیں گھر میں تک کر والی۔“ ہادی کی بات پر اس نے بے تابی سے سامنے دیکھا، وہ واقعی اسل کے ساتھ ہستی مسکرائی اور وہی آ رہی تھیں۔ ہاتھوں میں بڑے بڑے اسل کریم کے کپ پکڑ رکھے تھے اسل کی بھی ان پر نظر پڑ گئی تھی اور اس نے سعد کو دیکھ کر خوش دلی سے ہاتھ ملایا۔

”ایسے ہو سعد؟“ اسل نے آگے بڑھ کر بڑی گرم جوشی سے ہاتھ ملایا تھا، جبکہ ان تینوں کے چہروں پر بڑی واضح بے زاری پھیلی تھی۔

”فائن آج کل نظر نہیں آرہے جو گنگ پر؟“ سعد ایک دم باجھیں پھیلا کر بولا۔ اسل کا والمانہ انداز اسے تانے کے لیے کافی تھا کہ ہادی کی شکایت کے اثرات اس تک نہیں پہنچے۔

”آج کل انگریز امنیہ وجہ سے اسلام آباد والے گھر میں ہوں۔“ اس نے مسکرا کر وضاحت کی۔

”اس سے ملو یہ میرا ہیوسٹ فرینڈ ہے ہادی فارسٹ آفیسر کے طور پر جو اننگس دی ہے اس نے میرے ہی آفس میں“ سعد نے جھٹ سے تعارف کی رسم بھائی اسل بڑی خوش دلی سے ہادی سے ملا تھا۔

”تم لوگ چلو میں آ رہا ہوں۔“ اس نے پیچھے مڑ کر ایک طرف پر کھڑی در شوار، طوطی اور نیرو سے کہا جو اس کی بات مان کر فوراً ہی چل پڑی تھیں، لیکن جاتے جاتے در شوار، ہادی کو گھورتا نہیں بھولی تھی۔

”آئیں نا، لہیں بیٹھ کر کافی پیتے ہیں۔“ اسل نے آفر کی۔

”میرا خیال ہے یہ مناسب نہیں ہے، آپ خواتین کو چھوڑ آئیں گھر پھر کسی دن بیٹھتے ہیں کہیں۔“ ہادی کا تذبذب انداز اسل کو اچھا لگا تھا تب ہی نووہ جلدی سے انتہائی کلمات کہہ کر ان تینوں کے پیچھے چل پڑا۔

”تمہیں کیا تکلیف تھی۔ بیٹھنے دیتے، بندے کے تعلقات بدھتے ہیں۔“ اس کے جاتے ہی سعد اس پر برس ڈالا۔

”یار! اچھا تھوڑی لگتا ہے رات کے اس وقت خواتین اکیلی جائیں اپنے گھر۔“ ہادی کی بات پر سعد نے ہلکوں نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

”وہیے تم ان کی شرارتوں پر شکایتیں لگانے پہنچ جاتے ہو اب بڑی پریشانی ہو رہی ہے تمہیں۔“

”وہ الگ بات ہے، لیکن یوں آدھی رات کو گھر کی عورتوں کو اکیلے بھینچا کہاں کی عقل مندی ہے۔ کم از کم میں تو ایسا نہیں کر سکتا، تمہارے بارے میں کچھ کہہ نہیں سکتا۔“ وہ بے نیازی سے اسے چھیڑتا ہوا آگے بڑھ گیا۔

”بہت ہی عجیب انسان ہو تم“ سعد تیز تیز چلا اس کے برابر آن پہنچا۔

”کہہ سکتے ہو۔“ اس نے لاپرواہی سے کندھے اچکائے۔

”بھی محبت کی ہے کسی سے؟“ سعد نے سر دی کی شدت کو کم کرنے کے لیے ہاتھ رگڑے۔ ہادی چلتے چلتے رکا اور حیرانی سے اسے یوں دیکھا جیسے اس کے خرابی نامع کا لیٹھن آ گیا ہو۔

”نہیں“ اس نے نظریں چرا کر جواب دیا اور تیز تیز چلنے لگا جیسے اس موضوع پر مزید بات نہ کرنا چاہتا ہو۔

وہ دونوں مال روڈ کی خاک چھان کر دو گئے بعد گھر پہنچے تو رات کا ڈیڑھ بج رہا تھا۔ انہوں نے جیسے ہی داخلی دروازے کو کھولنے کے لیے ہاتھ بڑھایا سامنے لگا پرچا اس کا منہ چڑا رہا تھا۔

”یہ کیا ہے؟“ سعد نے حیرانی سے ہادی کی طرف دیکھا جو آگے بڑھ کر اس پر کبھی تحریر پڑھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

”شاید کوئی حدیث ہے۔“ ہادی نے کاغذ پر نظریں دوڑائیں۔

”کیسی حدت ہے؟“ سعد حیران ہوا۔  
 ”رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ چغل خور جنت میں داخل نہیں ہوگا۔“ (بخاری، مسلم) اس نے  
 مسکراتے ہوئے بلند آواز میں پڑھتے ہوئے وہ پر چار دروازے سے اتارا جو کہ ٹیپ سے چپکایا گیا تھا۔  
 ”اس کا مطلب؟“ سعد نے الجھن بھرے انداز میں اس کی طرف دیکھا وہ بات سمجھنے سے قاصر تھا۔  
 ”مطلب یہ ہے کہ شکایت لگانا بھی چغل خوری کے زمرے میں آتا ہے۔“ ہادی کی وضاحت پر سعد کو ساری  
 بات سمجھ میں آئی وہ قہقہہ لگا کر ہنسا۔  
 ”میں نے کہا تھا نایہ گینگ کبھی باز نہیں آئے گا۔“ ہادی منہ بناتے ہوئے لاؤنچ میں داخل ہوا۔  
 ”ویسے کہا تو بالکل ٹھیک ہے ان بے چاریوں نے چغل خور جنت میں نہیں جانے گا۔“ سعد نے جھٹ سے  
 ان کی طرف داری کی۔

”کنی یہ بے چاریاں ایسا سبق سکھائیں گی تمہیں لگ پتا جائے گا۔“ ہادی کے منہ بنانے پر وہ مسکرایا۔  
 ”اچھا اب اپنا دل مت جلاؤ، جا کر سو جاؤ، پہلے ہی رات بہت ہو گئی ہے، شب بخیر۔“ سعد مسکراتے ہوئے  
 اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

\*\*\*

انابیہ کی زندگی عجیب دورا ہے پر آن کھڑی ہوئی تھی۔  
 اسے اپنی زندگی میں دو مردوں سے بے تحاشا محبت تھی اور اس کی بد قسمتی تھی کہ اسے دونوں کی ہی چاہت اور  
 توجہ حاصل نہیں ہو پائی، پہلا مرد اس کا باپ میر خاقان علی، جنہوں نے ساری زندگی اپنی پہلی بیوی اور دونوں بیٹیوں  
 کو اپنی توجہ کے قابل نہیں سمجھا، ان کی بوسہ کبھی نہ دیا، ہمیشہ گھر سے باہر رہی تھیں، ندرت بیگم سے دوسری شادی کرنے  
 کے بعد بھی ان کے مزاج میں کوئی خاص تبدیلی نہیں آئی۔  
 دوسرا شخص اس کا نایا زاد کنز بہان، محترم تھا، جس کی محبت اس کے ساتھ ہی پل کر جوان ہوئی تھی، لیکن اسے  
 بہان کی طرف سے ہمیشہ بے رخی کا تحفہ ہی ملا تھا۔ اس کی بے تحاشا چاہت بھی بہان کو اپنی طرف متوجہ نہیں  
 کر سکی۔

”شاید تمہیں اس بات کا احساس ہی نہیں، کوئی چوبیس گھنٹوں میں چوبیس ہزار دفعہ تمہارا نام محبت کی تسبیح  
 کے دانوں پر پڑھتا ہے، تمہاری ایک نظر اس کے اندر سرشاری کا ایک جہان بھر دیتی ہے، اس کی آنکھوں میں  
 امیدوں کے جگنوؤں کے قافلے آن کر بیٹھ جاتے ہیں۔ تمہاری بے رخی میں لپٹی ایک نظر کسی کو ان دیکھی دلیل  
 میں دھنسا کر اس کی زندگی کو بد صورت بنا دیتی ہے۔ محبت کے سفر میں اکیلا ہونے کا احساس دنیا  
 کے ہر احساس سے زیادہ جان لیوا ہوتا ہے، لیکن شاید تم اس بات کو کبھی نہ جان سکو۔“ انابیہ نے ایک لمبا سانس  
 بھر کر اپنی ڈائری بند کر دی۔

محبت کے سفر میں یہ ڈائری اس کی بہترین دوست تھی، جس کے سینے میں اس کی ساری خوشیاں اور دکھ سموئے  
 ہوئے تھے۔ وہ بڑی اعلا ظرفی کے ساتھ اس کے سارے کمزور محلوں میں بیان کی گئی سچائیوں کو اپنے اندر دفن کیے  
 ہوئے تھی۔

”بھائی کو بلو کلر بہت اچھا لگتا ہے۔“ در شہوار کے منہ سے نکلنے والے اس جملے کے بعد انابیہ کی الماری نیلے  
 رنگ سے بھر گئی تھی۔

”خدا کا خوف کرو، یا، کبھی کبھی تو تمہیں دیکھ کر میرا دل کرتا ہے ایک گانا زور زور سے گاؤں۔“ ایک دن طوبی

نس سے الماری بند کر کے اس کے بالکل عین سامنے آن کھڑی ہوئی۔

”کون سا؟“ اس نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

”میں نیل کرائیاں نیل کھال، میرا تن من نیلو نیل۔“ طوبی کے ایک دم جل کر بولنے پر وہ بے ساختہ قہقہہ لگا کر  
 ہنسی لگتی۔

”جب تمہیں محبت ہوگی تو پھر پوچھوں گی۔“ اس نے ہاتھ میں پکڑی ”عشق کا عین“ بند کرتے ہوئے اسے  
 پیٹھا۔

”اللہ بچائے ایسی محبت سے۔“ اس نے شرارت سے کانوں کو ہاتھ لگایا، جلدی سے انابیہ کا سوٹ نکالا اور واش  
 روم کی طرف بڑھی۔

”یہ میرا سوٹ کس خوشی میں پہن رہی ہو۔“ اس نے منہ بنا کر پوچھا۔

”ویسے ہی۔۔۔ میرا بھی دل کر رہا تھا آج نیلو نیل ہوئے کو۔“ وہ شرارتی انداز میں گویا ہوئی۔

انابیہ ماضی کی خوش گوار یادوں کو جھٹک کر کھڑی ہوئی۔ رات کا ڈیڑھ بج رہا تھا اور طوبی میسر کی کتاب منہ پر  
 رکھے گہری نیند سوئی ہوئی تھی، کمپارٹ آنے کے بعد وہ اور در شہوار اکثر ہی رات لگانے میں مگن نظر آتی تھیں۔

انابیہ کو اچانک یاد آیا، دوپہر میں اس کی ایک سہیلی نے بڑے محتاط انداز میں اسے آج کا اخبار دیکھنے کی تلقین کی  
 تھی۔ اس خیال کے آتے ہی وہ بے چین ہو گئی اور دے قدموں کے ساتھ میز پر حیاں اتر کر ہال کمرے میں آ گئی۔

سامنے لکڑی کے بنے ریک میں صبح کے اخبارات ایک ترتیب سے رکھے ہوئے تھے۔ اس نے ایک اخبار بڑی  
 احتیاط سے نکالا اور صوفے پر بیٹھ گئی۔

سامنے کے صفحات میں اسے کوئی خاص خبر نظر نہیں آئی تھی، اس نے درمیان کے صفحات پر سرسری نگاہ ڈال  
 کر جیسے ہی اسے پلٹا۔ اس کا دل دھک سے رہ گیا۔ آنکھوں کے گرد جالا سا بن گیا۔ پتھرائی ہوئی آنکھوں سے وہ اس

خبر کو بڑھنے لگی۔  
 ”کیوں کرتے ہیں آپ ایسا؟“ انابیہ آنسوؤں سے لبریز آنکھوں کے ساتھ اس اخبار میں چھپنے والی اپنے والد میر  
 خاقان علی کی تصویر کو دیکھنے لگی، جس میں وہ بڑے بے تکلفانہ انداز سے ایک ابھرتی ہوئی گلوکارہ کے ساتھ کسی  
 فنکشن میں بیٹھے تھے۔

وہ بہت سالوں سے ان کی اس قسم کی دلچسپیوں کے بارے میں سنتی آرہی تھی، لیکن اس کے باوجود اسے ہر دفعہ  
 پہلے سے بڑھ کر ہی تکلیف ہوتی۔ میر خاقان علی حکومت میں ہوں یا نہ ہوں، لیکن ان کی چھوٹی سے چھوٹی خبر بھی

میڈیا میں خاصی اہم سمجھی کی جاتی تھی۔ انہیں خبروں میں رہنے کا فن آتا تھا۔ اس عمر میں بھی ڈشنگ پرسنائی  
 کے حامل تھے۔ باقاعدگی سے جم جانے، ایکسرسائز کرنے کی وجہ سے وہ اپنی عمر سے کئی سال چھوٹے ہی لگتے۔ انہیں

اچھا پسینہ کا جنون تھا، ان کی الماری برینڈڈ کپڑوں سے بھری ہوئی تھی۔  
 دراز قدرے متناسب جسم اور کپڑوں پر ہلکی ہلکی سفیدی کے ساتھ ساتھ ان کے بولنے کا انداز اتنا دلکش تھا کہ کوئی

بھی ان سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔

اخبار کی اس خبر میں میر خاقان کے سابقہ اسکینڈلز کو بھی کافی اچھلا گیا تھا۔ انابیہ کا دل دکھ کے گہرے احساس  
 سے بھر گیا۔ اسے پہلے دفعہ اپنی والدہ شارقہ بیگم اور ندرت امی کی لاعلمی پر رشک آیا۔ وہ دونوں ہی زیادہ ملنے جلنے

والی نہیں تھیں اور سونے سے سہاگہ انہیں بیوی اور اخبارات سے بھی کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی۔ اسی وجہ سے یہ  
 خبر ابھی تک ان تک نہیں پہنچی تھی۔

”میری، ہم عمر تو ہوگی یہ لڑکی۔“ انابیہ دل ہی دل میں اس گلوکارہ کی عمر کا تعین کرنے میں مگن تھی، اسے پتا ہی

نہیں چلا، کب دروازہ کھول کر بہانہ اندر داخل ہوئے اور انہوں نے اپنا لپ ٹاپ کا بیگ میز پر رکھتے ہوئے دیوار کی گڑھی پر ٹانگ دکھا۔

”یہ نیوز پیپر پڑھنے کا کون سا ٹائم ہے؟“ ان کے طنزیہ انداز پر وہ بوکھلا کر کھڑی ہوئی اور گود میں رکھا اخبار اچھل کر بہانہ کے قدموں میں جا کر۔ بہانہ کی نظر میر خاقان کی تصویر پر پڑی اور انہوں نے فوراً ”جگت بھرے انداز میں اخبار اٹھایا۔“

”ویسے ہی دیکھ رہی تھی۔“ انابیہ نے بڑی مہارت سے اپنے آنسو اندر دھکیلے۔

بہانہ نے تاسف بھرے انداز میں اس خبر کو پڑھتے ہوئے دوسری نظر انابیہ پر ڈالی وہ سر جھکائے اپنے جوتے کی نوک سے قالین کو رگڑتے ہوئے انہیں ذہنی طور پر بہت مضطرب لگی اور یہ بالکل فطری بات تھی۔ کسی بھی بیٹی کے لیے اپنے والد کے رنگین معاشقے کی خبر کو ہضم کرنا اتنا آسان نہیں تھا۔

”جن چیزوں کو ہم بدل نہیں سکتے“ ان کے ساتھ سمجھو تاکر نے میں ہی عافیت ہوتی ہے۔“ انہوں نے ہاتھ میں پکڑا اخبار میز پر رکھتے ہوئے قدرے نرمی سے کہا ”انابیہ کو جھٹکا لگا، وہ ان سے اس انداز کی توقع دراکم ہی رکھتی تھی۔“

اس نے سر اٹھا کر ان کی طرف دیکھا، وہ ہمدردانہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔ انابیہ کے دل کی دھڑکنیں بے ربط ہوئیں۔ اپنے والد کے حوالے سے چپخنے والی آدمی تکلیف تو بہانہ کے نرم لہجے سے ہی کم کر دی تھی۔

”سمجھو تاکر نے کے لیے بھی تو ہمارا جتنا حوصلہ چاہا ہے۔“ اس کے منہ سے بلا ارادہ ہی پھسلا۔

”میرا نہیں خیال، پہاڑوں پر رہنے والی کوئی لڑکی کم ہمت یا کم حوصلہ ہو سکتی ہے۔“ ان کی اگلی بات نے انابیہ کو ایک دم ہی آسان پر پہنچایا۔

”میں اتنی بھی ہمدرد نہیں ہوں، جتنا آپ سمجھتے ہیں۔“ ان کی اپنے اوپر جمی نظروں کی تاب نہ لا کر اس نے سر جھکا لیا اور محبوب کے سامنے سر جھکانے میں کتنا لطف آتا ہے، وہ ابھی دھنک سے اس سے محظوظ ہو بھی نہ پائی تھی کہ بہانہ کے سیل فون کی کھنٹی نے سارا مزمرا کر کر دیا۔

”ہیلو۔“ انہوں نے بڑے محتاط انداز میں بات کی۔

”السلام علیکم! کیسے ہیں آپ؟“ رات کے سائے میں سیل فون کے تیز والیوم کی وجہ سے باہر آنے والی کھنٹی آواز نے انابیہ کے کان کھڑے کر دیے۔ اس نے بہانہ کے چہرے پر پھیلی بے ساختہ مسکراہٹ سے بمشکل نظریں چرا لیں۔

”فائن۔ کیسی ہیں آپ؟“ وہ ایسی ہو گئی آپ کی؟“ وہ لپ ٹاپ اٹھا کر اپنے کمرے کی طرف بڑھے، ساتھ ہی وہ انابیہ کے دل کا سارا سکون بھی اپنے ساتھ چڑا کر لے گئے۔

انابیہ نے بے ساختہ وال کلاک کی طرف دیکھا، رات کے دو بجے آنے والی یہ کال کتنی اہم تھی، اس کا اندازہ اسے بہانہ کے چہرے پر پھیلی جگمگاہٹ سے ہو گیا تھا اور دل کی اس دیوانی میں اندیشوں کے کئی ناگنے جانے کن کوئے کھدروں سے نکل کر سامنے آ گئے۔ انابیہ کے وجود پر ایک مکمل سناٹا چھا گیا تھا۔

وہ کچھ دیر پہلے میر خاقان کے حوالے سے چپخنے والی اس خبر کو بھول کر اب اس انجان کھنٹی آواز کے زہریلے پن کو اپنے اندر اترا تا ہوا محسوس کر رہی تھی۔



دور تاحہ نگاہ کسی ذی روح کا نام و نشان نہیں تھا، جنگل کی اس رات بادل دہلا دینے والا سناٹا اور تاریکی چھائی

... انہوں نے ہانکنا چاہا ہے۔“ اس سوچ کے آتے ہی وہ ہنگاموں اندھا دھند بھاگنے لگی۔

انسانی دیران جنگل میں ایک الو کی کمرہ جیجی کی آواز سن کر اس کے سارے وجود میں سنناٹا پھیل گئی۔

انابیہ اس کا دل پسلیاں توڑ کر سینے سے باہر نکل آئے گا۔ اس کا گلا خشک ہو گیا اور پیٹ میں اینٹھن ہونے لگی۔ ان وقت درختوں کے جھنڈے سے ایک بڑے پرندے کے پروں کی پھر پھر آواز پر اس نے بوکھلا کر مڑ کر دیکھا،

ایک موٹا تازہ کمرہ شکل کا الو تھا جو بجلی کی سی تیزی سے اس کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اس کی اوپر کی سائیں اوپر اور نیچے کی نیچے رہ گئیں۔ فضاؤں میں عجیب سا شور بلند ہوا اور اسے لگا جیسے اس کے

فانوں کے پورے پھٹ جائیں گے، وہ اپنی جان بچانے کے لیے پاؤں کی طرح بھاگی۔

”رک جاؤ۔“ اس خوف ناک آواز کے تعاقب میں اس نے بے اختیار اوپر کی طرف دیکھا، جنگل میں موجود درختوں کی شاخوں سے کئی رنگ برنگی کھوپڑیاں لٹک رہی تھیں۔ یہ آواز انہی میں سے کسی ایک کی تھی۔

”کون ہو تم؟“ اس کے حلق سے چھنی چھنی سی آواز نکلی۔

”روحیل محمود جسے مار دیا تھا تم نے،“ کوئی بلند آواز میں دھاڑا تھا۔ اس نے بے ساختہ مڑ کر دیکھا، وہ خوف ناک

”تم کا پرندہ منظر سے غائب ہو چکا تھا اور اب اس کی جگہ پر روحیل محمود اس کے تعاقب میں تھا،“ اس کا دل دھک سے رہ گیا۔ سفید رنگ کے گفن میں اس کی زندہ لاش دیوانہ وار اس کے پیچھے بھاگ رہی تھی۔ اس کی گردن باہر

اٹھ رہی تھی اور سر سے تازہ خون ٹپک رہا تھا۔

”پائے گاؤں میں نے تمہیں نہیں مارا۔“ وہ بھاگتے بھاگتے ٹھوکر کھا کر بری طرح مگری اور تب تک وہ اس کے سر پر پہنچ چکا تھا۔

”لیکن تمہاری وجہ سے وہ حادثہ ہوا اب میں تمہیں بھی ویسے ہی مار دوں گا۔“ اس نے بہت بڑے طریقے سے رومیمہ کو بالوں سے پکڑا اور اس کا سر پیچ کر زمین پر مارنے لگا، رومیمہ کے حلق سے نکلنے والی چیخوں نے ”نیٹنا ہاؤس“ کے دروہام کو دہلایا۔ پورے گھر میں بھاگنے دوڑنے کی آوازیں سن کر روٹی کی آنکھ کھلی۔

”جھک کیا ہوا روٹی؟“ سب سے پہلے میری اس کے کمرے کا دروازہ کھول کر بوکھلائے ہوئے انداز میں اندر داخل ہوئی۔

اتنے سرد موسم میں بھی روٹی کا سارا جسم سینے سے شربور تھا۔ وہ خوف زدہ انداز میں شیریں کے ساتھ آکر لپٹ گئی اور بلند آواز میں رونے لگی۔ ”خدا کی قسم میں نے اسے نہیں مارا۔“ کانپتی ہوئی آواز میں وہ ایک ہی فقرہ دہرائے جا رہی تھی۔

”ٹینک اٹ اپنی، میری جان، کچھ نہیں ہوا۔“ شیریں نے اسے اپنے ساتھ لگا کر لاسا دینے کی کوشش کی۔

نیٹنا بیگم سیاہ رنگ کے نائٹ ڈریس میں گھبرائی ہوئی اندر داخل ہوئیں، انہوں نے سخت پریشانی سے اندر کا منظر دیکھا، انہیں ایک لمحے میں سمجھ میں آیا تھا کہ رومیمہ خواب میں ڈر گئی ہے اور اس کی چیخوں نے بھی کو دہلایا تھا۔

”مام انٹرسٹی میں نے نہیں مارا اسے۔“ وہ خوف زدہ لہجے میں بولی، ایک آنسو اس کی یلک سے ٹوٹ کر

رخسار پر کسی موتی کی طرح ٹھہر گیا۔ یینا بیگم نے بے ساختہ نظریں چرائیں۔ ان کا دل تاسف کے گہرے احساس سے بھر گیا۔  
 ”میں جانتی ہوں سوئٹ ہارٹ! تم ایسا نہیں کر سکتیں۔“ وہ شل ہوتے دم کو سنبھالتے ہوئے اسے دلاسا دینے لگیں۔  
 ماں بیٹی کے درمیان پھیلی سرد مہر کی برف بڑی تیزی سے پکھلنے لگی۔ وہ اپنی ماں سے لپٹی بالکل ننھے بچوں کی طرح رو رہی تھی، یینا بیگم کی آنکھیں بھی نمکین پانیوں سے بھر گئیں۔  
 ”روٹی! یہ پالی بواور آیت الکرہی پڑھ کر سو جاؤ۔“ شہر زادہ خود کو سنبھال چکی تھی۔ اس نے گلاس میں پانی ڈال کر اس کی طرف بڑھایا۔  
 ”مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے۔“ اس کا وجود ابھی بھی ہلکا ہلکا کانپ رہا تھا۔  
 ”کچھ نہیں ہوگا، ہم سب تمہارے ساتھ ہیں کوئی بھی تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔“ وہ تسلی دینے کے انداز میں بولی۔

”وہ لوگ مجھے جیل میں ڈال دیں گے۔“ رومیمہ شدید قسم کے خوف میں مبتلا ہو چکی تھی۔  
 ”ایسا نہیں ہوگا روٹی! ہم سب لوگ تمہارے ساتھ ہیں، بی بی۔“ یینا بیگم نے بھی اسے دلاسا دیا۔  
 ”مام! بائے گاؤں میں نے اسے نہیں مارا، وہ خود گاڑی سے ٹکرایا تھا، اس کے ہاتھ میں پشیل بھی تھا، وہ مجھے مارنا چاہتا تھا۔“ وہ بے ربط انداز میں اپنی صفائی دینے کی کوشش کر رہی تھی۔  
 ”رومیمہ! بس کرو، سب پتا ہے ہمیں، بس آنکھیں بند کر کے سونے کی کوشش کرو۔“ شہر زادے اس کا کبل ٹھیک کرتے ہوئے نرمی سے کہا۔  
 ”آپ لوگ چھوڑ کر دو نہیں جائیں گے مجھے۔“ وہ ہراساں لگا ہوں سے انہیں دیکھتے ہوئے پھر اٹھ کر بیٹھ گئی۔  
 رو جیل محمود کی موت نے اسے اندر سے ہلا کر رکھ دیا تھا، وہ آنکھیں بند کر تی تو اس کا خون میں لت پت چہرہ اس کی نظروں کے سامنے آ جاتا۔ اس واقعے نے اسے ذہنی طور پر بہت ڈسٹرب کر دیا تھا۔ وہ اپنے کمرے میں اکیلے لیٹنے سے ڈرنے لگی تھی۔  
 ”آئی تھنک ٹیری، ہمیں بیس سو جانا چاہیے آج۔“ یینا بیگم کے سنجیدہ انداز پر اس نے اثبات میں سر ہلایا اور کشن اٹھا کر سامنے صوفے پر لیٹ گئی، جبکہ مام روٹی کے بستر پر ہی لیٹ گئی تھیں۔

ان تینوں کی آنکھوں سے نیند غائب ہو چکی تھی۔ جنس محمود نام کا جن ان سب کے حواسوں پر سوار تھا۔ وہ مشکل رات ان تینوں نے بڑی مشکل ہی سے کالی تھی۔ صبح چار بجے کے قریب شہر زادہ کی آنکھ لگی اور پھر دس بجے جا کر کھلی، کمرہ خالی تھا۔ وہ اپنے کمرے میں جا کر فریش ہو کر نیچے آئی تو ملازمہ ڈاننگ روم میں ناشتا لگا رہی تھی اور وہ دونوں وہیں موجود تھیں۔ رات بھر کی بے خوابی، یینا بیگم اور رومیمہ کی سرخ آنکھوں اور متضلل انداز سے ظاہر تھی۔  
 ”ہیلو ماما! بے رومی۔“ وہ دانستہ مسکراتی ہوئی اندر داخل ہوئی۔  
 ”کیسی ہو؟ میں تو ساری رات نہیں سو سکی۔“ مام کی تھکی تھکی آواز اس بات کی گواہ تھی کہ وہ بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں۔  
 ”نیکویشن لیتی ہیں سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔“  
 ”پتا نہیں، کیسے ہوگا۔“ وہ اچھی خاصی مایوس تھیں۔  
 ”میں نے بہت سوچنے کے بعد ایک فیصلہ کیا ہے مام۔“ توں پر جم لگتے ہوئے وہ آج اپنے مخصوص پر اعتماد

”ایس! تو کیا قسمی۔ دونوں نے ہی چونک کر اس کی طرف دیکھا۔  
 ”ایس! ماما! یینا بیگم نے حیرانی سے دریافت کیا۔  
 ”میں! بے رومی کا کس میں خود لٹوں گی۔“ اس کی بات پر رومی کی آنکھوں میں ہلکا سا استعجاب ابھرا۔  
 ”ایس! میں تو بہر شہرالیہ سے بات کر چکی ہوں۔“ یینا بیگم نے اس کی معلومات میں اضافہ کیا۔  
 ”اس! ادکے، لیکن میں ان کے ساتھ ان کی اسسٹنٹ کے طور پر ضرور درک کروں گی۔“ اس نے تھراپس سے اپناپ میں چائے انڈیٹی۔  
 ”ہاں۔۔۔ اور اس کیس کا فیصلہ آتے ہی میں رومی کو لندن بھجوا دوں گی۔“ ان کی انگلی بلا ٹنگ سنتے ہی شہر زادے کا ارادہ رومیمہ کی طرف دیکھا، اسے یقین تھا۔ وہاں سے صدائے احتجاج ضرور بلند ہوگی، لیکن اس سے پہلے ہی ایب اور جگہ سے اعتراض آگیا۔  
 ”تمہارا کیا خیال ہے محمود احمد! اتنا گدھا ہے کہ وہ اپنے بیٹے کی قاتلہ کو ملک سے باہر جانے دے دے گا۔“  
 ہارون رضا کی اس موقع پر آمد ان تینوں کو ہی سخت ناگوار گزری۔ وہ شاید نہیں یقیناً ”اندرا“ داخل ہوتے ہوئے ان کی آنکھوں کا کچھ حصہ سن چکے تھے۔

”میری بیٹی نے مؤثر نہیں کیا۔“ یینا بیگم ایک دم تپ کر بولیں۔  
 ”یہ فیصلہ کرنا تمہارا نہیں، کورٹ کا کام ہے۔“ وہ استہزائیہ انداز میں گویا ہوئے۔  
 ”پھر تم بھی اپنی زبان بند رکھو اور عدالتی معاملات میں مجھنے کی کوشش مت کرو۔“ یینا نے بھی بدلتا طعنے انہیں مشورہ دیا۔  
 ”حالتا ہوں کس کی شہ پر اتنا اچھل رہی ہوں تم۔“ ہارون کی بد تمیزی پر رومی اور شیری دونوں کا چہرہ سرخ ہوا۔  
 ”فضول کے انداز سے مت لگایا کرو۔“ یینا بیگم نے صحنوں پر اچکا کر کوفت بھرے انداز سے کہا۔  
 ”سیف الرحمن۔ وہی ہے نا جو آج کل ”اوپر“ بیٹھا تمہاری ساری ڈوریں ہلا رہا ہے۔“ اپنی بیٹیوں کے سامنے ہارون رضا کا استہزائیہ لہجہ انہیں متضلل کر گیا۔  
 ”شٹ اپ!“ انہوں نے ہاتھ میں پکڑا جو اس کا گلاس ایک دم ہی ٹیبل پر ٹپکا، جس پر چھلک کر میز کی سطح پر پھیل گیا۔  
 ”کیا انٹرسٹ ہے اس کا اس معاملے میں؟ کیوں بھاگتا پھر رہا ہے وہ تمہارے لیے۔“ ہارون رضا کا ہر آلود لہجہ

شہر زادہ کو سخت ناگوار گزرا۔  
 ”تمہیں بہت تکلیف ہو رہی ہے تو ڈائورس دے دو مجھے۔“ وہ ایک دم چینیں۔  
 ”آج آسانی سے جان نہیں چھوڑوں گا تمہاری یہ بات یا اور کھانا تم؟“ انہوں نے انگلی اٹھا کر یینا بیگم کو دھمکی دی۔ اس کے ساتھ ہی شہر زادہ کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ وہ ایک جھٹکے سے کھڑی ہوئی۔  
 ”آپ دونوں کو جو بھی پراہم ہے جا کر اسے بیڈ روم میں حل کریں، یہاں پر خواہ مخواہ کا تماشا مت لگائیں۔“  
 شہر زادہ کے سرو لہجے پر ہارون رضا کو ایک دم جھٹکا لگا۔ انہوں نے بے یقینی سے اس کی طرف دیکھا۔  
 ”چلو رومیمہ۔“ شہر زادے بالکل بے جان انداز میں بیٹھی رومی کا بازو پکڑا تو اسے احساس ہوا، وہ بالکل ٹھنڈی ہو چکی ہے۔ وہ اسے زبردستی ٹھٹھیتی ہوئی لاؤنج میں لے گئی۔ وہ دل ہی دل میں سوچ چکی تھی کہ اسے ہارون رضا کے معاملے میں اب کھل کر مام سے بات کر لینی چاہیے، وہ اس شخص کو اب مزید ڈھیل دینے کے حق میں نہیں تھی۔





”کیا مصیبت ہے پریکٹیکل کی کاپی لینے کے لیے خود جانا ضروری تھا کیا۔“ مری کے اونچے نیچے راستوں پر چلتے ہوئے طوطی کا سانس پھول چکا تھا۔ جبکہ درشوار کیٹوس شوہر اپنے بڑے مزے سے چل رہی تھی۔  
 ”ناویانہ مانو، تمہارا وزن بڑھ چکا ہے تب ہی تو اتنا سانس پھول رہا ہے تمہارا۔“ درشوار کے فٹوے پر طوطی نے تپ کر اسے دیکھا۔ جس کا چہرہ اس وقت اسے سخت منحوس لگ رہا تھا ویسے بھی وہ اپنی اسمارٹنس کے معاملے میں خاصی حساس تھی۔

”یہ بات اگر تم اس موٹی بھینس نمو کے بارے میں کہتیں تو شاید کوئی یقین کر بھی لیتا۔“ طوطی نے نمیو کی غیر موجودگی کا فائدہ اٹھا کر کھل کر اپنی رائے کا اظہار کیا۔

”وہ موٹی، اگر اس وقت ساتھ ہوتی تو تمہارے اگلے دو دانت تو ضرور توڑ چکی ہوتی۔“ درشوار چلتے چلتے رکی۔ وہ دونوں اس وقت اپنی ایک مشترکہ سہیلی کے گھر سے کیمسٹری کی پریکٹیکل کاپی لے کر واپس آ رہی تھیں۔ اسی وقت نضاؤں میں مغرب کی اذانیں گونجنے لگیں۔

”نیمہ دو دانت بعد میں توڑے گی، ناالی اماں آج ہماری ایک آدھ ٹانگ ضرور توڑ دیں گی۔“ طوطی نے پہاڑوں پر اترتی تاریکی کو دیکھتے ہوئے خوف زدہ انداز میں کہنا نہ چاہتے ہوئے بھی دونوں خاصی لیٹ ہو چکی تھیں۔  
 ”تم ہی شاہی کباب کھانے بیٹھ گئی تھیں ورنہ میں تو کافی دیر سے کہہ رہی تھی کہ گھر چلتے ہیں۔“ درشوار نے سارا الزام اس کے سر پر رکھ دیا۔

”یہی کوئی بکواس تم نے ناالی اماں کے سامنے کی تو یقین مانو اپنی منقولہ اور غیر منقولہ جائیداد سے عاق کروں گی۔“ طوطی تڑپ کر بولی۔

”اچھا اچھا بعد میں عاق کر دینا، ذرا ادھر دیکھو۔“ درشوار نے خوبانیوں کے ایک درخت کی طرف مسکراتے ہوئے اشارہ کیا۔

”خبردار، ان پر بری نظر ڈالنے کی ضرورت نہیں، ہم پہلے ہی لیٹ ہو چکے ہیں۔“ اس نے فوراً ہی آنکھیں ماتھے پر رکھیں۔

”مہمیں بتا تو ہے خوبانیاں میری کمزوری ہیں۔“ درشوار نے پریکٹیکل کی کاپی اسے پکڑا کر کسی پتھری تلاش میں دائیں بائیں دیکھا۔

”درشوار! اس کرو، ہم لوگ لیٹ ہو رہے ہیں۔“ وہ جھنجھلا گئی۔

”لو دو منٹ کا تو کام ہے، راستے میں مزے سے کھاتے جا میں گے۔“

اس نے ایک بڑا سا پتھر کھمکھ کر درخت کی ایک پھل دار تنہی پر دے مارا۔ درشوار کا نشانہ تو بالکل ٹھیک تھا، لیکن اس کی بد قسمتی کہ وہ بھاری پتھر موٹے تنے کو چھو تا ہوا، درخت سے ٹھوڑے فاصلے پر بیٹھے ایک باؤلے کے کتے کو جا لگا۔

وہ کتا شعل ہو کر اٹھا اور بھونکتے ہوئے درشوار پر حملہ کرنے کی نیت سے آگے بڑھا۔ درشوار کے دماغ میں خطرے کی گھنٹی بجی۔

”وہ میرے خدا طوطی بھاگو۔“ اس نے ناگمانی آفت پر بوکھلا کر سڑک پر بھاگنے کے بجائے دائیں طرف بنے واقع جنگل کی طرف دوڑ لگائی۔

”یہ توقف لڑکی، ادھر کہاں جا رہی ہو؟“ طوطی نے خوف زدہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا، جو تیزی سے دھڑلوانی سطح پر پہنچتی ہوئی نیچے کو جا رہی تھی، جبکہ وہ کتا ابھی تک اس کے تعاقب میں تھا۔ درشوار تیزی سے دوڑنے لگی، اچانک اس کا پاؤں پھسلا اور وہ سیکڑوں میں جنگل کی دھڑلوان سطح سے پھسلے ہوئے ہموار زمین پر جا

”اے اس کے گھٹنے اور بازو پر خاصی چوٹ لگی تھی۔“  
 وہ اچھل کر کھڑی ہوئی اور اس نے بوکھلا کر اپنے پیچھے دیکھا، وہ کتا لمبی لمبی چھلانگیں لگاتا ہوا اس کے پیچھے تھا۔  
 ”اے اے، اے، اے، اے، موت بہت قریب آتی ہوئی محسوس ہوئی اس نے آنا، فنا“ فیصلہ کیا اور پھولی ہوئی سانسوں کے ساتھ ایک اور پتھر اٹھایا اور اپنے دفاع کے لیے گھما کر دے مارا، جو کتے کی ٹانگ پر جا لگا اور وہ مزید غصے میں آکر اس کے پیچھے دوڑنے لگا، درشوار کا رنگ فق ہو گیا۔

”یا اللہ بچانا۔“ اس نے پھر نیچے کی جانب دوڑ لگائی، وہ کتا بھی اس کے پیچھے تھا۔ اسی دوران درشوار کا ایک جوتا اس کی سرنگھیا اور وہ اب ایک عدد ننگے پیر کے ساتھ بھاگ رہی تھی۔ اسے لگا اس کے بدن سے دھج پودا لڑنے لگی ہے۔

”کیسے انسان رکھ۔“ وہ کتے کو دھمکیاں دیتے ہوئے ایک بھاری قسم کے درخت کے پیچھے سے نکلے ٹھہرادی سے بری طرح لگرائی، جو اس وقت اپنے آسن کے کام سے فیئڈ میں لٹکا ہوا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ سمجھتا، اس نے چھلانگ لگا کر درشوار پر حملہ کیا، وہ سر اسے انداز میں ایک دم زمین پر بیٹھ گئی، وہ کتا اچھل کر اس کے اوپر سے ہوتا ہوا در جا کر۔

درشوار حواس باختہ انداز میں مٹی اس کا دھنٹا ایک جھاڑی سے الجھا اور وہ اسے چھوڑ کر بوکھلا کر ہادی کے پیچھے ماکھڑی ہوئی، اب سین کچھ یوں تھا کہ ہادی کے سامنے وہ جھنکی کتا اور پیچھے درشوار تھی جس کا سانس پھولا ہوا اور آنکھوں سے آنسو قطاری کی صورت میں بہہ رہے تھے۔ اس صورت حال نے اسے سخت خوف زدہ کر دیا تھا، اوپر سے سورج کے ڈوبنے ہی چاروں طرف ملک جاسا اندھیرا پھیل گیا تھا۔

”پلیز بچائیں مجھے،“ وہ بیانی انداز میں کہتی ہوئی خود پر قابو نہ پا کر رو پڑی۔  
 وہ کتا ذرا فاصلے پر کھڑا بھونک رہا تھا، ہادی کو ایک نظر دیکھنے سے ہی اندازہ ہو گیا کہ وہ اتنی آسانی سے جان نہوڑنے والا نہیں ہے، وہ آہستہ آہستہ پھر ان دونوں کی طرف بڑھ رہا تھا، ہادی نے ایک لمحے میں فیصلہ کیا اور اپنی نیک کی جیب سے پٹل نکالا، جو وہ فیئڈ پر جاٹے ہوئے جنگلی جانوروں سے بچاؤ کے لیے اپنے اس رکھتا تھا۔

وہ پاگل کتا اب ہادی پر حملہ کرنے کی نیت سے آگے بڑھا۔ اس نے فوراً ہی نشانہ باندھ کر گولی اس کی ٹانگ میں دے ماری، وہ تڑپ کر زمین پر گرا، اس نے ایک دفعہ پھر اٹھ کر حملہ کرنے کی کوشش کی، لیکن اگلے فائر سے وہ

اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھا۔ جبکہ درشوار آنکھیں بند کیے بڑے طریقے سے رو رہی تھی۔ ہادی کو ہلکی سی بے زاری ہوئی۔

”مر گیا ہے وہ۔“ ہادی نے سپاٹ لہجے میں کہتے ہوئے جھاڑیوں میں الجھا ہوا اس کا دھنٹا اٹھایا۔ وہ سپید پڑتی رنگت کے ساتھ ساکت و جاہد تھی۔

”یہ دھنٹا لیں انا۔“ ہادی کے سنجیدہ انداز پر اس نے فوراً ”چونک کر دیکھا تو اسے احساس ہوا کہ وہ بغیر دوپٹے کے تھی۔ اس نے بوکھلا کر دھنٹا پکڑا اور فوراً ”اوڑھ لیا۔ زمین پر گرنے کی وجہ سے اس کی ٹہنیں کا بازو ایک جگہ سے پھٹ چکا تھا اور جلد پر کئی خراشیں آچکی تھیں۔ دور کیس لمبی کے رونے کی آواز نے جنگل میں عجیب سا ماحول طاری کر دیا۔

اس وقت وہ سرخ آنکھوں، بکھرے بالوں اور گرد آلود کپڑوں کے ساتھ انتہائی خوف زدہ انداز میں چاروں طرف دیکھ رہی تھی۔

”نکلیں یہاں سے۔“ وہ نظریں پُر کر آگے چلنے لگا، یہ موقع کوئی طعنہ دینے کا نہیں تھا ورنہ اس کا شہت سے دل چاہ رہا تھا کہ وہ دو چار کھری کھری تو ضرور سنا دے، اس لڑکی کو جو اپنے گھر میں ٹارزن تھی اور اس وقت بیگلی ملی

بنی اس کے پیچھے چل رہی تھی۔  
”آہستہ چلتیں۔“ درشوار کے حواس شل ہو گئے تھے۔

”اس سے پہلے کہ کوئی اور جانور کہیں سے نکل آئے“ آپ برائے مہربانی تیز قدم اٹھائیں۔“ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی تھوڑا تلخ ہوا۔

درشوار سنبھل سنبھل کر چڑھائی چڑھ رہی تھی، ایک پیر میں جو تانہ ہونے کی وجہ سے اسے چلنے میں مشکل پیش آرہی تھی، اچانک چلتے چلتے ایک نوکیلا پتھر اس کے پاؤں کے ناخن سے ٹکرایا اور درشوار کے منہ سے نکلنے والی بے ساختہ چیخ پر وہ لکسا بولکھا کر مڑا۔

وہ اپنے پیڑ پر جھکی تکلیف سے کراہ رہی تھی، ہادی نے سیل فون میں موجود ٹارچ جلا کر تھوڑا سا جھک کر دیکھا، اس کے پاؤں کا ناخن اودھا ٹوٹ چکا تھا اور نوکیلا پتھر اندر گھسنے کی وجہ سے اب خون نکل رہا تھا۔

”اُدھ فُسد“ وہ فوراً ”نہیں پر بیٹھا اور بڑی احتیاط سے اس نے انگوٹھے کے آدھے ناخن میں پھنسے ایک چھوٹے سے پتھر کو باہر نکالا، درد کی ایک بے ساختہ لہر درشوار کے وجود میں دوڑی اور اس نے لاشعوری طور پر ہادی کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑ لیا۔ وہ آنکھیں بند کیے ضبط کے کڑے مراحل سے گزر رہی تھی۔

”ریلیکس“ ہادی نے اپنی چیٹک سے رومال نکالا اور کس کر اس کے انگوٹھے پر باندھ دیا، جس سے خون بہنا تو رک گیا تھا لیکن تکلیف کے گہرے احساس کو ضبط کرنے کی کوشش میں درشوار کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔

”مجھ سے چلا نہیں جا رہا۔“ آنسوؤں میں بھیگی اس آواز نے ہادی کے قدم روک دیے۔

”تھوڑی ہمت کرس، نوڈ پر گاڑی کھڑی ہے میری۔“ ہادی کو اس کے مسلسل رونے پر ترس آئی گیا۔

”تناؤ درد ہو رہا ہے مجھے۔“ وہ گھٹنے پر ہاتھ رکھ کر بمشکل کھڑی ہوئی۔

”اُدھر دیں اپنا ہاتھ۔“ ہادی نے نظریں چرا کر اپنا بازو اس کی طرف برہایا جو اس نے ہلکا سا جھجک کر تھام لیا، اب وہ اسے پکڑے انتہائی احتیاط سے اوپر چڑھ رہا تھا۔ درشوار کو ایک دم یوں لگا جیسے اس کے دل کی دھڑکنوں نے ایک اور ہی راگ الاپنا شروع کر دیا ہو۔

درشوار کے اندر کی دنیا سیکندوں میں بدلی تھی۔ اس کی ساری شوخی اور شرارتیں یہیں کہیں اس جنگل میں کھو

گئی تھی۔ وہ اس سے نظریں چرائے بس سر جھکائے اس کے پیچھے چل رہی تھی۔ ہادی کو یہ خاموشی کسی بڑے

طوفان کا پیش خیمہ محسوس ہوئی۔ جیسے ہی دونوں تھوڑا اوپر پہنچے طوبی حواس باختہ انداز میں درشوار کی تلاش میں

نیچے اتر رہی تھی۔ اسے دیکھ کر اس کی جان میں جان آئی۔

”تھنکس گاڈ“ تم زندہ ہو، یقین مانو ایک سو ایک دفعہ آیت الکرسی پڑھ کر بھوک چکی ہوں تم پر۔“ طوبی بے

چین انداز میں اس کی طرف بڑھی۔

”شکر کریں فاتحہ نہیں پڑھی پڑی ورنہ آپ کی کزن کے آج ارادے تو ایسے ہی تھے۔“ ہادی سنجیدگی سے بولا

تھا۔

”آپ کہاں سے آگئے اچانک؟“ طوبی حیران ہوئی۔

”اپنی روزی روٹی کے چکر میں گھوم رہا تھا جنگل میں، مجھے کیا پتا تھا آپ لوگوں نے اب انسانوں کو چھوڑ کر

جانوروں کو تنگ کرنا شروع کر دیا ہے۔“ اس نے ایک طرف کھڑی اپنی گاڑی کا دروازہ کھولا مڑک پر لگی روشنی

میں طوبی کی نظر درشوار کے پاؤں پر پڑی۔

”اُدھ مانی گاڈ! یہ تمہارے پاؤں کو کیا ہوا، کیسے چوٹ لگ گئی۔“ وہ بولکھا کر اس کے پاؤں پر جھکی اور اس کا جائزہ

لے لی۔

”نہ انا خواستہ، تمہاری زبان پر تو چوٹ نہیں لگ گئی۔“ طوبی اس کی غیر معمولی خاموشی پر گھبرا کر بولی تو ہادی کے

پیشانی پر یہ تعقیبش آپ گھر جا کر لے لیجئے گا، اس وقت تاہم کافی ہو گیا ہے۔“ اس کی بات پر طوبی نے گھبرا کر کھلائی

اس پانی کھڑی سے تاہم دیکھا ساتھ ہی اس کے سیل فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ اس نے جلدی سے کال اینڈ کی۔

اس کی طرف اتنا ہی تھیں۔

”اباں ہو تم دونوں تاہم دیکھا ہے، واجی گھر آچکے ہیں۔“ تاہم کی اطلاع نے اس کی روح فنا کر دی۔

”تم پلیز کوئی ہمانہ بناؤ، ہم لوگ پچھلے لان کی طرف سے آرہے ہیں۔“ طوبی نے جلدی سے فون بند کیا۔

”پلیز ہمیں گھر تک ڈراپ کر دیں۔“ اس سے پہلے کہ وہ کچھ اور کہتا، وہ درشوار کا بازو پکڑ کر گاڑی کی پچھلی سیٹ

پر بیٹھ گئی۔ دس منٹ کی ڈرائیو کے بعد وہ ”میراؤس“ کے قریب پہنچا ہی تھا کہ طوبی بول پڑی۔

”پلیز گاڑی اپنے گھر لے جائیں۔“ اس کی اگلی فرمائش پر ہادی کا دماغ جھک کر کے اڑا۔

”وہ کس خوشی میں؟“

”ہمارے سامنے والے لان میں واجی کے روم کی کھڑکیاں کھلتی ہیں اور اس وقت وہاں سے گزرتا خطرے سے

خالی نہیں۔“ اس نے ہلکی سی خجالت کے ساتھ اپنی بات کی وضاحت کی، ہادی کو نہ چاہتے ہوئے بھی اس کی بات

مانا پڑی۔

گاڑی جیسے ہی رکی، درشوار ہلکا سا لتکڑا تکی ہوئی نیچے اترتی۔ طوبی نے آگے بڑھ کر اس کو سہارا دیا۔ وہ خاصی

بے حال لگ رہی تھی اور اس کا حلیہ خاصا مشکوک لگ رہا تھا اور ایسی حالت میں واقعی کسی بڑے کے سامنے جانا

نارے سے خالی نہیں تھا۔

”یار جلدی چلو۔“ طوبی اس کا بازو پکڑ کر لان کی پچھلی طرف چل دی۔ ہادی بھی بلا ارادہ ان کے پیچھے چلا

آیا۔ طوبی نے جلدی سے منڈیر پر چڑھ کر چھلانگ لگائی اور اگلے ہی لمحے وہ دوسری طرف تھی۔

درشوار چلتے چلتے رکی۔ اس کا پاؤں سوچ چکا تھا اور اتنی تکلیف کے ساتھ اچھل کر منڈیر پر چڑھنا کوئی آسان

کام نہیں تھا۔ ہادی کو اس کی مشکل سمجھ میں آگئی تھی۔ اس نے دوسری دیوار کے پاس رکھی دو اینٹیں اٹھائیں اور

خاموشی سے منڈیر کے پاس رکھ دیں۔

”اس پر پاؤں رکھ کر چڑھیں۔“ ہادی کے نرم لہجے پر درشوار نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ اس کی مہربان

آنکھوں میں پچھلی نرم جگہ گاہٹ اسے اپنے دل کے اندر اترتی ہوئی محسوس ہوئی۔ دور کہیں دیرانوں میں گھنٹیاں

بجی تھیں۔

”فار گاڈ سک یار، جلدی کرو، سن سچوں میں گم ہو۔“ طوبی کی جھنجھلاہٹ پر وہ ہلکا سا بولکھلائی۔

اس نے بمشکل اپنا پر ہادی کی رکھی ہوئی اینٹوں پر بٹایا اور ساتھ ہی اس کی چاہت نے دل کے کسی کونے میں

شب و بلی سے ڈیرہ جمالیا۔ محبت ایک تیز رفتار زلزلے کی صورت میں اس پر حملہ آور ہوئی تھی اور اس نے سیکندوں

میں درشوار کے سارے وجود کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ وہ گھبرا کر منڈیر پر بیٹھی اور ساتھ ہی اس نے سوچے سمجھے بغیر

اس کی طرف چھلانگ لگا دی۔



صبح سے ہونے والی موسلا دھار بارش نے اسلام آباد کے مکینوں کو عجیب سی بے زاری اور کوفت میں مبتلا کر دیا

تھا۔ اتنی سردی میں منجوس بچے سے ہونے والی مسلسل بارش رات کے بارہ بجے بھی جاری تھی۔

آج نور محل میں عجیب سی وحشت طاری تھی گھر کے سب ہی ملازمین شام ہوتے ہی اپنے کواٹروں میں دیک گئے تھے۔ اتنے بڑے بنگلے میں آج فارحہ بھا بھی اور ان کی ملازمہ صندل ہی تھیں۔ حاجی اور میر مختتم بھی شام کو مری کے لیے نکل گئے تھے۔ میر وہاج کو ملتان گئے ہوئے پانچ روز گزر چکے تھے اور ابھی ان کی واپسی کی کوئی اطلاع نہیں تھی۔

صندل نے آج جلدی جلدی سارا کام سمیٹ لیا تھا۔ اس وقت وہ دودھ کا گلاس رکھنے فارحہ بی بی کے کمرے میں آئی۔ جن کی طبیعت پچھلے دو دن سے خاصی خراب تھی۔ سارا سارا دن اپنے کمرے میں اندھیرا کیے لیٹی رہیں۔

”صندل، ساری کھڑکیاں اور دروازے اچھی طرح بند کر دیے ہیں نا۔“ فارحہ بھا بھی نے مدد حال انداز میں اس سے پوچھا۔

”بی بی بی بی۔“ اس نے جھٹ سے اثبات میں سر ہلادیا۔  
”سائیڈ ٹیبل کی دراز سے نیند کی ٹیبلٹ نکال کر دو مجھے۔“ ان کے رنجیدہ لہجے پر صندل کا دل تاسف کے احساس سے بھر گیا۔

”بی بی جی اتنی گولیاں مت کھایا کریں۔“ صندل کو فارحہ بی بی پر خاصا ترس آتا تھا گھر کے باقی ملازمین کی طرح وہ بھی ان کی ازدواجی زندگی کی تلخیوں سے بخوبی واقف تھی۔ اپنے میاں وہاج کے برعکس فارحہ بھا بھی کا رویہ ملازمین کے ساتھ بہت اچھا تھا۔

”گلیا کروں اس کے بغیر نیند نہیں آتی۔“ انہوں نے افسرہ انداز میں کہتے ہوئے پانی سے گولی نگلی۔ دور کہیں آسمانوں پر بادل گرجے تھے۔ ساتھ آسمانی بجلی کی کڑک نے ان دونوں کا دل دہلادیا۔  
”آج تو موسم بہت خراب ہے؟“ صندل نے فکر مند انداز میں کہتے ہوئے کمرے کے بھاری پردے آگے کیے۔

”تم بھی لائٹ بند کر کے سو جاؤ اپنے کمرے میں۔“ فارحہ نے نرمی سے اسے کہا تو وہ جلدی سے اپنے کمرے کی طرف بڑھ آئی جو اسٹور روم کے ساتھ تھا۔ در شہوار سے مانگے گئے ڈائجسٹو میں سے ایک ڈائجسٹ نکال کر اس

نے پڑھنا شروع کر دیا اور وہ کہانی میں ایسی گم ہوئی کہ ایک دم لائٹ کے جانے پر ہی اسے ہوش آیا۔ اس وقت رات کا ڈیڑھ بج رہا تھا۔ چوکیدار نے ابھی تک جزیر نہیں چلایا تھا وہ کچھ دیر انتظار کر کے اٹھی اور موبائل فون کی روشنی میں اس نے اپنے کمرے کا دروازہ کھولا اور موم بتی کی تلاش میں کچن کی طرف قدم بڑھائے۔ اپنی دھن میں جیسے ہی وہ باہر نکلی سیمینگ روم کا دروازہ باہر سے کھلا اور وہاج بڑی تیزی سے اندر داخل ہوئے۔ صندل کو سامنے دیکھ کر ان کی آنکھوں میں عجیب سی براسرا چمک ابھری۔ صندل کا دل بری طرح دھڑکا۔

اگلے ہی لمبے وہ تیزی سے آگے بڑھے اور اس سے پہلے کہ صندل ان کے ارادوں کو سمجھتی انہوں نے اچانک اس کے منہ پر ہاتھ رکھ کر اسے زبردستی گھینٹتے ہوئے ساتھ والے کمرے میں لے جا کر پٹخا۔ صندل نے چیخا چاہا مگر اس کی آواز حلق میں ہی دم توڑ گئی۔ بہت سرعت کے ساتھ وہاج صاحب نے کمرہ اندر سے لاک کیا۔ باہر چوکیدار نے جزیر چلا دیا تھا اس کے شور میں صندل کی کھٹی کھٹی سی چیخیں کمرے میں دم توڑ گئیں۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

محبت کو دی جانے والی میری ننھی منی سی دھمکی بڑی شان سے میری طرف پلٹ آئی تھی۔ اس روم کے درو دیوار پر جی آئل پینٹنگز، شیشے کی میز پر رکھائلی شیڈ ویپر وٹ، ان دور سدا بہار پلانٹس۔ سب نے میری بے بسی پر جیسے قہقہہ بلند کیا اور پھر سے اپنی جگہ ساکت ہو گئے۔ جم گئے۔

میں صدام حسین ہوں، ایک بزنس ٹائیگون جس کے نزدیک محبت کسی بے کار شغل کے علاوہ کچھ نہیں۔ میں محبت کے ”منکرین“ میں سے ہوں۔ اور میری اسی بات نے محبت کو تیش دلایا۔ وہ آئی، وارد ہوئی، میں پہلے حیران ہوا، پھر چونکا اور آخری میں بال نوح ڈالے۔

”صدام حسین! تمہیں کسی افریقین سے محبت ہو جاتی۔ انگریزوں سے بھی ہو جائے تو مضائقہ نہیں۔ مگر کم از کم اس مینا حفیظ سے نہ ہوتی۔ دل چاہ رہا ہے اور بھی عین غلے دلتے میں محبت کے سوا کھنکھاتا ہوا، جینز میں ہاتھ ڈالے مال روڈ کی سیر کو نکل جاؤں۔ اور پھر واپسی کا رستہ بھول جاؤں۔“

مینا حفیظ تو اگلے کو آنکھوں سے جٹ کر جانے کا فن جانتی ہے۔ صاحبہ جان رکھو یہ بھی بڑا فن ہے۔ ہماری دوسری مشرقی دو ٹیڑاؤں کو تو یہ فن چھو کر بھی نہیں گزرا ابھی تک میں نشیے، شرابے، لچائے، انگلی دانتوں میں دبائے جیسے بھینٹوں میں ابھی ہوئی ہیں۔ ارے سیکھو کچھ مینا حفیظ سے۔

آئے! اب آپ سب کا محترمہ مینا حفیظ سے بھی تعارف کروا دوں جو ناقابل فراموش شخصیت ہے، آہ مینا حفیظ سرکاری لائبریری میں لائبریرین کے اعلا عہدے پر فائز ہے۔ خوب صورت بالکل بھی نہیں ہے۔ ویسی ہی ہے جیسی باقی ستر فیصد لڑکیاں ہوتی ہیں۔

عام سی، مناسب مین نقش اور میرے ایک خطرناک حد تک غلط اندازے کے مطابق ایسی لڑکیوں سے کبھی محبت نہیں ہوتی کبھی نہیں۔ اس کی کرسی کے عین اوپر دیوار پر اس کی اپنی ہی

لکھائی میں ایک بورڈ لگا ہوا تھا۔  
”خاموشی کا احترام کریں۔“ میں معصوم انسان تو خاموشیوں کا احترام کرنے والوں میں سے ہوں مگر میرا موبائل برائٹ ناٹ کی گھنٹیاں بجاتا اور مینا حفیظ کی لمبی ہیل کی ٹنگ ٹنگ میرے قریب آئی۔ میں زمانے بھر کا بے نیاز بنا ”آگ کا دریا“ دھستا نظر آتا۔

”آپ کو خاموشی اچھی نہیں لگتی؟“  
”اں نہیں، نہیں تو میں تو خاموشیوں کا بہت بڑا فن ہوں۔“ زمانے بھر کی معصومیت جانے کیوں مجھ پر ختم سی ہو جاتی۔ اف صدام حسین دی کریٹ۔  
”آئندہ اپنا فون سائلنٹ موڈ پر رکھا کریں۔“

کچھو میں سیدھے لمبے بال بکترے ہوئے لیڈ پسل کان پر انکار رکھی تھی۔ کئی ذہن آنکھیں صدام حسین دی کریٹ پر بھی تھیں۔  
”میں پوری کوشش کروں گا۔“  
”کو شش“ وہ چلائی تھی لوگ دیکھنے لگے ہم دونوں معذرت کے سے انداز میں مسکرائے۔

”میرا مطلب ہے آئندہ ایسا نہیں ہو گا۔“ میں نے یقین دلایا تھا۔ وہ جانے لگی تھی ٹنگ ٹنگ۔  
”سین پلیر“ میں نے آواز دی وہ تھی پلٹ کر دیکھا خشکیاں نظریں۔  
”ٹیں۔“

”یہ آپ کی پسل! نازک پسل شاید آپ کے چلانے کا بوجھ نہ برداشت کر سکی۔“  
غصے میں تھر تھر کا پتی مینا حفیظ نے پسل جھپٹی اور اپنے ڈیسک کی طرف بڑھ گئی۔ مقدس خاموشی میں گھڑی کی آواز کو جتی رہی، ہلکی مدھم، میرا مطالعے کا وقت ختم ہو چکا تھا۔ میں ہولے سے اٹھا۔ آگ کا دریا مینا حفیظ کے سامنے میز پر رکھی۔ وہ چشمہ لگائے انگلیاں اخبار پڑھ رہی تھی۔ میں نے سوچا۔ ”آئی ایم

امپرسنڈ“ گریہ کیا؟ مقدس خاموشیوں میں شرارت کا پیر آن براجمان ہوا شریر پیر۔  
”سین“ میں نے آواز دی تھی۔ جنسن لیڈی

دانی داپ ڈیک پر پٹا۔ عیسیٰ نظریں میں ڈر سا اٹھا۔

”اب کیا ہے؟“ ڈیٹ کر بوجھا گیا تھا۔ میرا دل چاہا مینا حفیظ بھی کوئی شرماٹی لچائی مشرقی ناری ہوئی جو ام از لم یوں تو نہ کرتی اور میں معصوم صدام ابن ابن اس کی آنکھوں کے اینٹم بموں سے محفوظ رہتا۔  
”بزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ نکلے۔“  
(سا بوا آگے خود شعر مکمل کریں مجھے شاعری سے کوئی سلف نہیں۔)

”اب بتائیں بھی کیا کہنا ہے؟“ غصے سے چرے نے رنگ بدلے نیلا پیلا گال۔  
”میں مینا حفیظ! آپ ”دی نیوز“ لانا پڑے جاری ہیں۔“ یہ کہہ کر میں مکمل اطمینان اور سکون سے خاموشیوں کے مقدس ماحول سے باہر نکل آیا تھا۔  
پیچھے دیکھو تو خاموشیوں کے مقدس پیر میں شرارت کے قہقہے پھوٹ پڑے ہیں۔

☆ ☆ ☆  
آج مینا حفیظ ”دی نیوز“ سدا پڑھ رہی تھی۔ خطرناک حد تک جان لیوا سنجیدی سے مجھے دیکھا اور چاہیوں کا کچھا ڈیک پر پٹا دیا گیا۔

”الماری نمبر 13“ چابی نمبر 26 -  
اس بل مجھے مینا حفیظ روحانیت کے اعلا درجے تک پہنچی ہوئی لگی تھی۔ کیسے جان لیا کہ مجھے کون سی کتاب چاہیے۔  
”واہ آپ کو کیسے پتا مجھے کون سی کتاب چاہیے؟“  
میں نے روحانیت کا درجہ ماننے کی کوشش کی تھی۔

کاہل سے جی آنکھیں جیسے طنز سے کھلکھلائی تھیں۔ ”آپ پچھلے دو ماہ چار دن سے قرۃ العین حیدر کی آگ کا دریا ہی پڑھ رہے ہیں جو آپ کی مولیٰ عقل میں نہیں آ رہی۔“

بھری لائبریری میں مجھے شرمندہ کر دیا گیا۔ ڈیک سے چاہیوں کا کچھا جھپٹا میں تن فن کرتا الماری نمبر 13 کی طرف گیا تھا۔ سارا وقت میں کتاب بند

کے لگا تار مینا حفیظ کو گھورتا رہا، گھورتا رہا، وہ تھکی، سنبھلی، ہیل کی ٹنگ ٹنگ میرے قریب آئی۔

”آپ مجھے گھور رہے ہیں؟“  
شکر ہے مینا حفیظ کے پاس وہ ”چھو منتر“ نہیں ہے جس سے اگلا بندہ پلک جھپکتے ہی جل کر جسم ہو جاتا ہے۔ شکر یہ پارے اللہ کی اس حفاظت کے لیے۔  
میں نے سنجیدی سے سر اٹھایا۔ ”جی نہیں میں تو آپ کی بیک والی ہے وہ آئل پینٹنگ دیکھ رہا ہوں۔“  
جس میں ایک جنگل دکھایا گیا ہے اور چند بن مانس اچھل کود رہے ہیں۔ جانے کس احق نے بنائی ہے۔

”آپ مجھے احق کہہ رہے ہیں؟“ پھر سے لیڈ پسل کان کی اوٹ سے اچھلے پیچھے جا گری۔  
میں ہکا بکا مینا حفیظ کو دیکھ رہا تھا۔ ”اس کا مطلب وہ واٹر کلر والی تصویر بھی آپ نے بنائی ہے، جس میں ٹیڑھے میڑھے چاند اور پانچ نارے بنے ہیں؟“  
وہ غصے میں لال چلی آگے بڑھ گئی۔ ”آئی ہیٹ یو۔“  
مینا حفیظ کی گری ہوئی پسل میں نے اٹھا کر اپنے کان میں انکائی۔ دوبارہ اسے ہلا کر پسل واپس کرنے کی خطرناک غلطی میں نہیں کر سکتا۔ اب تو وہ پکا ہرے کچھوے والا پیپر وٹ گھما کر دے مارنی جو اس کے ڈیک پر پڑا نظر آتا تھا۔ میری تحقیق نے انکشاف کیا کہ جنگلی جانور بن مانس، کچھوے اس کے خالص پسندیدہ ہیں اور لائبریری کی آنکھیں اور کان رکھتی دیواروں کی تحقیق نے ایک اور انکشاف کر دیا۔

”صدام حسین کو مینا حفیظ سے کچھ کچھ محبت ہونے لگی ہے اور کچھ کچھ سی محبت بعد میں بست کچھ ہو جایا کرتی ہے۔“ (دیواروں کی باتوں سے ماخوذ)

فروری کی بارش نے جانے کب سے گردوغبار میں اپنی سویت لی کی بیلوں کو غسل کروایا تھا۔ ہر چتر ٹھہر گئی تھی۔ وہ بیگ تھامے سیدھی چلتی جا رہی تھی۔

مینا حفیظ ناک کی سیدھ میں چلتی تھی اور میرا ناک میں دم کر رہا تھا۔ میں گاڑی قریب لایا۔

مینا حفیظ ناک کی سیدھ میں چلتی تھی اور میرا ناک میں دم کر رہا تھا۔ میں گاڑی قریب لایا۔



”آئیے آپ کو ڈراپ کر دوں۔“ میں نے دانت نکالے اس نے دانت بھیجے تھے۔  
”فری ہونے کی کو شش کر رہے ہو؟“ میرا دل چاہا گاڑی کی سیٹ کا فوم پھنے اور میں اس میں دھنسل جاؤں۔

”میں ایسی دبی لڑکی نہیں ہوں، سمجھے۔“ شہادت کی انگلی سے مجھے دھمکایا گیا تھا۔  
مجھے جی بھر کے تاؤ آیا تھا۔ ”میں بھی ایسا ویسا لڑکا نہیں ہوں، سمجھیں۔“ یہ کہہ کر میں گاڑی بھگا لایا تھا۔ وہ وہیں کھڑی حیرت سے کچھ سوچتی رہی۔ سوچتی رہی۔ گو تم بدھ کی نواسی کیس کی۔ منہ بھاڑ کر مجھے جیسے شریف لڑکے کو کہہ دیا۔ میں ایسی دبی لڑکی نہیں ٹوکیا میں ایسا ویسا لڑکا ہوں۔ ہونہ ہو نہ۔

سوٹ پی کی بیلوں نے فردری کی بارش جم جم کر برستی رہی۔ زمین پر پانی کے گلبے بنتے، بگڑتے رہے اور میں نے اپنی محبت کا بلبلہ اس وقت پھوڑا جب وہ ادلی ٹالوڑ کا ڈھیر اٹھائے، بشکل سانس لیتی سامنے سے گزری تھی۔  
”آئی لویو، مینا حفیظ۔“

آآآآ — علی پور کا اعلیٰ راجہ گدھ، اواس نسلیں، ”الکھ گری ایک ایک کر کے گری تھیں میں نے بھی ایک ایک کر کے اٹھالیں۔

مینا حفیظ سکتے سے نکلی مجھ پر چلائی۔ ”آرپو میڈ“ کان میں اچھی پس اچھی اڑ کر گریزی میں اٹھانے کو جھکا اور ساری اٹھائی ہوئی کتابیں گرا بیٹھا۔ خیر دوبارہ اٹھانے کی غلطی قطعاً نہیں کی اور اسے صرف اتنا کہا۔ ”لیس، آئی ایم میڈ“ یہ کہہ کر لائبریری میں رکا نہیں۔ بلکہ تیز چیز چلا ”حاطا سکوت“ میں گہرا سکوت پھیلا کے باہر آیا۔ ”میرا پیغام محبت ہے، جہاں تک پہنچے۔“



”آپ پچھلے چار ماہ سے برابر مجھے پروڈ کر رہے ہیں اور آپ کو غلط فہمی بھی ہے کہ آپ مجھ سے طوفانی

حس کی محبت میں مبتلا ہو چکے ہیں۔ آپ کی حیثیت اور میری حیثیت میں زمین آسمان کا فرق ہے میں ہر بار کی طرح آپ کا روپوڈل رعبیٹ کرتی ہوں۔“ کافی کے بھاپ اڑاتے کپ کے کناروں پر انگلی پھیرتے اس کا جواب مجھ تک پہنچا تھا۔

میرا دل چاہا اس کا کچھوے والا پیپر وٹ اٹھا کر اپنے سر میں دے ماروں زخمی محبت ”میں انسانوں کے وجود کا قائل ہوں حیثیت مرتے میرے نزدیک ثانوی چیزیں ہیں۔“ میں نے ہمیشہ کا جواب اس تک پہنچایا اور وہ ہمیشہ کی طرح مجھے دیکھتی رہی، دیکھتی رہی۔

میں نے کچھ الفاظ کا اضافہ کیا۔ ”میں آپ کے لیے کچھ بھی کر سکتا ہوں۔“ میں نے کافی لمب کر کہا تھا۔

گو تم بدھ کی نواسی کو میرا لکنا ڈرا نہ بھایا تھا۔ ”میرے لیے جان دے سکتے ہو؟“ یوں لگا ارد گرد برف باری شروع ہو اور مینا حفیظ برف کے بجائے میرا سنو مین بنانے چلی ہو

”جان کے علاوہ کچھ مانگ لو نا۔“ جانے ٹائی کی گرہ کیوں تنگ ہونے لگی ہے۔

”اگر جان ہی چاہیے ہو تو؟“ مینا حفیظ پہلی بار مسکرائی تھی۔ شاید زندگی میں پہلی بار یہ میرا اندازہ تھا اور یہ الگ بات ہے کہ میرے لگائے گئے سارے اندازے غلط ہی ہوتے ہیں۔

”دے دوں گا۔“ اس کی جاوٹی مسکراہٹ نے مجھ میں چلائی بھر دی تھی واؤ

”جان نہیں چاہیے۔“ خو خوار حسینہ نے کافی کا کپ اٹھا کر لمبی سی چسکی لی تھی اڑتی ہوئی بھاپ۔

”اس آؤ پھر؟“ میں نے سوالیہ نظریں اس پر نکادی تھیں۔ وہ سوچتی رہی۔ پھر بولی تھی۔

”میں تم سے ہمار کی تعریف چاہتی ہوں۔ زندگی کے الگ الگ شعبوں سے، پیشوں سے وابستہ لوگوں سے تم ہمار کی تعریف طلب کر کے لے آؤ میرے

”مینا حفیظ نے یہ شرط رکھی تھی۔ میں حیران تھا اور انکے ہوں وہ کتنی عجیب اور مختلف سی ہے اور میں نے یہ کہہ کر وہ ایسی نہ ہوئی تو صدام حسن کو کبھی محبت ہی نہ ہوئی۔ اس نے میرے سامنے اہل رکھا ہے جو ہزار جواب رکھتا ہے۔

”ہمارے لیے اٹھائے گئے سوالوں کے جواب ہمارے دل ملا کرتے ہیں۔“

اور میں نے ہمار کا سوال سب سے پہلے حالی روڈ کے سامنے رکھا تھا۔ مصور نے برش کان کی آفت میں اٹکایا، مجھے لگا کہیں مینا کی پینل کی طرح مصور کا برش بھی نہ لڑھک جائے۔

مصور نے جواب دیا تھا۔ ”ہمار رنگوں کے عروج و زوال سے گزری ایک پہلی ہے جو تخلیق کے دائروں میں کھومتی پھرتی ہے۔ رنگ ہمار کا اشارہ ہیں۔“ میں نے یہ مصور کا قول ”ہمار یک“ میں نوٹ کر لیا تھا۔

پھر میں نے ہمار کا سوال پاک فی ہاؤس میں بیٹھی ایک کہانی کا سر سے پوچھا تھا۔ وہ پہلے تو ہنسی رہی اور اپنے اچھے بالوں کا ہونسلہ دائیں بائیں گھمائی رہی۔

پھر جواب ناگ آواز میں بولی تھی۔

”میں اپنی کہانی کے کرداروں کے ساتھ ہنسی روتی ہوں۔ ہر ایک دوسرے کے اچھے ساتھی ہیں اور جب میں ان کی کہانی مکمل کر لیتی ہوں تو وہ لمحہ ہمار ہوتا ہے۔“ اس دن کہانی کا خاتون نے مجھے چار کپ چائے لے پلائے تھے۔ مجھے چائے کے وہ ”چار“ کپ آج بھی یاد ہیں۔

وائٹن بجاتے عیسائی لڑکے نے ہمار یک میں ہمار کا دواں لکھا۔ ”اور میں اس وقت راحت محسوس کرتا ہوں، جب میرے وائٹن کی آواز کسی کو خوشی دیتی ہے، ایسا یہ ہمار سے کم ہے؟“

بہر حال میں یہ نہیں بھول سکتا کہ ابتدا میں اس نے کوئی خوف ناگ ساز بجاکر مجھے ڈرایا ضرور تھا۔ ٹائی ہوائے۔

تندور میں روٹیاں لگاتی رزق حلال کی شیدائی حلیمہ لی کا جواب مجھے بولا پسند آیا تھا۔ ”وے پتر جان رکھ

’جے تیرے دل وچ ایمان دا بو ٹالگا اے‘ تنہا کو وقت بہار دالے۔“

ہمار کے سوال نے مجھے چینی پروفیسر فوکاک کے سامنے کھڑا کیا۔ ان کے بال بہت چمک دار اور سیاہ تھے۔ چھوٹی چھوٹی آنکھیں نہایت سے بھرپور تھیں۔ وہ لحظہ بھر کو سوچتے رہے، پھر بولے۔

”صدام! ہر وہ ساعت ہمار ہے جب تک معلم طالب کو ایمان داری سے علم سکھاتا رہے۔“ یہ کہہ کر پروفیسر فوکاک نے اپنی چمک دار سیاہ بالوں والی وگ شان بے نیازی سے انار کر کر گلوب پر لٹکادی۔

میں ہکا بکا دکھتا رہا کیونکہ میں ان سے کم و بیش تین بار ان کے بالوں کی تعریف کر چکا تھا۔ یہ شرمندگی اور میرا تو جیسے چلی دامن کا ساتھ ہے۔ ہونہ۔

ہمار میں ہی ہماروں کے جواب لے کر میں مینا حفیظ کے پاس پہنچ گیا تھا، ہمار یک سے میں ہمار کے جواب اسے سنا رہا تھا۔ اور وہ ہنسی ہوئی کچھوے والا اپنا تار اور نایاب پیپر وٹ گھما رہی تھی۔

سوٹ پی کی بیلوں پر ہمار کی قتلخ منڈلا رہی ہیں۔ مینا حفیظ نے مجھے دیکھا ہے۔

”تمہارے لیے ہمار کیا ہے؟“ مقدس خاموشیوں میں ہماریں میری مدد کو آن پہنچی ہیں۔

”مینا حفیظ کا اقرار صدام حسین کے لیے ساعت ہمار ہے۔“ ڈال کلاک کی ٹک ٹک گونج رہی ہے۔

مینا حفیظ نے آگ کا دریا مجھے تھادی ہے۔ ”تو پھر تمہیں ساعت ہمار مبارک ہو۔ میں راضی ہوں۔“

میں ہمار زاہد اس ہمار زادی کی خطرناک حد تک ڈراؤنی ہنسنی گویا تعریفیں کر رہا ہوں۔

”محبت ہمار کا پہلا پھول ہے۔ اس پر کبھی خزاں کا موسم نہیں ٹھہرتا۔“

”آپ سب کو ہمار مبارک آؤ صدائیں سب مل کر ہمار حاضر ہو۔“



## ناولٹ

مر مر میں سرور ات اپنے جلو میں رنگ ساز اور گیت لیے کسی رقاصہ کی مانند محور گھوم رہی تھی۔ رنگ و بو کا ایک سیلاب اس کے ہر تڑپے کے ساتھ فضا میں پھیلتا جاتا تھا۔ اس کی مدائی خوشبو وہاں موجود ہر شخص پر خوشی اور انبساط کے پے لٹا رہی تھی۔ وہ شانہ ملی کی رات تھی۔ لاہوریوں کو ایسٹ انڈیا کی سڑکی کا لطف آگیا تھا۔ خوشبودار تھوے، سبز چائے، مٹھائی اور ڈرائی فروٹس سے باریتوں کی تواضع کی جا رہی تھی۔

”یار عاشق تو ساری سراسل — حسین ہے کیا

عطیہ خالد

## عطیہ خالد کی ناولٹ

مسحج آیا۔  
”بے خبر تو! میں اکیلا ایچ رہ سوکھ رہا ہوں۔ جب تک دل میں نہیں آتی تم لوگ نہیں مر سکتے میرے ساتھ۔“ میں نے مسحج بڑھ کر سنایا۔  
”نہیں۔“ ساغر نے صاف انکار کیا۔  
”مر تو سکتے ہیں مگر چہ نہیں سکتے۔“ عاصم نے فوراً جواب لکھ بھیجا۔

”دیکھ لوں گا تم سب کو۔“ اس نے ہمیں دیکھتے نظر ہر مکرراتے ہوئے مسحج کیا۔  
عاشق اپنے والدین کا اکلوتا تھا۔ اس کے کزنز وغیرہ سب لڑکی والوں کی طرف سے شریک تھے۔ اس لیے بارات میں انکل آئی ہم سب شیدا بنیں کو بصد اصرار لائے تھے۔ اور ہم سب کو بے حد لطف آ رہا تھا۔  
ہماری خوش پکیاں جاری تھیں کہ اسی دوران دل میں



کے آنے کا شور مچ گیا۔ ہم عاشر کو ہاتھ ملاتے شرافت سے آخری میز کے گرد کرسیوں پر چلے گئے۔

چھوٹی چھوٹی بچیاں ایک ترتیب سے ایک جیسے لباس میں بلبوس علاقائی گیت گاتی ہوئی آئیں۔ پیچھے خواتین کے جھرمٹ میں دلہن تھیں۔ خالہا "زنانہ محفل" تھیں۔ ہم سب رخ موڑے باتوں میں مصروف رہے۔

دلہنا "مجھے یوں محسوس ہوا جیسے فضا میں پھیلی ہوئی سفید چمکتی چاندی پھیل گئی ہو۔ ایسا ہرگز نہیں تھا کہ میں نے اس سے قبل کوئی خوب صورت لڑکی نہیں دیکھی تھی، مگر ایسی لڑکی بہر حال نہیں دیکھی تھی جس کی شبہ عکس بن جائے اور دل اس عکس کو تصویر بنا لینے کی خواہش کرنے لگے۔

وہ اپنا لباس بالادہ دونوں ہاتھوں کی چٹکیوں میں تھامے بیچ سے اتر رہی تھیں۔ ادھر ادھر آ جا رہی تھیں۔ وہ ادھر آ رہی تھیں۔ کبھی کسی سے جھک کر کچھ کہہ رہی تھیں۔ پھر اس نے ہنستے ہوئے اپنی پیشانی پر ہولے سے ہاتھ مارا۔ میری نظریں اس کے ساتھ ساتھ تھیں۔

یہ میں بھلا کب سے اتنے بے اختیار ہو گیا تھا۔ میں نے خود کو اب اس محفل میں لانے کی کوشش کی۔ صد شکر کہ کھانے کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا اور نہ ساغر اور عاصم کی نظروں سے میرا رخ پانا ناممکن تھا۔ دلہن کے بھائی ارسلان اور عمران میزبانی کے فرائض ادا کرتے ہمیں بے تکلفی سے کھانے کا کہہ گئے تھے۔ وہ نہ بھی کہتے تو ہم بے تکلفی کا ریکارڈ توڑنے والوں میں سے تھے۔

مانا کہ کھانا بے حد لذیذ تھا اور ہم تھے بھی باراتی۔ لیکن عاصم اور آصف کو دیکھ کر میرا اور ساغر کا خون کھول رہا تھا۔ ان کا پہلا اور آخری مقصد حیات اس وقت کھانا تھا۔

خدا خدا کر کے کھانے کا سلسلہ ختم ہوا۔ جیسے ہی بیڈن نے رخصتی کا سنا جانا شروع کیا، ہم اٹھ کھڑے ہوئے اور نیچے گاڑیوں کا انتظام دیکھنے پہنچ گئے۔

گئے۔ اب عاشر کے دوسرے کزنز کو بھی ہمارے ساتھ جانا تھا۔

دلہن کو بڑی سی اجرک پہنائے ارسلان اور عمران سہارا دے کر لارے تھے۔ عاشر اور انکل کے ساتھ دیگر مورشتہ دار نیچے پارکنگ تک آ چکے تھے۔ کچھ خواتین ابھی اوپر ہی تھیں۔ آئی کو لینے میں اور آیا تو وہ ان کے ساتھ ٹھہری تھیں۔ آئی اسے پیار کر رہی تھیں۔

"اچھا بیٹا! اب اجازت دو۔ کل ملاقات ہوگی۔"

"کیا کوئی روتے ہوئے اتنا خوب صورت لگ سکتا ہے۔" بے اختیار میرا دل چاہا کہ ہاتھ بٹھا کر اس کے آنسو چوں۔

"یہ آپ کا سوٹ کیس۔"

اس نے آنسو پونچھتے ہوئے اپنی سبز آنکھیں اٹھائیں۔ ایک لمحے کے لیے ان آنکھوں نے اٹھ کر میری ہستی کو زیر کر لیا۔

سب گاڑیاں آگے پیچھے روانہ ہو گئیں۔ پندرہ منٹ کی مسافت پر وہ دوسرا ہوٹل تھا۔ جہاں ہماری رہائش تھی۔ دلہن کو آئی کمرے میں لے گئیں۔ اور اس کی کزنز جو ساتھ آئی تھیں گیت گانے لگیں۔ ہم نے عاشر کو گھیر لیا۔ میرا دل اس ہنگامے اور دلچسپ محفل سے دور بھٹک رہا تھا۔ آنسوؤں سے بھری سبز آنکھوں میں۔ جیسے ہی عاشر اپنے کمرے میں گیا اور باقی تینوں اپنے اپنے بستر پر ڈھیر ہوئے، میں چپکے سے باہر نکل آیا۔

عاشر کے سسرال والوں کے ہوٹل سارے شبلی علاقہ جات میں پھیلے ہوئے تھے۔ اس شہر میں بھی ان کے کئی ہوٹل تھے۔ جس ہوٹل میں شادی ہوئی اور جس میں ہم ٹھہرے ہوئے تھے، یہ بھی ان ہی کے تھے۔ دونوں شہر کے کنارے نسبتاً "اوپر" پارٹی پر واقع تھے۔

پورے چاند کی روشنی میں ایک بے حد حسین رات چلی ہوئی تھی۔ بل کھائی، لہرائی، پتھروں سے مرزبان تلی سی سڑک پر چلنا ہوا میں نیچے سامنے خوابیدہ

دلہن منظر کو تک رہا تھا۔ دور دور جلتی ہوئی گلیاں جگنوؤں کی طرح محسوس ہو رہی تھیں۔ شہر کے ان میں طرف موجود برف سے ڈھکی پہاڑ کی سفید گلیاں چاندنی میں چمک رہی تھیں۔ جیسے اس پہاڑ نے راز افشاں کرنے پر آمادہ ہوں۔ اور یا میں طرف اب کے ساتھ المستاد پہاڑ پر چنار اور صنوبر کے پستانار اور اونچے اونچے درخت، صنایع کی صنایع پر محو تھے۔ ساکن اور موڈب۔ دست بستہ، محو راز و باز۔

میرا پرانا رفیق، میرا دوست، چاند آسمان پر مسکرا رہا تھا۔ وہ ہمیشہ سے راز دار تھا میرا۔ میرے دل کے رازوں سے واقف، دھیرے دھیرے لب دبائے۔ ساتھ چلنا ہوا۔ مسکرا کر پوچھ رہا تھا۔

"آج کی کاخیال ساتھ لائے ہو شاید؟"

"ہاں! خیال بھی اور جمال بھی۔"

"کیسی لگی وہ! اس کی تلاش میں سرگرداں تھے ناں؟"

"تم سے بھی زیادہ شفاف، اجلی، دلکش اور دلنوازا؟"

"پھر مل گئی تم کو تمہاری خواہش چاند کی مسکراہٹ کہی ہو گئی۔"

"ہاں میرے دوست۔" میں نے اعتراف کر لیا۔

"خوش رہو۔" اس نے چپکے سے دعا دی اور ایک بال کی اوٹ میں ہو گیا۔

\*\*\*

"تم نے تو کہا تم مجھ سے محبت کرتے ہو، میرے بغیر ی نہیں پاؤ گے پھر اب؟ کہاں ہو تم مجھے کیوں نکال باہر اپنا اپنی زندگی سے۔"

"پتا نہیں اس کا یہ دورہ کتنا لمبا چلے والا ہے؟" نیلم نے تاسف سے دشمہ کی طرف دیکھا جو بول بول کر اپنی اپنی ہوئی جا رہی تھی۔ سارہ کو دالانے کا اشارہ کرتی وہی وہ آہستہ سے اس کی طرف بڑھی۔

"ارے تمہیں تو بخار ہے دشمہ۔ سارا بدن بھیگی طرح جل رہا ہے۔"

اس نے ڈرتے ڈرتے قریب ہو کر اس کا ہاتھ سہلایا۔ خلاف توقع اس نے اپنی آنسو بھری براؤن آنکھوں سے نیلم کی طرف دیکھتے ہوئے سسکی لی اور اس سے لپٹ کر آنکھیں موند لیں۔ اتنے میں سارہ دو لے کر آچکی تھی۔

"یہ لو دو لکی کھالو۔" نیلم نے نرمی سے اس کے ریشمی بالوں کو سنوار کر دو اس کے منہ میں رکھ کر پانی کا گلاس اس کے لبوں سے لگا دیا۔

"اب اسے سونے بنا۔ خبردار جو تم نے اماں کو اس کمرے کی طرف پھٹکنے بھی دیا۔ مجھے اپنے گھر کی مجبوری نہ ہوتی تو کبھی اسے اس حال میں چھوڑ کر نہ جاتی۔ ویسے ہی وہ شکایت کرتے رہتے ہیں کہ "ابنی بہن کی وجہ سے تم نے سارے گھر کو نظر انداز کرنا شروع کر دیا ہے۔" میرا بس چلے تو اسے اپنے ساتھ گھر لے جاؤں۔ لیکن اس کی چیخیں۔"

"نپا! آپ فکر نہ کرو۔ میں بیٹیں ہوں اس کے پاس۔ اور یہ دو ختم ہو شمشہ کی۔"

نیلم نے ڈاکٹری نسخہ لکھ کر جی بیگ میں رکھا اور تاسف سے اس سونے کو دیکھنے لگی جو اب بیتل میں ڈھل چکا تھا۔ چاند کی چودھویں سا حسن، اب چاند گرہن کی طرح ہو گیا تھا۔ وہ ان تینوں بہنوں میں سب سے خوب صورت، طرہ دار تھی۔ ہر بات میں آگے ہر انداز میں الگ۔ کیا یہ وہی دشمہ تھی جس کی زندگی بھار کا دوسرا نام تھی۔ جو ہر دن کو زندگی کا آخری دن سمجھ کر گزارتی تھی۔ اور اب۔۔۔ اب تو وہ جیسے اپنی زندگی کے آخری دن کے انتظار میں ہی تھی۔ صرف اس لیے کہ۔۔۔ اسے محبت کے نام پر دھوکا ملا۔

\*\*\*

"شانہ! پھر آپ نے کیا سوچا ہے؟" کیپٹن شارق نے پوچھا۔

"کس سلسلے میں؟" شانہ نے ذرا چونک کر شوہر کی طرف دیکھا۔

"ارے بھی! آپ کو تو مجھ سے بھی زیادہ جلدی

تھی فارس کی شادی کی۔ تو اب تک تو آپ کو اسماء سے بات کر لینی چاہیے۔" کیپٹن شارق نے کتاب پر سے نظریں اٹھا کر کہا۔

"میرا دل چاہتا ہے کہ فارس کی ہاؤس جاب مکمل ہوتے ہی شادی کر دی جائے۔ اسپیشلائزیشن ہونا رہے گا وقت کے ساتھ ساتھ۔ آپ کا کیا خیال ہے؟" ڈاکٹر شائدہ ذریعہ تک نیل کے استنول پر بیٹھی اپنے بال برش کر رہی تھیں۔

"جی جناب! میرا بھی دل چاہتا ہے۔ لیکن میں اسماء سے بات کرنے سے پہلے ایک بار فارس سے پوچھنا چاہتی ہوں۔"

"ہو سکتا ہے اس کا کہیں اور خیال ہو۔" پوچھ کے دیکھ لیجیے مناسب بھی یہی ہے۔" کیپٹن صاحب نے دوبارہ کتاب پر نظریں جمائیں۔ "فارس جب سے ایبٹ آباد سے واپس آیا ہے کچھ خاموش ہے۔ مجھے تو قدرے الجھا ہوا بھی لگا؟"

وہ پر سوچ انداز میں بولیں۔ بیوی کی بات سن کر کیپٹن صاحب کچھ دیر کو خاموش ہو گئے۔ وہ خود کو بھی محسوس کر رہے تھے کہ وہ کچھ زیادہ ہی سنجیدہ اور چپ چاپ تھا۔

"اگر تم نے بھی اس بات کو محسوس کیا ہے تو فارس سے بات کر لو۔ ہو سکتا ہے دوستوں میں کوئی بات ہو گئی ہو۔"

"کل میرا آف ہے۔ میں اس سے بات کروں گی۔" انہوں نے برش رکھ کر چوٹی گوندھتی شروع کر دی۔ انہیں بال باندھ کر سونے کی عادت تھی۔

صبح ناشتہ کے بعد کیپٹن صاحب آفس کے لیے اٹھ گئے۔ انہوں نے ریٹائرمنٹ کے بعد اپنے دوست کی ایڈورٹائزنگ ایجنسی جوائن کر لی تھی۔ فارس نسلی سے چائے پی رہا تھا۔ شائدہ بھی چھٹی کی وجہ سے نسلی سے بیٹھی فارس سے چھوٹی چھوٹی باتیں کر رہی تھیں۔

"فارس! آپ کو کب نکلتا ہے اسپتال کے لیے؟" انہوں نے اسے اٹھتے دیکھ کر پوچھا۔ "ایک گھنٹہ ہے میرے پاس آپ نے جانا ہے"

کہیں؟

"جانا تو کہیں نہیں۔ بس تم سے بات کرنی ہے۔ وہ مسکرائیں اور اس کے ہاتھ کو بوسہ دیا۔

"خیریت؟ کیا بات ہے ملا؟" فارس اٹھتے اٹھتے بیٹھ گیا۔

"فارس بیٹا! میں تمہاری خالہ اسماء سے بات کرنا چاہتی تھی۔"

"کیسی بات ملا؟" فارس نے تعجب سے پوچھا۔

"ہماری ہو کو اب ہمارے گھر آ جانا چاہیے ناں؟" جی۔ وہ مسکرا کر بولیں۔

"اوہ! اچھا! ابھی اس ذکر کو جانے دیں۔ ابھی اس ذکر کا وقت نہیں۔ ابھی تو میری پر بھائی بھی مکمل نہیں ہوئی۔"

"کیوں بھی؟ دو ماہ بعد تمہارا ہاؤس جاب ہو جائے گا۔ اب تو وقت آ گیا ہے میری جان میں تو کب سے اس دن کا انتظار کر رہی تھی۔"

"ملا! میرا ابھی موڈ نہیں ہے۔ میں اتنی جلدی شادی نہیں کرنا چاہتا۔"

"موڈ بناؤ گے تو بنے گا ناں۔ تمہارے پیلا بھی یہی چاہتے ہیں۔"

"کیوں کیپٹن صاحب سے میری آزادی برداشت نہیں ہو رہی۔ حسد کرنے لگے ہیں مجھ سے؟" وہ شرارت سے بولا۔

"کیا؟" شائدہ مصنوعی غصے سے بولیں۔ "ہیٹاؤس گی تمہارے پیلا کو کہ کیا خیالات ہیں صاحبزادے کے ان کے متعلق۔"

"ضرور۔ ضرور۔"

"کہیں ایسا تو نہیں کہ تم کسی اور کو پسند کرنے لگے ہو۔ ایبٹ آباد میں کوئی پری وری تو نہیں نظر آئی۔"

"اگر ایسا ہے بھی تو سب سے پہلے آپ کو بتاؤں گا۔ آپ کو فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔" وہ شرارت کے موڈ میں تھا۔

"ٹھیک ہے لیکن جلدی۔ ہمیں اپنے گھر میں رونق چاہیے۔"

"اچھا ملا! آج تو مجھے ایک ضروری کام سے ایبٹ آباد ہاؤس پر بات کریں گے۔" وہ بولا۔

"ارے پھر ایبٹ آباد؟ ابھی چند روز قبل تو تم وہاں آ رہے تھے۔ اب پھر؟"

"ملا! اس وقت تو میں عاشق شادی پر گیا تھا۔ اب ہا ہا ہا! دوسری نوعیت کا کام ہے۔"

"اس وقت جانا ہے؟"

"ابھی تو ہسپتال جاؤں گا۔ پھر تقریباً گیارہ بجے وہاں آؤں گا۔ آپ میرا بیگ ریڈی کروا دیجیے گا۔"

"اے ہا ہا ہا! سوری ہے۔ میرا لانگ کوٹ بھی رکھوا دیجیے گا۔"

"وہ شائدہ کے سر پر بوسہ دیتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔" خدا صاف لکھ کر وہ وہیں بیٹھ کر سوچ رہی تھیں کہ وہاں لکھی ہوئی۔ اسماء کا فون تھا۔



شادی کے اگلے دن آغا فاران صاحب نے ہم سب کو بلایا تھا۔ ان کے قدیم طرز کے وسیع اور شاندار راتنگ روم میں ہم سب بیٹھے تھے۔ نیلے اور زرد رنگ کے استراج سے سجایا راتنگ روم بے حد دلکش تھا۔ بارہ گئے کا حوط شدہ سر تو بے حد دلکش تھا۔

ہم سب جائزہ لینے میں مصروف تھے۔ دائیں طرف دو دو فونو فریجز دیکھ کر ساغر بولا۔

"فارس! مجھے تو لگتا ہے تو اسی خاندان کا ہے۔"

عاصم بھی بولا۔ "واقعی فارس تو بالکل آغا صاحب کا بیٹا ہے۔"

"ایسا فصول بات کر رہے ہو تم لوگ۔"

مجھے ہنسی آئی۔ عاصم کی عادت تھی اتنی سنجیدگی سے بات کرنا۔

"ارے یار! ان لوگوں کا کوئی بھائی بچپن میں اغوا تو کیا؟"

"عاصم کہاں باز آنے والا تھا۔"

عاصم کی لن ترائی ابھی اور آگے تک جاتی لیکن

ملازم نے کھانا لگنے کی اطلاع دے دی۔ اس کے پیچھے ارسلان اور عمران بھی ہمیں بلانے چلے آئے۔ ارسلان کی بھی اپنے والد سے کافی مماثلت تھی۔ جبکہ عمران قدرے مختلف تھا۔ لیکن دونوں میرے ساتھ چلتے ہوئے میرے بھائی لگ رہے تھے۔ میں نے اس بات کو محسوس کیا۔ آغا فاران احمد ڈرائنگ ہال کے منقش دروازے پر کھڑے خوش آمدید کہہ رہے تھے۔

عاشق کے ابو بھی وہیں موجود تھے۔ عاشق ساغر اور عاصم وغیرہ کو انہوں نے ہاتھ ملا کر کندھے پیچھا کر خوش آمدید کہا اور مجھے ہاتھ ملاتے ہوئے ایک دم اپنے سینے سے لگا لیا۔ ان کے انداز میں بہت گرم جوشی تھی۔ میرا پورا وجود جیسے کپکپا گیا۔ ان کی گرم جوشی کے مقابل پر میں نے خود کو بالکل سرد محسوس کیا۔

یہ ایک مغربی طرز کا ڈرائنگ ہال تھا۔ قدیم طرز تعمیر سے مزین عمارت میں ایسا ڈرائنگ ہال اچھوتا سا محسوس ہو رہا تھا۔ میز انواع و اقسام کی نعمتوں سے پر تھی۔ مجھے

آغا جان نے اپنے دائیں طرف بٹھا لیا تھا اور اصرار کر کے میری پلیٹ میں کچھ نہ کچھ ڈلواتے رہے۔ مگر میری بھوک بالکل ختم ہو گئی تھی۔ ان کے سوالات کا

غیر حاضر دماغی سے جواب دیتا رہا۔ شاید انہوں نے میری لافعلی محسوس کر لی تھی۔ اس لیے وہ بھی خاموش ہو گئے۔ جبکہ باقی سب عمران اور ارسلان کے ساتھ چٹکے چھوڑتے رہے۔

"یار! لگتا ہے ان کو بھی تجھ میں اپنا چھڑا ہوا بیٹا نظر آ رہا تھا۔"

ڈنر کے بعد باہر نکلتے ہی عاصم بولا۔ عاشق تو ٹھانہ بھائی اور انکل، اتنی وغیرہ کو گاڑی میں لے کر ہوٹل چلا گیا تھا۔ ہم لوگ چلنے کے ارادے سے پیدل نکل آئے تھے۔ لیکن مجھے اپنا یوں بار بار زیر بحث لایا جانا بہت ناگوار گزارا۔

"شٹ اپ عاصم! کیا فصول مذاق ہے یہ۔"

میں خلاف مزاج درشتی سے بولا تو ساغر نے بات بدل دی اور بولا۔

"یار! میں نے ایک پان کی دکان تلاش کی ہے۔"



انسانی زبردست پان ملنے ہیں وہاں۔ لاہور میں کبھی ایسا لذیذ اور خوشبودار پان نہیں کھایا۔  
یوں ہم سب اس کے بتائے راستے پر پان کھانے کے لیے چل پڑے۔

\*\*\*

”وشمہ! تم نے سیر کمانی سے بات کی؟“ ماں نے بھنوس اچکا کر اس سے پوچھا۔  
”گناہ تو تھا آپ سے۔ کروں گی۔“  
”وہ روز تمہیں یک کرنے آجاتا ہے، تم اس سے سیدھے سیدھے بات کیوں نہیں کرتیں؟ ذرتی ہو اس سے۔“ ماں آپ کو ایسا کیوں لگتا ہے کہ وہ مجھے دھوکا دے رہا ہے۔

”یہاں دوا کرنا توں ہے۔ مرد تو بالکل نہیں۔“  
ماں ٹھیک کہہ رہی ہیں وشمہ! تم اس سے بات کر کے تو دیکھو۔“  
”موقع محل دیکھ کر ہی بات کروں گی ناں۔ ایسے کیسے سیدھا سیدھا کہہ دوں کہ کوئی کو بھی ہنگامہ میرے نام لگا دیں۔“ وہ چڑی۔  
”موقع محل دیکھا نہیں جاتا، پیدا کیا جاتا ہے۔“  
ماں بھی چڑ گئیں۔ ”ابھی تمہارے قبضے میں ہے طوطے کی جان۔“

”ویسے آپ! کیا کیا کرتا ہے طوطا؟“ سارہ نے وشمہ کی طرف جھک کر پوچھا۔  
”وہی جو تم جتنی ہو کہ مجھ میں اس کی جان بند ہے۔“ وہ جو چڑی بیٹھی تھی، کھل اٹھی۔ اتنے میں اس کا موبائل ننگنٹا۔  
”ارے وہ بس مجھے پک کرنے آنے ہی والے ہیں۔ میں جلدی سے تیار ہو جاؤں۔“

کچھ دیر بعد نیلے رنگ کی ساری کا بارڈر سنبھالتی، دوسرے ہاتھ سے سسکی براؤن بالوں کو سنوارتی وشمہ، سیر کمانی کے دل پر بجلیاں گرائی اس کی سیاہ مریدیز میں بیٹھی بھورن پی سی کی طرف روانہ ہو چکی تھی۔

آج اس کا ارادہ تھا کہ بات کرنے کے لیے ماحول بنالے ورنہ ماں نے اس کے کان کھا جانے تھے۔  
وہ سیر کمانی سے مری میں ملی تھی۔ وہیں بقول سیر کمانی اسے وشمہ کو دیکھتے ہی محبت ہو گئی تھی۔ وشمہ کو بھی سیر کمانی سے محبت ہونے میں زیادہ وقت نہیں لگا تھا۔ ماں نے ساری زندگی ایک خوش باش، آزاد خیال زندگی گزاری تھی۔ انہوں نے زمانے اور زمانے کی چال کی کم ہی پروا کی تھی۔ اب ماں سے عمر میں کافی بڑے تھے، لیکن چونکہ جائیداد والے تھے اس لیے ماں نے ان سے شادی کر لی تھی۔ وہ تینوں بھینس ابھی چھوٹی ہی تھیں جب ابافوت ہو گئے۔ ماں کو شادی کے بعد بھی آزادی پیاری رہی اور بیوگی کے بعد بھی۔ ان کے جوان ہونے پر ان کے لیے بہت سے رشے آئے لیکن ماں تو کوئی صاحب جائیداد ہی اپنی بیٹیوں کے لیے چاہے تھیں۔ نہ انہیں مشکل و صورت سے مطلب تھا، نہ بڑھائی لکھائی سے۔ خود اپنی جائیداد انہوں نے پیچ پیچ کر کھالی تھی۔ اب بس مشکل سے ہی ان کا گزارا ہو رہا تھا۔ بیٹیاں جوان ہو گئی تھیں تو اس بھی کہ داماد دولت مند ہوں گے۔ ان کی زندگی کو پر آسائش بنادیں گے۔ سیر کمانی کی بے تحاشا دولت نے ماں کو وشمہ سے پہلے ان کا گرویدہ کر دیا تھا۔ اور انہوں نے وشمہ کو مجبور کرنا شروع کر دیا تھا کہ وہ شادی سے پہلے کچھ اپنا نام لگوالے۔

”صرف ایک کو تھی؟ بخارہ تھا یہ دل تم سے ملنے سے پہلے مگر فکر، قریہ قریہ بھٹکنے والی بخارے کو تم نے اپنا اسیر کر لیا ہے۔ آٹا کر لیا ہے ایک جگہ ٹھہر جانے پر، ایک گھر بنانے پر۔ تمہاری تو ہر تنہا پوری کرنا میرا فرض ہے۔ تم پر تو کمانی اپنا پورا برس امپائر ترقیان کر سکتا ہے۔ تم حکم کر کے تو دیکھو!“ وہ دل پر ہاتھ رکھ کر بولا۔ وشمہ نے ایک دلبرانہ قہقہہ لگایا۔

”ماں بس یہ چاہتی ہیں کہ میرا مستقبل محفوظ ہو جائے۔ اب بھی نہیں ہیں، اور ہمارا کوئی بھائی بھی نہیں ہے۔ اس لیے بس۔“  
”ہاں ہاں کیوں نہیں۔ مائیں ایسے ہی فکر مند

ہیں۔“ سیر کمانی نے محبت بھرے الفاظ کا جال بٹھانے لگا۔ اطراف بچھاؤ لگا تھا۔ جس میں وہ اپنی مرضی پہنچانے بوجھتے ہوئے چھٹنے کے لیے تار تھی۔  
”سب کام تھوڑا پر پھینچیل ہوں گے۔ ہم نکاح کریں گے اور نکاح کے بعد میں تمہیں مری میں موجود رہنے کو تھی میں رکھوں گا۔ تمہیں میری مجبوری کا خیال رکھنا ہو گا۔ بس جب تک حالات سازگار نہ ہوں میں تمہیں اپنی فیملی سے نہیں ملواسکوں گا۔“  
”لیکن ملواتو دیں گے نا؟“

”تمہیں نہیں ملواتوں گا تو اور کسے ملواتوں؟ بیوی بننے جا رہی ہو تم میری۔ عزت ہو میری۔ اگر ہمارے ہاں خاندان میں ہی شادی کا رواج نہ ہوتا تو میں ایسے نہ پک کر نکاح بھی نہ کرتا۔ تمہیں شان سے بیاہ کر لے آجاتا۔“

”نکاح کے بعد گھر والے ماں جائیں گے؟“  
”کیوں نہیں مائیں گے۔ نکاح کے بعد ان کا زور ماں چلے گا مجھ پر؟“ طاہر جب خود ہی ایسا معصوم ہو تو ہلکا سا دھوکہ کسی اخلاقی تدبیر کی کیا ضرورت تھی۔ بڑے مکن انداز میں اس نے گاڑی کو پی سی کی داخلی دروازے پر روکا تھا۔

\*\*\*

اگلے روز ہم سب لاہور آگئے تھے لیکن مجھے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے اپنا کوئی حصہ وہیں چھوڑ آیا ہوں۔  
”کیا بے چینی مجھے پھر ایٹ آباد لے آئی تھی۔ اور اب بے چینی جھنجھلاہٹ میں بدل رہی تھی۔“  
”بس سوچو اب۔“

ہوٹل پہنچنے تک میں فیملہ کرچکا تھا۔ مزید افغانستان پلاؤ اور گرلڈ چمن کاؤز کرتے ہوئے میں نے اپنے اہن کو پرسکون کرنے کی کوشش کی اور کسی حد تک اس میں کامیاب بھی ہو گیا۔ غنیمت بھی کافی بہتر آئی۔ صبح میں اپنی براؤن میں پنڈلی لپی رکھ کر پلٹا ہی تھا کہ دوسری طرف گاڑی سے نکلے ہوئے ارسلان سے بری طرح ٹکرا گیا۔

”اوہ معاف کرنا، ارے بھائی فارس! آپ یہاں؟“  
آپ کب آئے؟ گھر کیوں نہیں آئے؟“  
اس نے ایک ساتھ ہی اتنے سارے سوال پوچھ لیے۔

”بس یار! ایک ضروری کام سے آیا تھا۔ جلدی واپس جانا تھا اس لیے گھر نہ آسکا۔ میں نے جان چھڑانے کا سا انداز اپنایا۔“

”چلیں بابا جان سے ملو اؤں۔ وہ آپ کو بہت یاد کرتے ہیں۔“ وہ خلوص بھری سادگی سے بولا۔  
”یار! مجھے آج بہت جلدی ہے۔ میں اس وقت گھر نہیں جا سکتا۔“

”گھر جانے کا کون کہہ رہا ہے۔ بابا جان کا آفس میں ہے۔ ہمارے اس ہوٹل میں شیئر زیں۔“  
وہ میرا ہاتھ پکڑ کر تقریباً ”کھینچتا ہوا بولا۔

چند لمحوں بعد ہم گراؤنڈ فلور پر موجود ایک خوب صورت آفس میں موجود تھے۔  
”دیکھیے بابا جان! فارس بھائی یہیں ٹھہرے ہوئے تھے۔“

اور آغا فاران صاحب نے جیسے ارسلان کی بات سنی ہی نہیں، وہ میز کے پیچھے اپنی کرسی دھکیل کر تیزی سے آگے آئے۔

”السلام علیکم۔ خوش آمدید۔ مرحبا۔“  
ان کی آنکھوں کی چمک اور محاففہ کا انداز ان کی خوشی کے اظہار کے لیے کافی تھا۔ گلے لگانے کے بعد انہوں نے مجھے خود سے علیحدہ کر کے کندھوں سے تھام لیا۔ جیسے بھرپور انداز میں کوئی باپ اپنے دیرینہ بچھڑے ہوئے بیٹے کو دیکھتا ہو اور پھر میری پیشانی پر بوسہ دیا۔ میری پیشانی دھک اٹھی تھی۔

وہ مجھے ساتھ لیے لیے آفس میں موجود صوفوں کی طرف بڑھ گئے اور مجھے ٹھاکر لے کر لے گئے۔  
”مجھے یقین تھا کہ تم ضرور آؤ گے۔“  
ارسلان جو شاید اب تک کی کاروائی کو حیرت سے دیکھ رہا تھا بولا ”دیکھا فارس بھائی! میں نہ کہتا تھا، بابا جان آپ کو بہت یاد کرتے ہیں۔“

”ارسلان! شاندار سی چائے منگو اور خیر سے کما  
 اخوت کا حلوہ بھی لے کر آئے۔“  
 ارسلان انٹرکام پر پیغام دینے لگا۔  
 ”اور ہاں صہبا کو بھی کال کرو۔“  
 میں جوان سے اجازت طلب کرنے کا ارادہ کر رہا تھا  
 صہبا کا نام سن کر بیٹھ گیا۔ ارسلان نے کسی چپک پر سانس  
 لینے تھے مگر اتنا جان نے اس کو انکار کر دیا۔  
 ”ہوتے رہیں گے کام۔ دیکھ نہیں رہے آج ہمارا  
 بیٹا آیا ہے۔“  
 میں ان کا بیٹا کہاں سے ہو گیا۔ میں نے دل میں  
 سوچا۔  
 ”السلام علیکم“ کی آواز کے ساتھ ہی جیسے کمرے  
 میں روشنی ہو گئی ہو۔ میں بے اختیار پذیرائی کے لیے  
 کھڑا ہو گیا۔  
 ”او! آؤ صہبا بیٹا! یہ ہیں ڈاکٹر فارس احمد۔ ثانیہ کی  
 شادی پر دیکھا ہو گا تم نے انہیں۔“  
 صہبا نے اپنی ساری چاندنی لیے میرے اندھیرے  
 کو روشن کرتے ہوئے میری طرف دیکھا۔ وقت اسی  
 ایک لمحے میں ٹھہر گیا۔  
 ”اور فارس بیٹا! یہ میری لاڈلی صہبا حسن۔ برنس  
 اینڈ منسٹریشن میں ماسٹر کیا ہے اور اب ہمارے  
 ہوٹل منہج کر رہی ہے۔“ تعارف کے ساتھ وہ کمال  
 اعتماد کے ساتھ مجھے بیٹھنے کا اشارہ کرتی خود بھی بیٹھ گئی۔  
 ”صہبا کو بھی بہت شوق تھا میڈیکل میں جانے  
 کا۔“ اتنا جان بولے۔  
 ”اچھا! تو پھر کیا وجہ ہوئی نہ جانے کی؟“ میں نے  
 قدرے بے ربط سا جملہ بولا اور نظر اٹھا کر اس ماہر کو  
 دیکھا۔  
 ”انجیشن لگانے سے ڈر لگتا ہے۔“  
 اتنا جان بڑی سنجیدگی سے بولے اور پھر وہ اور  
 ارسلان قہقہہ لگا کر ہنس پڑے۔ وہ بھی دھیرے سے  
 ہنسی۔ موتیوں کی طرح قطار میں سجدے دانت عتالی  
 ہونٹوں کے درمیان قدرے نمایاں ہو گئے۔ کیا کوئی  
 اس دلکشی سے ہنس سکتا ہے۔ اس کا گلاب سا کھلا چہرہ

ماحول کو معطر کرنے لگا۔  
 ”کیا اسے اپنے حسن بے پناہ کی کوئی خبر ہے؟“  
 ”میں چائے بناتی ہوں“ میں اس کی سفید محرک  
 انگلیوں کو دیکھ رہا تھا۔ اس کی انگلیوں سے میرے دل  
 کے تار ربط میں تھے۔ وہ اپنی مرضی سے انہیں چھیڑ  
 رہی تھی۔ میں اس محبت آمیز نگہاٹ کو سن رہا تھا۔  
 ”محبت نے ہمارے درمیان بند باندھ دیا تھا۔“  
 ”ہم محبت کے جاوٹی دیس کی طرف عازم سفر  
 تھے۔“  
 چائے پیتے باتیں کرتے کافی دیر گزر گئی جب انٹر  
 کام نے اس کو متوجہ کر لیا۔ اسٹاف کے ساتھ ان  
 لوگوں کی ضروری میٹنگ تھی۔ میں اجازت لینے کے  
 لیے اٹھ کھڑا ہوا۔  
 ”صہبا! تم فارس کو گھر لے جاؤ۔ ہم سب فارغ ہو  
 کر آتے ہیں۔“  
 ”بس مجھے اب اجازت دیجیے۔ مجھے آج ہی واپس  
 پہنچنا ہے۔“ میری بات کو تو جیسے انہوں نے ان سنا کر  
 دیا۔  
 ”اچھا فارس بیٹا! آپ صہبا کے ساتھ گھر جائیں۔  
 بی بی سے ملیں۔“  
 اور وہ ارسلان کے ساتھ باہر نکل گئے اور میں وہیں  
 کھڑا رہ گیا۔ صہبا میری کیفیت سے محفوظ ہو کر مسکرا  
 رہی تھی۔  
 ”چلیے فارس صاحب!“ اس نے میز پر سے اپنی  
 چیزیں اٹھالیں۔ ”آپ اپنی گاڑی کی چابی دے دیں۔  
 ڈرائیور گاڑی لے آئے گا۔ آپ میرے ساتھ  
 چلیں۔“  
 ایسا ہے تو ایسے ہی سہی۔ میں نے چابی ڈرائیور کے  
 حوالے کی اور اپنے اذلی اعتماد سے مسکرا کر صہبا کی  
 گاڑی کی ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔  
 موسم رنگ بدل رہا تھا۔ بھری ہوئی دھوپ کا  
 کہیں نام و نشان نہیں تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے سفید روٹی  
 کے گالے آسمان کو چھوڑ کر دھرتی پر گھر بنانے لگے  
 تھے۔ شور مچاتی، پتھرائی ہوئی شرارتی لڑکوں کے ٹولے

لی ہا نہ سیٹھیل بجاتی گاڑی کے شیشوں سے ٹکرار ہی  
 تھی۔ میں نے صہبا پر نظر ڈالی تو وہ قدرے گھبرائی ہوئی  
 معلوم ہوئی تھی۔  
 ”آپ پریشان ہیں؟“  
 ”ہم تو اس موسم کے عادی ہیں۔ میں آپ کی وجہ  
 پریشان تھی۔ آپ کے لیے یہ موسم اجنبی ہے۔“  
 ”مجھے تو ذرہ بھر بھی اجنبیت محسوس نہیں ہو رہی  
 میں نے اپنے دل کی بات کی۔“ مجھے تو یہ موسم  
 اتنا اچھا لگ رہا ہے۔“ میں نے گھر کی طرف جانے  
 والا پہلا ہی موڑ درست کاٹا تو وہ حیرانی سے بولی۔  
 ”آپ کو ہمارے گھر کا راستہ یاد ہے؟“  
 میں نے بے اختیار اڈ آنے والی مسکراہٹ دہلی۔  
 اسے کیا کتاب کہ یہ موڑ یہ راستہ تو ایسا تھا کہ میں  
 آنکھیں بند کر کے بھی منزل تک پہنچ سکتا تھا۔ اس  
 منزل کی تمنہاں تو مجھے یہاں دوبارہ لے آئی تھی۔  
 تھوڑی دیر بعد ہی میں نے گاڑی سرائے مان کے  
 ڈرائیور سے برلا روکی تھی۔ گھر میں بی بی جان نے میرا  
 پر تپاک استقبال کیا۔ میں ان کے لیے قطعاً ”اجنبی  
 نہیں تھا۔ میں ان کی اپنائیت پر حیران ان کے پاس بیٹھا  
 رہا۔  
 دوپہر کھانے کے بعد صہبا کو قہوہ لانے کے لیے کہہ  
 کر اتنا صاحب مجھے اپنے کمرے میں لے گئے۔ برف  
 باری رک چکی تھی۔ میرا ارادہ اب واپسی کا تھا۔ صبح  
 مجھے ہر صورت ہسپتال پہنچنا تھا۔ اس لیے میں ڈرائیور  
 سے چابی لے آیا تھا۔ ابھی میں ان سے بات کرنے کے  
 لیے موزوں الفاظ سوچ رہا تھا کہ میری نظر سامنے موجود  
 اپنی قد آور تصویر پر پڑی۔ میں اتنا حیران ہوا کہ مجسمہ  
 بن گیا۔  
 ”یہ تو میری تصویر ہے؟“ میں نے خود سے کہا اور  
 بے اختیار اٹھ کر تصویر کے قریب چلا گیا۔  
 ”یہ تصویر میرے چھوٹے بھائی کی ہے۔“ اتنا  
 صاحب میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولے۔ ”اسی  
 لیے تو میں تمہیں دیکھ کر حیران رہ گیا تھا۔“  
 بھرائی ہوئی آواز میں کہتے ہوئے انہوں نے

میرے کندھے پر ہاتھ رکھا۔  
 ”جی!“ میں حیرت سے گنگ ہو گیا۔ نہ جانے کیوں  
 میرا دل چاہا کہ میں وہاں سے بھاگ جاؤں۔ دور ہو  
 جاؤں اس تصویر سے۔ اتنی مشابہت۔ ایسا کیسے ہو  
 سکتا ہے۔  
 تیزی سے میں ڈرائیور سے بر آیا۔ اور اپنی براؤڈ کی  
 طرف بھاگتے ہوئے میں نے چوکیدار کو گیٹ کھولنے  
 کے لیے کہا۔ شکر ہے کہ فاطمہ اور نسرین کچن میں  
 موجود تھیں۔ شاور کے بعد میں بھی کچن میں چلا آیا۔  
 ”اماں! کیا کیا ہے آج؟“  
 ”مشرقیہ بنایا ہے۔ آلو گو بھی بھی ہے۔ آپ بیٹھو  
 بیٹا! میں ابھی روٹی بنا کر لارہی ہوں۔“  
 ”اماں! روٹی نسرین پکا دے گی۔ آپ میرے پاس  
 آئیے اور مجھ سے باتیں کریں۔“  
 میں ان کا ہاتھ پکڑ کر ان کو کھانے کی بلانے لے آیا۔  
 ”اماں مجھے میرے بچپن کی باتیں بتائیں۔ میں لیا ہاتھ  
 تھا۔“  
 اماں کئی باری بتاتی ہوئی شرارتیں اور باتیں دہرانے  
 لگیں۔ اماں کو ماما نے میری پیدائش پر خاص طور پر مجھے  
 سنبھالنے کے لیے رکھا تھا۔ اب تو انہیں گھر کے ایک  
 باقاعدہ فرد کی حیثیت حاصل تھی۔  
 ”اماں! دیکھیے کیسی عجیب بات ہے کہ نہ میں پیلا سے  
 ملتا ہوں نہ ہی ماما سے۔ بلکہ میری شکل کسی بھی رشتہ  
 دار سے نہیں ملتی۔“  
 ”ارے بیٹا! یہ کیا خیال آگیا تم کو آج؟“ وہ قدرے  
 گھبرا کر بولیں۔ ”نسرین نے تمہارے لیے چائے رکھی  
 یا نہیں میں دیکھ آؤں۔“  
 ان کا کھانا مجھ سے چھپا نہیں تھا۔ جب چائے لے  
 کر بھی وہ خود نہیں آئیں بلکہ نسرین سے بھجوا دی تو  
 میں مزید الجھ گیا۔  
 \* \* \*  
 اگر کوئی حسن و انساب کو مجسم دیکھنا چاہتا تھا تو آج  
 دشمنہ کو دیکھنا۔ جس کے چہرے پر خوشی اور طہانیت

دھنک رنگ اوڑھے براجمان تھی۔ سفید جوڑے پر سرخ کلاہ اردو پنہ اوڑھے بھاری زیورات پہنے اس کی تو جھب ہی زالی تھی۔ پیشانی پر آویزاں سرخ یا قوت نے تو جیسے سارے چہرے کو متعکس کر رکھا تھا اپنی شعاعوں سے۔ کسی بھی قسم کے میک اپ سے پاک چہرہ اندرونی خوشی اور سرشاری کے احساس سے ایسے سجا ہوا تھا کہ سینکڑوں مشاطاؤں کی فنکاری اس روپ پر قربان تھی۔

نکاح کے بعد وہ سمیر کرمانی کے ساتھ اس کے مری والی کوچھی میں موجود تھی۔ سارہ اور نیکم بھی اس کے ساتھ تھیں۔ اماں کا بھی خوشی سے چہرہ دمک رہا تھا۔ سمیر کرمانی نے کوٹھی اس کے نام کردی تھی اور یہ کوٹھی اتنی قیمت کی تو ضرور تھی کہ اماں یوں شاداں تھیں۔

باہر لان میں نکاح میں شامل ہونے والے دوستوں کی تواضع کی جا رہی تھی۔ فضا میں اشتہا انگیز خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ نیکم نے دشمہ کی پلیٹ تیار کرتے ہوئے کہا۔

”سارہ! تم تو اٹھ کر خود لے لو۔ دیکھو سب ہی کچھ بہت لذیذ لگ رہا ہے مجھے تو۔“

”ہاں! لگے گا ہی تم کو۔ ایک ہم ہیں ذرا غور سے دیکھ بھی لیں ان حرمین اشیاء کو تو دو چار پونڈ وزن ابھی بڑھ جائے۔“

”دشمہ دل کھول کر نہیں۔“ آج کوئی پابندی نہیں۔ آج دل بھر کے کھاؤ۔ ایسے بل بار بار نہیں آتے۔“

”ہماری زندگی میں بھی یہ دن آجائے گا۔“ نیکم نے شرارت سے کہا۔

دشمہ نے قہقہہ لگایا۔ ”بہت انتظار ہے۔“

”ابھی تو انتظار ہی کیا جا سکتا ہے۔“ نیکم نے آنکھ ماری۔

”اب آج بہت خوب صورت لگ رہی ہو کیا۔“

سارہ نے اپنی آنکھ کا کاجل انگلی کی پور سے دشمہ کی کان کی لوپر لگایا۔

دھنک رنگ اوڑھے براجمان تھی۔ سفید جوڑے پر سرخ کلاہ اردو پنہ اوڑھے بھاری زیورات پہنے اس کی تو جھب ہی زالی تھی۔ پیشانی پر آویزاں سرخ یا قوت نے تو جیسے سارے چہرے کو متعکس کر رکھا تھا اپنی شعاعوں سے۔ کسی بھی قسم کے میک اپ سے پاک چہرہ اندرونی خوشی اور سرشاری کے احساس سے ایسے سجا ہوا تھا کہ سینکڑوں مشاطاؤں کی فنکاری اس روپ پر قربان تھی۔

نکاح کے بعد وہ سمیر کرمانی کے ساتھ اس کے مری والی کوچھی میں موجود تھی۔ سارہ اور نیکم بھی اس کے ساتھ تھیں۔ اماں کا بھی خوشی سے چہرہ دمک رہا تھا۔ سمیر کرمانی نے کوٹھی اس کے نام کردی تھی اور یہ کوٹھی اتنی قیمت کی تو ضرور تھی کہ اماں یوں شاداں تھیں۔

باہر لان میں نکاح میں شامل ہونے والے دوستوں کی تواضع کی جا رہی تھی۔ فضا میں اشتہا انگیز خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ نیکم نے دشمہ کی پلیٹ تیار کرتے ہوئے کہا۔

”سارہ! تم تو اٹھ کر خود لے لو۔ دیکھو سب ہی کچھ بہت لذیذ لگ رہا ہے مجھے تو۔“

”ہاں! لگے گا ہی تم کو۔ ایک ہم ہیں ذرا غور سے دیکھ بھی لیں ان حرمین اشیاء کو تو دو چار پونڈ وزن ابھی بڑھ جائے۔“

”دشمہ دل کھول کر نہیں۔“ آج کوئی پابندی نہیں۔ آج دل بھر کے کھاؤ۔ ایسے بل بار بار نہیں آتے۔“

”ہماری زندگی میں بھی یہ دن آجائے گا۔“ نیکم نے شرارت سے کہا۔

دشمہ نے قہقہہ لگایا۔ ”بہت انتظار ہے۔“

”ابھی تو انتظار ہی کیا جا سکتا ہے۔“ نیکم نے آنکھ ماری۔

”اب آج بہت خوب صورت لگ رہی ہو کیا۔“

سارہ نے اپنی آنکھ کا کاجل انگلی کی پور سے دشمہ کی کان کی لوپر لگایا۔

ان کا نکاح ہو چکا تھا اور سمیر کرمانی اسے حاصل تھا۔ لیکن کچھ تھا جو اسے ٹھنکتا تھا۔ وہ کئی بار سمیر کرمانی سے کہہ چکی تھی کہ اب وہ اسے اپنے گھر لے جائے۔ لیکن وہ ہر بار ٹال جاتا تھا۔

”ہماری شادی کو ایک سال ہونے والا ہے۔ آپ مجھے کہ اپنے گھر لے کر جائیں گے؟“

”نکشی! بار بار بتا چکا ہوں کہ کوشش کرو رہا ہوں۔ تم روز روز مجھے کیوں پریشان کرتی ہو۔“

”آپ کو میری پریشانی نظر نہیں آتی؟“

”آئی ہے۔ اسی لیے کہتا ہوں کہ پریشان ہونا چھوڑو۔ خوش رہا کرو۔“

”کیسے رہوں خوش۔۔۔ سسرال والے مان نہیں رہے۔ آپ باپ بننے کے لیے تیار نہیں ہیں۔“

”پھر وہی فضول باتیں کون بھرتا ہے تمہارے دماغ میں یہ سب۔؟“

”کون بھرے گا؟ آخر کب تک میں یوں زندگی گزاروں گی۔ مجھے بچہ چاہیے۔“

آپ وعدہ کریں جلد سے جلد بات کریں گے۔“

”اچھا بابا! کروں گا۔ چلو تیار ہو جاؤ۔۔۔ ڈنر کے لیے چلتے ہیں۔“

ان کی زندگی بس لُچ، دُز، آؤٹنگ کے دائرے میں چکراتی رہتی تھی۔ جیسے وہ کوئی چیز تھی جسے کرمانی استعمال کر رہا تھا۔ کوئی شوپس، جسے سجاوٹ کی طرح زندگی میں سجایا ہوا تھا۔ وہ اپنے شہر جاتا تو کئی کئی ہفتوں بعد آتا۔ اس دوران وہ اسے فون بھی نہیں کر سکتی تھی۔ وہ تو یہ تک نہیں جانتی تھی کہ وہ لاہور میں رہتا کہاں ہے۔ بس وہ گلبرگ کا نام جانتی تھی۔ اس نے محبت کی تو شادی کے معاملے میں چھان بین کرنا جرم سمجھا۔ وہ سمیر کرمانی پر آنکھیں بند کر کے اعتبار کرتی تھی۔ آنکھیں کھولنے کی کوشش بھی کر لیتی تو کیا کرتی۔

اماں سے جب بھی بات کرتی تو اماں کہتیں۔

”نہیں مان رہے گھر والے تو چھوڑو وہ تو تمہارے ساتھ ٹھیک ہے نا؟ پیسے دیتا ہے گھر تمہارے نام ہے کل کو

چھوڑ بھی گیا تو گھر بچ رہتا۔“

”اماں! میں محبت کرتی ہوں اس سے۔“

”محبت وقتی جذبہ ہوتا ہے بس۔۔۔“ اماں سنگ دلی سے کہہ دیتیں۔

وہ سوچ سوچ کر پریشان ہوتی رہتی لیکن کچھ نہیں سکتی تھی۔ سمیر سے نکاح کے بعد تو وہ بالکل ہی بے بس ہو چکی تھی۔ وہ سمیر کو زیادہ کریدنے سے بھی ڈرتی تھی۔ اگر کچھ غلط نکل آیا تو؟ تو جو امید ہے وہ بھی جاتی رہے گی۔

آکھیں کھولنے کی کوشش کی تو کئی من وزن تھا۔ آنکھوں پر سر، جسم جیسے شکنے میں جکڑا ہوا تھا۔ میں پکارنا چاہتا تھا مگر کوئی آواز نہیں نکلتی تھی۔ کیا میں زندہ تھا؟

”ڈاکٹر صاحب! فارس ہوش میں آ رہا ہے۔“

”ڈاکٹر صاحب! میرا بیٹا رو رہا ہے۔“ یہ آواز اماں کی تھی۔

”فارس! فارس! میرے بچے میرے چاند۔“ مجھے ان کے ہونٹوں کا لمس اپنی پیشانی پر اپنے ہاتھوں پر محسوس ہو رہا تھا۔ میں نے آنکھیں کھولیں۔ مگر کمرے میں اندھیرا تھا۔

”ڈاکٹر شائد! حوصلہ رکھیں۔ مجھے ذرا فارس کو چیک کرنے دیں۔“

”ہیلو فارس! کیسے ہیں آپ؟“ ڈاکٹر صاحب بولے۔

بڑی کوشش کے باوجود کوئی آواز نہ نکلی۔ لیکن آنکھیں کھول لی تھیں میں نے۔ ڈاکٹر صاحب نے میرے بازو ہلائے۔ میرا چہرہ تھپتھپایا۔

”نئی زندگی مبارک ہو فارس!“

وہ بولے۔ پاپا بھی آگئے تھے۔ یہ ان کو کیا ہو گیا تھا۔

ایک دم سے سارے بال سفید۔۔۔ اور اماں بھی بوڑھی اور کمزور لگ رہی تھیں۔ دونوں بے تابانہ مجھے پار کر رہے تھے۔ میں اپنے ہاتھوں کو کسی قدر ہلکا سکتا تھا۔ مگر

باقی کا جسم بکرا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔  
”مجھے کھولیں ماما۔ مجھے باندھا کیوں ہے؟“ میں نے کساتا چاہا مگر بے ربط سی آواز سن گئیں۔

اس روز جو میں سیڑھیوں سے گرا تو اٹھ جنوری سن دو ہزار تیرہ تھا اور آج پانچ اکتوبر سن دو ہزار سولہ۔ مجھے تین سال دس ماہ بعد ہوش آیا تھا۔ ایک ماہ میں میں باندھ لانے کے قاتل ہو گیا تھا۔ مگر کمر سے نیچے کا دھڑا بھی مفلوج تھا۔ میں صحیح طرح نہیں بول سکتا تھا۔ میں بہت کمزور ہو گیا تھا۔ میں زور زور سے روتا۔ میں ایک دم سے اٹھنا چاہتا تھا، چلنا چاہتا تھا۔ لیکن ابھی تک میں کھانا بھی خود نہیں کھا سکتا تھا۔ ڈاکٹر نے مجھے مزید ایک ماہ ہسپتال میں ہی رکھا۔

ماما پیلا تو سب کچھ بھلائے میرے ساتھ لگے ہوئے تھے۔ میرے دوستوں میں اب صرف عاشری لاہور میں تھا۔ وہ ملنے آیا تو مجھے سب کچھ یاد آ گیا۔ میں اس روز خوب چیخا چلایا۔ اس کو برا بھلا کہا۔ بڑی مشکلوں سے ڈاکٹر صاحب نے مجھے کنٹرول کیا۔ اگلے روز میں نے گھر جانے کی ضد پکڑ لی۔ ماما نے کہا کہ وہ مجھے سب بتا دیں گی۔ بس میں ڈاکٹر سے ’فزیو تھراپیٹ‘ سے تعاون کروں۔ میرے ہاتھ، میری پیشانی، میرا چہرہ جو متی وہ سخت دل گیر تھیں۔

مزید چند دن میں میں وہ ہیل چیئر پر بیٹھنے کے قاتل ہو چکا تھا۔ باقی۔ مزید صحت یاب ہونے کے لیے میری دائیں ٹانگ اور کولے کا آپریشن ہونا تھا۔ لیکن مجھے ڈاکٹر نے گھر جانے کی اجازت دے دی۔

بے شمار صدقات نکال کر مجھے ماما پیلا گھر لے آئے میرا کروہ ویسی ہی تھا سیاہ اور سلور۔ بس ماما نے اسے پھولوں سے بھر دیا تھا۔ میں بہت تھک گیا تھا۔ کمرے میں لا کر ماما نے مجھے سوپ پلایا اور میں سو گیا۔ آنکھ کھلی تو دیکھا میرے بید کے قریب قاتلین پر نکیہ رکھے سو رہی تھیں۔ میرا دل بھر آیا۔ میری وجہ سے کس قدر تکلیف اٹھا رہی تھیں وہ۔

”ماما!“

”جی میرا بیٹا!“ وہ ایک لمحے میں اٹھ کر آئیں۔ میں

ان سے لپٹ کر چھوٹے بچے کی طرح رو پڑا۔  
”ماما! میرے سب کیا ہو گیا؟“  
”یہ زندگی ہے بیٹا! یہ حالات بھی بدلتے موسموں کی طرح بدلتے ہیں۔ ان سے کیا گھبراؤ۔“

”موسم تو اتنے تکلیف دہ نہیں ہوتے۔“  
”بس تم ٹھیک ہو رہے ہو۔ اللہ کا احسان ہے۔“  
”ماما میں آپ کا بیٹا ہوں؟“ میں نے ان کے ہاتھ اپنے لرزتے ہاتھوں میں تھام لیے۔

”یقیناً“ تم میرے بیٹے ہو۔“ انہوں نے نیل بجائی۔ تو مکمل خان فوراً ”آگیا۔ وہ مجھے واش روم لے گیا۔ واپس لا کر ریڈر پوچھا دیا۔ اس سے گیلاتولید منگوا کر ماما نے میرا چہرہ پوچھا میرے ہاتھ پوچھے۔ گل خان کو واپس بھیج کر وہ کہنے لگیں۔

”بیٹا! بعض لوگ بچہ کی پیدائش کا ذریعہ بنتے ہیں۔ لیکن وہ اس بچہ کی ذمہ داری نہیں اٹھا پاتے۔ پھر خدائے رحمان جو اپنے بندے سے ایک پل کے لیے بھی غافل نہیں ہوتا اس بچے کو اپنے سائے میں اپنی پناہ میں لے لیتا ہے اور اس بچے کو ایسے لوگوں کے سپرد کر دیتا ہے جو اس کے حقیقی والدین نہ ہو مگر بھی اس کے مال باپ بن جاتے ہیں۔“

میرا ہاتھ تھام کر وہ بولیں ”تسلی رکھو۔ میں تم سے کچھ نہیں چھاپاؤں گی۔ تم آغا سلمان اور رانی کا نکاح نامہ دیکھ چکے ہو۔ وہی تمہارے حقیقی والدین تھے۔ میری جب تمہارے بابا سے شادی ہوئی تو ان کی پوسٹنگ کوئٹہ میں تھی۔ میں ان کے ساتھ ہی چلی گئی، وہیں گھر کرائے پر لے کر اپنا ریسٹوٹ کھینک بنا لیا تھا۔ زینب ایک مقامی عورت تھی وہ ہماری گھریلو ملازمہ کے طور پر کام کرتی تھی۔ رانی زینب کی بھانجی تھی۔ آغا سلمان سیر کے لیے کوئٹہ آیا تو اس نے رانی کو دیکھ لیا اور اس کو درغلز نکاح کر لیا۔ اس کی ماں غریب عورت تھی۔ کچھ نہ کر سکی۔ آغا سلمان رانی کو ساتھ لے جاتا اور جہاں چاہتا گھومتا پھر تارا پھر واپس چھوڑ دیتا۔ اب رانی کے لیے سفر مشکل ہو رہا تھا۔ انھوں

میں نہ تھا۔ دو تین مرتبہ زینب اور فاطمہ اس کو میرے پاس چیک اپ کے لیے لائی تھی۔ اس کی حالت دیکھتے ”وئے میں نے سفر کرنے سے منع کر دیا۔ ان ہی دنوں آغا سلمان اس کو لے جانے کے لیے آیا۔

وہ مری اسلام آباد کی طرف جانا چاہتا تھا۔ ماں نے رانی کی حالت کی طرف توجہ دلائی تو وہ غصے میں رانی کو اکیلے کر نکال گیا۔ رانی براشت نہ کر سکی اور اس کی ماں مارے خوف کے اس کو ہسپتال لے گئی نہ میرے پاس لائی۔ بچے کی پیدائش کے ساتھ ہی رانی جاں بحق ہو گئی۔ اور اگلے ہی دن آغا سلمان کی جیب ایک کھڈ میں جا گری۔ آغا سلمان کی بیوی کو اس کے رانی سے نکاح کا علم ہو چکا تھا۔ وہ ”وقتی“ ”فوقی“ اپنے بھائیوں کے ذریعے ان کو خوفزدہ کرواتا تھی۔ آغا سلمان کی وفات کے بعد جب ان لوگوں نے رانی کے گھر رابطہ کیا تو زینب اور فاطمہ نے ان کو یہی بتایا کہ زوجگی کے دوران رانی اور بچہ دونوں نہیں بچے۔ اور وہ بچہ لے کر ہمارے پاس آئی اور التجا کی کہ بچے کو کسی محفوظ یتیم خانے میں پہنچا دیں۔

میری شادی کو چار سال ہو چکے تھے۔ بچے کو دیکھ کر میری ماما ترپ اٹھی اور میں نے تمہارے بابا کو منا لیا۔ اور ہم سب تمہاری نالی سمیت لاہور آ گئے۔ حقیقت صرف میری امی اور شارق کے والدین کو معلوم تھی۔ تمہاری نالی کے ساتھ ہونے کی وجہ سے کسی قسم کی قانونی الجھن پیش نہیں آئی۔ اور یوں قدرت نے تمہیں ہمارا بیٹا بنا دیا۔ ہم کاغذات میں تمہاری اصلی ولایت لکھواتا چاہتے تھے لیکن تمہاری نالی کے خوف کی وجہ سے ایسا نہ کر سکے۔ کیا تمہیں حقیقت بتانی چاہی مگر تمہاری نالی کے اصرار پر خاموش رہی۔ تمہاری بے ہوشی کے ہر لمحے میں میں نے اس غلطی کی معافی مانگی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ میرے رب نے مجھے معاف کر دیا ہے۔ ابھی تو تم کو واپس لوٹا دیا ہے۔

عاشر اور ثانیہ کے ذریعے آغا فاران صاحب کو تمہارا پتا چلا تو وہ یہاں آئے۔ ان کو یقین تھا کہ تم ان

کے بھائی کے بیٹے ہو۔ غیر معمولی مشابہت کی وجہ سے وہ ایسا سوچنے پر مجبور تھے۔ وہ یہاں آئے تو فاطمہ نے بھی تصدیق کر دی۔ یوں بھی اب ان سے چھپانے کا کوئی فائدہ نہ تھا۔ وہ کئی مرتبہ تم کو دیکھنے کے لیے آئے۔ دل کے مریض تو وہ پہلے ہی تھے لیکن تمہارے غم نے ان کو مزید بیمار کر دیا۔ تقریباً ”ذیڑھ سال پہلے ان کا پانی پاس ہوا تھا۔ تب سے وہ نہیں آئے۔ البتہ باقاعدگی سے خون کر کے تمہارا حال پوچھتے ہیں۔“

”ماما میری نالی؟“ مجھے اپنی آواز جیسے دور کنویں سے آتی محسوس ہوئی۔

”بیٹے! اماں فاطمہ ہی تمہاری نالی ہیں۔“ ماما نے آنسو پوچھتے ہوئے بتایا۔

”ماما! آغا سلمان اکیلے آئے تھے؟“ میں نے پوچھا۔  
”ارے! نام نہیں لو ان کا وہ تمہارے بابا جان ہیں۔ اکیلے کیوں آتے وہ صہبا ساتھ آتی تھی۔“

”صہبا۔؟“  
”کیسے نہ آتی میرے اتنے پیارے بیٹے کو دیکھنے!“

ماں نے میرے چہرے کو اپنے ہاتھوں میں تھام کر میری پیشانی پر بوسہ دیا۔  
”ہاں کیوں نہ آتی وہ۔“ میں نے دل میں سوچا۔  
”بہت پسند آتی تھی میرے بیٹے کو۔ مجھے بھی بہت پسند آئی۔ چشتی خوب صورت ہے اتنی ہی سادہ دل اور محبت کرنے والی ہے۔“

”اب جب سے تمہارے بابا کا پانی پاس ہوا ہے وہ ان کو چھوڑ کر نہیں آتی۔ البتہ کارڈ، خوشبو اور پھول آتے ہیں۔ سب میں نے سنبھال کر رکھے ہیں۔“  
انہوں نے اٹھ کر سامنے سیاہ آنسوئی الماری کھول کر ایک براسا چری بیگ نکال کر میرے قریب کھول کر رکھ دیا۔

”تم ان کو دیکھو جب تک میں تمہارے کھانے کے لیے کچھ لائی ہوں۔“ وہ اٹھتے ہوئے بولیں۔  
”میں آپ کے سامنے دیکھوں گا۔ آپ کے بغیر مجھے کیا مزہ آئے گا۔“

”پگلا۔“ انہوں نے بیگ کھول دیا اور پسا کارڈ



میرے لرزتے ہوئے ہاتھوں میں دے دیا۔ ہلکے گلابی رنگ کے کارڈ پر موتیوں جیسے حروف کندہ تھے۔  
”تمہاری محبت کا دیا تو ازل سے میرے دل میں روشن تھا۔ اسی لیے جب میں نے تم کو دیکھا تو پہچان لیا۔“

اور اس گلدستے کے سارے گلاب سرخ تھے۔ میری آنکھوں سے ایک آنسو گرنا۔  
”کیا محبت روابط کی مرہونِ منت ہے؟“  
کیا محبت شرائط سے وابستہ ہے؟  
ہرگز نہیں! محبت خلوص، سادہ دلی اور بے دریائی سے معذون ہے۔ خشک زرگس اور چینی کی کپھولوں سے کمرہ بھر گیا تھا۔

صندلیں کارڈ پر سہرے رنگ سے لکھا ہوا تھا۔ میں محبت کا چمکتا ہوا جگنو اپنی پتیلیوں میں چھپا کر رکھتی ہوں۔“  
ساتھ ہی صندلیں کانڈ میں لپٹا ہوا سا لگہ کا تحفہ تھا۔ سنہری رین کھلا تو ایک کالج پورس پالہ تھا جس میں چھوٹا سا سفید کارڈ سبز رین سے بندھا ہوا تھا۔  
”میں نے محبت کی دہلیز پر پھول بکھیر رکھے ہیں۔ میری آنکھوں کا نمکین پانی انہیں تازہ رکھتا ہے اور خشک بھی۔“

رنگین پھولوں سے سجے خوب صورت جذبول سے گندھے سب کارڈز میں دیکھے۔ اور ان سب خشک پھولوں کو سونگھا۔ ان خاموش روکھے اور بے رنگ پھولوں سے بڑی گہری محبت جھلک رہی تھی محبت کی ملک۔ میں نے بیڈ کراؤن سے ٹیک لگالی۔ آنکھیں موندیں دیر تک میں جتنے روشن، محبت سے بر الفاظ کو ان میں جیسے جذبول کو اپنے گرد و خور قص پاتا تھا۔ کبھی مسکراتا، کبھی آنسوؤں کی نمکین نمی محسوس کرتا ایک نئے جہان میں تھا میں۔

یہ کیسی محبت تھی۔ میں حیران تھا۔ محبت واقعی روابط کی محتاج نہیں ہے۔  
مجھے خواب کر ماما نجانے کب کمرے سے چلی گئی تھیں۔ میں نے نیل بجائی تو وہ اندر آئیں۔ دوپٹہ نماز

کے انداز میں لپیٹ رکھا تھا۔ میرے ہاتھ پاؤں پر اور چہرے پر اور سینے پر چھو تک مار کر انہوں نے سب چیزیں احتیاط سے سمیٹ کر بیگ میں رکھ دیں۔ اور بیگ میرے سرہانے رکھ دیا۔ وہ ایسی ہی تھیں بنا کے میرے دل کی بات جان لینے والی۔

”ماما جانی! مجھے نیند کی دو گولیاں دے دیں۔“  
”ٹھیک ہے بیٹا! بس تھوڑا سا دودھ پی لو۔“  
گولیاں کھلا اور دودھ پلا کر انہوں نے مجھے لٹا دیا اور میرے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگیں۔ میں چند لمحوں میں غافل ہو گیا۔



”خدا تم کو میری عمر بھی لگا دے“ میرے بچے۔  
جب سے وہ آئے تھے میرے پاس ہی بیٹھے ہوئے تھے۔ مجھے ان سے مل کر خون کی گردش کا اندازہ ہو رہا تھا۔ ان کے وجود سے اٹھنے والی خوشبو نے مجھے باندھ لیا تھا۔ اپنا بیت کا جو اظہار اول روز سے ان کی طرف سے ہو رہا تھا وہ اب میری سمجھ میں آ رہا تھا۔ خون کا جوش مارتا کیا ہوتا ہے۔ یہ سب۔

ماما نے کھانا لکنے کی اطلاع دی تو عمران آغا جان کو سہارے سے باہر لے گیا۔ وہ بہت کمزور ہو گئے تھے۔ مہیا میرے لیے کھانا کمرے میں ہی لے آئی۔ اس کے ہاتھ سے نوالے لیتے ہوئے میں اس کی بھیگی آنکھوں اور لرزتی پلکوں کو دیکھ رہا تھا۔  
”بس۔“ میں نے پیچ بڑھاتے اس کے ہاتھ کو تھام لیا۔ اس کے آنسوؤں کو چٹتے ہوئے میں نے خود کو کہتے سنا۔

”محبت اتنی طاقت ور ہوتی ہے۔ مجھے یقین نہیں آتا۔ میں بیشک لیے سو گیا تھا۔“ تم نے مجھے کیسے مجھے پکارا اور پکار کر رہیں یہاں تک کے اندھیر غاروں میں قید میری سماعتوں نے تمام بند کلا ڈالے۔ اور تمہاری پکار کو سن لیا۔“

اس نے اپنی سبز آنکھیں اٹھائیں اور سب کہہ دیا۔ وہ بھی جو کہنا تھا اور وہ بھی جو دل میں چھپا کر رکھنا

ہااتی تھی۔  
”سنو رو کیوں رہی ہو“ میں ٹھیک ہو رہا ہوں۔“  
مجھے اس کے آنسو تکلیف دے رہے تھے۔  
”آپ بالکل ٹھیک ہو جائیں گے۔“ وہ دھیرے سے بولی۔

”اسی خوشی میں تم رو رہی ہو؟“ میں نے شرارت لی کوشش کی۔ اور وہ روتے روتے ہنس پڑی۔ میں نے برسات میں دھوپ کے منظر کو بہت دلچسپی سے دیکھا۔

وہ لوگ دودن رہے۔ دودنوں کی رفاقت میں تاریکی کا سیاہ رنگ چھٹ گیا۔

اگر یہ خواب تھا تو تعبیر سے زیادہ خوب صورت تھا۔ زندگی کے کیڑوں پر مسرت کے رنگ چھائے ہوئے محسوس ہوتے تھے۔

”صہبا! میں جلد آؤں گا تمہیں ہمیشہ کے لیے لانے۔“ میں نے محبت کی پیشانی پر جگمگاتی ہوئی تحریر پڑھ کر وقت رخصت امید کا جگنو اسے تھمایا۔

\*\*\*

اور اب مجھے ٹھیک ہو جانے کی جلدی تھی۔ فزیو تھراپسٹ کا فائدہ لگنے سے آتا اور مجھے انکسرسائز کروانا۔ میں وہیل چیئر پر سارے گھر میں گھوم لیتا تھا۔ ڈاکٹرز میری ہمت دیکھ کر بہت پر امید تھے۔

”ماما! گھر کے سارے آئینے آپ نے ہٹا دیے ہیں۔“ وہ میرے کمرے میں ڈیرنگ ٹیبل ہے۔ مجھے خود کو دیکھتا ہے۔  
”اچھا۔“ وہ کچن سے ہاتھ پونچھ کر آگئیں اور مجھے اپنے بیڈ روم میں لے آئیں۔ اس کے آئینے پر بھی انہوں نے چادر ڈالی ہوئی تھی۔ وہ میری کرسی کو بالکل شیشے کے سامنے لے آئیں۔

”بس میرے بچے! یہ یاد رکھنا آج میری محبت میری مانتا کا امتحان ہے۔“  
میرے کندھوں پر انہوں نے مضبوطی سے ہاتھ جمائے پھر ایک ہاتھ بڑھا کر چادر ہٹا دی۔ یہ آئینے میں

کون تھا۔ یہ تو میرا عکس بھی نہیں تھا۔ کمزور لاغر اور بوڑھا چہرہ۔ جا بجا زخموں کے نشان جو شاید کبھی مندمل ہونے والے نہیں تھے اور سفید اڑے اڑے بال یہ تھا میرا وہ عکس جو اس کو مانے مجھے دیا تھا۔ میری صحت مند، جوانی، نیند کی دوا دی چاٹ گئی تھی۔ میری وجہات گمان گئی تھی۔  
”آہ! میں نے کرب سے آنکھیں بند کرنا چاہیں۔“ مگر میرے کندھوں پر میری ماں کے ہاتھ لرز رہے تھے۔ جو ساڑے تین سال سے سوئی نہیں تھی۔ اس نے مجھے بکھرا ہوا دیکھا تھا اور ایک نئے بچے کی طرح سمیٹا تھا۔ میں مسکرایا۔ انہوں نے مجھے آنسو بھری آنکھوں کے ساتھ چوم لیا۔  
”میرا بیٹا! میرا بہادر شہزادہ“ میرا چاند۔“ وہ روتے روتے کہہ رہی تھیں۔ میرے ہوش میں آنے کے بعد میرے سامنے وہ پہلی بار آج روئی تھیں۔ مجھے جینا تھا۔ اسے ماں باپ کے لیے۔  
”ماما مجھے باہر لان میں لے چلیں۔“  
پلانے ہمیں باہر لان میں ویلکم کیا۔ ان کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا۔  
”پاپا! کیا ضروری ہے کہ میرا آپریشن نہیں ہو؟“ اندرونی خلفشار سے تنگ آکر میں نے پاپا سے بات کرنے کی ٹھانی۔  
”تم کہیں اور کروانا چاہتے ہو بیٹا۔“ پاپا نے پوچھا۔  
”ابھی تو فوراً آپریشن نہیں ہو گا۔ ابھی تم کو مزید مشقیں ہونا ہے۔“ پاپا نے کہا۔  
”بس پاپا! میں یہ جگہ چھوڑنا چاہتا ہوں۔ میں کہیں دور جانا چاہتا ہوں۔“ میں نے سامنے رکھی میز کو پکڑ کر اپنی لرزش دور کرنے کی کوشش کی۔  
”میں آغا فاران صاحب سے ان کی پیروی سے دور جانا چاہتا ہوں۔“  
چاہ کر بھی میری زبان سے صہبا کا نام آوا نہیں ہوا۔ ماما نے میرے پیچھے آکر کندھوں سے تھام کر اپنے ساتھ لگالی اور نرمی سے میرے بالوں میں انگلیاں پھیر کر کہنے لگیں۔

”ریلیکس بیٹا! وہ پوچھے بنا، اطلاع دے بغیر نہیں آئیں گے۔“

”نہیں! ماما! مجھے یہاں نہیں رہنا، آپ کراچی چلیں۔ واوی جان تو ساجد چاچو کے پاس ہیں۔ وہ گھر خالی پڑا ہے۔ بس آپ وہیں چلیں۔“ میں نے ضد کی۔

”ٹھیک ہے، بالکل ٹھیک۔ بس میرا بیٹا ذرا بھی پریشان نہ ہو۔“

گل خان، نرسن کے ساتھ مل کر ماما نے رات تک سارا گھر سمیٹ کر بند کر دیا۔ پبلنگ کر لی۔ اور اگلی شام ہم خاموشی سے کراچی چلے آئے۔ آغا خان ہسپتال میں ماما کی کزن نیلو فرج اب گرتی تھیں جو سائیکالرسٹ تھیں۔ خالہ نیلو فرج نے ہمیں آر تھوپڈک سرجن ڈاکٹر جانشین سے ملوایا۔ بہت قابل اور ماہر وزینگ پروفیسر ڈاکٹر تھے وہ۔ ڈاکٹر ماتھا البرٹ فزولو تھراپسٹ، انہی کی زیر ہدایت کام کرتی تھیں۔ انہوں نے مجھے ہفتے میں تین مرتبہ ایکس سائز شروع کروائی۔

یہ ہجرت مجھے بہت راس آلی۔ میں بہت جلدی ٹھیک ہونے لگا تھا۔ ماما، پاپا نے میری بات مان کر آغا فاران صاحب کی فیملی کو کوئی اطلاع نہیں دی تھی۔ صرف ایک بار ماما نے مجھے سمجھایا۔

”محبت کرنے والوں کا امتحان نہیں لیتے۔“ میں نے انہیں امتحان ہی سے توجہ دیا تھا۔ ایک ٹونا پھوٹا فارس احمد ماں باپ کے لیے تو قابل قبول تھا۔ اور شاید آغا فاران صاحب کے لیے بھی۔ مگر ”صہبا حسن“۔ میں کہے اس کو کسی امتحان میں ڈال دیتا۔ دن تو خبر کسی طرح گزر رہی جاتا تھا لیکن جب رات اتر آتی تھی، تو میں کھڑکی کے شیشوں سے ناک چپکائے ماضی میں بھٹکتا۔ میرے اندر ایک سفید موم سے بنی لڑکی کے عتابی ہونٹ بولنے لگتے تھے۔

”میں نے تمہارے دل کو اپنے قیام کے لیے موزوں ترین جانا اور اب وہی میرا ٹھکانہ ہے۔ زندگی کا خیمہ کس ٹھکانے پر جا لے گا؟ یہ قسمت طے کرے گی۔“



نپلا آسمان مجھ پر جھکا ہوا تھا۔ میں خواب دیکھ رہی تھی۔ محبت کی بری، مجھ سے بھلا مٹھی۔ میں نے اس کے پیغام کو سن لیا تھا۔ اس پیغام کو الفاظ کے پیر بن کی ضرورت کہاں ہوتی ہے۔ مجھے انتظار کرنا تھا اپنی زندگی کے آخری لمحے تک۔ محبت کو یہی نسیب دیتا ہے۔ محبت انہی دلوں میں قیام کرتی ہے جو اس کے بھیدوں کو سمجھ لیتے ہیں اور ان کے آگے سر ٹھوکتے ہوتے ہیں۔

”نی بی جان! آپ میری فکر کرنا چھوڑ دیوں کیوں نہیں دیتیں؟“

”میں کیسے چھوڑ دوں فکر۔ آپ باپ بیٹی کو تو نہ جانے کیا ہو گیا ہے۔“

”ہماری بیٹی کی قسمت؟“ آغا جان بولے۔

”قسمت کیسے؟ کوئی رسم ہوئی تھی اس کے ساتھ؟ زبان دی تھی آپ نے فارس کے ماں باپ کو؟ انہوں نے کہا تھا فارس ٹھیک ہو جائے تو وہ لوگ آئیں گے۔ نہ اس سے زیادہ نہ اس سے کم۔ کوئی اتنی بات پر بھی بٹھاتا ہے بیٹی کو۔ سارا خاندان باتیں بناتا ہے۔“

”خاندان والوں کی پروا نہیں ہے مجھے۔ اپنی بیٹی کی خوشی عزیز ہے مجھے۔“ آغا جان کو جلال آیا۔

”بیٹی کے ساتھ بچہ تو نہ بنیں آغا صاحب! چار سال پہلے گنوا دیے اس کے ہوش میں آنے کے انتظار میں۔ ٹھیک ہونے کی امید ہوئی تو جانے کہاں غائب ہو گئے سب۔ اس بات کو کبھی سال سے زیادہ ہو گیا اب تو۔“

کل چھوٹی بھابھی کی امی اپنے بیٹے کا رشتہ لائی تھیں جس کی پہلی بیوی فوت ہو چکی تھی۔ اس لیے بی بی جان کا غم و غصہ انتہا پر تھا اور وہ آغا جان کے آگے بولنے والی نہیں تھیں۔ ویسے بھی ان کو صہبا کے دل کی خبر تھی۔ لیکن اس پانی سر سے اونچا ہو رہا تھا۔



”کہانی تو روایتی ہی رہتی شاید، حرم نصیب روایتی کہانیوں کی طرح۔ اگر محبت درمیان میں راستہ نہ بنا

”ای۔ محبت جو بھورے کو کھلی کا، چکور کو چاندنی کا اہانہ بنا دیتی ہے۔ محبت ایک مشک فام بھید ہے جو اہل کو اپنی مشک سے دیوانہ بنا لیتا ہے، اسیر بنا لیتا ہے۔ شہ بھی سمیر کی اسیر تھی لیکن جس دن دشمن کو یہ معلوم ہوا کہ سمیر کہانی نہ صرف شادی شدہ بلکہ دو بیٹیوں کا باپ بھی ہے، اس دن وہ نیپا کھلی گئی ہو گئی۔ اسے اس دھوکے پر دکھ تھا جو سمیر نے اسے دیا۔ وہ اس سے جھوٹ بولتا رہا تھا۔ لیکن کیوں؟ اسے پانے کے لیے؟ یا اسے چھوڑ دینے کے لیے؟ اس نے اس سے انکار کیا تھا، لیکن ایسے نکاح کی حیثیت ہی کیا تھی آخر؟ نہ وہ معاشرے میں سر اٹھا کر جی سکتی تھی نہ وہ ماں بن سکتی تھی۔“

نیلیم نے اپنے دل کا سارا بوجھ رات کے اس پہر اتار دیا تھا۔ جانے کس احساس تلے، ایک انتہائی اجنبی شخص کو شریک راز، شریک غم کر لیا تھا۔ شاید وہ جواب دہا تھی، ایک مرد۔

آغا خان ہسپتال کے خورد سائیکارک وارڈ میں روٹی کر لائی، دشمن کی حالت اس سے دیکھی نہیں جاتی تھی۔ وہ ہر رات دو سو تھی۔ کبھی سمیر کہانی کا نام لے کر چلاتی تھی، کبھی اپنی محبت کا رونا روٹی تھی۔ اس واقعہ کو اب چار سال ہونے والے تھے جب وہ سب ہو اجو نہیں ہونا چاہیے تھا۔

سمیر کہانی نے حسب روایت دل بھر جانے کے بعد ”دشمن“ کو چھوڑ دیا تھا۔ کیسا نکاح اور کون سا نکاح؟ ہر فریب، سیاہ کار، دنیا کا یہ فریب ”دشمن“ کی سمجھ میں نہ آ سکا تھا۔ وہ روز روز کی تکرار سے تنگ آ گیا تھا یا دشمن کے برہتے ہوئے ڈپریشن سے کہ وہ دشمن کو کسی خاطر میں ہی نہیں لانا تھا۔ آئے دن ان کے جھگڑے ہوتے اور پھر ایک دن شدید ڈپریشن میں دشمن نے کہانی کے سسٹل سے اسی پر گولی چلا دی۔

کہانی تو بیچ گیا لیکن دشمن پاگل ہونے سے نہیں بچ سکی۔ کہانی نے اسے جانوروں کی طرح بنایا اور گھسیٹ کر گھر سے باہر نکال دیا۔ طلاق کے تین لفظ اس نے اس کے منہ پر دے مارے اور اپنے شرلوٹ گیا۔ دشمن

اس کی خوشبو تک بھی نہیں پہنچ سکتی تھی۔ جو کوٹھی بظاہر شہ کے نام تھی وہ کافورات بھی جلی تھی۔ اماں تو پہلے ہی کہتی تھیں کہ دشمن پاگل ہے۔ اور وہ واقعی پاگل ہی ہو گئی۔ شروع کے چند مہینے تو وہ ہوش سے بالکل بیگانہ رہی۔ آہستہ آہستہ کچھ تبدیلی بھی تو پھر دور در در جاتا اور اسے مینوں اور ہفتوں کے لیے ہاسپٹل میں ایڈمٹ کروا دیتا۔

نیلیم کی شادی ہو چکی تھی اور سارہ نے پارلر میں جاب کر لی تھی۔ دونوں نے دشمن سے سبق حاصل کیا اور اماں کو سختی سے تنبیہ کرنا شروع کر دی تھی کہ وہ دولت کا لالچ کرنا بند کر دیں۔ نیلیم جیسے ہی اپنے کھر کی ذمہ داریوں سے کچھ وقت نکالتی، اس کے پاس ہسپتال آ جاتی تھی۔

دو، تین دن سے تو دشمن کی بے چینی حد سے سوا تھی۔ معمول سے کہیں زائد وقت لے رہی تھی وہ وہاں کھانے کے بعد بھی سونے میں۔ کبھی کبھی وہ بہت زیادہ ہلک جاتی تھی بہت زیادہ چلانے لگتی تھی۔ اور کبھی وہ اتنی خاموش ہو جاتی تھی کہ لگتا تھا وہ کوئی ہو چکی ہے۔ وہ محبت نیپے پا کر اس نے کھو دیا تھا، وہ اس کی زندگی ہی لے ڈولی تھی۔ کوئی اس کوئی طلب اب اس کے اندر موجود نہیں تھی۔ شاید وہ موت کا انتظار کر رہی تھی، شاید اسے قیامت کے آجانے کی توقع تھی۔ سمیر کہانی اس کی زندگی میں موت کا قرب لے کر آیا تھا۔

اس رات نیلیم اس کے سونے کے بعد کینٹین سے چائے لینے کے لیے نکلی تھی کہ سامنے سے واکر کے سارے آتے فارس احمد ہے اس کی بد بھڑ ہو گئی۔ جس کی فائل سرجری ہو چکی تھی۔ اور اب وہ کافی بہتر طریق پر چل رہا تھا۔ عارضی نوعیت کے یہ بڑی چند ملاقاتوں میں ایک دوسرے کے دکھ درد جاننے لگے تھے۔ شائد اور فارس دونوں ہی بہت اچھے اخلاق کے مالک تھے۔ جس انداز سے وہ اس کا اور دشمن کا حال احوال پوچھتے تھے، اس انداز پر نیلیم کی آنکھیں نم ہو جاتی تھیں۔ اسے شدت سے ایسے لوگوں کی اپنی

زندگی میں طلب تھی جو ان کے لیے آسانی اور راحت کا باعث بنیں۔

فارس احمد جیسے نوجوان کو وا کر کے سارے چلتا دیکھنا نیلم جیسی حساس لڑکی کے لیے بہت مشکل تھا تو دوسری طرف کمرہ نمبر دو سو نوے آنے والی آہوں کراہوں اور سسکیوں کا سلسلہ 'فارس احمد' کے لیے بھی ناقابل برداشت تھا۔ اب یہ فارس احمد کی حلیم طبیعت اور شائستہ مزاجی کا اثر تھا یا نیلم کی تنہائی اور اعصاب شکنی... یا پھر قدرت نے یہ سب یوں ہی طے کر رکھا تھا۔

\*\*\*

ساری دنیا سے فحاشی نہیوڑے راج نہی بیٹھا تھا۔ اس کی سفیدی پھپکی پڑ چکی تھی پر دھلک گئے تھے۔ ہو امیں اس کے آنسوؤں کی می رچی ہوئی تھی۔

”تو آپ کی ماما آپ کی طاقت اور حوصلہ ہیں؟“ راج نہی نے رخ موڑے موڑے پوچھا۔  
”ہاں! انہوں نے ہی مجھے زندگی کو مثبت رخ سے دیکھنا سکھایا ہے۔ مثبت سوچنا اور مثبت رد عمل دکھانا۔“

”آپ کی زندگی میں کچھ نہ کچھ تو مثبت تھا ناں۔ بلکہ سب ہی کچھ مثبت تھا۔ ایک حادثے کے سوا۔ میرا اور آپ کا بھلا کیا مقابلہ۔ حادثوں اور غموں میں فرق ہوتا ہے۔ وہ زخم جو درد اسے ٹھیک نہ ہو، وہ زخم بہت تکلیف دیتے ہیں۔“ خود ترسی کی کوئی انتہا تھی۔

”بات مقابلے کی نہیں دشمہ بات اپنے اندر موجود طاقت کو تعمیری عمل کو جگانے کی ہے۔“ فارس کا لہجہ بے حد نرم تھا۔ ”اپنی مشکلات اور محرومیوں پر واویلا کرنے سے کیا حاصل؟“ وہ رمان سے بولا۔

کچھ نیلم نے دشمہ کے بارے میں بتایا تھا، کچھ وہ خود دشمہ کی آہوں کراہوں کی وجہ معلوم کرنے میں متجسس تھا کہ اس نے دشمہ سے دوستی کرنے میں دیر نہیں کی۔ آہستہ آہستہ وہ دونوں ایک دوسرے سے اپنے دل کی باتیں کرنے لگے۔ جب جب وہ کچھ بہتر

محسوس کرتی، وہ اس سے باتیں کرنے لگتا۔ دشمہ اس سے اپنی زندگی کے دکھ کہنے سننے لگی۔ فارس کو اندازہ تھا کہ زندگی نے دشمہ کو اتنے بدترین پہلو دکھائے ہیں کہ اب وہ زندگی کے روشن پہلوؤں سے کنارہ کش ہو چکی ہے۔ اسے لگتا تھا کہ زندگی میں اب نام کی بھی روٹنی موجود نہیں رہی۔ وہ امید سے اپنی ناامید ہو چکی تھی کہ اس کے الفاظ دکھ اور باپوسی کے لبادوں میں جیسے ہمیشہ کے لیے لپٹ گئے تھے۔

”واہ! واہ! کیا انصاف ہے آپ کا۔ جس کے پاس صرف زخم ہی ہوں وہ واویلا بھی نہ کرے۔“ دشمہ کے لہجے میں غصہ در آیا تھا۔

”دشمہ! مجھے تمہاری تکلیف کا اندازہ ہے۔“ اس نے دشمہ کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ ”لیکن ان تکلیفوں نے تمہیں بہت مضبوط بنادیا ہے۔ تم زندگی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اس کا مقابلہ کر سکتی ہو۔ اپنی طاقت کو پچانو دشمہ۔“ فارس نے دھارس دینے کی ایک اور راہ نکالی۔

”کیا فائدہ؟“ دشمہ نے جیسے قسم کھالی تھی کہ وہ اس کو لا جواب کر کے ساری دنیا سے بدلہ لے لے گی۔  
”میں تو اتنا جانتا ہوں کہ جس دشمہ سے میری دوستی ہو چکی ہے وہ بہت بہادر ہے۔“ فارس بھلا کیسے ہمت ہار دیتا۔

”آپ کو یہ اندازہ کیسے ہوا کہ میں بہادر ہوں؟ اگر ہوا ہے تو بالکل غلط ہوا ہے۔ میں بہت بزدل ہوں۔“ تنہی سے کہتی وہ کمرے سے باہر نکل گئی۔

فارس اندازہ لگا سکتا تھا کہ وہ ہمیشہ سے ایسی نہیں رہی ہو گی۔ دکھ کسی بھی بہادر انسان کو بزدل بنا دیتے ہیں۔ امید کی آس چھوڑ دینے سے کوئی بھی انسان سو بھی بیل کی طرح جھڑک زندگی سے الگ ہو جاتا ہے۔ جب زندگی سکھ کی زمین سے نکل کر کرب کی گلیچتی میں اپنی فصل کھڑی کر لیتی ہے تو کٹائی میں صدمہ آہیں اور سسکیاں ہی آتی ہیں۔

”کیا سوچ رہے ہو مینا؟“ شائستہ نے اس سے کتنی ہی دیر سوچوں میں کمر دیکھا تو پوچھا۔

”دشمہ کے بارے میں۔“

”اچھی لڑکی ہے وہ۔ لیکن بہت حساس ہے۔“

”شاید حالات نے اسے حساس بنادیا ہے ماما۔“

”تم اس کے بارے میں کیا سوچ رہے ہو؟“

”ماما! سمیرا کہانی نے اس کے ساتھ بہت برا کیا۔“

اسے سمیرا کہانی سے محبت تھی۔ کیا دنیا میں ہمیشہ محبت کے نام پر دھوکا ہی ملے گا؟

”یہ دنیا اور اس دنیا کے لوگ کچھ ایسے ہی ہیں بیٹا۔“

”تم کس کس بات پر سوچ سوچ کر بھگانا ہو گے؟“

”سب کے لیے خمیں لیکن ہم ان کے لیے تو فکر مند ہو سکتے ہیں نا جو اپنا دکھ ہم سے شیئر کرتے ہیں؟“

”ہاں! ہو سکتے ہیں۔ لیکن ایسے کہ تم اپنی صحت خراب نہ کرلو۔“ شائستہ کو اس کی فکر تھی۔

فارس خاموش رہا۔ شائستہ نے گردن موڑ کر دیکھا کہ وہ بدستور سوچوں میں کمر ہے۔

”تم واقعی اس کے لیے کچھ کرنا چاہتے ہو فارس؟“

اس سوال نے اسے حیران کر دیا تھا۔ ”کیا واقعی میں اس کے لیے کچھ کرنا چاہتا ہوں۔“ اس نے خود سے پوچھا۔ کیا وہ خالی خوبی، ہمدردی ہی کر سکتا ہے یا وہ واقعی دو نہیں چار قدم آگے بڑھ سکتا ہے۔

”میں دشمہ سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔“ اس نے جیسے فیصلہ کر لیا اور فوراً اس کا اعلان بھی کر دیا۔ ماما نے پہلے اسے حیرت سے دیکھا پھر وہ مسکرانے لگیں۔

”کیا دشمہ مان جائے گی ماما؟“

”اگر نہیں مانے گی تو اسے منالینا۔۔۔ میرا ہے میرا بیٹا۔“

\*\*\*

”آپ مجھ پر ترس کھارے ہیں؟“

”شادی کے سوال پر ہی تمہیں یہ کیوں لگا؟ ترس غیروں پر کھایا جاتا ہے اپنیوں پر نہیں۔“

”میں کب سے آپ کی اپنی ہو گئی۔“ اس کی آنکھیں بار بار جھلک رہی تھیں۔

”جب سے ہم نے اپنی اپنی باتیں ایک دوسرے

سے کرنا شروع کیں۔“

”میں تو آپ کو دوست سمجھ کر بات کرتی تھی۔ اب آپ مجھ سے ہمدردی کر رہے ہیں۔ ترس کھا رہے ہیں مجھ پر۔“

”تم ہمدردی کیوں سمجھ رہی ہو؟ محبت کیوں نہیں

”کیونکہ محبت کی یہاں کوئی گنجائش ہی نہ صورت دوستی کی حد تک آپ کی بات سمجھ آتی ہے۔ آپ کو مجھ سے محبت نہیں ہے۔“

”تمہارا خیال غلط ہے۔ دشمہ دوست سے بھی

محبت ہی ہوتی ہے نہیں ہو سکتی کیا؟“

دشمہ جیسے لا جواب ہو کر اسے دیکھنے لگی۔ ”ہو سکتی ہے۔“ اس نے سر جھکا کر کہا۔

اس نے دشمہ کو غور سے دیکھا اور جانا کہ اسے بھی ایک محبت کا قیاس ہی چاہیے تھا۔ وہ ایک عورت تھی

خواتین ڈائجسٹ

کی طرف سے بہنوں کے لیے ایک اور ناول

دستِ فکر

فوزیہ یاسین



دستِ فکر

شائستہ

اور روز ازل سے محبت کی طالب تھی۔ کسی بھی صورت اور کسی بھی تعلق کے ذریعے۔ بس محبت کی۔ اسے بس ایک یقین دہانی چاہیے تھی کہ اس سے صرف ”ہمدردی“ تو نہیں کی جارہی۔ فارس نے اسے یہ یقین دلایا اور اس کا ہاتھ تھام لیا۔ اور فارس اس پیاری لڑکی کو یہ یقین ہی تو دلانا چاہتا تھا۔

”میرا یقین رکھو وشمہ! تمہیں خوش رکھنے کی پوری کوشش کروں گا۔“

پھر شائے اور کیپٹن صاحب سب ہی محبت کا یقین دلانے والے۔ اتنی ساری محبتوں سے مفر ممکن کہاں تھا اس کے لیے۔ سوچ چاہ ایک گلابی شام میں وشمہ نے فارس احمد کے نام کی انگوٹھی پہن لی۔ اس کی بے چینیوں کو، تڑپ کو قرار آنے لگا تھا۔

صد شکر کہ دوا کھا کر ہی سہی وہ اب سونے لگی تھی۔

فارش خوش تھا یا نہیں۔ خوش نظر آنے کی بھرپور کوشش کر رہا تھا۔ لیکن بیشک کی طرح رات اترتے ہی ایک دلربا لڑکی کا چہرہ اس کے اندر لوٹنے لگا تھا۔

”محبت کی آنکھ ہمیشہ نم ہوتی ہے، دلوں پر ”الہام“ کرتی ہے، ان کو کھارے پانی سے دھو کر مختار دیتی ہے۔ اجلا کر دیتی ہے اور پاکیزہ۔ لیکن محبت دکھ دینے کا نام تو نہیں۔ محبت ضد کا نام تو نہیں۔ یہ تو آب جو ہے جو دلوں کے درمیان بہنے اور بے جانے کا نام ہے۔ وہ اپنی بے قراری کو دوا لاشمندی کے پیر بن میں پیٹنا چاہتا تو وہ مزید بڑھ جاتی۔

\*\*\*

پیاری مہربا! السلام علیکم!

ملاقات کے بجائے میں نے میل کو رابطے کا ذریعہ اس لیے بنایا کہ آپ کو غور کرنے کا موقع ملے۔ آپ جس روز فارس سے ملے ہسپتال آئیں میں نے اتفاق سے آپ کی باتیں سن لیں۔

مجھے یقین ہے کہ قدرت نے مجھے وہ باتیں سنوائیں ورنہ بے خبری میں، میں غاصب شہر کی، مجھ

سے ہمدردی کرنے والا، مجھے غم کی تاریکی سے نکالنے والا، صاحب ظرف، فارس احمد صرف آپ کا ہے۔ آپ کی آہوں کا منتظر۔ آپ دونوں کے درمیان نہ کوئی وشمہ ہے نہ کوئی ہوگی۔ ہاں حرف دعا کی صورت۔ آپ دونوں کی خیر طلب کرتی ہوگی۔

آپ کو یہ میل میں دینی سے کر رہی ہوں۔ جہاں اپنی والدہ اور بہن سارہ کے ساتھ میں آج ہی پہنچی ہوں۔ ہم دونوں بہنوں کو ایک کل سینٹر میں جا ب مل گئی ہے۔ ان کو بھی میل کر دی ہے۔ امید ہے وہ کل آپ کے پاس پہنچیں گے۔ فقط وشمہ

تعلیم سے مشورہ کرنے کے بعد سارہ اور وشمہ دونوں نے اپنے کالونیٹ لب ولجج کی بنیاد پر دینی کے ایک کل سینٹر میں نوکری کی درخواست کر دی تھی۔ ان کی بہن ٹھیک تھی اس کے سوا ان کو کچھ درکار نہیں تھا۔ وشمہ سے مہربا کے بارے میں جان کر وہ دل سے چاہتی تھیں کہ فارس کی شادی مہربا سے ہو۔ وہ فارس احمد اس کی فیملی کی احسان مند تھیں جن کی بدولت وشمہ زندگی کی طرف لوٹ آئی تھی۔

\*\*\*

سرائے مان اپنی تمام تر رعنائیوں سمیت ابستلہ تھا۔ چاندنی میں نازہ تازہ کیا ہوا سفید پینٹ چمک رہا تھا۔ گول مرمر کے ستونوں پر لیشی سبز ٹیلیں خوب گھٹی تھیں۔ صنوبر کے درخت ہنوز درہائی پر مامور تھے۔ البتہ ارد گرد کے درختوں نے ان چھ سالوں میں گھٹے بارغ کی شکل اختیار کر لی تھی۔ بڑی بڑی لائٹس آج بھی ان درختوں کو روشن کر رہی تھیں۔ اپنے نئے سیاہ لائٹ چیسٹو میں سرسبز مفلک لینے میں اپنی پراؤ سے اتر اور منتشر سیاہ گیٹ پر دستک دی۔ پہلی ہی دستک پر دروازہ کھول دیا گیا تھا۔ جیسے گھر کے کلین انتظار کرتے کرتے تھک کر ذرا سا ستانے کو مہمان خانے میں ہی بیٹھے ہوں۔

گرم اولیٰ پکڑوں میں دو چھوٹے بچے سب سے پہلے نظر آئے۔ دروازہ کھولنے والے ملازم کے اندر جا کر

اطلاع کرنے سے قبل ہی سارا گھر استقبال کے لیے ”واچلا آیا۔“

ارسلان، عمران ان کی بیویاں اور بچے سلام، مرحبا، خوش آمدید کے شور میں، میں آگے بڑھا تو سب سے پہلے آگے بڑھ کر مجھے آغا جان نے بھینچ لیا۔ وہ مجھے لپٹائے لپٹائے رو رہے تھے۔ اور میں بھی۔

”دیکھو بچے! میں زندہ رہا اور انتظار کرتا رہا کہ ایک دن تم آؤ گے۔ تمہارے انتظار نے مجھے مرنے نہ دیا۔ کوئی گلہ نہیں، میرے بچے تم سے کوئی گلہ نہیں، ہم کو اپنے خون کا انتظار تھا، یہ تمہارا حق تھا۔ اور تم آئے۔ ہماری خوش نصیبی۔ اللہ نے میرے یقین کی لالچ رکھی۔ اس کا شکریہ۔“

”آغا جان آپ بیٹھ جائیں، آپ کی طبیعت۔“

عمران نے آہستگی سے کہا۔

”ارے کچھ نہیں ہوتا مجھے۔ میرا بیٹا آگیا ہے۔ اب میں دس سال اور جیوں گا۔ اس کے بچے کھلاؤں گا۔“

”عمران بھائی کو کمرے میں لے جاؤ۔ یہ فریش ہو جائے۔ کس تم لوگ کھانا لگو آؤ۔“

عمران مجھے لے کر اوپر آگیا۔ جہاں میرا سامان رکھ

دیا گیا تھا۔ میں نہاد دھویا تو عمران مجھے لینے آگیا۔ آغا جان ڈانٹنگ ٹیبل پر میرا انتظار کر رہے تھے۔ اپنے دائیں طرف بٹھا کر انہوں نے ایک ایک چیز اصرار سے مجھے کھائی اور آخر میں سب کے منع کرنے کے باوجود اخروٹ کا حلوہ میرے ساتھ کھایا۔ ارسلان اور عمران کی بیویاں بچوں کو سلائے چلی گئیں۔

ہم سب کافی دیر تک باتیں کرتے رہے۔ عمران بڑی مشکل سے آغا جان کو متاثر سلائے کے لیے لے گیا کہ اب تو فارس بھائی ہمیں ہیں۔ کل باتیں کر لیجے گا۔

”آپ بھی آرام کر لیں فارس بھائی۔“ ارسلان

نے مجھ سے کہا۔

”میں کچھ دیر باہر ٹھلنا چاہتا ہوں۔“ میں نے

قدرے جھجک کر کہا۔

”آپ کا اپنا گھر ہے فارس بھائی! سمندر خان کو معلوم ہے۔ وہ گیٹ کھولے گا بھی اور بند بھی کر لے گا۔ آپ ضرور جائیں۔ لیکن باہر سردی ہے۔ آپ چیسٹو پہن لیں۔“ میں چیسٹو پہن کر باہر نکل آیا۔

صہبا اب تک سامنے نہیں آئی تھی۔

\*\*\*

پہلیں سے شہر کی طرف جانے والی سڑک کے دائیں جانب خوابیدہ شہر کا منظر مبہوت کر رہا تھا۔ سرد رات گرمی ہو چکی تھی اور بے حد خاموش بھی۔ سڑک کے بائیں جانب سیب اور آلو بخارے اور چنار کے چھتار درخت ابستلہ تھے۔ ان کے لمبے سائے مبہوت کر رہے تھے۔ صاف، چمکی، شفاف سڑک پر میرا سایہ میرے آگے آگے آہستہ آہستہ چل رہا تھا۔

میرے عقب میں میرا دوست، میرا چاند، بھی خاموش تھا۔ کچھ دیر بعد مجھے اپنے پیچھے آتا ہوا ایک سایہ دکھائی دیا۔ وہ صہبا تھی۔ یقیناً، میں صہبا گیا اور صہبا رہا یہاں تک کہ وہ سایہ مجھ میں مدغم ہو گیا۔

”پانے اور کھونے کے جھگڑوں سے آزاد، ہم محبت میں گم ہیں۔“ میں نے بے آواز سرگوشی کی۔

چاند کہنے لگا۔ ”محبت کے نصیب میں جدائی ہے، غم ہے، درد ہے۔ جو یہ درد سہ لیتے ہیں اور یہ جدائی اور غم گزار لیتے ہیں وہ اس کی لذت کو پاتے ہیں۔ محبت ان پر بارش کی طرح برتی ہے اور دھوپ کی طرح چمکتی ہے۔ بلاشبہ خوش نصیبی ان پر سایہ فگن ہے۔“





A high-contrast, black and white illustration of a woman in a patterned dress, looking down at a small object in her hands. The style is reminiscent of a woodcut or a high-contrast photograph.

آنکھیں جو شاید نیند کی کمی کے باعث اکثر ڈبڈبائی ہوئی لگتیں اور جو رُے ہانپنے پر گلگلی ہونٹ جو معائنہ کے وقت بیٹھے پر کھتا اور سوال جواب کے دوران ہلکا سا ایک طرف کو خم دیے کرسی پر ہلکے ہلکے جھولتا جانا مگر حیرت انگیز طور پر اس وقت یہ ہونٹ مسکرا رہے تھے۔ ”اس کو کیسے پتا چلا؟“ میں نے دل میں سوچا۔

”پچھلے ہفتے جو انٹنی بایونک لکھ کر دی تھی، تم نے لی ہو تو ابھی تمہاری حالت بہتر ہوئی۔ تمہیں بتایا بھی ہے کہ سردی میں اس بیماری کو بہت احتیاط سے لے کر چلنا ہوتا ہے۔ کھانسی بھی آئی گئی جو وقت کے ساتھ بڑھ گئے۔ تمہاری حالت بہتر ہونے کے بجائے بگڑ رہی ہے۔ اب تم ہی بتاؤ کیا چاہ رہی ہو؟“

95 اپنی شعاع مارچ 2017

ہوئے میرے ہاتھ میں پرجا پکڑا دیا۔ میں جان چھوٹنے پر جلدی سے اٹھ کھڑی ہوئی، مگر بخار کی شدت اور کمزوری سے چکرائی۔ وہ پھرتی سے اٹھ کھڑا ہوا اور مجھے سنبھالتا ہوا پھر سے ڈانٹنے لگا۔

”اتنی خراب طبیعت میں بھی آپ اکیلی ہی آئی ہیں، مانا کہ محلے میں کلینک ہے، مگر آپ کسی کو تو اپنے ساتھ لایا کریں، آپ سے زیادہ آپ کے گھر والوں پر حیرت ہوتی ہے کہ اس حالت میں آپ کو اکیلے آنے ہی کیسے دیتے ہیں۔“

اس نے مجھے واپس بٹھاتے ہوئے انٹرکام کا ریسیور اٹھا کر کمپاؤنڈر کو اندر بلایا تھا جو فوراً حاضر ہو گیا۔

”زاہد! ان کو گھر چھوڑ کر آؤ اور کوئی ان کا گھر والا ملے تو میرا پیغام دینا کہ میں نے مریضوں کو پک اپینڈ ڈراپ کی سولت نہیں دی ہوئی۔ اپنے اکیلے مریض اپنی ذمہ داری پر سمجھا کریں۔“ میں اپنی صفائی میں کچھ منمنائی اور ناچاہتے ہوئے بھی زاہد کا سہارا لیے کمرے سے باہر آئی۔

پورے راستے ڈنگ لگاتی رہی اور غصہ بھی کھاتی رہی۔ گزرن ایسے ہوتے ہیں۔ بیماری میں بھی میرا کوئی احساس نہیں اسے بد تمیز ایک تو گھر پر بلایا تھا کہ آکر دیکھ لے، مگر نہیں صاف مکر گیا اور حکم دے دیا کہ کلینک پر آکر دکھاؤ۔ اور پے سے ذلیل بھی کیسے دریا دلی سے گر رہا تھا۔ جیسے اس کا حق ہو۔ غصے کی ایک لہر خود پر بھی چڑھ دوڑی میں بھی تو ذرا اسی بیماری کو گلے سے لگا کر رکھتی ہوں۔ اب اگر یہ کھانسی ہر سڑی میں ہوتی ہی ہے تو کیوں اس کے ناز اٹھاتی ہوں۔ بڑی رہوں کمرے میں اور چپ چاپ مرجاؤں۔ مگر نہیں۔ کھانسی سے مرنا چھی کوئی مرنا ہوا۔ جیسے شیز چوہے کی موت مرجائے میں مرنے کے لیے ایسی معمولی سی بیماری کو ناکافی سمجھتی تھی۔ مطلب کہ بیمار

ہو کر ہی مرنا ہے تو کوئی ایسی انوکھی بیماری ہو جس کا نام بھی مشکل ہو اور جو علاج ہو جس کا چرچا پورے شہر میں نہیں تو کم از کم محلے بھر میں تو ہو کہ مجھے ایسی جان لیوا بیماری لگ گئی ہے۔ لوگوں کی آنکھوں میں افسوس

ہو کر ہی مرنا ہے تو کوئی ایسی انوکھی بیماری ہو جس کا نام بھی مشکل ہو اور جو علاج ہو جس کا چرچا پورے شہر میں نہیں تو کم از کم محلے بھر میں تو ہو کہ مجھے ایسی جان لیوا بیماری لگ گئی ہے۔ لوگوں کی آنکھوں میں افسوس

اُٹ آئے۔ بچوں میں میرے لیے مٹھاس بھر جائے۔ ایسے میں کسی کو شک بھی نہیں ہو گا اور پھر کھانسی سے اول تو میرے مرنے کے بہت ہی کم چانس تھے دو سرا یہ تکلیف وہ کھانسی کے دورے اور شدید بخار سننے کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔

میں تنگ آکر آخر کار ڈاکٹر یعنی اپنے پھوپھی زاد کے پاس دوڑ جاتی، مگر یہاں اس بار کچھ غلطی یہ ہوئی تھی کہ کافی طبیعت خراب ہونے پر میں اس کے پاس پہنچی تھی اور پھر اچھا خاصا دوائی لیتے لیتے خود سے ہی کسی بات پر ناراض ہو کر دوائی چھوڑ بیٹھی تھی اور اب جو پورے گھر میں اکیلی ہوئی اور طبیعت کچھ زیادہ ہی ناساز ہوئی تو ڈر کے پھر ڈاکٹر کے پاس دوڑی آئی تھی، جس کا خمیازہ بھی بھگت لیا تھا اور اپنی حد سے زیادہ بے عزتی بھی کر دلی تھی۔ چلو اب سکون رہے گا۔ ہم جیسوں کو دن بھر میں ایک بار کسی نہ کسی سے ذلیل ہونے کا ایسا چکا کا روتا ہے جیسے کوئی بڑی بیماری سے نچنے والا نیکس۔ کچھ بھی ہو، نیکس کو نا ضروری ہے، بے عزتی کا نیکس ہو نہ!۔

دو چار گھر چھوڑ کر ہی میرا گھر تھا۔ دھیرے دھیرے قدم اٹھانے پر بھی چند منٹ میں ہی گھر آگیا۔ گھر پر کوئی ہوتا تو زاہد اس کا پیغام دیتا۔ میرے پاس گیٹ کی چابی تھی۔ میں شکریہ کہہ کر گھر میں داخل ہو گئی اور چکرائی۔ ڈوٹنی۔ اپنے کمرے میں پہنچ کر بستر پر گر گئی۔

سب گھر والے ایک شادی میں گئے ہوئے تھے اور میں نے اکیلے کلینک جانے کے ڈر سے ہی اس کو فون کیا تھا کہ مجھے کلینک سے واپسی پر دکھانا جائے، مگر اس نے بد تمیزی سے انکار کر کے مجھے کلینک میں بلایا تھا۔ دیے تو اکثر ہی وہ کلینک سے زاہد کو دوڑانا اور کبھی چائے تو کبھی پانی منگو لیتا تھا مگر بیمار دیکھنے کے لیے کبھی

نہ آتا، یہاں تک کہ بابا جانی بھی موسمی بیماری کی دوائی لینے اس کی کلینک جانے پر مجبور تھے۔

اس پر بھی سب اس سے خوش تھے۔ کیونکہ اس قدر اکھڑ۔ بد دماغ اور بد تمیز صرف میرے ساتھ ہی

لہا۔ خاندان کے باقی لوگ اس کی خوش اخلاقی کی تعریف کرتے نہ تھکتے تھے اور میں اکثر حیران ہوتی تھی اس طرح لوگوں۔ ان کے رویوں اور حالات کو دیکھتی تھی اس طرح دنیا ہرگز نہیں دیکھتی تھی میں آج تک دنیا سے الگ تھلک۔ دوسری نہیں بلکہ شاید تیسری۔ مت میں کیوں سوچتی ہوں؟ اور اسی وجہ سے دنیا کی نظر میں ناکام ہوں۔ کیا جواز ہے میرے پاس، کوئی حیلہ، بہانہ اپنی نالائق، نااہلی اور ناکامی کا یہ دنیا سے مخالف سمت پر چلنے سے دنیا کی نظر میں آگے نہیں پیچھے جارہی ہوں۔ پھر بھی بغض ہوں کہ اسی طرح مخالف سمت پر منہ کر کے چلتی چلی جاؤں گی، میں سوچتے سوچتے سو گئی تھی۔

رات کے کسی پھر کسی نے دھیرے سے پیشانی پر ہاتھ پھیرا، بابا جانی سرہانے بیٹھے مسکرا رہے تھے۔ ”کیسا محسوس کر رہی ہو بیٹا؟“

بابا جانی نے کچھ اس اناہیت سے بوجھا کہ دل بھر آیا، آٹھ سے دو چار آنسو بھی لڑھک گئے بابا جانی ڈر کر پیچھے ہٹ گئے اور یہ کہتے جلدی سے کمرے سے نکل گئے کہ سوپ بنوا رہے ہیں۔

یہ باپ بیٹی کے آنسوؤں سے اس قدر خوف کیوں کھاتے ہیں؟ میں سوچتے سوچتے اٹھ بیٹھی اب جو دوسری سمت نظر کی تو ٹھنک گئی۔ وہ کمرے کے دوسرے سرے پر رکھے صوفے پر ٹانگ پر ٹانگ چڑھائے بیٹھا مجھے بغور دیکھ رہا تھا میں نے جلدی سے آنسو بونچھ ڈالے۔

”تمہارا مسئلہ کیا ہے؟“ وہ اسی سختی سے بولا، میں اس کے منہ لگنے کی نہ تو اہل ہوں نہ ہی اس وقت ہمت تھی اور مجھے آج شام ہی بے عزتی کا نیکس لگا کر اس نے ہفتے بھر کا کوٹ پورا کر دیا تھا۔ پھر بھی میرے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔

”روٹی پکڑو اور مکان۔“ وہ جھنجھلا کر تیز لہجے میں گویا ہوا۔ ”اصل میں بھرے پیٹ میں ایسے ہی ہری ہری سو جھتی ہے، بڑھی ناکی جاہل ہو تم، کبھی ذرا ایسے ارد گرد بھی دیکھو، ہفتی

تھی۔ بابا جانی نے دوسری شادی کئے کو میری خاطر کی تھی۔ ماما کے آنے سے مجھے ماں کی جگہ سے تو بابا جانی بھی دور ہو گئے۔ پہلے کم از کم بابا جانی تو مجھے میسر تھے۔ خیر کی ڈر و خوف کے مجھے گلے تو لگا لیتے تھے گو د میں

بھی لیتے تھے، اکثر اسکول بھی چھوڑنے یا لینے آجاتے تھے مگر ماما کے آنے کے ساتھ ہی بابا جانی سمٹ گئے۔  
ایسے میں میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ میں بابا جانی کی دوسری شادی کو کس طرح جانچوں وہ تو کہتے ہیں کہ دوسری شادی انہوں نے اسی جان کے مرنے کے دو سرے ہی سال اس لیے کی کہ ان کی آٹھ سالہ بچی یعنی مجھے ماں کی اشد ضرورت تھی مگر ضرورت میری تو کبھی بھی پوری نہ ہو سکی بلکہ شاید نفیسی اور بڑھ گئی۔  
پانی کے قریب ہونے پر بھی پیاس برقرار رہی۔

میں نے اپنے ہوش سنبھالتے ہی ماما کو سمجھا لیا تھا۔ انہوں نے میری تربیت آنے کے ساتھ ہی چند ہی دنوں میں مکمل طور پر کر دی تھی اور تربیت یہی تھی کہ کچھ بھی ہو میں ماما سے کسی بھی قسم کی کوئی امید نہ رکھوں۔ مجھے باپ سے شروع میں تو بابا جانی بہت کوشش کرتے کہ ماما مجھے برداشت کر لیں، مگر دوسرے بھائی بہنوں کے آنے اور ان کے ہوش سنبھالنے تک بابا جانی نے بھی ہمارا دل بھی اور جس وجہ سے ماما اس گھر میں آئی تھیں۔ کیس کی کوئی نہ میں جا دیکھی تھی۔

ویسے تو مجھے بھی گھر میں آرام، تحفظ، تعلیم، روپیہ پیسہ سب ہی تقریباً ماما کے بچوں جتنائی میرے ساتھ مگر پھر بھی میری کوئی ذمہ داری نہیں لیتا تھا، میں گھنٹوں گھر سے باہر رہوں۔ باہر کسی حادثے کا شکار ہو جاؤں، بیمار ہو جاؤں، کسی مشکل میں پھنس جاؤں، کوئی ذمہ دار نہ تھا نہ ہی مجھے کسی کو پکارنے کی اجازت ہی تھی۔ یہاں تک کہ بابا جانی بھی میری پکار پر اکثر خاموش ہی رہتے۔ بھرے ہوئے گھر میں بھی تنہا تھی۔ سب کے ہوتے ہوئے بھی اکیلی تھی۔ اوپر سے کئی سردیوں سے یہی ہونے لگا۔ میری کھانسی بڑھ جاتی اور میں نہ چاہتے ہوئے بھی اس کا علاج کرواتی جاتی۔ کبھی کبھی دل چاہتا کہ کوئی ہو جو محبت سے دوائی دے۔ بخار میں پتی

پیشانی پر ٹھنڈے پانی کی پٹیاں رکھے یا پھر کبھی آکر بس دو چار منٹ پیاس پیٹ کر حال چال ہی پوچھ لے۔  
ایسے میں پھوپھی جان ہی تھیں جن سے میں دل کا حال احوال کہہ سکتی تھی، مگر ماما کو یہ بات بھی پسند

نہیں تھی۔ ابھی پچھلے دنوں ہی پھوپھی جان نے بابا جان کو میرا دھیان رکھنے کے لیے دو چار لفظ ہی کہے تھے کہ ماما کا پارہ چڑھ گیا تھا اور بابا جانی دونوں کے درمیان صلح صفائی ابھی تک نہیں کروا سکے تھے۔ شاید اسی لیے ابھی تک پھوپھی جان مجھ سے ملنے نہیں آتی تھیں۔ ورنہ ہر سردی میں وہ ایسے وقت میں میرے پاس رہنے آجاتی تھیں۔ اسی وجہ سے اس بار تنہائی کچھ زیادہ ہی محسوس ہو رہی تھی۔

”تمہارا فون کہاں ہے؟“  
اس نے میرے سوپ کی فرانس ہوتے کے ساتھ ہی پوچھا، میں نے سائڈ ٹیبل کی طرف دیکھا تو وہ اٹھ کر بکھری ہوئی دو آہیوں، بیکٹ کے ڈبوں اور دیگر چیزوں کے درمیان میرا فون ڈھونڈنے لگا۔ فون ملا جو کہ چارج نہ کیے جانے پر بند پڑا تھا۔ تب ہی آج ایک بار بھی بابا جانی نے فون کر کے میرا حال احوال نہیں پوچھا تھا اس نے مجھے تنقیدی نظروں سے دیکھ کر چار چار ڈھونڈ کر فون دوبارہ اشارت کر دیا تھا جو اپنی مخصوص دھن سناتا زندہ ہو گیا۔

دل میں کسک جاگی۔ ایسے ہی کاش کوئی مجھ پر بھی مہربانی کر دے، میں کب سے بہت سی بے جان چیزوں کے درمیان خود بھی بے جان ہوئی بڑی ہوں، کوئی مجھے بھی اسی طرح میری مطلب کی توانائی سے میرا سرا جوڑ کر مجھے زندہ کرنے کی سعی کر لے، شاید میں بھی اسی طرح دھن سناتی، گنگنائی جاگ انھوں زندہ ہو جاؤں۔ واقعی میرا مسئلہ کیا ہے؟ موت؟ زندگی؟ یا پھر بس، وجود مجھے نہیں کبھی کوئی میرے اس وجود سے میرے ہونے کا احساس تو دلائے۔ کبھی کوئی اس طرح میرے کسی کونے میں کئی صدیوں سے بے جان پڑے ہونے پر مجھے تلاش تو کرے کیا مجھ سے، میری زندگی سے کسی کو کچھ بھی حاصل ہونے کی کوئی امید نہیں کیا واقعی کسی

کو میری کوئی ضرورت نہیں؟  
کمرے کا دروازہ کھلا ہوا تھا اور لاؤنج میں کبھی کبھار کوئی گزرتا اور پھر بھی نظر کر لیتا۔ تھوڑی دیر کے لیے ٹھنک کر کمرے میں اسے اور مجھے بغور دیکھا اور پھر

اگے بڑھ جاتا۔  
”اسی نے مجھے منع کیا تھا کہ تم سے اپنا ہلوں۔“  
اس نے دو ایک بار حسی کو گزرتے کمرے میں نظر انداز دیکھتے ہوئے کہا۔

میں ایک بار پھر سسک اٹھی پھوپھی جان کیا اب وہ بھی مجھ سے بدلے لیں گی؟ ماما کی بدتمیزی اور بابا جانی کی خاموشی کی سزا مجھے دیں گی؟ پھوپھی جان کو معلوم ہی ہے کہ میں بیمار ہوں پھر بھی انہوں نے اس اکھڑ کو اور بھی بد لحاظ ہو جانے کا کہہ دیا۔ گو میں اس سے بات لے رہا نہیں چاہتی تھی پھر بھی اس کی بات نے مجھے ایسا ادا کیا تھا کہ میں لڑکھرائی زبان سے پوچھ بیٹھی۔

”تو کیا ہو گیا اب تم مجھ سے کبھی نہیں ملو گے؟“  
میرے سوال پر مجھ پر ایک نظر بے نیازی سے ڈالتا وہ غریب سا مسکرا اٹھا۔

”در اصل میں اس معاملے میں پہلے تو خدا ہے وقف بن گیا۔ مجھ پر واردات تو کئی روز ہوئے گزر چکی تھی، مگر میں سمجھنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ ماننا نہیں چاہتا تھا میں تم سے کئی بار سوال کر چکا تھا، تم سے تمہارا مسئلہ جاننے کی کوشش کرتا تھا، مگر انہی مسئلہ سمجھ نہیں رہا تھا اور پھر تم بھی تو اپنی ہی دھن میں اس قدر مگن تھیں کہ تمہیں کبھی تمہاری ذات کے باہر کوئی نظری نہیں آیا، تم نے اپنے وجود کو ایسی دھند بنالیا کہ جس میں ہاتھ بھر کے فاصلے پر کھڑے ساتھ چلنے کو بھی دیکھ نہیں پاتیں۔“

وہ سانس لینے رکا اور میں نے پہلو بدلاؤہ جو کچھ کہہ رہا تھا میری کچھ سمجھ میں آ رہا تھا کچھ نہیں بھی آ رہا تھا، مگر میں دم بخود اس کو سنتی چلی جا رہی تھی اور نہیں چاہتی تھی کہ وہ بات ختم کیے بغیر ہی اٹھ کر چلا جائے۔ آج پہلی بار وہ مجھ سے اس طرح اتنی دیر کے لیے مخاطب ہوا تھا اور شاید آخری بار بھی۔

”شیریں؟“  
واقعی یہ دھند تھی۔ دور تک کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا کہ اس کی پکار مجھ تک پہنچی۔ دھند اچانک چھٹ گئی اور پھر سب کچھ بہت واضح ہو کر نظر آنے لگا۔ وہ

ابھی بھی میرے پاس ہی بیٹھا تھا۔ مجھ سے مخاطب تھا۔ مجھے نظروں ہی نظروں میں ٹٹولتا ہوا، مجھے پکارتا ہوا۔  
”شیریں! جب اسی نے مجھ سے تمہارے بارے میں پوچھا تھا تو میں تمہاری دھند میں ایسا الجھا ہوا تھا کہ اپنا مسئلہ سمجھ نہیں پایا تھا، میں نے امی کو صاف انکار کر دیا تھا۔ پھر امی کی ممانی جان سے ان بن ہو گئی اور امی نے مجھے سختی سے تم سے یا اس گھر میں کسی سے بھی رابطہ رکھنے سے زندگی میں پہلے بار منع کیا تو جانتی ہو شیریں! مجھے احساس ہوا کہ جس دھند میں تم تھیں اس نے اندھا مجھے بھی کر رکھا تھا۔ میری آنکھ کھلی تو میں ڈر گیا۔ حقیقت تمہارے بغیر مجھے بہت بے معنی سی لگنے لگی اس لیے میں پھر گیا اور کافی دن کی سوچ بچار کے بعد امی سے باقاعدہ بحث پر اتر آیا، پہلے پہل تو ان کو یہ پاور کرانے کی کوشش کی کہ تم اکیلی پڑ جاؤ گی، دھی ہو جاؤ گی، مرا جو گی، انہوں نے ہر مسئلہ کا حل پہلے سے سوچ رکھا تھا اور حل بھی کیا تھا، وہی میں نہیں تو کوئی اور۔ اور اگر کوئی ”اور“ تو پھر مجھے تمہارے سامنے آنے کی کوئی ضرورت نہیں، میں گڑبڑا گیا۔ ٹھک مار کر جیج کا سامنا کیا، کسی ماہر وکیل کی طرح اپنا مسئلہ بیان کیا، ان کو سمجھایا، مگر آخر کار وہ بھی میری ماں ہیں۔ پتا ہے انہوں نے کیا کیا؟“

وہ رک کر مجھے دیکھنے لگا، مگر میں تو خود ہی اس قدر محو تھی کہ بس سرفرائی میں ہلا کر رہ گئی تھی۔  
”اسی نے کہا کہ ہاں اب آئے ہو تم بہاؤ کے نیچے اور پھر کہنے لگیں کہ شیریں کو بھی جلد سیدھا کر دینی ہوں، ہر وقت مرنے مارنے کی باتیں کرتی رہتی ہے، بہت مرنے کا شوق ہے، نا اسے اب جلد اس کی موت کا سامنا کرنی ہوں۔ میں تو کہتا ہوں تیار ہو جاؤ شیریں! تمہارا برا وقت آنے والا ہے۔“

وہ آخری جملہ شرارت سے کھل کر کہہ رہا تھا اور تیزی سے کمرے سے نکل گیا۔  
میں زیر لب مسکرا اٹھی بالآخر میرے وجود کو بھی توانائی کا سرالما اور اب میں اپنی مخصوص دھن گنگنائی زندہ ہو گئی ہوں۔

مصباح علی سید

# کادیا دوعلا

”نماز پڑھ کر اے مت اٹھ جلیا کر نماز دل کو نرم  
کرتی ہے بندگی، یقین باندھتی ہے، اور دعا تو قبول ہی  
تج ہوئی ہے جب تصور میں یقین اور بندگی مضبوط  
ہوں۔“  
”ہو نہ۔۔۔“ وہ بددائی ”میں اور میری دعاؤں کا اثر“  
زخمی مسکن نارنجی ہونٹوں پر ابھرتے ہی معدوم ہو  
گئی۔  
”یہ نہیں کہتے، کم عقل۔“ انہوں نے اسے ڈپلہ  
”اللہ تعالیٰ سمجھ لیں، اے زیادہ پتا ہے، کب“

جائے نماز پر سر موڑے بیٹھے اسے کتنے پل بیت  
گئے تھے۔ دعا کے لیے ہاتھ پھیلتے تھے۔ رہتی ہوٹ  
مسلسل ورد کے بعد آگے شروع ہو گئے۔ کالج سی  
پہلیاں پھیلیوں پر جی رہ گئیں۔ آنکھوں میں پانی  
پھیلتی گلابی لکیوں نے نمی کو اکسایا۔ بس پسلا قطرہ  
بیشکل نکلتا ہے، پھر سیل رواں لڑنے کے لیے بے  
قرار تھا۔ یہاں تک کہ ستواں ناک کے دونوں جانب  
نرم گالوں پر لکیریں چمکنے لگیں۔ اور دامن بھینکا گیا۔  
تیری سانسوں کے سچ بدلے قرار بے طرح دھڑک رہا  
تھا۔ آمنہ نے تکی بار سمجھایا۔

## مکمل ناول





کیسے دعا قبول کرنی ہے۔“

تذکرہ کذابان باتوں میں ذرا دلچسپی نہیں تھی۔ اس کا دل چوبیس گھنٹوں میں بیس گھنٹے بچپن منٹ یہی کہتا تھا ”جب قسمت لکھ دی، دعا کیا کرے گی؟ البتہ پانچ منٹ کے لیے دل کی دھڑکن ساکن ہو جاتی، ذہن موقوف بہت امید سے باتوں سے جھلکلاتے آسمان پر آہستہ آہستہ نگاہ جاتی، کسی امید، خوف، التجا جیسی۔ آہستہ آہستہ اس وقتوں سے غم گوشوں کو نرم ہوا کے جھوٹے سکھا دیتے۔ پھر وہی بے یقینی۔

”نہیں قسمت میں ایسے ہی لکھا تھا، لیکن اللہ جی، میری ہی قسمت میں کیوں؟ ہر تیسرے شخص کی طرح دن میں ہزاروں شکوہ (بھلا سوچو اللہ نے امتحان میں کیا ہاتھوں، سمندروں کو ڈالنا ہے، جنت میں عیش انسان کرے گا تو آزمائش جیسی قیمت اسے ہی دینا ہوگی) شکوہ کنال ہوتے ہی پل بھر کے لیے آنکھیں میچتے لمحے دعا نکلتی۔

”اے اللہ! یا تو اسے ملا دے یا پھر دل سے نکال دے۔“ کتنی عجیب بات ہے جس چیز کو سمیٹ کر اس نے اپنا دل بتا رکھا تھا وہ تن سے کیسے نکل سکتا تھا؟

\*\*\*

بہت چھوٹی عمر میں ان دونوں کا مضبوط بندھن بندھ گیا تھا۔ تب نکاح کا مطلب بھی پتا نہ تھا۔ نائی کا ایکسڈنٹ ہوا۔ تیا موقع پر چل بے نائی نے البتہ ہسپتال تک سانس کھینچ لی۔ آخری ٹوٹی جوتی سانسوں میں آمنہ کا ہاتھ پکڑ کر آسٹون کے بیچ بیٹھتی آواز میں کہا تھا۔

”آمنہ! اللہ کے بعد میرا رازی تیرے حوالے بڑا ہو گا تو اسے اپنا بیٹا بنا لیتا۔“

”بھابھی! رازی آج بھی میرا بیٹا ہے، کیوں فکر کرتی ہے۔“

”نہیں آمنہ! خدا کے واسطے، مجھے یقین دے، تو اسے مالک اپنے بیٹے کی طرح چالے گی، جیسے تو ویسے

۔۔۔ وہ مجھے بہت پیاری ہے، کاش میں۔۔۔ جیتی اور۔۔۔ خود۔۔۔ انہوں نے ہچکولے لینے شروع کیے۔ ڈاکٹر زرمیں جمع ہو گئے مگر وہ آمنہ سے مخاطب تھیں۔

”بتا آمنہ! تو رازی اور تو کا نکاح۔۔۔“

”بھابھی! ایسی باتیں نہ کر۔۔۔ تو ٹھیک ہو جائے گی۔“

”بتا ناں۔۔۔ بتا۔۔۔ وہ ہاتھ پکڑے اصرار کر رہی تھیں۔ آمنہ نے سر ایک دو بار ہلاتے تسلی دی۔

”تو بے فکر رہ بھابھی! رازی میرا ہی بیٹا ہے، اور دونوں کا نکاح بھی۔۔۔“

ابھی لفظ زبان تلے تھے صفری کے چہرے پر اطمینان پھیل گیا۔ اکلوتی اولاد کو تحفظ ملا، روح کو امان مل گئی۔

\*\*\*

دس سالہ تذکرہ، بارہ سالہ رازی کا تیا، نائی کی برسی پر نکاح کر کے آمنہ نے اپنے الفاظ پورے کر دیے۔ وہ صفری بھابھی کے سامنے سر خرو ہو گئیں۔ اس عمر میں بچے اپنے تعلق کی نزاکت سے بے پروا ساتھ ساتھ کھیل کود، پڑھ لکھ، جوان ہو گئے۔ مل باپ کی کمی نے رازی کو چڑچڑا، بد تمیز، اکھڑتا دیا تھا۔ بات بے بات جھگڑا، کھانے پینے میں عیب۔

”مرغی کیوں پکائی، بدبو آتی ہے، کر لے زہر جیسے لگتے، مگر دو پھکا تو چاول کچے، روٹی جلی ہوئی لگتی، دو چار نوالے لے کر ناک منہ چڑھا کر برتن پھینک دیا۔ آمنہ اس کا ہاتھ پکڑتی رہ جاتیں مگر وہ اتنی بے رحمی سے جھٹکتا کہ ان کا بازو جوڑے مل جاتا تھا۔ اسکول سے روز شکایات آنے لگیں۔

کسی کی کتاب کھودی، کسی کا قلم توڑ دیا، کسی کا سر پھاڑ دیا اور تو اور صرف چودہ برس کی عمر میں پاؤں اڑا کر ماسٹر کو گرا دیا۔ شکایت پہنچ کر احسان کو بلایا گیا۔ وہ آئے دن کی شکایات سے عاجز تھے۔ تھپڑ مارتے گا لیاں بکتے گھر تک لائے۔ اور پلنگ پر دھکا دیا۔ آمنہ نے سینہ تھام لیا۔

”اے بے کیا ہوا۔۔۔ کیوں مارتے ہو بچے کو۔“

”جانے کب سدھرے گا، یہ بد بخت۔“ احسان نے ایک اور تھپڑ رسید کیا۔ ”اور تم نے۔۔۔“

انہوں نے اگلے دانت جساتے قہر آلود نگاہ آمنہ پر الٹی جو پر جوش سی اٹھی تھیں، ساری کانٹ گئیں۔ غالباً آمنہ کا ان کے نکاح پر بے جا ضد اور پھر کروا کر دم لینا، انہیں رہ رہ کر غصہ دلاتا۔ بہت سمجھا مگر نہیں مانیں۔ کیا کسی دیورانی، جیٹھانی میں محبت ہوگی، جتنی صفری اور آمنہ میں بھی۔ شروع سے ایک گھر میں رہیں کسی بات پر اختلاف، جھگڑا نہیں۔ چند سال بعد پوری رضامندی سے اپنے اپنے باورچی خانے الگ کر لیے۔ پھر بھی ایک دوسرے کے کام میں ہاتھ بٹاتا۔

دونوں بھائیوں کی مشترکہ دکان تھی۔ پورے حساب کتاب سے معاملات درست چل رہے تھے کہ بڑے بھائی کا ایکسڈنٹ ہو گیا۔ پیچھے رہ جانے والی ان کی اولاد جان سے عزیز بن گئی۔ آمنہ کو اپنی بات کا بھرم بھی اس قدر عزیز تھا کہ مان کر نہ دیں۔

”میں نے صفری کے نکلنے دم زبان دی تھی، مکملوں کی نہیں۔“

”زبان دے دی تھی تو منہ میں تلوار کیوں لٹکا لی نیک بخت، کیوں بچی کے پیچھے پڑی ہے۔“ وہ بار بار کہتے۔

”انہیں بڑا ہو جانے دو، بھلی مائیں، جانے وقت پر کون کیسا نطفہ ہمارا بچی کا معاملہ ہے۔“

”کون کیسے؟ یہ کیا مطلب ہوا۔“ وہ تنگ گئیں۔ ”اچھی تربیت کروں گی، اچھے ہی بنیں گے۔“

”چلو مان لیا اچھے۔ اور اگر اس اچھا، اچھی میں ایک زیادہ اچھا بن گیا، دوسرے کو ناپسند کیا؟“

”ایسے ہی ناپسند کیا۔“ وہ جھری سبزی میں بیخ کر گھومیں ”اور میاں“ یہی تو وجہ ہے نکاح کرنے کی، نا پسندی کی کوئی صورت چھوڑیں گے، تب ناں۔۔۔ اندھا، کانہ، اور کالا، نصیب سمجھ کر برداشت کریں گے، تو کے لبا۔۔۔ مگر تم میں تو ذرا دراندیشی نہیں۔۔۔“

”ہاں۔۔۔ وہ ناگوار ہی ہے بولے“ تمہیں تو پہاڑ کے اندر تک کھائی دیتا ہے کیا کہنے تمہاری نگاہ کے۔ وہ پیچھے ہٹنے والی نہ تھیں ہر بات پر دلیل۔

”اگر رازی دلا دیا ہو گا تو، ہماری نظر میں اس کی محبت الگ ہی رہے گی، ٹیکری اولادیں کر بھاری نہیں پڑے گا، ہماری اکلوتی اولاد بیاہ کر کہیں اور چلی گئی تو لیاہ رازی کی دلہن، ہم بڑا بدمعاشی کو برداشت کرے گی، ہماری اکلوتی بیٹی ہے، ہمیشہ گھر میں سانسے نظروں کے رہے گی میاں، سسرال، سدھیانے کے جھنجھٹ بھی نہیں، پھر رازی بھی احسان مندی میں دب کے رہے گا، تمہاری چھوٹی عقل میں کچھ آتا ہی نہیں۔“

آمنہ نے آخر منوا کر ہی دم لیا۔ نکاح ہو گیا۔ آمنہ کی دور اندیشی سال بعد ہی رنگ بدل کر سامنے کھڑی تھی۔ بیار محبت کرنے والا پیارا سارا رازی بالکل ہی بدلنے لگا تھا۔ بس ابتدا احسان صاحب سے ہوئی تھی۔

وہ صبح سے گلی میں کرکٹ کھیل رہا تھا۔ بہت سے دوست اکٹھے کر کے خوب چوکے، جھلے، اگلے دن اس کا اردو کا ٹیسٹ تھا اور اردو اس کی انتہائی کمزور ٹیوشن رکھ لی فرق نہ پڑا۔ وہ گھر کھانا کھانے آئے تھے اسے کھیلتا دیکھ کر کٹس گئے۔ کلائی پکڑ کھلائے، کمرے میں بند کر دیا۔

”انمان بن کر اپنا ٹیسٹ تیار کر، جب دیکھو کھیل رہا ہے۔“

ڈپٹ کر باہر نکلتے چچا کی پشت کو اس نے خوت سے گھورا۔ دل میں آیا ساری کتابیں پھاڑ کر، ان کی پشت پر دے مارے مگر نہ سکا۔ دو چار رٹے لگائے، رٹوں کے دوران ہی سلاخوں والی کھڑکی سے نیچے پر آمدے میں بیٹھی خوبر پر نگاہ گئی۔ سیہلی کے ساتھ گیند بنے کھیل رہی تھی۔ تن من سلگ گیا۔ ایک توڑ کے اس کا نام لے لے کر چھیڑتے تھے، اوپر سے اس کی بے فکری۔

”اپنی بیٹی ہے ناں، جیسی تو اسے کھیلنے سے منع

نہیں کرتے، اس کی پڑھائی کی فکر نہیں، صرف میری ہے، ہونہ۔“ اس نے ضد باندھ لی، ٹیسٹ تیار کرتی ہے میری جوتی۔“

اگلے دن آدھے نمبروں والا ٹیسٹ گھر آیا۔ پھر کیا تھا احسان کی جوتی اور اس کی کمر۔

”بے حیا تو سیدھے طریقے سے نہیں مانے گا۔“

آمنہ بھاگ کر آگئیں۔

”کیوں مارتے ہوئے پڑھ لے گا۔ ماسٹر کم بخت کو بھی اس سے ضد ہے، جان کر نمبر کم دیتا ہے، جلتا ہے اس کی ذہانت سے۔“

”اس بھوسے کی ذہانت سے جلتا گا؟“

انہوں نے ایک اور گھونسا لگا دیا، آمنہ نے اسے اپنے ساتھ پچکارے ہوئے پلٹایا۔ میاں کو خفگی سے دیکھتے اس سے رساں سے بولیں۔

”کیوں ہونے لگا بھوسا پڑھے گا لکھے گا؟“ اک دن بڑا افسر بن جائے گا۔ ہیں ناں۔“ انہوں نے اس کی ٹھوڑی پکڑ کر اونچی کی آنکھوں میں جھانکا، ”میرا رازی

تو سب سے اچھا ہے، ہے ناں۔“ وہ خاموش رہا، گردن جھٹک کر جاتے چچا کو اس نے آنکھیں سکیڑے گہری نگاہ سے دیکھا۔ کوئی خفگی شکوہ ان میں تیرا تھا۔ آمنہ نے اسے چمکارتے ہوئے ساتھ لگا لیا۔

”رازی! تو کیوں ایسے کرتا ہے، اپنے چچا کی بات مانا کر، وہ تجھ سے بہت پیار کرتے ہیں۔“ وہ ایسے دانت کچکا رہا تھا جیسے دانتوں میں نبولی آگنی ہو۔

”ہو نہہ پیار، تب ہی سب کے سامنے مارتا ہے، وہاں نہ بیٹھ، اس سے نہ ہیل، پڑھ لے، پڑھ لے پتا نہیں مجھے پڑھا کر کیا لے گا۔“

”دیکھ رازی!“

انہوں نے پیار سے اس کے ماتھے کے بال پیچھے کبے بوسا لیا۔ ”تیرا چاچا جانتا ہے، تو سب سے اچھا، لائق بنے، سب تجھ پر رشک کریں، تیری زندگی قابل گزرے۔“

”اچھا تو چاچا جانتا ہے۔“

اس نے سوچا اور قابلیت سے ہی چڑ ہو گئی۔ ان کے سامنے ہر ایسا کام کرنا کہ وہ اندر تک ٹکس جاتے۔ خود کو بہت روکنے کے باوجود بھی ہاتھ جاتا اور بعد میں خود ایک جانب سر پکڑ کر بیٹھ جاتے، روتے پریشان ہوتے۔

”اللہ میں کیا کروں لوگ کیا کہیں گے، ایک بھتیجا، وہ بھی ٹکھو، آوارہ۔“ جب بیٹی کے مستقبل کی فکر ہوتی تو ہول اٹھتے۔

\*\*\*

رشتے تعلق کے جذبے سے لڑکے عاری ہو سکتے ہیں لیکن لڑکی کی فطرت میں ہی رشتوں کا تقدس محبت گندھی ہوتی ہے، تعلق احساس بن کر دھڑکنے لگتا ہے، لوگوں کی زبانوں اشارے کنارینے، ہنسی ٹھٹھول نے رشتے میں جذبات پرو دیے۔ بچپن میں سمجھ نہ تھی پھر جیسے جیسے بڑی ہوئی وہ اکھر مغرور اچھا لگنے لگا۔ اس کے بھاری قدموں کی چاپ سن کر سارا خون چہرے پر سمٹ جاتا، حیا کی لالی سے گل دہکنے لگتے اور

جب بھولے بھٹکے مخاطب کرتا تو دل کی دھڑکن اس قدر بے ہنگم ہو جاتی اس کی بات سچ سے سمجھ میں بھی نہ آتی۔ اپنی ہی دھک دھک کانوں کے پردے پھاڑ دینے کو ہوتی تھ وہ چلا کر ہوتا۔

”اے سہری! تجھے میری بات سنائی دیتی ہے یا نہیں سنا کر پوچھتی تھی۔“

”کک! کیا کہنا نہ؟“

”کچھ نہیں۔“ اس کا غصہ، خفگی لہجے میں رچ گئی۔ گردن جھٹک کر دیا، ”میری ناگلی میرے منھے ماری۔“

جسے چاہا جائے، جو دل کے طلب نے میں براجمان ہو اس کے لہجے کی درشتی بھی سکون دیتی ہے۔ اس کا کھرا لہجہ فرحت آئیں لگتا ہے، وہ اس فرحت میں کھو جاتی، خیالوں گمانوں میں جانے کس دنیا کی سیر پر نکل جاتی۔ ہاں تکلیف تب ہوتی جب اب اسے ڈانٹ ڈپٹ کرتے برا بھلا کہتے یا ماریٹ قطعاً، برداشت نہ ہوتی تھی۔ ایسا

لگتا تھا کوئی اس کے اپنے من پر چابک برسا رہا ہو۔ اب اسے کہنے کی ہمت نہ تھی۔ البتہ اس کا قدرے اچھا موڈ دیکھ کر ڈرتے جھپکتے سمجھاتے ضرور تھی۔

”رازی! تو اب اسے فوراً“ معافی مانگ لیا کر، ان کی مرضی کے خلاف نہ چلا کر، وہ تیرا برا نہیں چاہتے۔“ ایک اور چاچا کی حمایتی۔ اس نے تند نگاہوں سے گھورا اور بارہ نکل گیا۔

\*\*\*

جتنی سنہری روپ رہی تھی۔ دھوپ کی تمازت میں سب سائے ڈھونڈ رہے تھے۔ کالج سے آتے رازی کو شرارت سوچھی۔ کریم بخش کے نیل کی زنجیر کھول دی اور وہ بھی انتظار میں تھا۔ کھیت روندنا بھاگا ساتھ والے گاؤں سے پکڑ کر لائے، ہانپنے کا پیٹے کریم نے احسان سے شکایت لگائی۔ وہ اب بچہ نہیں تھا۔ اٹھارہ انیس سالہ کڑیل نوجوان تھا۔ پھر بھی احسان کاؤنڈ اور رازی کی ٹانگیں بازو بدن نیل و نیل ہو گیا تھا۔

”کسی کے سامنے نظر ملانے کے قابل چھوڑے گا بھی یا ذلیل کر کے دم لے گا، بے غیرت۔“

انہوں نے اسے کمرے میں بند کر دیا۔ آمنہ نے بہت شور ڈالا، ہاتھ پکڑ پکڑ کر روکا مگر انہوں نے کھا جانے والی ایسی نگاہوں سے گھورا۔ ان کی جرات نہ ہوئی مزید آگے آنے کی۔ دروازہ باہر سے بند تھا۔

تذلیل خاموشی سے تماشہ دیکھتی رہی۔ تقریباً آدھی رات کے وقت وہ چوری سے کھانے لے کر گئی تھی۔ وہ گھٹنوں میں سر دیے بیٹھا تھا۔ دروازہ کھلا، بلب جلا اس سے تو بڑی چیز ہار کر دیکھا تھا۔ پھر نخت سے رخ پھیر لیا۔ وہ اس کے قریب ترے رکھتے ہوئے مقابل بیٹھ گئی۔ خاموش۔ روٹھا اس نے جھپٹے ہونٹوں پر زبان پھیری، پھر کانٹے لگی۔ اس کی نگاہ سیاہ بالوں سے بھری مضبوط کلائیوں پر چپے تازہ نیلیوں پر ٹھہر گئی، سفید جلد پر گہرے نیلے داغ، دھڑکتے دل کے ساتھ بہت۔ جھپٹے۔ ہوئے وہ اپنی مخروطی انگلیاں

اس کی کلائی تک لے گئی تھی۔ پوریں ابھی مس بھی نہ ہوئی تھیں۔ وہ پھمکارتے ہوئے دھاڑا۔

”چل اٹھ، یہاں سے جا، میرے سامنے نہ آیا کر، کچھ نہیں لگتا میں کسی کا۔“

ایک سخت ہاتھ مار کر رڑے فرش پر الٹ دی تھی۔ کچے فرش نے مسالہ دار گرم شوربہ تیزی سے اپنے اندر جذب کر لیا۔

دو کالج سی پتلیاں لبالب بھری جمیل میں ڈوب گئیں۔ بانی کے شدید دھندلے گئے ہیں وہ بمشکل اٹھی۔ دوپے کا پلو بلیوں پر رکھ کر سسکیوں کا گلا گھونٹا، تیزی سے باہر نکلی اور اس کی چوٹ کی دیوار سے ٹیک لگا کر پھر بہت دیر روٹی تھی۔ محبت بھی عجیب شے ہے، انسان کو سب کچھ بخش کر زبان چھین لیتی ہے، وہ بھی گنگ ہوئی، آنسو بہاتی، جتنے آنسو نکلتے دل پر اتنا ہی بوجھ بڑھتا گیا۔ اسی بھاری دل کے نرم گوشے میں کچھ دھڑکنے لگا تھا۔ شاید کچھ لفظ تھے۔ اسے پہل بار ایسا محسوس ہوا جیسے اس کے دل کے اندر ابھی ابھی ہونٹ بنے ہوں۔ پہلے کپکپائے اور پھر کچھ ضدی انداز میں طلب گار بن گئے۔ اس نے ماں کو ہمیشہ ہاتھ اٹھائے دعا مانگتے دیکھا تھا۔ اس نے بھی ہاتھ اٹھالیے۔ دل کے ہونٹ زور و شور سے اس کے طلب گار بن گئے۔ دعا دعا اور کبھی نہ ختم ہونے والی مقبول دعا بن گئے۔

جانے کس پہر اس کی آنکھ لگی۔ قبلہ رخ لیٹی وہیں سو گئی۔ تہجد کی اذان پر وہ کسمسلتے ہوئے کھٹی، آنکھ کھلی لب ہٹے محسوس ہوئے شاید کچھ ورد کر رہے تھے۔ کچی زمین کی پیش چاند کی کرنوں نے بہت حد تک ماند کر دی۔ اک مسکور سی خفگی کا احساس تھا۔ اس نے پبلو بدلتا چاہا۔ کوئی کپڑا اس کے ساتھ لپٹا محسوس ہوا۔ اس نے بازو پھیل کر اپنے جسم پر محسوس کیا۔ اس پر ایک چادر لپٹی تھی۔ اس کا دماغ پوری طرح بیدار ہوا۔ وہ سمٹ کر اٹھ بیٹھی، چادر کو بغور دیکھا۔ نیلی پتیوں والی گلابی چادر۔ وہ تو رازی کے بستر کی چادر تھی۔

”تو کیا رات کو وہ خود اسے اوڑھا گیا تھا۔ ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟ رازی؟ اس کو رات میں پیاس بہت لگتی تھی۔ وہ پانی پینے باہر نکلا۔ دروازے کے ساتھ دو کے ہندسے کی طرح وہ سڑکی لپٹی تھی۔ پہلے اسے حیرت ہوئی پھر غصہ آیا۔ جی چاہا تو کمر مار کر اپنے راستے سے ہٹا دے لیکن برداشت کرنا نظر انداز کر گیا۔ کمرے میں واپس آ کر اس کی بے چینی مزید بڑھنے لگی۔ کبھی لیٹا، کبھی بیٹھا، آخر تک آکر اٹھا اپنے نسری چادر جھاڑ کر اسے اوڑھا دی اور واپس آ کر سو گیا۔ وہ بھی اس کی چادر میں پرسکون سمٹ گئی تھی اور اب آنکھ کھلنے پر اس چادر سے ناویدہ لمس محسوس ہو رہا تھا۔ اس نے پورے استحقاق سے اسے اپنے گرد لپیٹا اس میں رچی رازی کی خوشبو، اس کا احساس خود میں سمونے پھرے سونے کی کوشش کرنے لگی۔

دھک اور مکھ میں ایک قدر بے حد مشترک ہے، سب سے پہلے حواس چھتے ہیں، نیند پروٹھ جاتی ہے، اس کی خوش نما خیالوں کی روبھنگ بھنگ کہاں سے کہاں پہنچ رہی تھی۔ وہ اٹھی وضو کیا۔ نفل پڑھے اور پورے شمع سے شکرانہ ادا کیا تھا۔

آمنہ احسان کے سامنے ہمیشہ اس کی ڈھال بنی تھیں، کسی صورت اس کی غلطی مان کرنے دیتیں۔ لکٹی بار اپنی آنکھوں سے اسے غلط کام کرتے دیکھا مگر نظر انداز کر گئیں۔ احسان کے سامنے ویسے ہی ڈٹ کر کہتیں۔

”میرا رازی ایسا کر ہی نہیں سکتا، رازی ایسا تو ہوا ہے۔ ساہل نہیں ہے وہ، ضرور دوسرے لڑکے نے ہی بنگالیا ہو گا پھر نائلیں تو ٹوئیں گی، نائیوں کے لڑکے تو ہوتے ہی لڑا کا ہیں، باپ کے استرے سے زیادہ ان کی زبان چلتی ہے، جھوٹ بول رہا ہو گا وہ کمینہ، رازی بھلا کیوں اس بلند زور کو دھکا دینے لگا، خواجواہ تھوڑی کسی کی کتاب پھاڑے گا، ضرور اسی نے پہلے جھینے ہوگی، مانیٹر کو تو ویسے ہی اس سے اللہ واسطے کا پیر ہے، خود تو کالا، سوکھا، لمبا ترنگا، جلتا ہے میرے بچے کے رنگ و روپ

سے، اس بڑھے کریم کو تو سدا سے جھوٹ بولنے کی بیماری ہے، تو یہ استغفار اپنی عمر کا بھی لحاظ نہیں، بلا وجہ میرے رازی کا نام لگا دیا، یہ کیوں کھولنے لگا کسی کا تیل، ایسا ہی عزیز تھا تو کوڈ میں لیے بیٹھتا، راستے میں کیوں باندھ رکھا تھا اور وہ ماشرود نر پڑی چیز دکھائی نہیں دیتی، مونے شیشوں کی عینک لگائے چڑھائے پھرتا ہے قدم اٹھانے سے پہلے گر جاتا ہے حسب قسمت گر گیا ہو گا نام میرے بچے کا لگا دیا، خدا واسطے کا پیر لگا رکھے ہیں میرے لال سے، اللہ تو جیسے گا ان کد ابوں کو۔“

جتنی اس کی طرف دار بنتی اس سے زیادہ بچکانہ تھی پھر سمجھا جھلسا دیتیں۔ لیکن انسان انسانوں سے جھوٹ بول سکتا ہے، دھوکا دے سکتا ہے مگر اپنے رب سے نہیں۔ وہ راتوں میں چھائے سنائے میاں اٹھتیں۔ اور رازی کی ہدایت کے لیے دعا مانگتیں۔

راتوں میں اٹھ کر یوں پکارنے کی عادت انہیں پچھلے مہینے سے ہوئی تھی۔ غالباً ”چھوٹی موٹی غلطیوں کو وہ کبھی خاطر میں نہیں لاتی تھیں۔ جولائی کی شرارتیں کہہ کر ٹال دیں مگر پچھلے مہینے سامنے لگی کے منصور نے جو کچھ بتایا ان کے ہوش اڑ گئے گاؤں سے خاصے فاصلے پر پیرا دتے کا ڈیرہ تھا۔ نشے، فحاشی میں بدنام۔ منصور نے بتایا کالج اوقات میں اس نے کئی بار رازی کو اس رستے پر دیکھا ہے۔

”تیرا دوہم ہو گا۔ کوئی اور ہو سکتا ہے رازی نہیں۔“

”خالد! میں اندھا ہوں یا رازی کو نہیں پہچانتا۔“ آمنہ نے اس کے آگے ہاتھ جوڑے ”خدا کے واسطے اپنے چاچا کو نہ بتانا میں خود اس کی خبر لوں گی۔“ اور تیسرے دن کی بات ہے، کپڑے دھوئے ہوئے اس کی شلوار کی جیب سے سگریٹ کی بھری ڈبی نکل آئی۔ آمنہ زمین میں دھنسنے کو تھیں کہ عقب سے اس کی گھبریا تو آواز ابھری۔

”چاچی! یہ کیلی تو نہیں ہوئی۔“

اس نے لینے کے لیے ہاتھ آگے بڑھایا، وہ ساکت لہا سے دیکھ رہی تھیں۔

”آج آگیا ہو گا اس کا باپ، اسے دکھاؤں گا، بڑا ہاچے کے آگے کھتا پھرتا ہے اس کا بیٹا بار بار سا ہے۔“

نام حسین کے سامنے اس کے ہاتھ سے چھینی ہے، اسے بھی ساتھ لے کر جاؤں گا۔“ ڈبی پکڑ اپنی جیب میں رکھتے ہوئے بڑبڑا رہا تھا۔ آمنہ ٹھنڈے لہجے میں پوچھ رہی تھیں۔

”کس کی بات کر رہا ہے؟“

”منصور کی، یاروں کے ساتھ مل کر یہ حرکتیں کرتا ہے اور چاچا۔“ اس کے منہ میں یک لخت کڑواہٹ ابھری۔ ”ہر بار اس کی مثال دیتا ہے، وہ اچھا ہے، ایسا ہے دیا ہے۔ یہ ہیں حرکتیں اس کی۔ ہونہ۔“ اس نے جیب پر ہاتھ مارے گئے، وہ ہکا بکا رہ گئیں۔ پھر دھیرے سے تصدیق کی۔

”سچ کہہ رہا ہے ناں تو۔ کہیں تیری تو۔“ ان کا اشارہ ڈبی کی طرف تھا۔

”اوہ رہن دے چاچی۔!“ اس نے ہاتھ جھٹکا۔

”چاچا کا ڈیرہ کم گرم ہے حواس سے منہ ساڑوں گا۔“ وہ پھیکا سا مسکرا کر گردن جھٹکا، بھر نکلا تھا اور ان کی بے یقین دل میں اک سکون اتر آیا۔

حقیقت بھی یہی تھی۔ منصور نے اپنے دفاع میں شکایت کی کوشش کی تاکہ رازی کو اپنی ہی پڑ جائے۔ وہ

احسان اس سے لاپرواہ ہو گئے، وہ باہر والوں سے ہو گیا۔ بلا جواز ضد اپنا کھٹکا بنا دینے لگی تھی۔ بند مٹھی میں پکڑی ریت کی طرح پھسلتا وقت، کبھی کالج ریزوں سے ہتھیاریاں چر کر گزرتا تھا۔ اب ایک تسلسل سے پھسلنے لگا۔ کئی ہفتے گزر گئے۔ ایک سے دن رات، کہیں کسی نے رازی کی کوئی شکایت نہ لگائی تھی، کالج میں آئے دن تو زچھوڑ میں وہ پیش پیش ہوتا تھا، وہاں بھی خاموشی، سیاسی سرگرمیوں میں بڑھتی اس کی دلچسپی بھی مفقود ہوتی جا رہی تھی۔ ایسا کیسے ہو سکتا ہے رازی خود بخود سدھر جائے؟ وہ تو ایسا بھٹکا مسافر تھا جسے دکھائی

دینے کے باوجود قطبین کھوئے محسوس ہوتے تھے۔ اس کا ہاتھ پکڑ پکڑ گڈنڈی پر چڑھایا جانا اور وہ اپنی ضد سے پھسل پھسل اترتا اور اب اچانک بغیر ہمنائی کے بھلا کیسے چلنے لگا۔ احسان اندر تک جو گئے مگر ظاہر نہ کیا۔ مبادا پھر سے سرکشی عود آئے۔ گھر میں بھی گردن جھکائے داخل ہوتا، قدموں کی آہٹ تک زمین جذب کر لیتی۔ جو کیا کھالیا، پسند نہ آیا ظاہر نہ کیا، وہی جو راتوں کو خواجواہ اوہرا دھر پھرتا تھا مشام ڈھلے گھر، ہر وقت کے خریچے یک لخت سمٹ گئے۔ یہ تبدیلی معمولی نہیں تھی۔ جو آمنہ پر ظاہر نہ ہوتی۔ محسوس ہوا مگر پوچھنے سے گریز، جائے دماغ میں کیا چل رہا ہو جب مسلسل کئی دن گزر گئے تو رب کا شکر ادا کیا۔

”شکر ہے مالک! جو مزاج میں تبدیلی لاتا ہے۔“

اکثر اوقات احسان کو جتا جاتیں۔

”میں نہ کتنی تھی وقت پر سب کو عقل آجاتی ہے، مگر تم لاٹھی سے لانا چاہتے تھے۔“

”او، نیک بخت میں دشمن نہیں ہوں اس کا، میں چاہتا ہوں اس کے بازوؤں میں اتنا دم ہو کہ مجھے کندھا دے سکے، مٹی ڈال سکے مجھ پر۔“

”یہ! امرنے مارنے پر اتر آیا کرو، ہمیشہ۔“ وہ ناک چنڑھا کر بولیں۔ ”جب دم نکلتا ہے ناں میاں، کندھا اور مٹی آپو آپ مل جاتی ہے، میں گھر رہی ہوں بچہ بال رہا ہے، بجائے بڑے میاں خوش ہونے کے باتیں شروع۔“ چولھے سے ہانڈی اتار کر تو چڑھانے

خفت بھرے انداز میں کہا۔

انہوں نے اثبات میں سر ہلاتے ٹھنڈی آہ بھری۔

”بدل تو رہا ہے مگر بہت دیر اور بہت ست روی سے،“

بڑی امیدیں تھیں اس سے۔ ”ان کے تلخ لفظ پر انہوں نے ہاتھ اٹھایا۔

”بس میاں! یہ لفظ مت کہو۔ تمہارے غصے سے بگڑا ہے وہ، اب دیکھنا ایک دن تمہاری ساری انگلیں پوری کرے گا۔“

”اللہ کرے۔“

بادلوں کے سفید دھبوں سے چھن کر گرتی پکھل چاندی جیسی شعاعیں وجود کو زندگی بخشی تھیں۔ چاندی کی مورتی کا بدن کرنوں کا عکس بن گیا۔ اس عکس میں محبت کی شفاف روشنی میں بھونتی سفید ملاؤ جیسے رخساروں پر ملا پھیلا۔ وہ لمبے ڈگ بھرنا صحن عبور کر ہسپتال کے لیے نکل گیا تھا پاس سے گزرتے صرف اک نگاہ اٹھا کر اسے دیکھا تھا۔ ساوہ بے ضرر۔ صرف اک نگاہ اور وہ اتنی سی لو سے ہی پکھل کر بننے لگی وجود نرم گرم موم میں بدل گیا۔ دوپٹہ لپیٹی جھینپ کر اندر غراپ ہو گئی۔ اس لمحے ان کے قدموں لگو نشین بھی تیز تیز دھڑکتی تھی۔



ہسپتال کے وارڈ میں آتے جاتے، دوائیں لاتے اسے فکر مند ہوتے دیکھ کر احسان کو وہ اپنے بے حد قریب محسوس ہوا تھا۔ پہلی بار انہیں اس پر زہ دار بیٹے کی طرح نخر محسوس ہوا۔ اتنی تکلیف میں بھی کہیں سکون اترتا تھا۔ اپنی سختیوں پر خود ہی شرمندہ تھے۔

”کاش رازی یہ جان جائے میں اس سے محبت کرتا ہوں اسے کامیاب دیکھنا چاہتا ہوں۔“

وہ ہسپتال سے گھر آگئے تھے ڈاکٹر نے بہت سی ہدایات کے ساتھ انہیں مکمل آرام کا کہا اور اچھی خوراک کی نصیحت کی۔ خاص کر وزن اٹھانے سے پرہیز بتایا تھا۔ گھر آنے کے بعد ان کا ہر ممکن خیال رکھنا۔ اٹھنے بیٹھنے میں مدد کے علاوہ بھی پاس بیٹھا رہتا

تھا مگر خاموش۔ چپ ہسپتال میں پھر کوئی بات ہو جاتی کسی ملنے والے کا بتا دیتا مگر گھر میں خاموشی کی چادر اجنبی پیرہن کی طرح درمیان میں پٹی رہتی وہ خود سے بھی نہ ہلاتے۔ اتنا ہی کافی تھا کہ وہ ان کے پاس ہے، لوگوں سے لڑتا بھڑکتا چھوڑ دیا ہے۔



بیرونی دروازے کے عقب میں بنے غسل خانے

وہ پاؤں پھیلاتے چارپائی پر لیٹ گئے۔ کمرے میں صفحوں کو پلٹتے رازی نے ساری باتیں سنیں اور چاچی کے توصیفی جملے اندر تک شانت کر گئے۔

زندگی ریل کی طرح سیدھی ساٹ پڑی پر سفر ضرور کرتی ہے مگر منزل تک پہنچنے کے لیے کانٹے کا آنا اور جنکشن پر پڑی بدل کر موڑ کاٹنا از حد ضروری ہے۔ ان کی زندگی کی چھک چھو میں بڑا جنکشن آتا تھا۔ عام معمول کی سبزی ترکاری لاتے احسان کی سائیکل دیگیں سے نکل گئی۔ بہت تیز رفتار ڈرائیور تھا سنبھلنے کا موقع نہ ملا وہ اچھل کر بہت دور گرے۔ ہاتھ پاؤں چہرہ سب پر چو میں آئیں سب چو میں ایک طرف اور کولے کی بڑی کی چوٹ ایک طرف۔ ڈاکٹروں نے فوراً آرٹیشن کے ذریعے راڈ ڈالنے کا کہا تھا۔ آمنہ کے ہوش اڑ گئے۔ اچھا خاصا خنر چا تھا۔ کچھ جمع پونجی تھی کچھ زیور۔ وہ ہاتھ میں ہار پکڑے اس کے وزن کا اندازہ لگا رہی تھیں۔

”پرانا ہمارے، ٹانگے ہی ٹانگے۔ کیا رقم ملے گی چند ہزار۔“ ان کی خود کلامی پر وہ عقب سے بولا۔  
”امی کے بھی تو ہوں گے، وہ ڈال کر شاید کافی ہو جائے۔“

وہ اچھا خاصا چو کی تھیں۔ آج تک کبھی ماں کا ذکر کیا، نہ کسی اور چیز کا اب اچانک انہوں نے اپنی حیرانی ظاہر نہیں ہونے دی، سنبھل کر مسکرائیں۔  
”تیری ماں کے زیور تیری دلہن کے لیے رکھے ہیں۔“

”تو پھر دلہن سے پوچھ کر لے لو۔“  
حیران و حیران۔ اس کے یوں کہہ کر چلے جانے پر وہ تو حیران تھیں ہی چو کھٹ پر قدم رکھتی تو ساری کی ساری منجمد ہو گئی۔ آج تک اس کے کسی رویے، کسی انداز سے قطعاً محسوس نہیں ہوا تھا کہ وہ اپنے اور اس کے رشتے سے واقف ہے۔ اب لہجہ کا ٹھہراؤ اتنا قطعی تھا جیسے وہ رشتے سے مطمئن بھی ہو۔ آن میں ہی نیلا آسمان تلو کے لیے مضبوط ہو گیا سیسے سے بھی زیادہ مضبوط



سے وہ تولیے سے بال رگڑتا نکلا تھا۔ گیلا تولیہ تار پر پھیلایا، سرمئی کرنے کی آستین لپیٹا اپنے زوہیان میں برآمدے کی جانب بڑھ رہا تھا۔ موڑھے پر سامنے والی خالہ چچی کے برابر بیٹھی باتوں میں مصروف تھیں۔ چاچا کی تیار داری کے لیے اکثر ہی کوئی ہمسائی آتی بیٹھی ہوتی۔ موضوع گفتگو وہ اپناں، ٹونگے، وہ سرے اشارے سے سلام کرتا اندر کمرے میں بڑھ گیا۔ شیشے کے آگے کھڑا بالوں کو سنوار رہا تھا۔ تب خالہ کی آواز پر ہاتھ تھم گئے۔

”جئے فکر کی کیا ضرورت، اتنا کڑیل جوان تو ہے رازی“ اسے کہہ دکان کھولے، آخر لڑکے مانگتے کس لیے ہیں۔“

اس کے کان خود بخود چچی کے جواب رنگ گئے۔ ”وہ تو بہت ضد کر رہا ہے کھولنے کی گنجائش ہی منع کرتی ہوں۔ اب گھر پر مرد کا ہونا بھی ضروری ہے کوئی نہ کوئی آجاتا ہے تیرے بھائی سے ملنے، بس تھوڑے دن کی بات ہے پھر سب ٹھیک ہو جائے گا۔“ چچی کے بات سننا نہ اسے اپنی کہا نیکی کا احساس ہوا اور اپنی بے فکری پر فخر افسوس وہ ابھی بھی کچھ کہتے ہوئے مٹھی کھولے ان کے آگے کر رہی تھیں۔

”ہاں، یہی بالیاں، تم ہی تو کہہ رہی تھیں ایسی بوائے کا تو یہی رکھ لو۔“ اس نے گردن اٹھا کر باہر کی جانب جھانکا، ان کی ہتھیلی پر سونے کی بالیاں چمک رہی تھیں۔ نگاہ ان کے خالی کانوں پر گئی دل پر پھر مکاسا کا، خفیف منہ کھل گیا۔ ”جو سنار قیمت لگائے مجھے دے دینا، ویسے بھی

بھاری چیزیں اب ہنسی نہیں جاتیں۔“ بالیاں ان کی ہتھیلی سے اٹھاتے خالہ کے چہرے پر تاسف ابھرا۔ ”ہم عورتوں کے پاس، یہی ہوتی ہیں مشکل میں کام آنے کے لیے، حق ہا، چلو بہن! میں جلدی پیسے بھجواؤں گی۔“

کچھ دیر بیٹھ کر وہ توجلی گئیں مگر وہ شرمساری میں ہیک گیا، جی میں آیا بھاگ کر جائے ان کی مٹھی کھولے،

بالیاں چاچی کے کانوں میں ڈال دے، لیکن وہ خالی نظریں دیواروں پر پھرتے بے بسی سے مٹھیاں پیچنے لگا پھر کچھ سوچ کر اثبات میں سر ایک دو بار ہلایا۔

وہ صبح سویرے نمادھو کر صاف ستھرا ان کے پاس آ کھڑا ہوا، کچھ دیر نگاہیں ادھر ادھر پھیرتا رہا کان پر پشت کھجائی، نگاہ ان کی چارپائی کے پاس رہی تپائی پر دو اؤں کے ڈھیر سے سرک کر کمرے کی ایک ایک چیز پر گئی، مینے بھر میں بہت کچھ بدل گیا تھا۔ اب کان کی لو اس کی پوروں سے رگڑ کھا رہی تھی۔ وہ کھنکھار کر بولا۔

”وہ، چاہیاں دے دیں۔“ احسان چپ رہے بس اک گہری نگاہ اس پر گئی پھر کچھ توقف سے کہنے کے نیچے ہاتھ پھیرا، چابیوں کا چھٹکتا گچھا نکال اس کے سامنے دھر دیا۔ نذرے جھجکتے ہوئے وہ جھانکھانے کے لیے جھکنا تھا۔

”مال ہے یا آئے گا؟“ اس کے مختصر استفسار پر وہ اندر تک متحیر تھے مگر یہ لفظی جواب دیا۔ ”دیکھنا پڑے گا!“

اس کے سر خم کرنے پر تحیر کی جگہ اندر تک طمانیت پھیل گئی۔ اپنے بچوں میں احساس ذمہ داری پیدا ہونے پر ہر مال باپ فخر سے پھول جاتے ہیں زمین پر پاؤں خود بخود مضبوط ہے اور قیمتی محسوس ہوتے ہیں۔ اس لمحے احسان کو اپنا وجود بھی ستار کے ہیرے کی طرح محسوس ہوا وہ پھیل کر چارپائی پر لیٹ گئے۔ بازو سستوں میں بچھالے، نگاہ چچی چھت کو پڑے مضبوط ٹکڑ کی کڑیوں اور ہتھیر پر رک گئی۔

☆ ☆ ☆

وہ چاہیاں جیب میں ڈال ہوئے سے ”اللہ حافظ“ کہہ باہر نکلا۔ برآمدے کے وسط میں پہنچا تھا غیر ارادی نگاہ اس کے کمرے کی سلاخوں والی کھڑکی پر رک گئی۔ سرمئی سرمئی چادر میں ملفوف اس کی کاٹھی سی پشت بستی دکھائی دی۔ چادر بہت اچھی طرح سے سرسری تھی۔ دعا کے لیے اٹھے ہاتھ چادر کے اندر سے جھانکتے تھے دکش سفید انگوٹھوں سے تسبیح کے سیاہ دانے

لے نظر آتے تھے یقیناً ”وہ دعا مانگ رہی تھی۔ دن لے اولین لمحوں میں تسبیحات اس کا معمول تھا اور اب ہاتھ دعا کے لیے اٹھے تھے چند مینے پہلے کا منظر ایک نکت اس کی آنکھوں میں آن کھڑا ہوا۔

اسے دکان پر جاتے ہی روز ہو گئے تھے شام کو مارا حساب لا کر چاچا کے سامنے رکھ دیا۔ وہ خاموشی سے رجسٹر بڑھتے پھر تیبے کے نیچے رکھ دیتے۔ نئے مال لے لیے وہ بختی رقم دیتے وہ بلا جوں چراں رکھ لیتا۔ نہ اندوں نے زیادہ پوچھ کچھ کی نہ اس نے بات پھیلانی۔ البتہ ہمہ کن اٹھیں۔ اسے کمرے میں آتے، وہاں دیتے، کھانا رکھتے وہ پٹہ سنبھالتے بڑی نرم لگا ہوں سے دیکھ کر نظریں جھکا لیتا تھا۔

☆ ☆ ☆

دن سورج سے گرتی اجلی شفاف کرنوں کی طرح نلک اکٹھے ہوتے جا رہے تھے ہر آنے والا دن سورج کی روشنی میں شفافیت بھر جاتا۔ اس کا نرم گرم احساس زندگی کی علامت کو جلا بخشتا ہے۔ اک دن آمنے احسان سے کہا تھا۔

”میاں! تمہارا حادثہ اللہ کی طرف سے بڑا مبارک لگا۔“

احسان نے شکوہ کنال نگاہ اٹھائی، وہ سنبھلیں۔ اپنے رازی کی وجہ سے کہہ رہی ہوں، ماشا اللہ ایک مینے میں کیسا سنبھل گیا، دکانداری خوب چمکالی میرے نیچے۔“

انہوں نے پر سوچ انداز میں سر ہلایا ”ہوں۔۔۔“ ”میں تو کہتی ہوں آمنے کے ابا کوئی اچھا سا دل دیکھ کر ان کی شادی کے فرض سے فارغ ہوں۔“

”تم نے کبھی رازی سے ذکر کیا شادی کا۔“ ان کے راز دانہ استفسار پر آمنے کے سارے چہرے پر مسکان پھیل گئی۔ معمولی سا اثبات میں سر ہلایا اور اس دن اس کا یہ کہنا ”چھو بہن سے پوچھ کر لے لو۔“ اندر تک مسرور کر گیا تھا۔

ان کی طبیعت اب خاصی حد تک سنبھل چکی تھی۔ ٹانگ میں اگرچہ لنگ آگیا تھا مگر چھڑی کے سارے قریبی دکانوں پر جاتے ضروری سودا سلف لے آتے۔ اندر باہر کے چھوٹے موٹے کام پھندا دیتے۔ آج وہ بجلی کا بل جمع کروانے کی غرض سے نکلے تھے۔ گلی کے کنارے پر تھے جب انیس بیس سالہ لڑکا ان کے پاس آکر رکا۔ خاصا گھبراہٹا، ہانپتا کانپتا۔ کچھ دیر سانس بحال کی پھر مخاطب ہوا۔

”چاچا۔۔۔ چاچا وہ رازی۔“ ”کیا ہوا۔ خیر تو ہے کیا ہوا میرے رازی کو؟“ ”چاچا! رازی کو پولیس پکڑ کر لے گئی۔“ ”بوڑھے ہاتھوں کی گرفت چھڑی پر کانپ گئی۔

”اس نے ساتھ والے حمید کا سر پھاڑ دیا ہے،“ اگر خون نہ رکا وہ مرجائے گا اور رازی کو پھانسی۔ سب دکاندار ایسے ہی کہہ رہے ہیں۔“

آخری جملہ اس نے گھسیانے ہوتے آہستگی سے کہا تھا۔ احسان کا چہرہ لٹھکی کی مانند سفید ہو گیا۔ پتیلیاں پھیلنے لگیں۔ وہ زمین پر بیٹھتے چلے گئے۔ لگ رہا تھا زمین لرز رہی ہو اور سورج کی تیز شعاعیں نارنجی لٹک کے گولے ان پر برسانے لگی ہوں۔ بھلے وہ شروع سے ضدی، اکھڑا تھا مگر اتنا تو کبھی نہیں رہا کہ معاملہ پولیس تک پہنچ جائے اور اب تو سدھر گیا تھا۔

”اف میرے اللہ!“ خاکستر زمین پر بیٹھتے ہی اپنا سر دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔

کچھلتی چاندنی میں وہ جلد، ساکت جاگتی رہی سانس تسلسل سے چل رہی تھی۔ آج نیند صرف اس کی ہی کی نہیں روٹھی تھی۔ بلکہ وہ بھی بے چین تھا۔ بھی کروٹ بدلتا بھی بے چینی سے اٹھ کر بیٹھ جاتا پھر زور سے گردن جھٹک کر کمرے کے انداز میں لیٹا، دھم سے گرنے پر چارپائی کے جوڑ چیتنے چلاتے اور ایسے میں اگر نگاہ لوہے کی سلاخوں والی کھڑکی کے پار لیٹی تو پر جاتی تو سکون و رہم پر ہم ہو جاتا۔ پچھل بڑھ جاتی۔ اپنی صفائی میں کچھ کہنے سے پہلے وہی انا، ضد فصیل بنا کھڑی

تھی۔

احسان چاچا بڑی ہمت کے ساتھ نمبردار کے پاس گئے تھے۔ بہت منت سماجت سے اس کے ساتھ جا کر رازی کو تھانے سے بازیاں کر لائے تھے۔ مگر اس ملزم پر نگاہ غلط ڈالنا بھی گوارہ نہیں کی۔ پرانا غصہ خفگی پھر سے عود آئی۔ اور تو اور آمنہ جو صبح سے اس کی فکر میں برآمدے میں بیٹھی رو رہی تھیں۔ بین ڈال کر حملہ اکٹھا کر لیا، اب اس کی آمد پر منہ دوپٹے سے پونچھتی اٹھیں۔ اندر کمرے میں جا کر لیٹ گئیں۔ اس نے ان کا پہلی بار اظہار ناراضی دیکھا تھا۔ کچھ سمجھ نہ پایا۔ ایک دو بار ان کی جو کھٹ تک گیا۔ اندر جانے کی ہمت نہ ہوئی۔ ہونٹ کچلتا واپس آگیا۔ کسی کے پاس کہنے کو کچھ نہ بچا تھا۔ صرف شرمندگی تھی۔ ایک تو چار کا ہند سا ہماری ساری زندگی کا مدار ہے۔ چار نوالے کھاؤ، چار لفظ پڑھ لو، چار لوگوں میں عزت رہ جائے، بھلے ساری دنیا میں بے عزتی ہو مگر چار ہندوں میں رہ جائے وہاں بھی چار کی کک اٹھ رہی تھی۔

”چار ہندوں میں بے عزتی ہوگی، کیا کہیں گے اب نوبت تھانے پھرے تک آگئی، اس نے ہمیں چار دن بھی سکون نہ لینے دیا، حتیٰ ہا!“ (دوبی چار)

وہ بہت دیر ان کی ڈانٹ کا منتظر رہا، شاید آئیں، ڈانٹیں مگر آمنہ نے بھی خفگی سے دیکھا نہیں تھا۔ اب کیا ڈانٹیں وہ ماپوس ہو گیا۔ رات کا کھانا جوں کا توں بڑا رہا۔ جو جہاں تھا وہاں سے نہ نکلا۔ یہاں تک کہ اس کی تنو بھی۔

”وہ تو میری پیاس پر بے چین ہو جاتی تھی اور آج میں صبح سے بھوکا ہوں، چاچا کی بار میری پشت کے بجائے اپنے دل پر محسوس ہوتی تھی، ناپیدہ نیل دیکھتے تھے اور آج میں تھانے سے آیا ہوں، سپاہیوں کے ٹھڈے گالیاں سن کر۔۔۔ سارا دن گزار کر آگے پونچھا تو کیا نظر ملانا تک گوارہ نہیں کیا، کیا آج درد نہیں ہو رہا، مجھے کوئی کیوں نہیں پوچھتا، کیا ہوا، کیوں ہوا، پولیس نے کیا سلوک کیا، آج کسی کو میری کسی بات سے فرق

نہیں پڑ رہا، میری اہمیت، محبت سب ملیا میٹ ہو گئی۔ کیوں آخر کیوں؟“

وہ برآمدے میں کچھ تخت پر ہی لیٹ گیا تھا۔ اپنے کمرے میں اسے شدید مٹھن محسوس ہونے لگی تھی۔ برآمدے کی دیوار کے عین دوسری جانب وہ اپنے کمرے کی سلاخ دار کھڑکی کے نیچے چھپی چارپائی پر بیٹھ کئی کی اوٹ سے آسمان تک رہی تھی۔

صبح کا پہلا پھر تھا۔ مٹھن کی آواز پر وہ چونکا، سارے رات کے سگلتے من نے وجود میں کانٹے لگا دیے تھے۔ وہ پانی پینے کے لیے اٹھا تھا۔ احسان چاچا حسب عادت دروازہ کھولے لیٹے تھے۔ زیر و کے بلب کی بدھم نیلا روشنی کمرے کی تاریکی کو قدرے کم کر رہی تھی، مدھم روشنی میں کسی کی روندھی آواز بھی تھی۔ وہی عورت

کی پرانی عادت منہ پر دوپٹہ رکھے روتے ہوئے مسلسل بولنا۔ وہ آہستہ آہستہ کمرے کی جانب آیا، چاچی کہہ رہی تھیں۔

”مجھے معاف کر دے تو کہ ابابا میں ہی غلط تھی، ہر جھوٹ پر رازی کا ساتھ دیا، اس کی غلطیوں کی پردہ پوشی کی، بھول گئی تھی یہ اسی اکھر ضدی، بددل، اگر کم کی اولاد ہے، خون تو اسی کا ہے۔ کیسے ذرا ذرا سی چیز پر صغریٰ بھابھی کو تڑپاتا تھا، مارنے کی دھمکیاں دیتا تھا۔ یہ بھی تو اسی کا جایا ہے، میں سمجھی میری محبت، خلوص، تربیت اس کا اندر بدل دیں گی، مگر اصل تو اصل ہے، اس مضمون سے تو بہت پہلے ہی مجھے بتایا تھا اس کی غلط محبت کا، سگریٹ کی ڈلی بھی نکلی تھی اس کی جیب سے، مگر مجھ کم عقل کو کتنے آرام سے اس نے جھانہ دے دیا۔“

”آہ!“ احسان کے تانے فٹانے سانس پر وہ منہ سے دوپٹہ ہٹانا کچھ بچھڑے روئے لگیں۔

”میں پاگل ٹھوڑا تھا جو اس پر سختی کرتا تھا، ڈر تھا کہیں اکرم جیسا نہ بن جائے، وہ لاڈ میں بڑا تھا اور تو کیا سمجھتی ہے، وہ اب کسڈ منٹ سے مرے تھے۔“

وہ زخمی سانس بھرتے ہوئے رکے اور آمنہ نے

لاپلاہنا کر حیرانی سے میاں کو دیکھا، رونا دھونا بھول گیا۔

”کیا مطلب؟“

”کیا مطلب، ہونا بھلی مانس، اس دن کی لڑائی، بھول گئی میاں بیوی کی، ہانے سے صغریٰ بھابھی کو لے گیا تھا، چلتی ٹرین کھانے جان کے سائیکل چڑھائی تھی، وہ تو رازی کو بھابھی نے پرے پھینک دیا تھا۔ آنکھوں

دیکھا لوگوں نے بتایا تھا۔“

آمنہ کا پورا منہ کھل گیا اور باہر کھڑا رازی جیسے زندہ درگور ہو گیا۔

”اب کیا لوگوں سے کہتا، بڑا بھائی، حرام موت مرا“

اس خوف کے مارے میں ان کے نکاح کے حق میں نہیں تھا، ہے تو اسی اکرم کی اولاد۔ آج ثابت بھی کر رہا ہے۔“

”ہائے میں مر گئی۔۔۔“ آمنہ نے سینے پر ہاتھ مارا

”بھابھی صغریٰ کے ساتھ اتنا کچھ ہو گیا۔۔۔ تب ہی رازی کے لیے پریشان تھی۔“ رازی کا نام لیتے ہی اپنا دونا پھر سے یاد آگیا، دہن پھر سے منہ پر، بچکولے لیتے روئے لگیں۔

”ہائے میری بے جا ضد اور خوش فہمی نے ہماری اگلی بیٹی کا مقدر جلا دیا، میں تو سمجھتی تھی پیار سے سدھر جائے گا، گھر کا بچہ ہے، اپنی بیٹی بھی اپنے پاس رہے گی، کیا خبر تھی اکھڑی اولاد اکھڑی نکلے گی، توج لڑائی فساد کر کے تھانے کا منہ بھی دیکھ آیا، کل کلاں کسی کو قتل کر، جیل چلا جائے گا اور قاتل کی بیوی کا دھبہ ہماری بیٹی کی پیشانی پر، آہ! اب کیا اعتبار رہ گیا، جانے کس لڑکی کا چکر ہے، بڑا تیار ہو کر وقت پر نکلتا تھا جس پر دعائیں اثر نہ کیں تو کہ ابابا، جس میں شرم لحاظ نہیں، اس کے بارے میں کیا کہہ سکتے ہیں، اگر کل ہماری بیٹی کو کہیں آگے بچھے کر دیا یا اپنے باپ کی طرح۔۔۔ ہائے میں نے یہ کیا ظلم کیا تو پر ہنوس۔ تو عزت سے مر جائی، مہتر ہے۔“

دوسرے رازی کی آنکھیں بھنچ گئیں، اب مزید سننے

کی سکت نہیں تھی، دل ایسے پھنسا جیسے خوب ہوا بھرا غبارہ، غبارہ۔۔۔ غبارے کی آواز دور تک سنائی دیتی ہے اور اسے یہ آواز اپنے سارے وجود کے چھتھرے اڑائی سنائی دی تھی۔ چاچی کے زامو زار رونے پر بھی وہ اندر نہیں گیا، اپنی صفائی میں کچھ نہیں کہا، اسے صفائیاں دینے کی عادت نہیں تھی۔ پاؤں زمین میں دھسنے تھے، آنکھیں سارکت، ماں باپ کی موت کا کیسا عجب راز اور پھر اپنی بے اعتباری سب یک لخت سامنے آگیا، دماغ ہوڑ بجا تھا۔

”چاچی اتنی بے اعتبار، اتنی ماپوس ہو گئیں مجھ سے، ہر لڑکھائے قدم پر اپنا کندھا پیش کرنے والی چاچی، جھوٹ، غلطی پر ڈھال بننے والی چاچی، اس وقت ہاتھ کھینچا جب میرا قصور بھی نہ تھا۔ سچا تھا میں، مجھ سے ایک بار بھی نہ پوچھا میں نے کیا کیا، کیسے لڑائی شروع ہوئی۔ بغیر صفائی کے پیشی لگائی سزا سزا دی، وارچڑھا دیا، میرا ہونا نہ ہونا ضروری بھی نہ سمجھا۔“



اس روز جھگڑا رازی نے نہیں بلکہ حمید (ہمسایہ) کا انداز نے کیا تھا۔ اس نے اپنی دکان کے آگے اتنا پانی پھیرا کہ وہ سارا بھر کر احسان کی دکان کے سامنے گھرا ہو گیا۔

”اوئے۔۔۔ یہ کیا کر رہا ہے، میری گاہکی خراب ہو گی۔“

رازی نے جیسے ہی دیکھا اپنی کرسی چھوڑا ہر نکل آیا تھا۔ حمید اس کی روز بروز چلتی دکانداری سے حسد کا شکار تھا، تلخی سے بولا۔

”پانی تو ڈھلوان میں جاتا ہے، اپنے لنگڑے چالچے سے کہہ کر ٹھراؤ نچا کر والے۔“

اس کی بد زبانی پر اس کے تپور چڑھ گئے۔

”بندہ بن۔۔۔ زبان سنبھال کے بات کر۔“

”تو بندہ بن، بڑا آگیا گھورنے والا، اس نے گلی نکال کر کہا تھا، تیرا چاچا صوبے دار لگ گیا ہے۔“

رازی نے آنکھیں نکالتے اس کا جبر اپنی سخت

گرفت میں لے لیا، اس کا چہرہ سرخ آنکھیں ابل پڑیں۔

”آئندہ مجھے یا میرے چاہے کو گالی دی تو تیری زبان کھینچ لوں گا۔“

”اوہ تیری۔“ وہ پھر سے گالیاں بک رہا تھا۔ دونوں میں زور دار لڑائی ہوئی۔ بیچ بچاؤ کے دوران رازی نے اس کا گریبان یک لخت جھٹکے سے چھوڑا اور وہ پانی سے رہت کر گرا۔ پتھر لگنے سے سر پھٹا، خون ہی خون اس کے باپ نے شور مچا، پولیس بلوائی اور بیان دیا۔

”رازی نے حمید کا سر پھرمار کر پھاڑا ہے، قتل کی دھمکی دی ہے، کسی لڑکی کا چکر ہے۔“ رازی کی سخت مزاحی سے سب ہی واقف تھے۔ کسی نے بھی اس کے حق میں گواہی نہ دی۔ تھانے حاضری اسے ملزم کے بجائے مجرم بنا کر رکھی۔ پچھلے ساری دنیا اسے مجرم کے مگر

چاچی نہیں یہ اس کی برداشت سے باہر تھا۔

”کیا چاچی کو میرے کردار پر شک ہے؟“ وہ من من بھاری ندموں سے سخت پر آگرا۔

”کیا میں تو کے لیے دھبہ ہوں؟ چاچی اپنے فیصلے پر پچھتاتی ہے، شرمندہ ہے، یہ کیا کہا چاچی نے۔ ایسا سوچ بھی کیسے لیا کیا میں اتنا بے اعتبار بے غیرت ہو گیا کہ اپنے نام برسوں سے جڑی بیٹی اپنی عزت کو آگے پیچھے کر دوں گا اور خود کسی اور لڑکی۔ کسی کی انھی لمبے بھر کی نگاہ میں برداشت نہیں کر سکتا، اس اپنی تو کو آگے پیچھے اف۔“ اس کا دل گھم سا گیا ابھی تو یہ دل اس کے لیے پوری شدت سے دھڑکنے لگا ہے، طلب گار بنا ہے، اسے سوچنا، دیکھنا سوچ دینے لگا اور اب میں مجرم بن گیا۔“

ہر گزرتا ہل اسے بھاری محسوس ہو رہا تھا۔ اپنے آپ سے گھن آنے لگی۔

’آج کی صبح بھی اس گھر کے کینوں کی طرح تھی تھکی خشک سی تھی۔ خلاف معمول وہ بتاتیا رہوئے باہر

نکل گیا۔ آمنہ اسے ناشتے کے لیے آوازیں دیتی رہ گئیں۔ شاید اس نے سنا نہیں یا پھر جان کر ان سنی کر گیا۔

وہ کچھ دیر پہلے ہی اٹھ کر باہر آئی تھی۔ اور بیرونی دروازے کی جانب اٹھتے اس کے تیز قدم دیکھتی رہ گئی۔ آنکھوں میں رت جھجکے کی سرخی تھی پیش زدہ آنکھوں سے اس کی پشت کا سایہ بھی دروازے پر غائب ہوتا نظر آیا۔ اک تانسف پوری جان میں اترا۔ خالی نگاہ سے ماں کو دیکھا وہ چولے میں دہکتی لکڑیوں کو دھکنے سے کرید رہی تھی۔

رات چو کھٹ پر آن ٹھہری، دروازہ پر سر منی لب نے سیاہ لبادہ سجایا۔ سارے دن کے تھکے ماندے پنچھی درختوں کی شاخوں کو ٹٹولتے اپنے گھونسلوں کو تلاش کر رہے تھے۔ سب اپنے ٹھکانوں پر تھے۔ نہیں پلٹا تو رازی۔

رات کی سیانی میں گیدڑوں کی آوازیں ہولناکی مچانے لگیں۔ احسان کی سوچ، فکر کا روپ دھار گئی۔ اور فکر نے سارے گاؤں میں ان کی دوڑیں لگوا دیں۔ آمنہ جلے پاؤں کی پٹی بنی بھی دروازے تک جا نہیں، کبھی صحن میں چکر اتاریں اور توں۔ گم صم ویران المادوس کے چاند کی طرح اس کے کمرے کی چو کھٹ سے سر چپتی زمین پر بیٹھ گئی تھی۔ سو طرح کے دوسوے دل کو ضرب لگاتے تھے۔

”بہت برا لگتا ہوں میں چاچا کو، اگر کبھی چلا گیا تو پلٹ کر دیکھوں گا بھی نہیں۔“

بہت پہلے کے کسے جملے ایک کے بعد ایک ساعت پر چاچک برسا رہے تھے۔ ”اگر چاچی اس گھر میں نہ ہو، میں ادھر قدم بھی نہ رکھوں۔“

”ہاں، ہاں، تو مجھے بری لگتی ہے، بہت بری، سوار بری لگتی ہے۔“ ایک بار بے طرح برساتھا۔ ”اس لیے کہ تو احسان چاچا کی بیٹی ہے۔“

”ٹھیک ہے احسان چاچا کی بیٹی ہوں، پر تیری بھی تو کچھ لگتی ہوں نا۔“

”اسی لیے تو بری لگتی ہے، تیری فکر میں وہ مجھے مارتا ہے، نہیں ہے میرے دل میں چاچا کی محبت اور نہ تیری۔“

”پھر اماں کی خاطر خود کو بدل لے۔ ان سے تو محبت ہے نا۔“

”تو چاچی کو بیچ میں مت لایا کر، چاچی کا مقام ہی کچھ اور ہے۔“

وفا، فوقتاً، اس کی بڑھتی آوازیں ساعتوں کا گھیرا تنک کرنے لگیں۔ ہاں ایک بار یوں بھی کہا تھا۔

”جس دن چاچی مجھ سے روٹھ گئی نا، میری دنیا روٹھ جائے گی اور میں دنیا سے۔ کبھی پلٹ کر بھی اس دنیا کو نہیں دیکھنے والا۔“

اس کی۔ آنکھیں پھیل گئیں۔ دل کی دھڑکن پسلیاں توڑ دینے کو تھی۔ اس نے کانوں پر ہتھیلیاں جمالیں۔

”تو کیا رازی سے اماں ناراض ہو گئی تھیں، کیا اماں نے اسے کچھ کہا؟ قریب تھا اس کا دل پھٹ جانا۔ وہ بے قراری سے اٹھی اس کے کمرے کی ہر چیز الٹ پلٹ کر دیکھی، کہیں کچھ غیر معمولی نہیں تھا۔ نہ کوئی خط نہ پیغام۔ اس کا سارا سامان جوں کا توں پڑا تھا۔ وہ ماں کے پاس آگئی۔ کچھ دیر سپاٹ نگاہوں ان کے چہرے کو کھوجتی رہی پھر یک لخت ان کے قدموں میں آگری۔ گھٹنوں پر سر رکھ بے حد روئی۔

”کیوں رو رہی ہے۔ تو اپنے ماں باپ کے پاس ہے۔“

”حالا نکہ مجھے ہونا اس کے پاس چاہیے تھا۔“ اس نے رندھی آواز کے ساتھ سر اٹھایا، آنسو ہونٹوں کے کناروں تک آگئے۔ ”کیوں گیا ہے وہ کیا کہا تھا۔“

”کننے کی تو نوبت ہی نہیں آئی توں۔“ ان کا لہجہ سپاٹ تھا۔ ”بن کے ہی جان گیا۔ بہت دل دکھا ہے اس کی طرف سے، لیکن اتنا بھی نہیں کہ اس کے بغیر جی سکوں گی۔“

انہوں نے اپنے دوپٹے سے ناک بو مچھی۔

”اب نہیں آئے گا وہ۔“ اس نے کہتے ساتھ پھر سر گھٹنوں پر رکھ دیا۔

”آجائے گا۔“ ملل کے دوپٹے سے آنکھیں رگڑ کر صبح کر کے اوڑھا۔ ”میرا دل ہوتا ہے وہ آجائے گا اور میرے دل کی بات اس تک تو خود بخود پہنچ جاتی ہے۔“

وہ کچھ دیر ماں کے پاس بو منی بیٹھی رہی پھر اپنا کو ماپوس سا آٹا کچھ کرا بھی اور اپنے کمرے میں آگئی۔ اپنے بستر کی چادر کھسکائی۔ نیلی پتیوں والی گلابی چادر پر ہاتھ پھیرنے لگی۔ پھیرتے پھیرتے اس پر چہرہ نکلیا۔

”خدا کے واسطے رازی واپس آجا، میرا بچا، امتحان نہ لے، میں نے تجھے شعوری کوشش سے نہیں چاہا، جانے کب، کیسے اور کیوں؟ لیکن خدا کے لیے آجا، میرے بوڑھے ماں باپ پر ترس کھا۔“ ہولناک رات ڈوبنے لگی، جگر جگر کرنا چاند پھلتا، امروڈ کے پتوں میں گم ہو گیا تھا۔ صبح کا اجالا پھیلا، آسمان پر سفیدی تھی۔

\*\*\*

احسان صبح سویرے ہی دکان پر گئے۔ ارد گرد کے دکانداروں نے بتایا۔

”تمہاری دکان تو کل سے بند ہے، رازی کو تو ادھر دیکھا ہی نہیں۔“

یہاں، وہاں، دوست احباب انہوں نے سب چھان مارا تھا۔ کسی کو کچھ معلوم نہ تھا وہ کہاں گیا۔ بے شک گھر سے خفا نکلا تھا مگر پلٹ کر نہیں آئے گا، ایسا قطعاً محسوس نہیں ہوا تھا۔ وہ دن ڈوبا تا رہے ابھرے پھر آخری تارہ بھی ڈوب گیا، تلاش جاری تھی وہ سوئی بن گیا۔ بدن میں پیوست ہوتی گھاؤ لگائی سوئی۔ تھانہ، ہسپتال کوئی جگہ نہ چھوڑی مگر وہ کہیں ہوتا تو کھائی دیتا۔ تقریباً چار پانچ دن بعد احسان نے اپنی دکان کھولی۔ ایک بڑا سارے جو شاید کسی نے شیشو کے نیچے سے گھبراہٹھا ان کے پاؤں میں الجھا۔ انہوں نے

مڑا تڑا کاغذ بمشکل اٹھایا، کھولا جیسے جیسے پڑھتے گئے دل تھمتا گیا، آنکھوں میں دھند لگا بڑھنے لگا۔ آخری سطروں میں ٹوٹ ٹوٹ کر لکھا تھا۔

”چاچا! میں سب کچھ برداشت کر سکتا ہوں، سب کچھ، مگر چاچی کی عدم اعتمادی نہیں، بھلے تم ساری رات بدن پر کوڑے برساتے رہتے مگر چاچی کے چند لفظ اس درد پر بھاری ہو گئے، مجھے ماں کی ممتا کا تو علم نہیں بس، ممتا ماں، محبت سب کچھ چاچی ہی تھی اور ایسے لمحے میں بے اعتبار ہو گئیں جب میرا تصور بھی نہ

تھا، کیا انہیں یقین ہے، ان کا رازی کسی اور لڑکی کے چکر میں پڑ سکتا ہے یا وہ مجھے تو کے لیے دھبہ سمجھ رہی ہیں۔ تو۔“

دھبہ لفظ پر کاغذ اُسے پھول کر اکڑا تھا جیسے کوئی قطرہ گرا ہو اور سیاتی پھیلتی گئی۔

”اگر وہ چاہیں گی تو یہ دھبہ مٹ جائے گا، دور بہت دور چلا جاؤں گا، جہاں اس دھبے کا عکس بھی نہ رہے، مانا میں بہت برا، اکھڑا ہوں مگر اتنا بے غیرت نہیں کہ اپنی تو، اپنی عزت کو آگے پیچھے کر دوں گا، مجھے ڈھونڈ کر چاچا اپنی صحت اور وقت ضائع مت کرنا، بس معاف کر دینا، تم نے بہت محنت کی مجھ پر مگر سب اکارت گئی۔“

چاچی سے معافی کا مطلب گاران کا اپنا نہ رازی۔ خالی سطروں پر بہت سی جگہ گول گول قطرے اکڑ کر پھولے ہوئے تھے۔ احسان نے وہ کاغذ ہو نونوں پر لگایا اور سنبھلتے ہوئے کاؤنٹر کو مضبوطی سے تھاما تھا۔ وہ لڑکھاتے ہوئے بیچ پر بیٹھتے چلے گئے۔

\*\*\*

رازی کے خط نے سب کو چپ لگا دی تھی۔ لفظ ختم ہو گئے کم صم پتھر لڑکی آنکھیں آگ دو بے سوال کر میں شکوے بیٹیں۔ جلد ہی انہیں دکانداروں سے اس دن کے جھگڑے کا پتا بھی چل گیا تھا۔ ساری غلطی حمید کی تھی مگر اب کیا ہو سکتا تھا رازی تو چلا گیا۔ البتہ

آمنہ نے خود کو خوب پینا سینہ کوبی کی چہرے پر تھپہ مارے۔

”ہائے رازی، میرے دل میں تو پہلی بار تیرے لیے میل آیا تھا اور تو نے پہلی بار ہی پکڑ لی، مجھ سے شکوہ کرتا، پٹ کر روٹا جھگڑتا، تجھے کیا پتا اس دل میں تیرے کتنی ممتا ہے۔“

انہوں نے خود اس کی تلاش شروع کی، ہر رشتے دار ملنے ملانے والے کے ہاں پتا کر کے آئیں مگر بے سود۔ گھڑیاں کی ٹک ٹک پورا سال تنزیلہ کو اپنے دل پر چابک کی طرح محسوس ہوتی رہی نسوں میں اتری سوئی

تیرتی دل میں ہوسست ہو گئی تھی بس ابھی تک دل پھنا نہیں تھا۔ وہ بالکل چپ سنان، دیران، وحشت زدہ سی لگنے لگی تھی۔ شروع میں اس کی دعاؤں میں شدت تھی، منتیں مرادیں، وظائف سب کچھ۔ پھر دعاؤں کی تاثیر چھپ چکی محسوس ہونے لگی حالانکہ لفظ دعا تو خود بہت پر تاثیر ہے لیکن وہ یہی سمجھتی تھی ”دعا کا کوئی فائدہ نہیں اماں، وہ اگر دعا سے ٹھیک ہوا تو اتنا ٹھیک ہی رہتا پلٹا کیوں، وہ خود ہی ٹھیک ہوا تھا اور خود ہی روٹھ گیا۔ اب اگر اسے آنا ہو گا تو آجائے گا۔“

وہ جتنی مضبوط بنی کہہ رہی تھی اتنی ہی نہ تھی اس ایک سال میں کھل کر برسوں کی پیار لگنے لگی تھی۔ اناری رنگ پر کسی نے گیندے کا لیب چڑھا دیا تھا۔ ابھی ابھی سیاہ بڑی آنکھیں تاریک گھائیاں لگنے لگیں۔ قد ویسا ہی تھا لہذا مگر بدن بہت سوکھ گیا تھا۔ ملنے ملانے والے دیکھ کر ٹھٹھک جاتے۔

”اے آمنہ، لڑکی کا علاج دلائج کرو، اسے کوئی پر چھاواں ہو گیا ہے۔“

کوئی سوکھے کی مریضہ کتا اور اگر کسی کے سامنے غلطی سے کھائیں لیتی تو وہم کی ٹی ٹی کی ساری علامتیں بیٹھے بیٹھے نکال دیتا۔ یہ صرف اللہ یا اس کے ماں باپ جانتے تھے کون سی دیکھ اسے اندر اندر چاٹ رہی ہے۔

\*\*\*

رات کا آخری پہر تھا۔ اسے شدید بخار چڑھا تھا تاکہ اس کے قریب گزرنے پر بھی تپش کی پلٹیں آتی تھیں۔ آمنہ کے ہاتھ پاؤں پھول گئے، ٹھنڈے پانی میں دوپٹے بھگو بھگو اس کے سر پر رکھا۔ نور سا بھر کتا ماتھا پانی کی کمی سے چھٹک گیا۔ احسان الگ پریشان تھے۔

رات اچھی بھلی سوئی تھی۔ کچھ دیر بعد اس کے منہ سے نکلتی کھٹی کھٹی آوازوں پر آمنہ انھیں وہ نیند میں بردہ رہی تھی اور اس کا جسم جل رہا تھا۔ آمنہ نے اسے اٹھا کر پانی پلایا۔ احسان پریشان، وہ ادبی مگر بخار بڑھنے لگا۔ اس کی آنکھوں میں سرخ نمی تیرتی تھی۔ قطرے

باہر نکلنے سے پہلے ہی لو سے جھلس کر سوکھ جاتے۔ آمنہ نے اسے اپنے ساتھ لیٹا لیا۔ ”کیا ہوا، خواب میں آ رہی۔“

ماں کے سینے میں دبی کیا جاتی خواب میں اسے رازی نظر آیا ہے پورے سال بعد وہ بھی شدید زخمی۔ اس کے بدن سے خون رستا تھا، لوگ اٹھائے کئیں لے جا رہے تھے۔ اس کی لرزتی پلکوں پر آنسو اور ہلکپاتے ہونٹوں پر توتہ۔ وہ مجھے پکار رہا تھا، اپنی توتہ کو۔ کہاں جائے، کہاں تلاش کرے یہ سب ماں کو کیسے بتائے۔ بس ان کے ساتھ لپٹی ہوئے ہولے نفی میں سر ہلاتی رہی۔

”اماں! کچھ نہیں ہوا، تھوڑا سا سر میں درد ہے۔ اور بس۔“

”میں تیری ماں ہوں تو۔“

انہوں نے اس کے بال سہلاتے جلتی پیشانی چومی ”بہت اچھی طرح جانتی ہوں، یہ کون سا درد ہے، مجھے معاف کر دے تو، وہ میری وجہ سے گھر چھوڑ گیا، تجھے پھوڑ گیا، لیکن میرا اللہ جانتا ہے میں نے اسے کبھی بیگانی اولاد نہیں سمجھا مگر وہ غیر بن کر چلا گیا۔“

انہوں نے نرمی سے کہتے اس کے دونوں گال چٹا پٹ چومے۔

”تو اگر ہم اسے ڈھونڈ نہیں سکتے تو کیا ہوا اس کے لیے خیریت کی دعا تو کر سکتے ہیں، ہو سکتا ہے وہ پلٹ

آئے۔“

”سال سے اور تو ہو گیا، اسے پکارتے ہوئے اماں۔“ وہ لمحہ بھر توقف سے بولی ”اب میں اسے نہیں مانگتی، صرف اللہ سے یہ مانگتی ہوں کہ اس کا خیال میرے دل سے نکال دے۔ یا پھر اس نے ہونٹ کا کوتا چپایا ”یا پھر میری جان نکال دے۔“

”مت کہا کر ایسے۔“ انہوں نے اسے اچھا خاصا ڈپٹا اور پھر خود بھی بہت دیر تک روکی تھیں۔

تاروں سے جھلجھل کرتی راتیں، کرنوں سے غسل کرتا دن اس کے لیے ہر چیز بے معنی تھی۔ بخار اتر گیا درد بھی ہٹ گیا بس اک ٹھن لگ گیا تھا جو ہڈیوں سے کھرچ کھرچ چوشت کھانا چارہ تھا۔ خاکستری تھال میں سورج سے جدا ہوئے ٹھٹھٹے سکے گرہتے جا رہے تھے۔ دل کو کسی حد تک یقین آ گیا تھا شاید وہ اب نہیں آئے گا، ابھی نہیں انتظار فصول سوئی نے دل کے اندر جگہ بنالی تھی۔ اس کی جیہن معمول بن گئی۔ اس کی لمبی نماز و قیام مزید طویل ہو گئے۔ البتہ دعا سے رشتہ بیگانہ ہو گیا تھا۔

\*\*\*

آسمان کو سیاہ بادلوں نے گھیر کر قطروں کی ناکہ بندی کر رکھی تھی۔ بے جان ہوا ٹھٹھٹھ گئی تھی بوندوں کے اترنے کے خوف سے آمنہ صحن سے چپڑیں سمیٹ رہی تھیں۔ چارپائی دیوار سے لگائے اس کے پاس سے گزریں وہ نماز سے فارغ ہو جلدی جلدی جائے نماز سے اٹھ رہی تھی۔ آمنہ بہت عرصے سے غور کر رہی تھیں کہ وہ نماز پڑھتے ہی فوراً ”جائے نماز لیٹنے کی کرتی ہے۔ انہوں نے متاثرانہ اسے دیکھا۔

”ماہوسی کفر ہے تو انسان میں تکبر بھرتی ہے کیا تو اللہ سے مایوس ہو کر کسی اور پر توکل کرنے لگی ہے؟“ اس کے ہاتھ ٹھٹھ گئے آدھ لپٹی جائے نماز پر دم سے بیٹھ گئی۔

”میں تکبر نہیں کرتی اماں میں تھک گئی۔“



تین سال کا عرصہ بیت چکا تھا آج پھر آواز میں فی اتر آئی آنکھوں میں قطرے سے ڈھیلے آج آمنہ کو اس پر قطعاً ترس نہیں آیا تھا بلکہ وہ چاہتی تھیں کہ یہ جو کم قسم سی ہو گئی ہے، سب سے ملنا جلنا چھوڑ دیا ہے آج خود رو سے کچھ تول ہلکا ہو۔ اسی لیے ان کا انداز تیز ہو گیا اور پاس بیٹھ گئیں۔

”تھک گئی؟ تو اپنے رب سے مانگتے ہوئے تھک گئی، ماں باپ سے مانگتے ہوئے تو بچے نہیں تھکتے، رو، دھو، خد کرنا لگتے رہتے ہیں، دیں نہ دیں ڈانٹ ڈپٹ، یا پکپکارس لیکن بچے باز نہیں آتے اور وہ جس کی ممتا شفقت کی حد نہیں جو ماں باپ سے بڑھ کر چاہنے والا ہے تو اس سے مانگتے تھک گئی۔“

آمنہ جانے اسے کیا کیا کہتی ایک نکتہ اٹھی تھیں۔ وہ برآمدے کے کونے میں خاصی اوٹ سے تھیں۔ اسے کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا سوائے اماں کے لفظوں کے وہ تاسف سے کچھ دیر نہیں کوکتی رہی سرخ آنکھوں میں گرد بار اٹھے نگاہ بھاری ہو گئی، بس پہلا قطرہ بمشکل نکلتا ہے پھر تو تارتی بنے لگا تھا۔ اس کے ہاتھ پھیلے تھے ہونٹ کپکپا کر اڑ گئے۔

”اے اللہ! تجھ سب خبر ہے میرے دل کا کون خبردار ہے، کوئی مل، کوئی لمحہ ایسا آیا، جب دل نے دھڑک دھڑک تجھ سے فریاد نہ کی ہو، بس اماں ابا کے سامنے ظاہر کرنا چھوڑ دیا تاکہ انہیں تکلیف نہ ہو، لیکن دیکھ آج پھر میرے ہاتھ پھیلے ہیں۔“

اس کے دعا کے لیے اٹھے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ آنسوؤں کا پانی، تھیلیوں پر اکٹھا ہونے لگا۔ بس سسکی بھرتے ہی نگاہ آسمان پر اٹھی۔ آن واحد میں ہی بہت زور سے نکلا۔ اے اللہ مجھے اپنی تقدیر پر راضی ہونا سکھا دے، اگر وہ میری تقدیر میں لکھا ہے تو ملا دے، ورنہ اس کا غم بھی دل سے نکال دے۔“

اس کے ہاتھ جانے کتنے گھنٹوں سے اٹھے تھے۔ بادل گر گڑھا کر رہنے لگے تھے وقت تو کیا اسے گرد و پیش محسوس نہ ہوا تھا۔ پرندوں نے کیوں شور مچایا اور پھر

امروہ کے پتوں میں کہاں، کیوں دیک گئے۔ آمنہ کیوں انھیں کہاں، کتنی دیر کے لیے گئیں۔ اس کی لرزتی پلکوں نے بصارت کو مقفل کر رکھا تھا سیاہ نوکیلے سروں سے پانی پھونٹا، لبوں کی لکڑی کو اس کی کبیرہ آواز نے جامد کر دیا۔

”بس کرو تو، تمہاری ان ہی دعاؤں اور آنسوؤں نے مجھے مسلسل بے قرار رکھا ہے۔“ اس نے پٹ سے سیاہ بازو اٹھائی۔

بڑے معجزات سنے تھے لیکن کبھی نہ ہونے والا معجزہ آج ساکن کر گیا۔

وہ پہلے سے بہت کھڑ گیا تھا۔ وجہ سرایا، خوش لباسی، چہرے کی تازگی اس کی خوش خوراک کی غماز تھی۔ لیکن بھوری آنکھوں کے گرد سیاہی مائل حلقے اس کے وجود کی تھکاوٹ بیان کر رہے تھے۔ وہ پرسکون تھا بھی نہیں۔

☆ ☆ ☆

اس دن بہت ارادہ باندھ کر گھر سے نکلا، رقعہ شیلڈر کے نیچے سے پھینک کر ایک سمت چلتا رہا۔ اس نے تہہ کر رکھا تھا اب کبھی ان راستوں پر چل کر نہیں آئے گا۔ کسی نہر میں کود جاؤں گا، نہر کنارے کھڑے ہو کر کوشش کی، لیکن پاؤں مٹی کے ساتھ ایسے چپکے تھے جیسے کسی غیر مٹی چیز نے جکڑ لیے ہوں، پھر ریل کی پٹری کے ساتھ گلنے لگے، ”ہائے بھی تو یہی کیا تھا سو میں ان کی اولاد ہوں، لیکن اس پٹری پر ٹرین آئی ہی نہیں اور آتی بھی کیسے۔ جن کے ساتھ دھڑکتے دلوں کی دعائیں شریک سفر ہوں وہ مسافر کچھ لمحوں کے لیے بھٹک تو سکتا ہے لیکن راہوں کی دھول بن کر اڑ جائے، یہ ممکن نہیں۔ اس نے بہت کوشش کی خود کو دھول بنانے کی بے پروا کا احصار بہت مضبوط تھا۔

وہ تھک کر اسٹیشن پر بیٹھ گیا آتے جاتے مسافروں کو دیکھتا۔ پھر ایک ٹرین آئی اس میں چڑھ سوار ہو شر پھینچ گیا۔ شر کسی کے استقبال کو نہیں بڑھتا۔ وہاں

لوگوں کا ہجوم تھا۔ اجنبی لوگ، اجنبی ماحول، رشتے دار، کسی عزیز کا اپنا نہ تھا۔ ساری رات سڑکوں کی دھول اڑاتے گزری۔ صبح بھوک کی بے چینی تھی، بے ساریانی کا عالم، اک ڈھابے پر رکا جب میں کچھ روپے تھے وہ وہی ناشتہ کیا۔ برتن واپس کرتے وقت مالک سے استفسار کیا تھا۔

”آپ کو کسی ملازم کی ضرورت ہے؟“

اس نے سر سے پاؤں تک اسے دیکھا، گرد آلود ملگجے کپڑے، لیکن شکل سے اچھے گھرانے کا لگتا تھا۔ اس نے خیر سے بھنوں میں جوڑیں پھرناک چڑھائی۔

”میرے پاس پہلے ہی اضافی ملازم ہیں، ان کی تنخواہ پوری نہیں ہوتی، چاہنا رستہ ناپ۔“

یہ پہلا جواب تھا پھر ایسے کتنے اور کہاں کہاں جواب ملے جو اپنوں کی محبتوں کو دھتکار دیتا ہے اسے دنیا دھتکارتی ہے اور ایسے ہی دھکے کھاتے ایک سرانے والے نے اپنے جانے کے کھکھڑے رکھ لیا۔ معمولی تنخواہ، دو وقت کا کھانا، سونے کے لیے بیچنے، بس اور بدلے میں وہ سارا دن چائے بیچتا، سرانے کی چارپائیاں درست کرنا اور باقی کام کم صم ربوٹ کی طرح پہلی بار اسے تب نوادہ آئی جب ڈھیر اچھے انڈوں کا دیکچہ اتارتے گرم پانی پاؤں پر گر گیا۔ دونوں پاؤں بری طرح جھلک گئے تھے۔

”کوئی اللہ! رازی!“

اسے چائے کا کپ تھمتاے اچانک کپ چھلک گیا۔ تنزیلہ کی آنکھیں خوف اور تکلیف سے پھیل گئیں۔ آج تک کبھی کوئی چیز ہاتھ سے نہ پھسل گئی تھی۔ اور آج ہاتھ لرز کر چڑ گئی بھی تو کس پر اور انتہائی گرم۔ وہ بے حد ہشیمان تھی۔ پھر تیزی سے باورچی خانے میں گئی کچے آلو کے کٹڑے جلدی جلدی کوٹے اور اس کے ہاتھوں پر لپ کرنے کے لیے لائی اور دور سے ہی اس کی پھیلی کی پشت پر پھونکیں مارتی بیالہ لیے آگے بڑھی۔

”یہ لگوالو، جلن کم ہو جائے گی۔“

اس نے ہاتھ قریب کیا ہی تھا کہ وہ گھورتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔

”بچہ نہیں ہوں میں، چائے کے چھینٹوں سے جھلس کر مر جاؤں گا، اپنا لپ اپنے پاس سنبھال کر رکھ۔“

جلے ہاتھ سے پیالہ ہٹا دیا، جاؤ۔ وہ اس کی بے رخی تنزیلہ کی آنکھوں میں مروجوں کی طرح لگی تھی۔ اور آج اس تکلیف سے اس کی اپنی آنکھیں سرخ تھیں۔ وہ سسکاری بھرتا زمین پر بیٹھتا چلا گیا۔ اک تنو کی یاد تھی جو اس قدر جلن میں فرحت بھرے احساس کی طرح گزری۔

”آج لپ نہیں کرو گی تو، مجھے بہت درد ہو رہا ہے۔“

”میرا فکر مند ہونا تمہیں پسند نہیں تھا نازازی، اسی لیے تو چھوڑ گئے۔“

اس کے اندر کہیں تنزیلہ کی آواز ابھری۔ ”اب میری دعائیں تمہارا لپ کرتی ہیں، ان سے پیچھا نہیں چھڑا سکتے تم۔ رازی۔“

مالک نے پاؤں کی خبر تو کیا لینی تھی۔ اس کی لفظوں اور گالیوں سے خوب دھناتی کی۔ انڈے ٹوٹنے سے اچھا خاصا نقصان ہو گیا تھا۔

”اندھا ہو کر کام کرتا ہے، تیرے باپ کا مال نہیں ہے (گالی)۔“ دل ہشمانی کی دلدل میں اتر گیا بنا علاج کے ہی زخم بھرنے لگا تھا۔

شطنج کی کچھی بساط پر وقت کا بازی گر اپنی چال چلتا گیا۔ سرانے پر کام کرتے اسے سال سے اوپر ہونے کو تھا۔ سر جھکائے کام سے کام۔ مالک برائے کپڑے اسے دے دیتا وہ پن لیتا، معمولی سی تنخواہ سے انتہائی ضروری چیزیں خرید لیتا۔ پرانے کپڑے، پرانی جوتی، بچا کھانا اسے اب ان چیزوں سے فرق نہیں پڑتا تھا۔ مالک اس کی پر سرار زندگی پر حیران تھا۔ نہ بھی کہیں ملنے گیانہ کوئی ملنے آیا۔ عید، بقر عید، تہوار سب بونہی سرانے پر اور تو اور بیمار ہونے پر بھی کوئی آرام نہیں۔ کتنی بار پوچھا۔

”ٹھیک ہے تو کہتا ہے اماں، کیا گزر گئے، بس بھائی تھے نہیں۔ مان لیا، آخر تو اتنا بڑا بھی تو ہوا ہے، درخت پر لٹک کر تو ہوا نہیں ہوگا، کہیں تو پورا بڑا ہو گا۔“

”تھے مہراں رشتہ دار۔۔۔“ بہت سوچ کر دم الفاظ میں جواب دیا تھا، لیکن اب کوئی نہیں ہے۔“

”کیوں۔۔۔ مر گئے؟“

اس کے چونکنے سے لگتا تھا جیسے لمحہ بھر کے لیے سانس رکی ہو۔

”اللہ نہ کرے۔“

”پھر۔۔۔؟“ مالک کا اصرار، اس نے درو بھری آنکھیں کھینچی۔

”چھوڑ دیا۔“

”تو نے، یا انہوں نے؟“ سوال پر سوال وہ چڑنے لگا۔ مگر یہاں مالک تھا چاچا نہیں جو اس کے غصے کی پروا کرتا۔

”شاید دونوں نے۔“

مدھم برید ملاٹ کے ساتھ گندے برتنوں کا ٹب اٹھا کر نل پر جا بیٹھا اور دھونے لگا تھا۔

مالک کو اس کی نرم مزاجی اور فرمانبرواری سے انیت ہو گئی تھی۔ بیل میں ایک ارادہ پینے لگا تھا۔ اس کی ایک معذور بیٹی تھی۔ جس کا جو خاندان تو کیا باہر بھی ملنا مشکل تھا۔ خبریہ لڑکا جس کی اپنی مرضی تو کیا زندگی بھی نہیں۔ اگر اسے گھر داماد بنا لیا جائے تو کیا مضائقہ ہے۔ بیٹی کو رکھ لال جائے گا اور اسے گھر بہت سوچ کر، اپنی بیوی کے مشورے سے اس سے بات کی۔ وہ سنتی ہی حیران رہ گیا۔

”مجھے شادی نہیں کرنی۔“

”کیوں؟“

”کہا۔۔۔ نال، نہیں کرنی تو بس نہیں کرنی۔“

”کوئی توجہ ہوگی، دیکھ یہاں میلے کچیلے پٹوں میں بیچ پر زندگی گزار رہا ہے، مجھے مجھے اپنے گھر لے جاؤں گا، صاف تھرا رہے، کھانے کو ملے گا، زندگی بن جائے گی تیری اور کیا چاہیے۔“

”میں جیسا ہوں، مجھے ایسی زندگی قبول ہے۔“

اس نے انتہائی قطعیت سے کہا تھا۔ کچھ بھی تھا ہزار رنجشیں، کلنتیں سہی مگر وہ تو کے حق میں خیانت کا سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ حالانکہ اس کا منہم ارادہ تھا کبھی نہ پلٹنے کا پھر بھی تنزیلہ اس کے ارد گرد تھی ضرور۔

اس کے اٹل فیصلے پر مالک کا اصرار بڑھنے لگا اور پھر اصرار میں شدت آگئی۔ وہ اسے تنگ کرنے پر تلا۔ ایک دن صاف کہہ دیا۔

”اگر میری بات پسند نہیں تو پھر اپنا بندوبست کہیں اور کر لے۔“

اس کا خیال تھا وہ زبردستی سے مان جائے گا۔ وہ اتنا پرست رازی تھا۔ زور زبردستی چاچا کی برواشت نہ تھی کسی غیر کی کیا کرتا۔

”لغت اس چھاپے نما سرے پر۔۔۔ اس نے وقت بھی نہ دیکھا۔ اسی وقت سرے چھوڑ دیا۔ عصر کے

لبے ہوتے سائے مغرب میں مدفون ہو گئے۔ وہ فنٹ ہاتھ پر چلتا جا رہا تھا۔ ڈھلون میں جاتی سڑک پر کچھی ٹنکر یوں کے علاوہ کوئی دوسرا ٹنکر نہ تھا۔ وہ چوراہے سے لٹک روڈ کی جانب مڑا تھا۔ شاید کسی غلط فہمی یا معمول کی دہشت گردی کی زد میں آ گیا۔ تاریخی آگ اس کے پیٹ کو چیرتے ہوئے گزری۔ تکلیف کی شدت سے آنکھیں ابلیں قدم لڑکھائے اس کے گرد اس کا اپنا خون کھیر رہا تھا۔ موت بہت قریب تھی۔ تب پوری شدت سے اسے اپنا گھر چاچا چاچی اور اپنی تو یاد آئی جس نے آخری خواہش تو کو دیکھنے کی تھی۔ لبوں نے بے ساختہ اسے پکارا، آنکھیں بند ہونے لگیں۔

اسے کئی گھنٹوں بعد ہوش آیا تھا، وہ ایک ہسپتال میں تھا۔ وارڈ میں بہت سے مریض تھے۔ سب کے پاس کوئی نہ کوئی بیمار دار موجود تھا اور اس کے پاس پولیس والا بیٹھا تھا۔ ہوش میں آتے ہی ہائی لینا شروع کر دیا۔ ٹونا پھوٹا بیان ریکارڈ کر کے چلتا بنا۔ اب

وہاں تھا تھا۔

\*\*\*

ایک ہاتھ میں اسٹیکسکوپ۔ اور پین پکڑے دوسرے میں فائل چرے پر ملا نمت بھری مسکراہٹ سجائے ڈاکٹر علی اسے سب میں مختلف لگے تھے۔ چالیس کے پینے میں سنجیدہ بریاد، خبریہ اسے چیک کرنے کے بعد۔ اسٹیکسکوپ اوور لک کی لمبی جیب میں ڈالا اس کا حال احوال پوچھتے نسخہ لکھ دیا تھا۔ ہریار چیک اپ کے دوران مسکراہٹ بکھرتے ہوئے اس کی زندگی کے متعلق ایک دو باتیں پوچھ لیتے اتنی سی ہمدردی سے وہ ساری دنیا میں اپنے لگے تھے۔ ڈسچارج ہونے کے بعد وہ ہمت کر کے ان کے کمرے میں گیا تھا۔

کھانے کا وقت تھا ان کی مسز ڈاکٹر سمیعہ ان کے روبرو بیٹھی کسی بات پر مسکرا رہی تھیں۔ اسے یوں اچانک دیکھ کر خفیف سی ناگواری ان کے ماتھے پر ابھر کر معدوم ہوئی پھر میاں کو دیکھا جو حسب عادت چرے پر ولیم کا بورڈ سجائے مسکرا رہے تھے۔

”ہاں بھئی رازی میاں، کیا حال ہے۔ درد شرد تو نہیں۔۔۔ ڈسچارج ہو گئے ہو، ناں؟“ ان کے تمام سوالات کے جواب میں اس نے اثبات میں سر ہلایا اور خاموش۔

”کوئی پر اہم ہے؟ آؤ بیٹھو، کیا بات ہے۔“

ان کی حوصلہ افزائی پر وہ چند قدم آگے آیا۔ دیوار کے ساتھ لگے بیچ پر بیٹھ گیا۔ خاصا جھجکتے ہوئے کہا تھا۔

”ڈاکٹر صاحب، آپ سے ایک بات کرنا تھی؟“

”ہاں، ہاں کرو، وہ کرسی کی پشت سے ٹیک لگاتے ہکا سا کڑے۔ ڈاکٹر سمیعہ نے چائے کا کپ لبوں سے لگاتے استغماہیہ ابرو چڑھائے۔

”وہ۔۔۔ آپ کے ہسپتال میں کوئی جاب، بھلے چھوٹی مولی ہو میں سب کرنے کو تیار ہوں۔“ اس کے غلٹ بھرے انداز پر انہوں نے گہری نگاہ سے اسے دیکھا پھر

دھیسا مسکرائے۔

”کتنا پڑھے ہوئے ہو؟“

”ایف اے۔“

”ہاں۔“ سوچتے ہوئے کہا پھر توقف سے بولے۔

”دیکھو رازی، فی الحال تو تمہیں بہتر ہونے میں چند دن اور لگیں گے اور اس وقت یہاں کوئی ایسی نوکری بھی نہیں، اپنا اسسٹنٹ بھی میں نے نیا رکھا ہے، ایسا ہے، تم اپنا کانٹیکٹکٹ دے جاؤ، جیسے ہی ضرورت ہوگی پہلے تمہیں کال کروں گا۔“

اس کا دل نہ ٹوٹنے کے خدشے سے انہوں نے ایسا کہا تھا۔ ورنہ خوب جانتے تھے ہسپتال میں کہاں یوں نوکریاں نکلتی ہیں۔

”فی الحال تو میرے پاس نمبر نہیں ہے، لیکن میں پھر چکر لگاؤں گا۔“

وہ ماپوسی و امید کے ملے جلے لہجے میں کہتے ہوئے اٹھا اور دروازے کی جانب برہٹا تھا کہ ڈاکٹر سمیعہ کی آواز آئی۔

”اچھا ٹھہرو۔“ وہ رکا۔ وہ خالی کپ میز پر رکھتے ہوئے اس کی جانب گھومیں۔ لہجہ ڈا، خوش شکل، صحت مند نوجوان، آگ جا بیتی نگاہ ڈال کر بھنوں سے سامنے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ ڈاکٹر علی بھی متعجب ہوئے۔

”کیا کیا کر سکتے ہو؟“

”کچھ بھی۔“

اس کے عاجزانہ جواب پر وہ استہزائیہ نہیں۔

”کچھ بھی میں تو سب کچھ آتا ہے، بھانڈو، پونچا، پکڑے، برتن، ناچنا، گانا، ڈھول، پیٹا، کیا سب کر لیتے ہو۔“

جہاں ڈاکٹر علی مسکرائے وہاں رازی نے گردن جھکا لی۔ مگر وہ اپنے انداز میں لوٹیں۔

”دیکھو بھائی۔۔۔ ایک بزرگ کے لیے کیئر ٹیکر کی ضرورت ہے۔“

”اوہ۔۔۔“ ڈاکٹر علی مطمئن ہو کر پھر سے دھیرے دھیرے جھولنے لگے۔ ڈاکٹر سمیعہ کے والد خاصے امیر انسان مگر مڑھاپے کی مشکل ترین منزل پر تھے۔ کر

کے مہلوں کی تکلیف، بلڈ ریشر، شوگر کے سبب اکثر وہیل چیئر پر آجاتے۔ اکلوتی شادی شدہ بیٹی گھر اور جاب کی مصروفیت سمیٹھہ کی اولاد بھی نہیں گھر میں مکمل سناٹا ہو رہے کو مزید بیمار کر دیتا ہے۔ دونوں میاں بیوی کا ان کے لیے وقت نکالنا بے حد مشکل ہو جاتا۔ آئے دن کوئی نہ کوئی ملازم چھٹی پر۔ اوپر سے بابا کی پر اپنی کے آئے دن کے مسئلے ایسے میں رازی ایک بہترین حل تھا۔ انہوں نے نگاہوں سے اسے سراہتے ہوئے کہا۔

”مصروفیت کی وجہ سے ہمارے پاس ٹائم کی قلت ہے، ان کی دواؤں، غذا کا خیال، واک بس یہ کام۔ باقی ملازم بھی موجود ہیں، بتاؤ کرلو گے؟“

”جی۔ ہاں جی!“

اس کی اتنی تنہائی پر وہ صاف گوتی سے بولیں۔

”اور ہاں، کبھی کبھی ایسے کام بھی کرنے پڑ جاتے ہیں، جو کرنے سے اولاد بھی گھبراتی ہے۔“ وہ گہری نظروں سے اس کا رویہ جانچ رہی تھیں، جو سب تھا۔

”صفائی وغیرہ، اکثر ملازم اسی وجہ سے بھاگ جاتے ہیں۔“

”اب بتاؤ کرلو گے۔“

اس کی پر امید نگاہیں لمحہ بھر کے لیے بھی تھیں۔

”لحے کے چوتھے حصے میں اس نے سوچا۔ ایکسڈنٹ کے بعد۔“

چاچا کے ساتھ بھی اٹھنے بیٹھنے کے مسائل تھے، وقت کے ساتھ بڑھ گئے ہوں گے، میں مضبوط جوان ہوں، اس وقت انہیں میری ضرورت ہوگی۔ ہنہ، انہیں تو شاید کبھی میری ضرورت نہیں تھی، بے اعتبار، دھبہ۔“ اس سے پیشتر وہ مزید سوچتا اس کے دماغ نے ہی نفی کر دی۔ اپنی سوچ ان دونوں پر ظاہر بھی نہ ہونے دی۔

”کیوں کیا سوچتے لگے؟“

”ہوں، ہاں، کچھ نہیں۔“ وہ چونکا ”میں کرلوں گا سب۔“

خاصا بڑا جدید طرز کا بنگلہ تھا۔ کئی ملازمین، وہ اسے آغا عثمان کے کمرے میں لے گئیں۔

ابتدائی اعتراف کے بعد اسے بہت سی ہدایت دے خود دروازے سے نکل کر جانے کس کمرے میں گم ہو گئی تھیں۔ پھر ان سے ملاقات صرف ناشتے کی میز پر ہی ہوئی۔ جب وہ جلدی جلدی ناشتہ کر کے اسپتال نکلنے کے چکر میں ہوتے تب رازی اور آغا عثمان لان کی ہوا خوری کے بعد اندر داخل ہوتے۔

”ہاں، بھی رازی سب صبح چل رہا ہے، آغا جانی آپ خوش ہیں۔“

ڈاکٹر علی نشو سے منہ تھپتھپاتے، نشست چھوڑ رکھی سی بات کرتے ڈاکٹر سمیٹھہ اپنا بیگ ٹٹولتے کوئی بات پوچھ لیتیں، یہ اس گھر کا معمول تھا۔ البتہ اس کی صحبت میں آغا جی کی صحت قدرے بہتر ہو گئی تھی، مزاج کا چڑچڑاہن جاتا رہا جو ڈاکٹر علی، ڈاکٹر سمیٹھہ کے لیے اطمینان کا باعث تھا۔ ایک ڈیڑھ سال میں ہی اس نے اپنا اعتماد خوب قائم کر لیا تھا۔

آغا عثمان شمر کے اچھے خاصے صاحب جانہ لڑتھے۔ صدر مارکیٹ میں کئی منزلہ پلانہ تھا جس کی دیکھ رکھیہ کرائے وصول کر کے پہنچانے کی ذمہ داری ایک نیچر پر تھی۔ آج کل کچھ ایسا تھا وہ کرائے تو لانا ساتھ کسی بڑے نقصان کی خبر بھی ہوتی بہت سارے نقصان کی نظر ہونے لگا تھا۔



وہ اتوار کی شام تھی۔ دونوں میاں بیوی لان میں بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ ان کے برابر نیچر خاصا متفکر بیٹھا کسی بات کی تفصیل سن رہا تھا۔ تب ہی رازی آغا عثمان کی وہیل چیئر پکڑے گیٹ سے اندر داخل ہوا۔ شام کے اوقات میں وہ اکثر انہیں باہر لے جانے لگا تھا۔ ایک دو گلیوں کے چکر لگوا کر گپ شپ کر گھر آجاتے۔ ان کے کہنے پر وہ ان کی چیئر چلاتا نیچر کے پاس لے آیا۔ وہ بات کرتے کرتے رک کا تھوڑے کھڑے ہو کر سلام کیا پھر ڈاکٹر سمیٹھہ سے کلام کا سلسلہ جو لیا۔

”بس میم بہت پریشان ہیں دکان دار، نقصان بھی تو بہت ہوا ہے، کرائے کہاں سے دیتے۔ بڑی مشکل

سے میں نے یہ تھوڑے تھوڑے کرائے نکلائے ہیں ان سے۔“

وہ چند نیلے نوٹ ان کی جانب بڑھا رہا تھا۔ انہوں نے اضمحلال سے نوٹوں کو دیکھا پھر میاں سے مخاطب ہوئیں۔

”آپ کسی طرح وقت نکالیں، دکان داروں سے مل لیں۔“

نیچر کے چہرے پر گڑبڑا تے تاثر پیدا ہوئے ہی تھے کہ ڈاکٹر علی کا جواب آیا۔

”یار! میرے پاس وقت کہاں ہوتا ہے، تم جانتی تو ہو۔ ویسے بھی نقصان مالکان کو بھرنا پڑتا ہے۔“ انہوں نے چائے کی چمکی لیتے میگزین کے اوراق پلٹتے اچھتی نگاہیں پر ڈالی۔

”آپ دیکھ لیجئے گا۔“

وہ خوب چمک کر بولا۔ ”جی، جی، تنخواہ کس بات کی لیتا ہوں۔“

اس کے فرمایاں برداری سے ہلتے سر کو رازی کی آواز نے بریک لگائی تھی۔

”آپ آغا جی کے پلازے کی بات کر رہے ہیں؟“

”ہوں۔“ اس نے تسفانہ سر ہلایا۔ ”بہت زیادہ آگ لگنے سے نقصان ہو گیا ہے۔“

”وہ تو معمولی سا شارٹ سرکٹ تھا، وہ بھی اگلی دو دکانوں پر، باقی دکان دار کرایہ کیوں نہیں دے رہے۔“ اس کے جملوں پر سب نے چونک کر پہلے اسے پھر جوابی نگاہ نیچر پر اور وہ سچا کر بولا۔

”تمہیں کیا پتا۔“

”سر، میں ویٹن ہی تھا سانسے میڈیٹن مارکیٹ سے آغا جان کی دوا میں لے رہا تھا، فائر بریڈ کے آنے سے پہلے ہی دکان داروں نے آگ بجھادی۔ میڈیا کو تو عادت ہے ایک کی دس کرنے کی، ورنہ دس بیس ہزار کا نقصان تھا، اب ایسا بھی نہیں ساری مارکیٹ کرایہ نہ دے۔“

”تمہارا کیا مطلب ہے، میں جھوٹ بول رہا

ہوں۔“

وہ تمام حلاوت بالائے طاق رکھ اس پر چڑھ دوڑا، بالکل ویسے ہی جب ہمارے پاس الفاظ دیمل ختم ہو جائیں تو آواز کی بلندی سے کام چلاتے ہیں اس کی بھی آواز اونچی تھی۔ ڈاکٹر علی نے بمشکل اسے ٹھنڈا کیا اور رازی کو اشارے سے اندر بھیجا تھا۔

وہ بی وی لاؤنج میں بیٹھے رازی سے پوری تفصیل سن رہے تھے۔ ڈاکٹر سمیٹھہ درمیان میں بولیں۔

”اسی دن ذکر کرتا تھا۔“

اس نے عادتاً شانے اچکائے ”میرے نزدیک وہ کوئی بڑی بات نہیں تھی، بازاروں میں چھوٹے موٹے واقعے ہوتے رہتے ہیں۔“

باہر کی باتیں گھر آکر تانا اس کی سرشت میں نہیں تھا۔ آغا عثمان کو ایک دو بار پہلے بھی نیچر پر شک گزرا تھا مگر توجہ نہیں دی۔ اس دن اس کی بوکھلاہٹ، پھر رازی پر غصہ۔ بہت کچھ سمجھا گیا اسے رخصت کر کے رازی سے باز پرس کی اور پھر ڈاکٹر علی نے خود جانچ کی، رازی سچا نکلا۔ دکان داروں نے کرایہ بھی پورا دیا۔ نقصان بھی خاص نہ تھا۔ اس کی تنخواہ میں اضافہ کرتے ہوئے پلازہ کی ذمہ داری آغا جی نے اسی کو سونپ دی۔

وہ اس گھر میں فرد کی حیثیت سے رہنے لگا تھا۔ ٹھانڈے والی مگر بے حد مصروف زندگی میں بھی اس کی حیات پر تنوکی یاد کا حصار تھا۔ کمرے کی کالچ سے بنی دیوار گیر گھڑی سے دکھائی دیتے سفید دھندلے بادلوں میں اپنی مرضی سے شوکی شکلیں بتاتا کبھی ہنسی باتیں کرتی، اور کبھی آنکھ کے کناروں پر جھلما نامونی نکالتے۔ درد کی لہر سے ہونٹ خود بخود کچل جاتا۔ وہ اپنے سیاہ کرتے کی آستین کہنیوں تک موڑے ہوئے، ان کے داہنی طرف بیٹھا پورے اٹھناک سے ٹالسٹائی کی ٹرانسفلیشن سن رہا تھا۔ اس کے کسرتی بازو کرسی کی ہتھیلی پر جتے تھے۔ اس روانوی قصے کا صفحہ پلٹتے چند لمحوں کے توقف میں اس کی سوچوں کی ناؤ تھوٹی آنکھوں میں بسی نمی میں الجھ گئی تھی۔

”کیا سوچنے لگی؟“ آغا عثمان کھنکھارے۔  
”کچھ نہیں۔“ وہ سٹپا کر صفحہ ثلاثہ لگا تھا مگر انہوں نے کتاب پر ہاتھ رکھ دیا۔  
”اسے رکھو۔ تم سے ایک بات کرنی ہے۔“  
”جی۔ میں سن رہا ہوں۔“  
”وہ ادھر ایک فائل رکھی ہے اٹھا کر لاؤ۔“  
سامنے شافت کی جانب اٹھتے اشارے پر وہ گیا اور فائل اٹھا کر انہیں تھمائی اور بیٹھ گیا، انہوں نے فائل بغور دیکھ کر اس کے سامنے رکھ دی۔  
”رازی میاں یہ پلازہ کی دو دکانوں کے کاغذات جو میں نے اپنے وکیل سے تمہارے نام ٹرانسفر کروا دیے ہیں۔“  
”جی۔۔۔ اس کے منہ سے پھسلا۔ جی یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔“  
”کیوں تمہاری سمجھ میں نہیں آیا۔“  
اس نے منہ اٹھی نگاہ سے لٹی کی ”نہیں کیونکہ آپ کی بیٹی ہے، والدہ ہے، یہ ان کا حق ہے۔“ وہ تکیہ درست کرواتے ہوئے قدرے اوپر ہوئے ”میرا یہ گھر میری بیٹی کے نام ہے، میرا داماد جو میرا بیٹھتا ہے، اس کا اسپتال میں نے بنوا کر دیا تھا، اور ابھی پر اپنی ہے، میرے بچے بہت اچھے، قابل ہیں، میرے مرنے کے بعد یقیناً مجھے یاد بھی کریں گے لیکن بیٹا۔“ ان کی نفامت بھری آواز میں ایک نکتہ آسف سما گیا ”ان کی بے حد مصروف زندگی شاید انہیں اتنا وقت نہ دے کہ میرے پاس کچھ سلمان بھیج سکیں۔“  
”سلمان۔۔۔“ وہ الجھا ”کیسا سلمان آغا جی۔“  
”رازی میاں سلمان، یہ سلمان نہیں جائیداد گاڑیاں، فرنیچر، بینک بیلنس، اس سلمان کی بات کر رہا ہوں جو مرنے کے بعد پتہ پتا ہے، اعمال، نیکیاں، صدقہ، خیرات، جو بڑی زندگی کو خوشحال کرتا ہے، تم ایک اچھے نیک اور سچے ہو، ذمہ دار شخص ہو۔“  
”ہو نہ ذمہ دار۔“ اس کے رخساروں پر پھٹکی سی مسکراہٹ ابھر کر غائب ہوئی۔ ”کاش یہ چاچا سن لیتے۔“

”اور میں یہ نہیں اس لیے دے رہا ہوں کہ تم سختی، دیانت دار انسان ہو، اگر میں تمہارے لیے کچھ کروں گا تو تم میرے لیے دعا کرو گے، تم احسان فراموش نہیں ہو۔“  
”لیکن آغا جی۔۔۔“ اس نے ہاتھ میں پکڑی کتاب مینہ ایک طرف پر رکھی۔ یہ آپ کی اولاد کا حق ہے اور یقیناً ڈاکٹر صاحب کو یہ بات پسند نہیں آئے گی۔“  
”علی میرا دامادی نہیں بیٹا بھی ہے، اسے میں جانتا ہوں۔“  
آغا عثمان کے مطابق واقعی ڈاکٹر علی کو اعتراض نہیں ہوا تھا لیکن ڈاکٹر سمیعہ کو خاصا ناگوار گزرا۔  
باپ کی جائیداد نوکر کے سپرد۔  
”اس لیے کہوں داتا اچھا کیوں بننا جا رہا ہے، آپ جو لٹو ہو رہے ہیں اس پر بھلا کوئی یوں بھی اپنی جائیداد کسی غیر کے نام کرتا ہے۔“  
”سمیعہ! آپ کیسی باتیں کر رہی ہیں۔“  
ڈاکٹر علی نے نرمی سے مداخلت کی ”یہ چیزیں سچا جان کی ہیں، انہیں رکھنے اور دینے کا اختیار ان کے پاس ہے۔“ انہوں نے شرمسار ہو کر کن اکھیوں سے بچا کو دیکھا کہیں بیٹی کی بات بری تو نہیں لگی مگر وہ نیک لگائے مان سے علی کو سن رہے تھے، رازی اس وقت دوائیں لینے مارکیٹ گیا تھا۔  
”ہمارے پاس بہت کچھ ہے۔۔۔ اور ویسے بھی بچا کی نیت اسے بچنے کی نہیں صدقہ جاریہ کی ہے، آپ کو قطعاً اعتراض نہیں ہونا چاہیے۔“  
ڈاکٹر سمیعہ نے ناگ سے کبھی اڑائی۔ پھر کتنے دن رازی کو پر شکوہ، تنقیدی نگاہ سے دیکھا اور ڈاکٹر علی نرم لگا ہوں سے بیگم کو درگزر کی تنبیہ کرتے رہے۔  
لیکن فی الوقت آغا عثمان نے اسے دکانوں کے کاغذات سوچتے فہمائشی انداز اپنایا۔  
”اور یا! اپنے چچا سے کب ملو رہے ہو، میں ان سے بات کرتا ہوں، اپنی تنو کو رخصت کرو لاؤ یا۔“  
اس کی گھٹی بھنوں میں قدرے جزیں، نگاہ اٹھی۔ اک

مرد آہ سانس کے ذریعے سارے بدن میں پھیل گئی۔  
”بتایا تو ہے، میں ان کی بیٹی کے لائق نہیں ہوں، پسند نہیں کرتے مجھے۔“  
”ایسا کیسے ہو سکتا ہے، تم ایک قابل مرد ہو، ممکن نہیں تمہیں کوئی ناپسند کرے اور پھر ان کا خون۔“ وہ خاموش رہا۔ دیکھو، جو کچھ تم بتاتے ہو، اتنا بھی غلط نہیں، اپنی سگی اولاد کے لیے بھی سخت رویہ اختیار کرنا پڑتا ہے غلط نم کر رہے ہو، بڑھاپے میں انہیں چھوڑ کر اور اس بے چاری کا نہیں سوچتے جو تمہارے نام سے منسوب ہے، کیا حالت ہوگی اس کی۔“  
اس کی بے تاثر نگاہیں کالج کی بڑی سی کھڑکی سے نظر آتے لان میں جا ٹھہریں۔ آسٹریلیاں نرم گھاس پر جمی ہید کی سنہری کریوں پر دونوں میاں بیوی خاصے خوشگوار موڈ میں کافی پیتے کن اکھیوں سے مالی کو کیا ریاں سنوارتے دیکھ رہے تھے شاید اسی پر کوئی بصرہ ہو۔  
انہیں بہت کم اکٹھے بیٹھا دیکھا ان کے چروں پر پچھلی مسکراہٹ ان کی کامیاب ازدواجی زندگی کی غماز تھی۔  
امنگوں کی رو بہکنے سے پہلے ہی اسے گود میں رکھی فائل کا خیال آیا۔  
”جب انہیں پتا چلے گا تو جانے کیا رویہ ہوگا۔“  
”رازی میاں کہاں کھو گئے“ آغا عثمان غل ہوئے ”یہ جو تم بیٹھے بیٹھے کھونے لگے ہو، اسی لیے کہہ رہا ہوں، تنو کو رخصت کرو لاؤ، زندگی سہل ہو جائے گی۔“  
”آں! ہاں، یہ فائل کہاں رکھوں، میرے پاس کبھی اتنا قیمتی سلمان نہیں رہا۔“ اس نے مسر موضوع بدلا۔  
”اسے کمرے کی دراز میں لاک کر لو، بینک میں رکھو، وہاں بھی، لیکن سنبھال لو۔“  
\* \* \*

دل کی دہلیز سے قطع نظر انداز زندگی وقت کی ندی پر تیری رہی۔ چند دن لگے تھے ڈاکٹر سمیعہ کا رویہ بہتر ہونے میں۔ آغا عثمان کی گاڑی اب رازی کے استعمال

میں رہنے لگی تھی۔ آغا جی کی طبیعت یک لخت بگڑ جاتی وقت بے وقت ہاسپٹل پہنچانا پڑتا اور سوگ جلد ہی سکھ لی سو سہولت ہو گئی تھی۔ وہ وقت دیکھے بنا فوراً پہنچا دیتا۔ سو اسی وجہ سے سمیعہ کا رویہ بدل گیا۔  
لندن میڈیکل ایسوسی ایشن کی جانب سے بلخاریہ میں ایک سی سی نارتھ ڈاکٹر علی، ڈاکٹر سمیعہ کا وہاں جانا بے حد ضروری تھا۔ آغا جی کی طبیعت خراب ضرور تھی مگر اتنی بھی نہیں کہ وہ جانے کا ارادہ ملتوی کر دیتے۔ رازی کو بہت سی ہدایات اور متعلقہ ڈاکٹر سے مشورے کے بعد وہ چار روز سی سی نار میں بلخاریہ جا چکے تھے۔ انہیں گئے دوسرا دن تھا جب رات کو اچانک ان کی طبیعت خراب ہوئی۔ بلڈ پریشر، شوگر دونوں بالی ہو گیا۔ فوراً اسپتال پہنچایا گیا۔ نیم غشی میں بار بار سمیعہ اور علی کو پکار رہے تھے۔  
”بلاؤ انہیں۔۔۔ رازی میری حسرت ہے شروع

ادارہ

# سوچ نگر کی دانی



رحمۃ جلیلہ

قیمت - 350/-



سے "آخری لمحے میرے پاس۔ میرا علی ہو مگر وہ نہیں ہے۔ بلاؤ اسے بلاؤ میری طبیعت کا بتاؤ اسے۔"

ایمر جنسی کی جانب پڑھتے انہوں نے آخری بات تھکے سانسوں سے کی تھی۔ حواس باختہ رازی کی آنکھیں ایمر جنسی کے بند دروازے کو دیکھ دیکھ تھک گئی تھیں۔ اس نے بار بار کال ملائی مگر مطلوبہ نمبر بند

ہونے کے مخصوص جملے سننے کو ملتے رہے۔ وہ یہی نار میں شرکت کے وقت موبائل آف کیے بیٹھے تھے چند گھنٹوں کی قطع تعلقی زندگی پر محیط ہو گئی۔ ایمر جنسی سلاؤنگ دروازہ کھلتے ہی مایوس چہرہ لیے ڈاکٹر زباہر تھے۔ حوصلے کی چھکی رازی کے کندھے پر دے کر چلے گئے۔ لمحے بعد آغا عثمان اسٹریچر پر ابدی نیند سوئے اس کے سامنے تھے۔ رابطہ ہونے پر دونوں پہلی ملنے والی سیٹ پر وہ دو دن بعد واپس آ سکے تھے ڈاکٹر سمیعہ صدمے سے بے حال تھیں۔

"جن ہتھیالیوں پر چڑھ چڑھ ہم اونچے مقام تک پہنچتے ہیں" ان ہاتھوں کو جھک کر جو منادور کنار پلٹ کر دیکھتا بھی غیر اہم سمجھتے ہیں، کتنا غیر اہم سمجھان کی بیماری کو اور یہی نار کتنا اہم تھا ہمارے لیے! باپا چلے گئے۔ بہت بد نصیب ہوں آخری وقت پر بھی پاس نہیں تھی رازی آخری لمحے کچھ نہ کہا ہو گا۔"

بہت دیر سے چپ چاپ بیٹھا رازی ڈاکٹر علی کو دیکھتے ہوئے بولا تھا۔

"بار بار آپ کو بلا رہے تھے۔"

ڈاکٹر علی نے سراپستکی سے نگاہ اٹھائی خالی ہاتھوں کو گھورتے ہوئے بہت سہانائی آنکھوں سے اٹھ اہونٹ مہم سے پھیلے تھے۔

"ہو نہ، چچا جان اکثر مجھے ڈانٹتے ہوئے کہتے تھے، تم پر اس لیے سختی کرتا ہوں علی، تاکہ تم اتنے مضبوط بن جاؤ میری آنکھوں کو بند کرنے کے لیے کسی اور کی ضرورت نہ پڑے۔ آہ!" انہوں نے گہرا سانس لیا۔

"دیکھو رازی۔" انہوں نے اپنے ہاتھ دیکھے۔ "آج میرے ہاتھ کتنے مضبوط ہیں، مگر میں بد نصیب ان کی

آخری نمائش بھی پوری نہ کر سکا، تین سال کا کمزور سا تھا جب ماں باپ رخصت ہوئے انہوں نے پالا جوان کیا اپنی اولاد تو سب پالیتے ہیں مجھ لاوارث بچے کو صرف بالائی نہیں اپنی اکلوتی بیٹی بھی دے دی اور میں ان کی آخری رسومات میں شامل نہ ہو سکا، میرا گلٹ اندر سے مجھے مار دے گا رازی۔"

ڈاکٹر علی، سمیعہ کا دکھ اپنی جگہ مگر رازی کے اندر

بہت سے چھانکے کیے بعد دیگرے ہوئے تھے۔ اس کا ذہن کئی برس پیچھے چل پڑا۔

"اوہ نیک بخت اس لیے سمجھاتا ہوں اسے" اس کے بازوؤں میں طاقت ہو گئی تو مجھے کندھا دے گا۔" انسانی دماغ عجیب ہے بعض اوقات ساری زندگی بتا کر بھی اپنی غلطیوں کا ادراک نہیں ہوتا اور بھی کبھی لمحہ سب سمجھ جاتا ہے کچھ ایسی حالت اس کی بھی تھی۔

"جانے چاچا کی طبیعت کیسی ہوگی بوڑھے تو تھے ہی، جوت لگنے سے لنگ بھی آگیا تھا، کتنی ضرورت تھی انہیں میری کتکائی اور کیا ہوگا دھونڈا ہوگا، بوجھاپے میں میں نے انہیں دکھی کیا۔"

ایک مہینہ احتساب کی پہری پر چلتے چلتے پاؤں زخم رسیدہ ہو گئے تھے۔

وہ آج صبح سے ہی خاصا چپ تھا، کچھ دیر ڈاکٹر علی کے پاس بیٹھا رہا جیسے کچھ کہنا چاہتا ہو پھر ان کے استفسار پر بولا تھا۔

"دراصل میں اپنے گھر واپس جانا چاہتا ہوں، ویسے بھی میری اب اس گھر میں ضرورت نہیں رہی۔"

اس سے پہلے کہ ڈاکٹر علی کچھ کہتے ڈاکٹر سمیعہ بول پڑیں۔

"کیسی بات کر رہے ہو رازی تم، تم ابا کو بے حد عزیز ہو گئے تھے، آخری وقت میں میرے باپ کو تم نے سنبھالا اور پھر وہ تم پر ایک ذمہ داری ڈال کر گئے تھے، اس کا کیا ہو گا۔"

وہ چپ رہا۔ "آپ وہ کاغذات لے لیں، کسی اور کو میسر نہ رہے گا۔"

"ہو نہ۔" اسے گہری نگاہ سے دیکھتے ان کے ہونٹ پھیلے تھے "ابا کو تو صرف تم پر اعتبار تھا خیر تم جاؤ اپنی فیملی سے ملو، بلکہ انہیں یہاں لے آؤ، میں ان کیلکسی ٹھیک کر دیتی ہوں، جب تک چاہو، یہاں رہو، ایک اور مشورہ دوں گی۔"

اس نے استفہامیہ نگاہ اٹھائی۔ "تم ان دکانوں میں

اپنا کوئی بزنس شروع کر لو اور باقی جو کچھ ابا اور تم میں ملے ہے، وہ تمہارا فرض ہے، پورا کرو اسے۔"

"آپ یہ اپنی خوشی سے کہہ رہی ہیں۔" لمحے میں استعجاب تھا۔ وہ مسکرا میں اثبات میں سر ہلایا۔

"بے حد خوشی سے۔"



کانن کے سرمئی کلف لگے سوٹ پر کھلون لگایا۔ تک مک سے تیار ہو کر کف کے ٹخن بند کرتے آئینے میں اس نے اپنا سر لایا بغور دیکھا تھا۔ خوش شکل تو پہلے ہی تھا۔ خوش خوراک، خوش لباسی اور آسودہ حالات زندگی نے اس کے کسرتی بدن میں مزید وجاہت بھر دی۔ اسے لمحہ بھر کے لیے اپنا آپ دیکھنا اچھا لگا پھر مسکرا کر سامنے سے ہٹ گیا۔

اس کی گاڑی کے نائز تنگ گلی کے کنار پر چرچرائے تھے۔ کچھ دیر بارش ہونے سے گلی میں کچڑ سا تھا۔ وہ لنگڑاتے ہوئے چمڑی کے سہارے سے سنبھل سنبھل کر گلی کی جانب بڑھ رہے تھے۔ وہ دیکھتے ہی چونکا۔ اپنا آپ شرمندگی میں گر گیا۔ چچائی کار کا دروازہ کھول کر تیزی سے باہر نکلتے رازی کو تھمتے راہ گیر پہچان کر چونکے وہ سب کی پروا کیے بغیر تیزی سے آگے بڑھا ان کا بازو تھام لیا۔ احسان لمحہ بھر کے لیے لوکڑا گئے انہیں یقین نہیں تھا۔ جیسے کوئی خواب، واہمہ، سانس روکے، پلکیں جھپک بغور دیکھا وہ بازو کھول زور سے پٹ گیا۔ تیز چلتے شخص میں معافی مانگتا

رہا۔ اور جب گھر کا دروازہ کھٹکھٹانے پر چاچی نے کھولا، خیر سے پھرا گئیں۔ وہ بے ساختہ ان سے پلٹا تھا۔ اپنی صفائی میں کچھ کہنے کے لیے ہونٹ کھولے انہوں نے جھٹکے سے اسے الگ کیا، بے یقین نگاہوں سے نکلتے اس کے چہرے کو ہاتھوں میں تھام لیا۔ "اپنی صفائی میں کچھ مت کہنا، میری نگاہ میں تو کبھی ملتا تھا ہی نہیں، یہ بوڑھی آنکھیں تیرے دیدار میں کھلی تھیں، تو آگیا بات ختم۔"

وہ خاموشی سے جائے نماز پر بیٹھی تھی کن کن بوندیں کب موسلا دھار بنی اور تھم بھی گئیں۔ وہ ہر چیز سے لا لعلق ہوئی بیٹھی تھی، پھیلے ہاتھ پلکوں کی جھار گری ہوئی۔ وہ دبے قدموں اندر آ کر برآمدے کے اس کونے میں بیٹھ گیا جہاں وہ اوٹ میں بیٹھی تھی۔ اس نے مضبوطی سے اس کے دونوں ہاتھوں کو تھام لیا۔

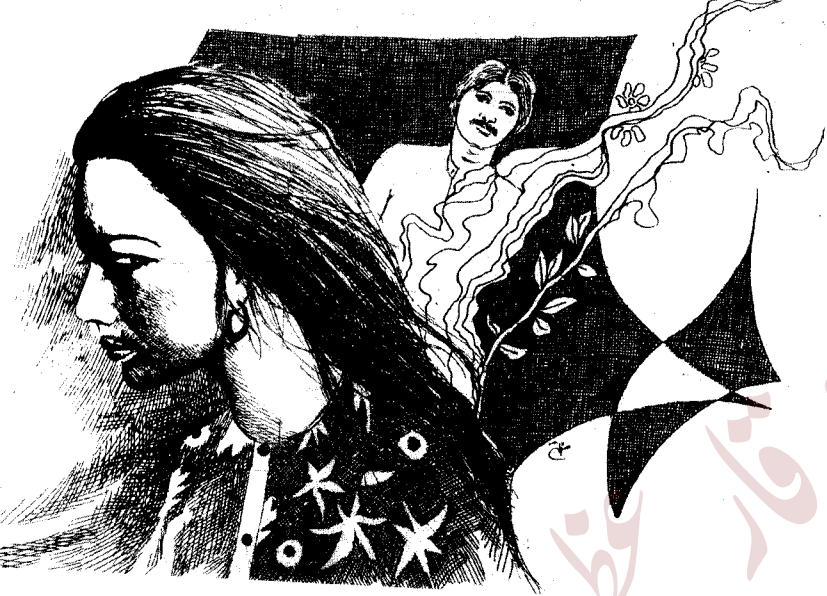
"تمہارے پھیلے ہاتھ اور آنسوؤں میں بہت طاقت ہے تو، میں کبھی نہ آنے کے لیے ارادے سے گیا تھا، لیکن پہلے کھوں میں ہی کمزور پڑ گیا اور پھر کمزور پڑ گیا، دل نہیں لگا ہی نہیں، بے چینی، بے قراری مجھے تمہارے پاس بھیج لائی، بڑی طاقت ہے تمہاری دعاؤں میں تو۔"

تنزیلہ کو اپنی ہتھیالیوں پر اس کی گرم پوریں سرکتی محسوس ہو رہی تھیں۔ "مجھے صاف کر دو، تمہیں دکھ دے کے مسکھ مجھے بھی نہیں ملا۔"

دونوں کی بے یقین نگاہیں اک دوجے پر تھیں۔ دونوں ہی ظاہری، باطنی بدل گئے تھے نگاہیں گڑی رہ گئیں۔ اک اک آنسو دونوں کی آنکھ سے ٹپکا اور تنزیلہ کی ہتھیلی پر آگرا، اس کی چمک کسی نادر ہیرے کی طرح آنکھوں کو خیرہ کرتی تھی۔



# پریکٹس



”میں سمجھا کہ اس تپتے موسم میں شاید تو نہ آئے“ اور میں انتظار کرتے کرتے ٹوٹے لٹ جاول۔“ فرید نے اپنا قیاس بتایا تھا۔

”ایسا کبھی نہیں ہو سکتا تو جانتا ہے یہ جو محبت کی آگ ہوتی ہے یا یہ ہر آگ سے بڑھ کر ہوتی ہے جس کو یہ چھو جائے اس یہ پھر کسی آگ کا اثر نہیں ہوتا۔“ اس نے فرید کا قیاس رد کرتے ہوئے کہا تھا۔

سیاہ افق پر بچے ان گنت ستارے آسمان کا حسن بڑھا رہے تھے ہر سوان ستاروں کی چمک دمک تھی۔ پردھرتی میں ایک جگہ ایسی بھی جہاں یہ ستارے اپنی دمک میں ماند پڑ رہے تھے وہ جگہ ایلوس کی سیاہ رات کے اندھیرے میں ڈوبی دکھائی دے رہی تھی۔ اس جگہ کے اگر قریب جا کر دیکھا جائے تو وہاں ایک موم بنی اپنی زرد روشنی چلتی رکتی سانسیوں کی طرح جلتی بجھتی دکھائی دے رہی تھی۔ جیسے کسی نے انتظار کا روپ جلار کھا ہو۔

غصہ ہوا تھا۔ اور اس کے غصے سے بڑھنے والی تپش اور زیادہ دھرتی کے سینے کو جلائے لگی تھی۔

پوچھا تھا۔  
”بتایا نا گلے ہفتے“  
”ہمیشہ ہمیشہ کے لیے کیا؟“ جو ڈر کنٹنی مارے اندر بیٹھا تھا یکدم ہا پر نکل آیا۔

”آج کل تو بڑا فلسفہ بولنے لگی ہے غیر تو ہے نا۔“ اب کے فرید نے شرارت بھرے لہجے میں سوال کیا۔  
”میں جتنی ان پڑھ کہاں فلسفہ جھاڑ سکتی ہوں۔ تو بس اس محبت کے کمالات ہیں جو ہم جیوں کو بھی کچھ نہ کچھ سکھا دیتی ہے۔“ وہ ہلکا سا مسکراتی تھی۔

یہ زرد پیلی روشنی کسی کا انتظار تھی۔ اور ایلوس کے اندھیرے والی جگہ مدارن کا گھر تھی۔

اور یوں راتوں انتظار کا لایہ اوڑھ کے اپنی پوری زندگی اس انتظار کے نام کر چکی تھی۔ انتظار کی یہ بیڑیاں اس وقت اسے طلائی زیور سے بھی زیادہ خوب صورت لگ رہی تھیں پڑو یہ نہیں جانتی تھی کہ یہ طلائی زیور سے بھی خوب صورت بیڑیاں اس کی جوتی کا سارا رس چوس لیں گی۔ اور پھر اس کھوکھلے وجود کو جتنی سے اپنے بس میں کر لیں گی۔ وہ نہیں جانتی تھی قطعی نہیں جانتی تھی۔

”اے شہر جا رہا ہوں کسی دوسرے ملک نہیں جوتو یوں پریشان ہو رہی ہے۔“ فرید اب کہ جھنجھلایا سا بولا تھا۔

”اب بتا کیوں بلایا ہے مجھے۔“ اس نے دریافت کیا۔  
”میں اگلے ہفتے شہر جا رہا ہوں نوکری کے لیے۔“

سورج دھرتی کے کشادہ سینے کو کسی تندور کی طرح گرم لپٹوں سے دھکا رہا تھا۔ ان گرم لپٹوں کی جان لیوا تپش سے بچنے کے لیے انسان تو انسان۔ چرند پرند بھی اپنے ٹھکانوں گھونسلوں میں دھکے دے رہے تھے۔ پر ایسے منظر میں ایک شخص ایسا تھا جو کسی کے انتظار میں ان گرم لپٹوں کی پروا کیے بغیر اندھا بند چلتا جا رہا تھا۔ اسے اپنی فکر نہیں تھی۔ اسے حوالہ انتظار شخص کی فکر تڑپائے جاری تھی۔ کسی نہ کسی طرح وہ وہاں پلک جھپکتے پہنچ جائے۔ اور چند لمحوں بعد یہ شخص اپنی مطلوبہ جگہ پہنچ گیا تھا۔ اور اس کو منتظر دیکھ کر اس کے سونکھے لبوں پر یکدم مسکراہٹ کھل اُٹھی۔

”میرے لیے تو تیرا شہر جانا بھی دوسرے ملک جیسا ہے۔“ وہ اداسی سے بولی تھی۔  
”مسال بھری تو بات ہے پھر میں شادی کے بعد تجھے بھی وہاں اپنے پاس بلا لوں گا۔“ مرد کا عورت کو زیر کرنے کا انڈی تھیار نسلی دلا سے عمید ان تین بیڑیوں کو عورت بڑے شوق سے اپنے گلے کا ہار بناتی ہے۔ اور راتوں بھی ان بیڑیوں کو اپنا لیا تھا۔

فرید نے یہ کہہ کر در حقیقت اسے ساکت کر دیا تھا۔  
”شہر جا رہا ہے؟ نوکری مل گئی؟ اور مجھے پتا ہی نہیں چلا۔“ سکتہ ٹوٹا تو کیے بد دیگرے تینوں سوال اٹھنے پوچھ لیے۔

”فرید نے خوشی سے اسے دکھا تھا۔  
”تو بلانا تو میں کیسے نہ آتی۔“ وہ بولی۔

”مجھے یاد نہیں رہا تجھے بتانا۔“  
”یہ پہلی بات ہے جو فرید نے راتوں سے چھپائی ہے۔“ یہ کہتے ہوئے راتوں کے نین کٹوڑے یکدم بھرنے لگے اور پھر بھر کر جھلکے لگے۔  
”اے پگلی روٹی کیوں ہے۔ میں کام کاج میں مصروف تھا۔ بتانا یاد نہ رہا۔“ اس نے جواز پیش کر کے راتوں کو تسلی دینی چاہی تھی۔  
”دکب جا رہا ہے؟“ راتوں نے دھڑکتے دل کے ساتھ

انتظار کا یہ روپ دو سال سے زائد کا عرصہ کاٹ چکا تھا۔ پر راتوں روپ کو روز امید کا تیل دینا نہ بھولتی تھی۔ روپ تھک گیا تھا۔ پر راتوں نہیں تھکی تھی۔ عورت ویسے بڑی کمزور ہوتی ہے پر مرد سے محبت کے مقابلے میں خست چٹان بن جاتی ہے۔ راتوں بھی چٹان

”میں تیرا انتظار کروں گی فرید۔“ اس کے جملے پر آس پاس کے درخت بڑی زور سے ہنسنے لگے۔  
”میں تیرے انتظار کی لاج رکھو گا راتوں۔“ فرید نے عہد کیا تھا۔ سورج مرد کے اس جھوٹے وعدے پر اور

بن گئی تھی۔ بھرچٹان جس پر بارش کبھی پھول بھی نہیں کھلاتی۔

☆☆☆

چار سال۔۔۔

انتظار کا یہ دہپ چار سال پورے کرچکا تھا۔ پر ابھی تک اس کی تپتیا کانت نہیں ہوا تھا۔ رانو کے بالوں میں چاندی کے بارے آگ آئے تھے مگر انتظار کا یہ دہپ ابھی تک بوڑھا نہ ہوا تھا۔ پر ہاں رانو کا دل ضرور بوڑھا ہوتا جا رہا تھا۔

☆☆☆

”خالہ! تو رانو کو کیوں نہیں سمجھاتی؟ وہ فرید کو دل سے نکال دے۔ وہ شادی کر کے اپنی زندگی میں خوش و خرم ہے تو رانو کیوں اس ہرجائی کے پیچھے اپنی زندگی برباد کر رہی ہے؟“ رانو کی سبکی اظہار آج بطور خاص رانو کے گھر اس کی اماں سے بات کرنے آئی تھی۔ کیونکہ اس سے رانو کی یہ حالت دیکھی نہیں جا رہی تھی۔

”پتر! میں سمجھا سمجھا کر تھک چکی ہوں، بروہ سمجھتی نہیں۔ یہ بھی بتا چکی ہوں کہ فرید شادی کرچکا ہے بروہ مانتی نہیں جس میں کہتی ہے کہ فرید میرے انتظار کی لاج ضرور رکھے گا۔“ اماں یہ کہتے ہوئے پھوٹ پھوٹ کر رو دی تھیں۔

”میں بات کرتی ہوں آج اس سے۔“ اظہار یہ کہہ کر وہاں سے اٹھ کر رانو کے پاس چلی آئی۔

”رانو! اور کسی پر نہیں تو اپنی بوڑھی ماں پر ہی ترس کھالے کیوں انہیں دکھ دیے جا رہی ہے؟“ اظہار نے غصے سے اسے جھنجھوڑا تھا۔

”میں نے اماں کو کیا دکھ دیا ہے؟“ وہ التاحیرت سے اس سے پوچھنے لگی۔

”مجھے اس کم بخت فرید کی ان دیکھی سب باتیں بتا

ہیں! پاس رہتی ماں کے دل کا حال نہیں معلوم، واہ رانو! مجھے اس دنیاوی عشق نے صحیح خوار کیا ہے۔“ اظہار بے بسی کے مارے مٹھیاں بھیجنے لگی تھی۔

”میں اپنا وعدہ نہیں توڑ سکتی اظہار! یہ انتظار کا دہپ میری محبت کی سانس ہے اگر اسے توڑ دیا تو میری محبت بھی مر جائے گی۔ نہیں میں ایسا ظلم نہیں کر سکتی، مجھے معاف کر دینا۔“

”فرید مجھے اللہ پوچھے گا۔ تو نے ایک ہنستی ہنستی زندگی اجاڑ دی۔“ اظہار دکھی دل اور غم آنکھوں کے ساتھ واپس لوٹ آئی تھی۔

☆☆☆

انتظار کی تپتیا برسوں گزر جانے کے بعد بھی ختم نہ ہوئی تھی۔ پر رانو کی زندگی اس پریم مدارن (جو گمن کی زندگی) آہستہ آہستہ ہوتے ہوئے کھتی جا رہی تھی۔ انتظار کا یہ دہپ براہی طاقتور ثابت ہوا تھا۔ ایک پوری زندگی کھا گیا تھا۔ پر ابھی تک اس دہپ کا پیالہ نہ بھرا تھا۔

رانو آج بھی بوڑھے منیس ابھرتے تھر تھر کانپتے ہاتھوں سے اس دہپ میں امید کا تیل ڈالتی تھی۔ آج بھی اس پریم مدارن کے من میں ایک یہی بات نقش تھی کہ وہ اس کے انتظار کی لاج ضرور رکھے گا۔

پریم رانو کو دیکھ کر اس مدارن کو دیکھ کر قہقہے لگا رہا تھا۔ اور یہی کہتا جا رہا تھا۔ ”مجھے حاصل کرنے کے لیے بڑے دکھ اٹھانے پڑتے ہیں، پوری زندگی اٹھانے پڑتے ہیں۔“ پریم مدارن مجسم سوال۔ بنی یہ پوچھ رہی ہے کہ پریم میں اٹھائے جانے والے دکھ ہمیشہ عورت کو ہی کیوں اٹھانے پڑتے ہیں۔



# خطِ حیات

ناولٹ

بیسہ عنائیہ کے کمرے میں گئی تو اس نے دیکھا عنائیہ نزع کے عالم میں تھی۔ اس کی سانسیں اکھڑ رہی تھیں۔ اس نے بیہ سے کہا کہ تمہاری خاموشی اور مہر جیت گیا اور میری فریاد رزاری ناکام ہوئی۔ میرا دل اور ہاتھ دونوں خالی ہیں۔ مجھے اس سے محبت تھی۔ وہ میرے اندر رہتا تھا۔ میں جان ہی نہ سکی۔ تم اسے بتا دینا کہ مجھے اس سے لگتی محبت تھی۔ بیہ کے پوچھنے پر اس نے بتایا کہ اسے ”فنا“ سے عشق تھا، بیہ ساکت رہ گئی۔ اسے اپنے کانوں پر یقین نہ آیا۔ وہ دیا کو عنائیہ کی موت کے بارے میں بتانے لگی۔

دیا کا کمرہ خاص یہ خانے میں تھا۔ جہاں وہ عبادت کرتی تھی۔ وہاں کسی کو جانے کی اجازت نہ تھی۔ بیہ پہلی بار وہاں گئی۔ کمرے میں داخل ہو کر وہ پتھر ہو گئی۔

دیا بھی مرنے کے قریب تھی۔ وہ ہری طرح چلا رہی تھی۔ بیہ جو اس سے گزرے برسوں کا حساب لینے آئی تھی۔ کچھ نہ کہہ سکی۔ دیا نے دم توڑ دیا تھا۔ وہاں کچھ تصویریں تھیں ایک ہی بندے کی تصویریں اور دیا کی ڈائریاں۔ ان ڈائریوں کے ساتھ ایک رقعہ تھا جس پر لکھا تھا۔ ”انہیں بڑھ لیتا۔ تمہارا تجسس دور ہو جائے گا۔“

بیہ نے کچھ قریبی لوگوں کو ان دونوں اموات کی اطلاع دی تھی اور فنا کو بھی فون کر کے عنائیہ کی موت کے بارے میں بتایا تھا۔ فنا نے سروسچ میں کہا تھا کہ تم یہ اطلاع رافع کو دے دو۔ بیہ کے جتانے پر کہ رافع اس کا شوہر ہے اس نے سرو مہی سے کہا کہ وہ اب اس کا شوہر نہیں ہے۔

بیہ نے رافع کو اطلاع نہیں دی تھی۔ افسوں مشدی ایک برنس ٹائیکون کی اکلوتی بیٹی تھی رافع ابراہیم ایک مزدور تھا۔ افسوں مشدی نے اس کو دیکھا اور اس کی اسیر ہو گئی۔ لیکن رافع ابراہیم نے اس پر توجہ نہ دی۔ افسوں نے اسے اپنے باپ





کی آمل کپنی میں ملازمت دے دی۔ وہ اسے بھول کر مارا تھا۔ تب ہی ایئر پورٹ پر افسوں پہنچ گئی تھی اور اس نے اسے روکنے کی کوشش کی تھی۔ لیکن جب رافع افراہیم نے اپنا ہاتھ لے لیا تو اس نے اپنے ہاتھ لے کر اسے روک دیا۔  
 مرید نے اپنے دوست حریر کو اپنی مفتی میں آنے کی دعوت دی تھی اور کہا اپنے ساتھ ایک اور ”دوست“ کو بھی لے آنا۔ جدید کا یہ دوست پائلٹ ہے۔ وہ انتہائی دلچسپ ہے لیکن ساتھ ساتھ بد ماغ اور فحش بھی ہے۔ انادوبہ بہت حسین دل کش تھی۔ اس کی کلاس فیلو روایاں اس کے لیے اپنے بھائی کا رشتہ لے آئی۔ یہ اسے اس کو ناراضی سے منع کر دیا اور کہا اس رشتہ سے انکار کی وجہ خود روایاں ہے۔  
 دیو باجب انادوبہ کے گھر گئی تو اس نے انادوبہ کے تایا زاد افراہیم کو دیکھا۔ اس کی گہری محبت بھری نظریں روایاں کو ڈسٹرب کر گئی تھیں۔

فوزان مشدی کے آمل پلانٹ پر کام ہو رہا تھا۔ فوزان مشدی اپنے ایک ایک در سے بخوبی واقف تھے۔ پچھلے چھ ماہ سے ان کے پلانٹ پر ایک در گر کام کر رہا تھا۔ اسے افسوں کی سفارش پر رکھا گیا تھا۔ یہ در کربست غیر مذہ دار اور لا پرواہ تھا۔ یہ لڑکا رافع افراہیم تھا۔ فوزان مشدی کو بتایا گیا کہ وہ معاہدہ توڑ کر ظران سے فرار ہو رہا ہے تو فوزان مشدی کو غصہ آ گیا اور اس نے خروج لگو کر اسے جیل بھجوا دیا۔  
 افسوں مشدی کی اپنی سوتیلی ماں آگینے سے بہت اچھی دوستی تھی۔ اس کے سوتیلے بھائی حمیر اور عمیر بھی اس سے بہت پیار کرتے تھے۔ افسوں کا اپنا گاہائی ناراض ہو کر گھر چھوڑ دیا تھا۔  
 رافع افراہیم کے جیل جانے سے افسوں بہت پریشان تھے۔ وہ اسے ہر نکلانا چاہتی تھی۔ وہ اسے چھڑانے کے لیے جیل چلی گئی جس کی وجہ سے اس کا باپ بہت پریشان ہو گیا۔  
 حریر اپنے پائلٹ دوست کے ساتھ ڈین بیگ پہنچا تو مرید قاضی انہیں لینے نہیں آیا تھا۔ حریر نے اسے بتایا کہ مرید نے اپنی مفتی میں شرکت کے لیے بلایا ہے۔ یہ سن کر اس کا پائلٹ دوست تنہا ہو گیا تھا۔ وہ مرید کی مفتی میں شریک نہیں ہونا چاہتا تھا۔ اس نے واپس جانے کا فیصلہ کر لیا، لیکن مرید نے اسے زبردستی روک لیا۔  
 مرید نے زندگی میں بہت برے دن دیکھے تھے۔ امید میں کی خالہ زاد بھی جس سے اس کی مفتی ہونے والی تھی۔ اس کے خالو خوش حال تھے۔ رانیہ کی شکل میں مرید کی لائری نکلی تھی۔  
 افسوں نے پہلی بار جب رافع افراہیم کو دیکھا تھا تو وہ ایک معمولی مزدور تھا۔ اس کی تباہ حالی کے باوجود افسوں اسے دل

دے بیٹھی، وہ اس کی منت سماجت کر کے اسے اپنی کپنی میں لے آئی۔ رافع افراہیم ہامی کے کسی واقعہ کی وجہ سے شدید پشیمانی اور اذیت کا شکار تھا۔ اس نے افسوں کی محبت قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ اس کی ہر ممکن مزاحمت اور انکار کے باوجود افسوں نے ہار نہیں مانی تھی اور بالآخر رافع نے ہتھیار ڈال دیے، لیکن اس کا گھر و دل یہ برداشت نہ کر سکا اور اس کی سانس بند ہونے لگی۔ افسوں یہ منظر نہیں دیکھ سکی اور خوف زدہ ہو کر بھاگ نکلی تھی، لیکن وہ بچ گیا تھا۔  
 فوزان، مشدی کو پتا چلا کہ وہ جیل سے رافع کو نکال لائی ہے تو انہوں نے افسوں کو بتایا کہ وہ رافع کے متعلق ساری معلومات کراچے ہیں۔ وہ اپنے خاندان کا شکار رہا ہے۔ اس نے اپنے بھائی کی بیوی پر بری نیت رکھنے کا گناہ کیا تھا۔  
 عنایہ اور دیو کی موت پر سب رشتہ دار شکوک کا شکار ہو رہے تھے۔ کچھ رشتہ داروں نے یہ پر شک کیا کہ اس نے پیسے کی خاطر سوتیلی بہن اور بھائی کو زہر دے دیا۔  
 دیو کا پورا نام انادوبہ تھا۔ دیو باجب انادوبہ کے لیے رشتہ لے کر گئی تو وہاں انادوبہ کے بچے کے بچے اپنے افراہیم نے اسے دیکھ کر پسند کیا اور رشتہ بھجوا دیا۔ انادوبہ کو شدید غصہ آیا۔ اور حسد محسوس ہوا کیوں کہ افراہیم نے اس کے لیے تو صاف انکار کر دیا تھا۔ انادوبہ کا روئے سوتیلی ماں کے ساتھ دن بہ دن خراب ہوتا جا رہا تھا۔ فرزانہ ماں بننے والی تھی۔ یہ بات اس کے لیے ناقابل برداشت تھی۔  
 انادوبہ نے افراہیم کے گھر سے آئی، اس کی مفتی کی مٹھائی بھی چھت پر پھینک دی تھی۔ اس نے تاجو کے ذریعے ماں دیوانی سے جاو کر لایا۔ کاشف اس پر بری طرح ریجھ گیا۔

انادوبہ کا بھائی ناصر ایک لڑکی کو کھ گالایا۔ اس وجہ سے گھر پر پولیس آگئی اور بابا کو گرفتار کر کے لے گئی۔ اب اس بے عزتی کو برداشت نہ کر سکے اور دل کے دورے میں زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھے۔  
 افراہیم کا نکاح ہونے لگا تو انادوبہ نے ماں دیوانی سے اس نکاح کو روکنے کے لیے تعویذ لیے۔ لیکن انادوبہ کی تمام تر کوششوں کے باوجود یہ نکاح ہو گیا۔ چچی نے انادوبہ کے بارے میں کہا کہ یہ جس کی زندگی میں جائے گی، اسے جنم بنادے گی۔ یہ سن کر انادوبہ کے تن بدن آگ لگ گئی۔  
 افراہیم نے ناصر کو جیل سے چھڑانے کی کوشش نہیں کی تھی۔ اسے اس بات کا بھی غصہ تھا۔ انادوبہ نے ایک بار پھر ماں دیوانی سے رجوع کیا۔  
 فرزانہ ایک بچی کو جنم دے کر دنیا سے رخصت ہو گئی۔ روایا امید سے تھی۔ وہ بیڑھیوں سے پھسل گئی تو اسے انادوبہ کی غلطی کہہ کر افراہیم نے انادوبہ کو بہت مارا۔ اس تیز لیل نے انادوبہ کے دل میں شعلے بھر دیے۔ وہ ماں دیوانی کے پاس پہنچ گئی۔  
 روایا کی زندگی اچانک طوفانوں کا شکار ہو گئی تھی۔ ابے گھر میں سائے نظر آتے۔ وہ خوف زدہ رہتی۔ ماں کی حالت بھی خراب رہنے لگی۔  
 روایا کی شادی کاشف سے ہو گئی تھی۔ انادوبہ اس کی سوتیلی بہن اس کے مزاج کی سختی کا شکار تھی۔ افراہیم کی امی نے افراہیم کے بیٹے فاح سے اس کا رشتہ طے کر دیا۔ انادوبہ کو اس پر بھی شدید غصہ تھا۔ وہ دن بہ دن غلط عملیات میں ڈوبتی جا رہی تھی۔  
 ایک دن تاجو اچانک دیا کے گھر آگئی۔ اس نے بتایا کہ عملیات کی وجہ سے وہ برباد ہو چکی ہے۔ اس نے اس کا ذمہ دار دیو کو ٹھہرایا۔ اس کی سانس نے یہ باتیں سن لیں۔ انہوں نے کاشف اور دیو کو گھر چھوڑنے کے لیے کہا۔  
 ماں کے دل میں روایا کے لیے نفرت پیدا ہو گئی تھی۔ وہ روایا سے خوف زدہ تھیں۔ افراہیم نے بھی تنگ آ کر ایک دن کہہ دیا کہ ”تم ماں کے سامنے نہ آیا کرو۔“

## ساتویں اور آخری قسطیں

کچھ ادراک بہت جان لیوا ہوتے ہیں۔ جو روح کو جھنجھوڑ ڈالتے ہیں۔ اور کچھ انکشاف بڑے اطمینان کا باعث ہوتے ہیں۔ جیسے مرید کی مفتی ہو جانے کا انکشاف، جو فاح کے لیے تو ایک اطمینان کے سوا کچھ نہ تھا البتہ حریر کی جذباتیت اسے تسلیم کرنے سے قاصر تھی۔  
 ”اس کی مفتی پہ تمہارے غصے کی وجہ سمجھ میں نہیں آئی۔“ فاح محلوں میں پرسکون ہو تا اب آرام کر رہی ہے بھول رہا تھا۔  
 مرید کی مفتی ہو چکی تھی اب کوئی فنکشن ہونے والا نہیں تھا؟ پاکستان سے رشتہ داروں کا ٹولہ آنے والا نہیں تھا۔ خاص طور پر مدیحہ تائی۔ مدیحہ کی سڑیل ماں۔  
 وہ ان کا سامنا بھی نہیں کرے گا۔  
 ”تم تو بے حس ہو۔ اس کلمی “ بے عزتی “ کو محسوس نہیں کر سکے۔ احمق اگر مفتی کا فنکشن نہیں تھا تو ہمیں اور مجھے یہاں نیولپ کے کھیت کٹوانے کے لیے بلوایا ہے؟ ہم بیگ میں بھتیجی باڑی کریں گے کیا؟“ وہ اونچی آواز میں بھونک رہا تھا۔ ”آپے“ سے باہر ہوا تو جوبی پر آمد سے نکلے مکمل خالو نے انہیں گھور کر دیکھا۔ وہ بیلے اٹھائے، ہاف نیکر پٹنے کھیتوں کی طرف جا رہے تھے۔  
 ”حریر کچھ خیال آنے پہ چونک گیا تھا اور اچانک بیٹھے سے سیدھا ہو گیا۔  
 ”وہ انہی تمہارا پوچھ رہی تھی۔“

”میرا۔۔۔؟“ فالج بری طرح سے ٹھکا تھا۔ ”اچھا، آتے ہی اس کے چہرے کا رنگ تبدیل ہو گیا۔ پھر اس نے جلدی سے سر جھکا لیا تھا۔ وہ اس کھوپ کی لگاؤں کے سامنے کچھ بھی عیاں نہیں ہونے دینا چاہتا تھا۔ جب وہ کھانا کھا کھال سے باہر گیسٹ روم کی طرف نکلا تو انیہ اچانک سامنے سے آئی اس سے ٹکرائی تھی۔ انیہ کے ہاتھ میں ٹیوپ کے پھول تھے جو زمیں پر گر گئے تھے۔ ٹیوپ اس ملک بالینڈی کی فخریہ کاشت تھی۔ ”آتم سوری۔۔۔“ فالج نے جھک کر پھول میٹھے تھے وہ لڑکی جو تم صم سی کھڑی تھی۔ لمحہ بھر میں ہی سنبھل کے چونک گئی۔ ”اٹس اوکے؟“ یہ آپ کے لیے ہی تھے۔ ”انیہ نے مسکرا کر پھولوں کی طرف اشارہ کیا۔ ”ہمارے ذہن ہیک میں آنے والے معزز مہمانوں کو خوش آمدید۔“ دوسرے ہی بل اس نے سینے پر ہاتھ رکھ کر ٹھوڑا جھٹکتے ہوئے کہا تھا۔ فالج اس انداز پر نہ چاہتے ہوئے بھی بے ساختہ مسکرایا۔ اسے انیہ کے لیے حریر کا تعریفی انداز یاد آیا تھا۔ ”تجھ مدید کی قسمت پر رشک آرہا ہے۔“ فالج کو اس رشک کی وجہ سمجھ میں آچکی تھی۔ وہ ایک بہت پیاری لڑکی تھی۔ یقیناً ”مدید کے ساتھ اس کی زندگی بہت اچھی گزرتی۔“ ”تمہیں ہیک بہت اچھا لگے گا۔ ٹیوپ یہاں کی سوغات ہے۔ یہ مسافر لو کو روک لیتے ہیں۔“ انیہ نے ایک عجیب بات کہی تھی۔ پھر فرش سے جھک کر ایک چھٹی گلی کو اٹھا کر فالج کی طرف بڑھایا۔ ”مجھے اندازہ نہیں تھا۔ مدید جیسے بندے کا دوست تمہارے جیسا بھی ہو سکتا ہے۔ تم ہیک میں طلوع ہوتے ایسے سورج کی مانند ہو جو ٹیوپ پر اپنی کرن پھینکے تو ہر سو سنہرا اجالا کر دے۔“ انیہ کے تعریفی کلمات نے فالج کو ہلکا کر رکھ دیا تھا۔ اسے پوری گفتگو میں ایک ہی جملہ کانٹنے کی طرح چبھا تھا۔ ”مدید جیسے

بندے کا۔۔۔؟“ اس بات سے انیہ کی کیا مراد تھی؟ فالج کو اپنا دماغ نہ داتا تھا۔ احموس ہو رہا تھا۔ ”تمہیں میری تعریف بری لگی ہے تو سوری۔“ اس نے فالج کے تاثرات فوراً ”بھانپ لیے تھے وہاں برہمی کی سرخی چھاری تھی۔ ”لیکن خدا کی صناعی اور اس کی کسی بھی مخلیق کو سراہنا کوئی جرم نہیں۔“ اس تصادم کے بعد ایک مرتبہ پھر انیہ کا سامنا کرنا بڑا ہی دشوار تھا۔ لیکن رات کے اس پیریاں کی شدت نے فالج کو ہسپتال سے اور اپنے مجبور کر دیا تھا۔ اور اب انیہ کو لاؤنڈر میں بیٹھا دیکھ کر وہ شاید واپس ہی چلا جاتا لیکن انیہ کی اچانک اس پر نگاہ پڑ گئی تھی۔ اور دوسرے ہی بل وہ جگ، گلاس سمیت اس کے سامنے تھی۔ ”یہ پانی تمہارے لیے۔“ وہ پانی سے بھرا جگ فالج کی طرف بڑھ رہی تھی۔ اور فالج کو جیسے شاک لگا تھا۔ انیہ کو کیسے پتا چلا کہ اسے پانی کی طلب تھی؟ کیا انیہ کو الہام ہوا تھا۔ ”مدید نے کہا تھا کہ میں تمہارے بیڈ روم میں پانی رکھوا دوں۔۔۔ جب میں پانی لے کر آئی تو تم سو چکے تھے۔ بیڈ روم اندر سے لائڈ تھا۔ میں تب سے یہاں بیٹھی ہوں کہ تم اٹھو گے اور پانی لینے ضرور آؤ گے۔ گریڈز رات کو چن لاک کر دیتی ہیں۔ میری بل کے وقتوں سے عادت ہے۔ انہیں ڈر تھا کہ غریب گھرانے کی پاکستانی بھورات کو فرن کا صفایا نہ کر دے۔ اور پرانی عادیں چھوٹی کمال ہیں؟ وقت بدل گیا۔ برصغیر کی عورتوں نے اپنی سوچ نہ بدلی۔ اب یہی حال دیکھ لو۔“ ممی کو شوگر ہوئی تو میں نے روم فریج منگوا دیا۔ ضرورت کی کھانے والی تمام چیزیں اندر بھر دیں۔ مگر گریڈز کا کام وہیں کا وہیں۔ راتوں کو اٹھ اٹھ کے چیک کرتی ہیں۔ ارے، میں بھی کس کمالی میں اچھ گئی یہ پانی لوٹا۔“ وہ ابھی تک جگ بڑھائے کھڑی تھی۔ ”فالج۔۔۔!“ انیہ کے طرز تخاطب سے اس نے

ناگواری محسوس کی تھی پھر اس نے جگ اور گلاس لے لیا اور جانے کے لیے مڑا۔ لیکن انیہ کی آواز نے قدم روک لیے۔ ”اور مجھے تو یہ بھی پتا ہے۔ تمہیں کھانے میں کیا پسند ہے؟“ اور تم کالی نہیں پیتے میوزک میں ڈانسنے کے سر پسند تھے اور گیتوں میں محمد میاں صاحب، وارث شاہ، علی شاہ تمہارے فیورٹ، تمہیں بہت بولنے والے لوگ پسند نہیں۔ لیکن بولنے سے انسان ریلیکس ہوتا ہے۔“ فالج حیران تھا۔ ”گڈ بائے فالج! صبح ملاقات ہوگی۔“ وہ بولتی جا رہی تھی۔ اس بات سے قطع نظر کہ کوئی اس کی سن بھی رہا تھا یا نہیں؟ وہ بول بول کر تھک گئی اور ٹھنڈے فرش پر بیٹھ گئی۔ یہ اس کے ساتھ کیا ہو رہا تھا؟ یہ سب کچھ الٹ پلٹ کیوں ہو رہا تھا۔ یوں جیسے اندر کا کوئی موسم بدل رہا ہو۔ وہ اپنی انگلی میں موجود انگوٹھی کو گھماتی اور وحشت زدہ سی رہ جاتی تھی۔

\*\*\*

ہیک کا آسمان بالوں سے بھرا ہوا تھا۔ مدید اپنے ہونے والے ”خالو سر“ کے ہمراہ کبیس روپوش ہوا تو آلتیا آلتیا حریر زرد ستی فالج کو کمرے سے گھنٹ کر باہر لے آیا تھا۔ وہ دونوں ہیک کے بازار گھومنے کے لیے نکل گئے تھے۔ واپسی پر اخلاقی تقاضوں کو نبھاتے ہوئے انیہ کے لیے تحفہ خرید لائے۔ اور فالج نے اپنی احتیاط پسند طبیعت کی وجہ سے وہ تحفہ انیہ کو براہ راست نہیں دیا تھا بلکہ مدید کے حوالے کر دیا تھا۔ مگر وہ خود انیہ تک کو پہنچا دے۔ مگر اس کے بعد کیا ہوا؟

\*\*\*

تا حد نگاہ بجلی کے بلب جیسے ٹیوپس کا فرش بچھا ہوا تھا۔ فضا میں تازہ گلابوں کی خوشبو بھی رچی تھی۔

وہ دونوں گیسٹ روم کی بالکونی میں بیٹھے تھے۔ اور ہیک پر اترا حسن دیکھ کر مہموت ہو رہے تھے۔ مدید صبح سویرے اپنے خالو سر کے ہمراہ نجانے کہاں نکل جانا تھا۔ یہ معہ بھی حل ہو گیا۔ کمال خالو اپنے کمال کے کھیتوں کی حفاظت و نگہداشت میں کمال کے حساس تھے۔ مختصر رہتے پہ پھیلے ٹیوپس کے باغ کی دیکھ بھال بذات خود فرماتے۔ اب دست راست کیا ملا۔ مفت کے اس مزدور سے پورا دن کام کروایا جاتا تھا۔ وہ کمال خالو کی طرح ہی لمبی سی نیکر، بنیان میں نیلے اٹھارے صبح کھیتوں کی طرف نکل جاتا تھا۔ حریر کو جب مدید کی ”مصوفیت“ کا علم ہوا تو اسے پتہ ہی لگ سکتے تھے۔ ”یہ گھر دامادی ہے یا مستقل جاگزی؟ اگر اسے گھر داماد رکھنا کہتے ہیں تو میں ایسی دس انیہ قربان کر دوں اور کبھی بھی گھر داماد نہ ہوں۔“ حریر کا مارے غصے کے برا حال تھا۔ انیہ کا بیچا ہوا ڈرائی فروٹ کھاتے ہوئے فالج نے حریر کے سرخ، پیلے ہوتے چہرے کی طرف دیکھا تھا۔ ”تم کہہ سکتے ہو، کیونکہ تم نے چھوٹے گھروں کے مسائل نہیں دیکھے۔ بجلی پانی، گیس نہ ملنے پہ کئی کئی دن بھوکا پیاسا اور ان دھلا رہنے کا عذاب نہیں سہا۔ تم کسی کے گھروں پہ نہیں چلے۔ تم نے گالیاں کونے اور دھکے نہیں کھائے۔ اگر زندگی میں اس ٹھوڑی سی مشقت کے بدلے میں ”شارٹ کٹ“ انیہ کی صورت میں میسر آجائے تو اسے خوش نصیبی سمجھ لینا چاہیے۔ مدید نے اسے خوش قسمتی سمجھ لیا ہے اور اس پچویشن کو قبول کر لیا ہے۔ کم از کم اس زندگی سے یہ زندگی بہت بہتر ہے۔ جو اس کی مایموں نے عذاب بنا رکھی تھی۔“ کچھ دیر بعد فالج نے نہایت سنجیدگی سے مدلل جواب دیا تھا۔ حریر لمحہ بھر کے لیے چپ رہ گیا۔ وہ فالج کے لمبے کی کٹ دار سچائی کی تکلیف محسوس کرنا مدید کو اب کوئی ”یرغمالی گھر داماد“ نہیں سمجھ رہا تھا۔ وہ گراس س بھر

کے رہ گیا۔

بہت دور نکلتوں کی صورت میں کمال خالو اور مدید ٹیولپ کے کھیت میں کام کرتے اور گوڈی کرتے دکھائی دے رہے تھے اور ان کے قریب کوئی اور بھی تھا۔ کوئی گلابی سلیش والا؟

”ان کا ذریعہ معاش یہی ہے ٹیولپ کی ایک پورٹ اور روزی کمانے کے لیے انسان محنت تو کرتا ہے۔“ فلاح نے چیخ کر اشارہ کرتے مدید کو ہاتھ بلایا تھا۔ جانے وہ کیا کہہ رہا تھا۔ یہ دونوں سمجھ ہی نہ پاسے معا ان دونوں کے پیچھے سے نکل کے کوئی سامنے آ گیا تھا۔ وہ دونوں بے ساختہ چونک اٹھے تھے۔ آنے والی انیہ کی گرینڈ مائیس۔ وہ خراش سی بوڑھی جسے حریر نے فوج کا نام دے رکھا تھا۔ کھڑی بالوں والی خوفناک سی آئی۔

”تمہارا دوست کھیتوں میں صبح سے گوڈی کرتا ذلیل ہو رہا ہے۔ اتنا احساس نہیں کہ اس کی مدد کرو اور سن لو یہاں مفت خوری کا رواج نہیں ہے۔“ انیہ کی گرینڈ مائیس میزائل کی طرح ان دونوں کے حواسوں پہ مری تھیں۔ وہ آگے پیچھے بالکونی سے اترے اور کھیتوں کی سمت چل نکلے تھے۔ اس حال میں کہ حریر غصے میں دانت پکچا تا تھا اور مٹھیاں پیچھے پیچھے کرنا لکونی کی طرف دیکھتا تھا۔

”ہم اس کے باپ کے ملازم ہیں کیا؟ بس نکل یہاں سے کسی ہوٹل میں بسیرا کرتے ہیں۔“ فلاح اس کی حالت زار پہ مسکراہٹ دیتا اور آگے کی طرف بڑھتا چلا گیا۔

\*\*\*

ٹیولپس کی لمبی دور تک جاتی تھاروں کے آخری کنارے پہ خوبانی کا ایک درخت لگا تھا۔ اور اسی درخت کے نیچے انیہ بیٹھی تھی۔ زرد ٹوکری میں ٹوٹ کر کڑی خوبانیوں کو اکٹھا کرتی ہوئی۔ اور اس کا چہرہ بہت سی سوچوں کے غبار سے اپنا اصلی رنگ کھو رہا تھا۔ گوڈی کرتے ہوئے مدید نے بے ساختہ چونک کر

ایک طرف دیکھا اور پھر ہاتھ پہ آیا پسینہ بونچھ کر سر سے اٹھ جاتا پھلوں کی اوٹ میں رنگ کے زمین پہ پڑا انیہ نے قریب آکر اٹھا۔ اپنے دھیان میں بیٹھی انیہ کی بے ساختہ چیخ نکل گئی تھی۔ مدید نے فوراً اپنا مٹی سے بھرا ہاتھ انیہ کے لبوں پہ رکھ کر اس کی چیخ کا گلا دیا تھا۔

”اوف ہاتھ ہٹاؤ۔“ انیہ نے زبردست مزاحمت کی تھی۔ مدید نے اسے چیخنے کے لیے پرتوتے دیکھ کر اپنا ہاتھ ہٹایا۔ ”جنگلی بلی! اتنا چیختی ہو تم۔“ مدید نے خشکی سے کہا اور اس کے باپ کی طرف اشارہ کیا۔ ”سسر صلیب نے مجھے کام چھوڑے تمہارے گھٹنے سے لگا دیکھ لیا تو ہاتھ میں پکڑا پکڑا اٹھا کر میرے سر میں

دے ماریں گے۔ اور ابھی میرا اوپر جانے کا کوئی پروگرام نہیں۔“ مدید نے مٹی بھرے ہاتھوں سے اپنا پسینہ رگڑا اور ٹوکری سے ایک خوبانی اٹھا کر کھانے لگا۔ انیہ ایک دم بلی آواز میں چیختی تھی۔ ”ہاتھ تو دھو لو۔“

”شہابی صراحی میں پانی لے آئیں تو ہاتھ بھی دھو لیتا۔“ وہ اس کے چیخنے پہ عذر دیتا مسجید کی بھری لاپرواہی سے بولا تھا۔ ”اب میں ایک کسان ہوں۔ اور کسان مٹی کے ساتھ مٹی ہو جاتا ہے۔ یہ مٹی کسان کے اندر رچ بس جاتی ہے۔“ مدید مسکراتا ہوا خوبانیاں کھاتا رہا۔ انیہ کے دھیان کی سوئی محوم پھر کر بالکونی میں ہی انک رہی تھی۔ جہاں یہ وہ دونوں بیٹھے تھے۔ اور ان دونوں کی طرف اشارہ کر کر کے باتیں کر رہے تھے۔ شاید موضوع گفتگو مدید ہی تھا۔ انیہ کا دل مجھے لگا۔ او اس ہونے لگا۔ وہ اپنی ان کیفیات پہ شدید ہراساں تھی۔

یہ اس کے اندر کون سا ”بدلاؤ“ چل رہا تھا۔ ”معا“ اس نے مدید کو ایک کونے میں رکھے پتھر کی طرف بڑھتا دیکھا۔ اس پتھر کے اوپر مدید کے کپڑے پڑے تھے اور ان کے نیچے ایک مٹھی تھیں۔

مٹھنی کے بعد پہلی مرتبہ کوئی تحفہ؟ اس کی آنکھیں جھگڑنے لگیں۔

مدید سابقہ انداز میں کمال خالو سے پچتا پچتا رہتا ہوا انیہ تک پہنچ گیا۔ پھر اس نے مٹھی کیس انیہ کے ہاتھ میں تھما دیا تھا۔ انیہ نے اشتیاق کے عالم میں مٹھی کیس کھولا۔ اور اندر سے بیروں کا جھگڑا برسلٹ برآمد ہوا۔ ڈین ہیک کی چمکتی روشنی میں برسلٹ کے ابرے دمک رہے تھے اور آنکھوں کو خیرہ کرتے تھے۔ ”یہ اتنا قیمتی تحفہ؟“ وہ ہکا کر خاموش ہو گئی تھی۔ مٹھنی کے بعد مدید کی طرف سے یہ پہلا تحفہ تھا۔ مٹھنی پہ اس کی تجوس خالہ نے صرف ایک چھلکا بھجوا دیا تھا۔ اور اب مدید کی طرف سے ملنے والا یہ انتہائی قیمتی تحفہ۔

وہ ایک خوب صورت مسکراہٹ کے ساتھ

برسلٹ پہننے لگی۔ ”تم ہٹاؤ گے ٹونڈا کرو گے۔“ وہ خوشی سے کھلتی کندم کی سنہری بالیوں کی طرح لگ رہی تھی۔ مدید اس کی بے تحاشا خوشی پہ حیران ہوتا ہے بتانے لگا۔ ”یہ مٹھنی کا تحفہ ہے۔“

”بتانے کی ضرورت نہیں۔ یہ کس کی چوائس سے خرید رہا ہے۔“ اب وہ پہلے والی بیڑاری بھلا کے سوال کر رہی تھی۔ ہونٹوں پہ مسکان، آنکھوں میں خوشی۔ مدید کا دل عجیب سا ہو گیا تھا۔ کیا عورتوں کی خوشی ان ہیرے موتیوں تک محدود ہوتی ہے؟ اس کے اندر بے کلی سی اترنے لگی تھی۔

”یہ میں نے نہیں خریدا۔“ مدید نے سچ بتایا اور وہ حیران رہ گئی۔

”تو پھر؟“ انیہ الجھ کر اسے دیکھنے لگی تھی۔ ”یہ انہوں نے دیا ہے۔ حریر اور فلاح نے۔“ مدید نے بالکونی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ وہ دونوں دور بالکونی میں بیٹھے تھے اور یہ سمجھ رہے تھے کہ مدید انہیں اشارے کر کے بلارہا ہے۔ جواباً فلاح نے بھی ہاتھ بلایا تھا۔ مدید کا ہاتھ اس کے پہلو میں لٹک گیا تھا۔

وہ ایک دم سے چمیں سا ہو گیا۔

”مٹھنی کا تحفہ۔ اور اب شادی پہ نہیں لوں گا۔“ مدید نے فیصلہ سنا دیا تھا۔ وہ ابھن بھری نظروں سے دیکھتی ایک دم ہنس پڑی تھی۔

”تو اب بھی نہ لیتے۔“ وہ برسلٹ کو بڑے پیار سے اپنی سڈول کلائی میں جھمارہی تھی اور اس کے ساتھ مدید کا دل بھی گول دائرے میں محوم رہا تھا۔

”وہ لے آئے تھے۔ لوٹانا اچھا نہیں لگا۔“ اس کی آواز دھیمی پڑ گئی تھی۔ کیونکہ تیز قدموں کی چاپ نے اسے چونکا دیا تھا۔ اور چونک تو انیہ بھی گئی تھی۔ پھر اس کے ہونٹوں پہ مسکراہٹ آگئی۔ ”مہوں، فلاح کی چوائس بہترین ہے۔“ اس نے تسلیم کر لیا تھا۔ او مدید کے سر پہ خوبانی کا پورا درخت آگرا۔ اس نے فلاح کا نام لیا تھا۔ حریر کا کیوں نہیں لیا؟ تحفہ ان دونوں نے مشترکہ دیا تھا تو پھر صرف فلاح کیوں؟

”معا“ تیز قدموں کی چاپ اس کے سر پہ پہنچ گئی تھی۔ مدید نے غائب دماغی سے آنے والوں کی طرف

Herbal

**سوہنی شیمپو**

**SOHNI SHAMPOO**

اس کے استعمال سے چھڑوں میں جگمگاہٹ  
گرتے ہوئے ہانڈا گڑھا ہے  
ہالوں کا منہ اور چھلکا ہوتا ہے

قیمت 90/- روپے

رجسٹرڈ سے بھانڈے ہار کی بازار سے بھانڈے والے  
دو ٹیمیں 250/- روپے تین ٹیمیں 350/- روپے  
اس میں ڈاک خرچ اور پیکٹ مارچ شامل ہیں۔  
بڈر پیرا ڈاک سے بھانڈے کا پتہ  
پانی پکس 53 اور گربہ مارکٹ امامیہ بازار راولپنڈی  
دفتر بڈر پیرا کے لیے:  
کے ایم ایم ڈاکسٹ 437 اور بازار کراچی۔ فون نمبر 32216381

دیکھا تھا۔ وہ حریر تھا جو غصے میں نجانے کیا کیا کر رہا تھا۔ اور فاح اس کے پیچھے تھا۔ نرم نرم مسکراتا ہوا۔ اس کے دماغ میں سائیں سائیں ہوتی رہی۔ وہ کچھ بھی نہیں سن رہا تھا۔ وہ کچھ بھی نہیں سمجھ رہا تھا۔ ماحول چند بل بعد بدل گیا۔ حریر اب انیہ کو برہسلیٹ پہنے دیکھ کر تعریف کر رہا تھا اور فاح پہلے اٹھا کر مدید کے حصے کا کام کر رہا تھا۔

پھر مدید نے ایک اور منظر دیکھا۔ حیران کن پریشان کن، اور یہی منظر حریر نے بھی دیکھا تھا۔ اور عجیب تو فاح کو بھی لگا تھا۔

مدید کی فانیسی کے چیلے کنوروں میں فاح کو دیکھ کر بجلی سی کیوں چمکتی تھی؟

اس سوال نے حریر کو دم بخود کر دیا تھا۔ وہ بے خیالی میں مدید کی طرف دیکھتا رہا۔ مدید کروش کے بل خم نہیں پہ سورا تھا۔ اچھا تھا وہ سورا تھا۔ وہ انجان تھا۔ انجان ہی رہتا۔

کیونکہ بعض اور اک بہت جان لیوا ہوتے ہیں۔ جو روح کو جھوٹے رکھ دیتے ہیں۔ جو زلزلے کی مانند آتے ہیں اور دل برباد کر جاتے ہیں۔

☆☆☆

بیک میں آج چھاجوں چھان مہمند برس رہا تھا۔ جیسے باہر کا موسم بدل چکا تھا ایسے ہی اندر کا موسم بھی بدل گیا تھا۔

خالو کمال سے لے کر اس خطبی بڑھیا تک سب کے سب تیری کی مانند سیدھے تھے۔ وہ مہمانوں کو دیکھ کر ماتھے کی تیوریاں، آنکھوں کی چڑھی پتلیاں، چوتھوں کے بل سب گدھے کے سر سے سینکوں کی طرح غائب تھے۔

حریر نے بادل خواستہ ہوٹل میں منتقل ہونے کا پروگرام بدل دیا تھا۔ کیونکہ آئی ”دوچ“ نے انہیں قسم ہی ایسی دی تھی۔

”میری لاش سے گزر کر ہوٹل میں جانا۔“ یہ کسی

غابی لہجہ کا انہلاک نہیں تھا۔ وہ حقیقتاً ”حریر کے سامنے اپنے فانی وجود کے ساتھ تن کر کھڑے ہونے کی کوشش میں لڑا کھڑا رہی تھیں۔ اب ان کی لاش سے گزر کر جانے کا دل گرہ کوئی کہاں سے لانا۔ اوپر سے مدید کی فٹیں اور انیہ کی معذرتیں ساتھ گریزنا کی ٹھنڈی ٹھنڈی بڑھاپیں۔

”مجھے کیا خبر تھی مدید کے دوست تھے نہیں۔ ایک جہاز اڑاتا ہے اور دوسرا ہر نفسیات یعنی ڈاکٹر۔ بھلا اس بچے مدید کے اتنے قابل دوست ہو سکتے ہیں۔“

گریزنا کو بلا آخر یقین آئی گیا تھا۔ ان کو یقین کیا آیا۔ حریر اور فاح کی قسمت کھل گئی۔ ایسا شہابی برونوئل اچھے سے اچھا خوان لگتا تھا اور مہمانوں والے سارے جاؤ ان پرورے کے جاتے تھے۔ ساری عمر میں شاید یہ پہلے مہمان تھے جن کی ہدایت اور آؤ بھگت ہو رہی تھی۔ ورنہ اس گھر میں مہمانوں کی خاطر خدمت کا رواج نہیں تھا۔ یہ کیا پلٹ انیہ اور مدید کی وجہ سے ہوئی تھی۔

”اتنے فارغ نہیں تھے جو منہ اٹھا کر آجاتے۔ میں نے فٹیں کر کے بلایا تھا۔“ مدید رات کو گریزنا سے لڑا تھا۔ ”اور آپ نے ایک گمشدہ پائلٹ کو بھتی باڑی پہ لگا دیا؟ وہ پائلٹ ہے کوئی کسان نہیں جس سے آپ ٹیوب کی ایک نئی فصل کاشت کروانے کی کوشش کر رہی تھیں اور وہ حریر، رب پی کاہنا اور کھریوں اور یوں کے اٹاٹوں کا مالک ہے۔

انیہ کے آئینہ دکھانے پہ گریزنا مچ چ پریشان، حواس باختہ اور شرمندہ ہو گئی تھیں۔ سوانہوں نے مہمانوں سے معذرت کرنے میں دیر نہ کی۔ اور اس رات گیسٹ روم کی فضا بڑی نرم تھی۔

آج کی شام حریر نے انیہ کی گریزنا کو دوچ کہنے سے پرہیز کیا تھا۔ انہیں سنجوس، تنک دل اور بھوک جیسے خطابات سے نہیں نوازا تھا۔ اور اس صورت حال پہ سب سے زیادہ مدید خوش تھا۔ اب اگلے چند ہفتوں تک گریزنا کا موسم بہت اچھا ہو جاتا اور اس دوران وہ

”مبارک ساعت“ بھی آجاتی۔ جس کے لیے مدید نے اپنے دوستوں کو پہلے ہی بلایا تھا۔

اس رات مدید اپنے کمرے سے نکل رہا تھا جب اسے ٹیرس نے انیہ کی ایک جھلک دکھائی دی تھی۔ وہ ٹیرس پہ اکیلی تھی اور بہت اداس بھی۔

مدید کی نگاہیں اس کے برہسلیٹ پہ جم گئی تھیں۔ وہ اضطرابی انداز میں برہسلیٹ کو اپنی سندر کلائی میں گھمائی تھی اور رات کی تاریکی میں جانے کیا کھوجنے لگتی۔

”انیہ! مدید کی آواز نے اسے چونکا دیا تھا۔ وہ گھبرا کر چہرہ موز گئی۔ شاید وہ اپنے تاثرات مدید سے چھپاتا چاہتی تھی۔ مدید گھوم کر اس کے سامنے گیا تھا۔

”یہ۔۔۔“ مدید نے اس کی کلائی کو ہاتھ میں لیا۔ اندھیرے میں بھی بیش قیمت ہیرے اپنا مول بتاتے تھے۔ اور ان کی چمک ایک دیوار تھی۔ جو مدید کی آنکھوں کے سامنے تن رہی تھی۔ یوں کہ اس کے لیے انیہ کا چہرہ دکھنا شواہد تھا۔

”یہ اتار دو۔“ مدید نے کلائی کو چھوا اور چھوڑ دیا تھا۔

”اتار دو؟ مگر کیوں؟“ اس کا سوال بڑا ہی بے چین کروانے والا تھا۔

”اس کی چمک میری آنکھوں کو تکلیف دیتی ہے۔“ مدید نے دونوں انداز میں کہا تھا۔

”مگر۔۔۔“ انیہ ہکلا سی گئی۔ اس کی آنکھوں میں ہلکیلا پانی جمع ہونے لگا۔

”یہ مجھے بہت پسند ہے۔ اس کا ڈیزائن بہت یونیک ہے۔ تمہیں نہیں پتا مدید! گریزنا کا یہ پورا گھر فروخت کر دیں تب بھی اس برہسلیٹ کی قیمت پوری نہ ہو۔ اس میں بڑے قیمتی ہیرے جڑے ہیں اور یہ مجھے بہت پیارا لگتا ہے۔“ آخری جملہ اس نے دل میں کہا تھا اور پھر خاموش ہو گئی۔ کیونکہ مدید وہاں نہیں تھا۔ وہ چلا گیا تھا۔ غصے میں یا شاید ناراض ہو کر۔

انیہ ٹیرس کی ریٹنگ سے کمر نکالے کمرے کمرے سانس لینے لگی تھی۔ اس کے ہاتھ اب بھی برہسلیٹ

کو گھما رہے تھے۔ پھر اس نے برہسلیٹ کا کپکھول کراتا رہا۔ اس کی کلائی سونی اور بے رنگ ہو چکی تھی۔

اس نے نفی میں سر ہلا کر لب بھیج لیے۔

وہ روتے ہوئے دوبارہ برہسلیٹ پہن رہی تھی۔ اس برہسلیٹ کو اتارنے کا فیصلہ گھور تاریکی میں کھو گیا تھا۔ پھر وہ تیزی سے ٹیرس کا دروازہ کھول کر اندھیرے میں گم ہو گئی۔

☆☆☆

”سر مئی رنگ کے اڑے اڑے پال۔ جیسے اس کھیتی میں کوئی ہم بلاسٹ ہوا ہو۔ چھوٹی گھرانہ تہائی شاطر آنکھیں۔ چہرے پہ ڈھیروں جھریاں۔۔۔ بوڑھے مخروطی ہاتھوں پہ ان گنت ابھری ہوئی رکیں۔ پتکے گل، لنگے ہونٹ، دیلا پتلا سختی سا سراپا۔ واللہ میرے تصور میں اس لڑکی کے سوا اور کوئی نہیں آتی۔ میں جب بھی آنکھیں موندتا ہوں۔ میرے خیالوں میں آپ کا چہرہ آتا ہے۔ آئی لو بو گریزنا! میں اپنا پروپونل آپ کی پوتی کے سامنے رکھوں یا پوتی کے ہونے والے شوہر کے سامنے؟“ یہ حریر تھا۔ گریزنا ہاں کے گھٹنے پہ سر رکھے اتاپ شیاپ بلتا ہوا۔ حریر کا کسی کسی دن میٹر لانا چلنے لگتا تھا۔ آج بھی ان ہی دنوں میں سے کوئی دن تھا۔

اخبار کو بلاؤج کھٹکنا فاح بمشکل اپنی مسکراہٹ روک سکا تھا۔ کچھ بھی تھا۔ اس حریر کے علاوہ فاح کے بے رنگ چہرے پہ مسکراہٹ لانے ہنر کا کسی اور کو نہیں آتا تھا۔ وہ جب بھی مسکراتا تھا۔ حریر کی ہکواس پہ ہی مسکراتا تھا۔

”تم بہت شرارتی ہو۔ مجھے یقین نہیں آتا کہ تم نے نفسیات پڑھ رکھی ہے۔“ گریزنا اپنے نفی دانستوں کے ساتھ ہنسی ہوئی بہت پیاری لگتی تھیں۔

”آپ کو تو یہ بھی یقین نہیں آتا تھا کہ فاح جہاز بھی اڑاتا ہے۔“ حریر نے فوراً ”جملہ اچکا۔

”لیکن اب تو آلیانا۔“ گریزنا ہنسنے لگیں۔

”ہماری خوش نصیبی۔“ وہ آداب بجالایا تھا۔



گرینڈا نے غم بھر میں ایسا ”لطیفہ“ نہیں دیکھا تھا۔ وہ انہیں ہنسنا ہنساکے بے حال کر دیتا تھا۔ یہاں تک کہ ان پہ کھاسی کا حملہ ہو جاتا۔

اس صورت حال پہ فاتح انہیں پانی پلاتا۔ ان کی کمر مسئلے ہوئے حریر کو زبردست گھوریوں سے نوازتا تھا۔  
”تم اپنی محبوب کی جان لینے کے ورے ہو؟“  
”محبوبہ کی جان لوں گا تب ہی تو مدید کی دادی سانس سے جان چھوٹے گی نا۔“ وہ آنکھ مار کر اشارہ کرتا تو فاتح اسے ایک آدھ دھمو کا جڑ دیتا تھا۔

گرینڈا سے حریر کی بڑی گاڑھی جھٹنے لگی تھی۔ اور ایک دن حریر انہیں کا جوس پیتے ہوئے گرینڈا سے بڑی رازداری کے عالم میں کہہ رہا تھا۔

”آپ کی پوتی بڑی ادا اس اور چپ رہتی ہے۔ جب ہم آئے تھے تو ایسا نہیں تھا۔ چار دن ستائیس گھنٹوں میں اسے کیا ہو گیا؟“ حریر ایسا ہی تھا۔ بظاہر من موہی اور لاپرواہ مگر حقیقت ہر چیز کا گہرائی سے مشاہدہ کرنے والا۔ حریر کے سوال نے فاتح کو بھی چونکا دیا تھا اور سودا سلف لے کر گھر کے اندر داخل ہوتے مدید کو بھی۔

”دن جو بیٹھ گئے ہیں۔ لڑکیاں پریشان تو ہوتی ہیں۔“ گرینڈا نے اپنے حساب سے وجہ بتائی تھی۔ حریر نے سمجھ کر سر ہلایا تھا۔ اور فاتح ”دن بیٹھنے“ کی تشریح میں الجھ گیا۔

رات کو حریر نے اس کے کمرے میں جھانکا تو فاتح نے پہلی مرتبہ از خود اندر آنے دعوت دی۔

”زبے نصیب۔“ حریر علاتا ”خوش ہوا۔ پھر چھلانگ لگا کر کاؤچ پہ بیٹھ گیا۔ اپنے کمرے میں وہ اس وقت بور ہی ہو رہا تھا۔ سوچا کہ مدید سے گپ شپ لگائے۔ مگر وہ پاکستان سے آنے والی کال میں مصروف تھا۔ اٹنی اٹنی حریر کے کانوں میں اتنی سی بات پڑی تھی۔

”بس آپ آنے کی کریں۔“ وہ اپنی ماں سے مخاطب تھا۔ حریر نے کن سونیاں لینے کا گناہ نہ کرتے ہوئے فاتح کا بھیجا لٹنے، مغز چاٹنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اور فاتح بھی شاید اسی کے انتظار میں تھا۔ پہلی مرتبہ

حریر کو، کچھ کر خیر مقدمی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔  
”تمہارا تجربہ گھر میں ہونے والی پراسرار تباہیوں لے مارے میں کیا کہتا ہے؟“ فاتح کے سوال نے اس کو چونکا دیا تھا۔

”تم رہنا گھامزہ کے گھامزہ۔ بھی مدید کی شادی طے کر دی گئی ہے۔ بلکہ پہلے سے طے شدہ تھی۔ اب کچھ بکلی ہوہ تمہیں ہرگز بھی نہیں بتانا چاہتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ تم اس کی شادی میں شرکت نہیں کرو گے۔“ حریر کے انکشاف نے فاتح کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھ گیا۔

”وہ الو مگر حال۔“ فاتح غصے میں کھول اٹھا تھا۔ ”کیا میں اب شرکت کروں گا؟“ اس نے ایک فیصلہ کیا اور اپنی چیزیں اٹھ کر سمیٹنے لگا۔

”تم اس طرح سے نہیں جاسکتے؟ سب کو سوالیہ نشان بنا کر؟ جس چیز سے تم بھاگ رہے ہو۔ وہ تمہاری تقدیر تھی۔ مدید کی خوشی پہ اپنا سایہ نہ ڈال کر تم اسے ”ملوس“ کی کالی راتوں سے بچا سکو گے؟ اگر مدید کی قسمت میں خوشی ہے تو اسے ضرور ملے گی۔ میں کہتا ہوں رک جاؤ فاتح!“ حریر نے بیگ میں کپڑے ٹھونس کر زپ بند کرتے فاتح کو اپنے وجود کی دیوار سے روک دیا تھا۔

”یہ اس کا وہم ہے اور کچھ نہیں۔“ مدید نجھانے کب شور کی آواز سن کر آگیا تھا۔ فلاح نے زخمی نظروں سے اسے دیکھا۔

”وہم نہیں حقیقت ہے اور تم سمجھتے نہیں۔“ فاتح نے کرب سے کہا تھا۔ ”تم جانتے ہو“ میں تمہاری شادی میں شرکت کیوں نہیں کرنا چاہتا۔“ فاتح تیزی سے باہر نکلتا چلا گیا۔ اس کے پیچھے مدید کی آوازیں اور حریر کی آہیں لپکتی رہیں۔

”تم کس بات سے گھبرائے ہو؟ کس چیز سے ڈرتے ہو؟ مدید کی ماں آکر تمہارے ماضی سے پردے کھینچ ڈالے گی۔ وہ تمہارے اذیت ناک ماضی کو ہم سب پہ عیاں کر دے گی؟“ حریر نے اپنی ماہرانہ صلاحیتوں کو بڑی غلط جگہ اور بڑے غلط وقت میں استعمال کیا تھا۔

فاتح چلتے چلتے رک گیا تھا۔ پھر اس نے خون آشام نگاہوں سے حریر کی طرف دیکھا تھا۔

”تم کس بات پہ منہ چھپاتے پھرتے ہو؟ تم نے کوئی گناہ نہیں کیا؟ پھر خاندان سے کیوں ڈرتے ہو؟ ڈرتا تو انہیں چاہیے جو گناہ گار تھے۔ جنہوں نے تمہارا گوشت نوچا۔“ وہ چلا یا تھا۔ فاتح کے آگے بڑھتے قدم پھرے رک گئے تھے۔ وہ پلٹ کر واپس آیا اور اس نے حریر کا گریبان پکڑ کر کھینچا تھا۔

نیرس پہ بھاتی ہوئی انیہ بھی ختم گئی۔ نیچے لان میں دو ہیولے تھے جو ختم کٹھا ایک دوسرے کو لاتیں، گھولنے مار رہے تھے۔

”تم بزدل! کیوں بھاگ آئے؟ اپنا انتقام تو پورا کر لیتے؟ جنہوں نے گھانا گھانگئے تھے انہیں اتنے ہی گھانا دیتے۔“ حریر اب بھی چلا رہا تھا۔

”ہاں میں بزدل تھا میں بزدل ہوں۔“ فاتح ہانپنے لگا۔ ”میں بزدل ہوں حریر! اسی لیے یہاں سے بھی جا رہا ہوں۔ مجھے یہ خوف نہیں کہ مدید کی تائی مجھے دیکھ کر اپنی اصلیت دکھائیں گی۔ مجھے یہ وہم لاحق ہے کہ میری وجہ سے مدید کی یہ پہلی اور آخری خوشی کہیں چھن نہ جائے۔“

اس کی کھلی آنکھیں نیرس پہ ہولے ہولے کپکپاتے ہوئے بے جم گئیں۔ حریر نے دکتے سر دکتے جسم اور لمبوں میں بھینکتے ہونٹوں پہ ہاتھ رکھ کر نیرس کی طرف دیکھا اور دھچک سے رہ گیا۔ وہاں انیہ کھڑی تھی۔ اور ہاتھ جوڑ کر فاتح سے رک جانے کی درخواست کر رہی تھی۔



”وہ ایسا کیوں ہے؟“ حریر نے بار بار مدید سے پوچھا تھا۔ اور مدید ہر دفعہ ٹال جاتا، نظر انداز کر جاتا۔ جیسے کچھ سنا ہی نہ ہو۔ پھر حریر کو فطرتاً ”کھون سی لگ گئی تھی۔ وہ مدید کا دوست تھا۔ حریر نے اسے اپنا دوست مان لیا۔ فلاح ماننا یا نہ ماننا۔ حریر خود کو اس کا گہرا دوست سمجھتا تھا۔

اسرار کھولنا گہرا میوں کو تپنا، کنوئوں میں اترنا عین انسانی فطرت ہے۔ پھر حریر جیسا تجسس بندہ۔ اس نے فاتح کو ایک پروجیکٹ سمجھ لیا تھا اور وہ اس پروجیکٹ پہ لگ گیا تھا۔

بیگ میں فاتح کو بہت قریب سے جانچا تھا اس نے حریر کو اندازہ ہوا کہ وہ زندگی کی رعنائیوں سے متغیر ضرور ہے۔ لیکن وہ ان کی حقیقتوں سے انکاری ہرگز نہیں۔ وہ جب الٹی سیدھی حرکتیں اور باتیں کرنا تو فاتح اخبار پڑھنے یا کوئی نظارہ کرتے پہلے کی طرح چیخ و نواب نہیں کھاتا تھا بلکہ دھیمے سے مسکراتا تھا۔

حریر نے مدید کی مگھتر کو تحفہ دینے کا پلان کیا، جان بوجھ کر سنار کی دکان میں گیا اور ایک تحفہ خرید کر واپس کر دیا۔ برصہلیٹ خرید کر واپس کرنے کی وجہ تھی۔

اور وہ وجہ حریر اب بتا رہا تھا۔ کیونکہ اس بات کا تعلق حریر کے ماضی سے تھا۔ اور ماضی کا کھولنا بڑا دشوار تھا۔

”مجھے لگا تھا۔ ہمیں انیہ کو برصہلیٹ نہیں دینا چاہیے تھا۔ کچھ اور دے دیتے۔ کپڑے، بوتے یا کچھ بھی۔ مگر اتنا مگنا برصہلیٹ نہیں۔“ وہ بہت دھیمی آواز میں کہہ رہا تھا۔ اور فاتح اول روز کی طرح ہی گم سم تھا۔ خاموش، چپ اور بس حریر کو سننا ہوا۔ اس کے وجود پہ ایک مرتبہ پھر فولادی خول چڑھ گیا تھا۔

”ہمیں انیہ کو کچھ ایسا دینا چاہیے تھا جو مدید کے دل پہ گئے تحفے کی مالیت سے کم نہ ہوتا۔“ وہ سوچی آنکھوں کو دبا تا بہت دور کسی پرانی یاد سے دامن چھڑا رہا تھا۔

”تمہیں ایسے سمجھ میں نہیں آئے گا۔ اس کے لیے مجھے اپنے ماضی کو بے پردہ کرنا پڑے گا اور یہ مشکل کام ہے، مگر ناممکن نہیں۔“ حریر کی اسودی آنکھوں میں غم کے شگے سائے پھیل رہے تھے۔

”ہر عورت کا مزاج مختلف ہوتا ہے۔ ہر عورت لمبی چیزوں کی دیوانی بھی نہیں ہوتی۔ میں صرف ان چند عورتوں کی بات کر رہا ہوں جو مجھے بہت سے تجربات کی بھی میں جھونک کر تجزیہ نگار بنا گئیں۔“

ان میں ایک میری ماں تھی۔ ہیروں اور موتیوں پہ  
نثار ہونے والی اور میرا باپ اسے ایران کے ایک  
طائفے سے چھڑا کر لایا تھا۔ اس عورت کے قدموں  
تले نعمتوں کے انبار تھے مگر وہ پھر بھی ناشکری نکل۔  
ہیروں کی چمک نے اسے اندھا کر دیا تھا اور وہ اپنے دو  
بچوں کو دھنکار کر فرانس کے ایک انگریز کی محبت میں  
جتلا ہو گئی۔ اس انگریز کی ذاتی ہیروں کی کان تھی۔ اس  
نے نہ اپنا وقار دیکھا نہ میرے عزت دار باپ کی  
محبت کو، کیوں کہ وہ انگریز میرے باپ سے بڑھ کر امیر  
تھا۔ اگر میرا باپ میری ماں کو ایک لاکھ کا ہیرا خرید کے  
دیتا تو وہ ایک کروڑ پچاس لاکھ کا ہیرا تحفہً پیش  
کردیتا۔ مادیت پرستی کی اس آگ نے میری ماں کو  
جھلسا کر رکھ کر دیا۔ جب وہ میرے سامنے آئی تو ایک  
مظلوم عورت تھی۔ انتہائی غرور میں ریگ ریگ کر  
جینے والی۔ جس کا وہ سراشور اسے طلاق دے چکا تھا۔  
مجھے ماں کی حالت زار پہ ترس آیا اور میں نے  
اپنے باپ کے سامنے ایک ناجائز مطالبہ رکھا۔ جسے  
اس نے ماننے سے انکار کر دیا تھا جس کی ہمارے گھر میں  
سب سے زیادہ چلتی تھی یعنی میری بہن۔ اور پھر  
ہماری لڑائی ہو گئی۔ اس نے مجھے گھر سے نکالا اور میں  
نکل آیا۔ اب حالت یہ ہے کہ نہ وہ مجھے بلا رہی ہے  
واپس نہ میں جا رہا ہوں واپس۔ اس دن سے قریب قریب  
گھوم رہا ہوں۔ خیریات کمال سے کمال نکل گئی۔  
بات ہو رہی تھی انہی کی۔  
وہ اپنے ماضی کو پکٹا ایک مرتبہ پھر انہی تک لوٹ آیا  
تھا۔

”میں یہ نہیں کہتا کہ انہی کی نیت میری ماں کی نیت  
سے مشابہ یا انہی ہیروں کے معاملے میں حریف ہے۔  
وہ اسے ایک عام انداز میں دیا جانے والا تحفہ تھا۔ اس  
میں غیر معمولی کچھ بھی نہیں تھا پھر بھی مجھے کسی بات  
نے چونکا دیا۔ انہی کا کھونا۔ کھوکھو کے کسی کے تصور  
میں ڈوب جانا۔ نامعلوم سا اضطراب اور نامعلوم سی  
بے چینی۔ میں اپنے اندازوں کو غلط سمت میں لے  
جا کر اپنی نظر سے گرنے نہیں چاہتا تھا، لیکن میرا شک

غلط نہیں تھا۔“

حریر کو بھر کے لیے خاموش ہوا تو فلاح اپنی کنپٹی کو  
مسلا کھڑکی میں جاکر اہوا کھڑکی کے سامنے ہول بلی  
کھڑا تھا۔ ایک انڈین ریڈیو نرٹ۔ جس کی شہرت  
پورے ہیک میں پھیلی تھی۔ یہ بہت مزگا ہول تھا مگر  
مجبوری یہ تھی کہ امیر جی میں ہی مل سکا۔ جس حال  
میں وہ یہاں آیا تھا اس ہول کا مل جانا بھی غنیمت  
تھا۔ ہول بلی اپنے نام کی طرح جی آدھا تیر آدھا تیر  
تھا۔ اپنی آرائش اور کھانے سمیت۔  
”اور شک میرا بھی غلط نہیں تھا، لیکن صد شکر کہ  
کوئی بڑا نقصان نہیں ہوا اور میں وقت سے پہلے وہ جگہ  
چھوڑ آیا۔“ فلاح کو انہی کی بھی نگاہوں کا خیال آتا تو  
جسم میں ایک پھیری دوڑ جاتی تھی۔

”اب تمہیں میرے ساتھ جانا ہے نکاح کی رسم  
میں شمولیت کے لیے۔ میں تمہیں ساتھ لے کر ہی  
جاؤں گا۔“ حریر نے ضدی لبے میں کہا تھا۔ فلاح گہرا  
سانس بھر کے رہ گیا۔ خدا کا شکر تھا کہ وہ مدید کی نظموں  
سے گرے بغیر یہ حفاظت وہاں سے نکل آیا اور اب  
اس کا دوبارہ ہیک جانے کا ارادہ نہیں تھا مگر حریر کی  
ضد؟

”تمہیں مدید کا ضرور خیال کرنا چاہیے۔ تمہارا پکا  
عاشق صادق ہے، نکاح مانے پہ دستخط نہیں کرے گا۔  
جب تک تمہارے درشن نہ ہوئے۔“ حریر اس کے  
برابر اکھڑا ہوا تھا پھر اس کے کندھے پر سر رکھ کے دلا رہا  
تھا۔

”چل نا تیرے بغیر میرا دل نہیں لگتا۔“  
”حریر! فلاح نے لجاجت سے کہا تھا اور حریر چیخ  
اٹھا تھا۔

”حریر نہیں۔ حریر سچ کے فتح یعنی زہر کے  
ساتھ نہیں سچ کے ضمہ یعنی پیش کے ساتھ۔ میں حریر  
ہوں۔ حریر تو ریشم ہوتا ہے۔“ وہ چیخنے لگا تھا۔ اپنے نام  
کے معاملے میں وہ ایسے ہی جذباتی تھا۔  
فلاح اس کے چیخنے پہ بدگ اٹھا۔ ”میرے لیے تو تم  
نرم و ملائم سے ریشم کی طرح ہو۔ یا ٹھنڈی پھواری

طرح ہو۔ اترو تو مجھم کرو۔“ وہ دھیسے سے آنکھیں بند  
کے ایک جذب کے ساتھ بولا تھا۔ حریر دھپ سے بستر  
پر گر اور پٹ سے بے ہوش ہو گیا۔  
وہ ایسی دل داری اور عزت کی توقع ہرگز نہیں کرتا  
تھا۔ اسے تو فلاح سے لالوں، مکوں اور گھونٹوں کی توقع  
رہتی تھی۔ کب وہ کوئی ایسی بات چھیڑے جس سے فلاح  
آپے سے باہر ہوتا دکھائی دے اور پھر کے لالیں  
گھونٹے شروع۔ اور اس کے بعد فلاح کی بھی بھیجی  
سی آواز سنائی دی۔

”میں تمہارے کہنے پہ چلا تو جاؤں گا، لیکن اتنا یاد  
رکھنا۔ میری وحشت دور سے نظر آجاتی ہے اور  
سدا ب کرنے کا موقع مل جاتا ہے، مگر انسان کی  
وحشت دکھائی نہیں دیتی اور سدا ب کا موقع بھی نہیں  
ملتا۔“

\*\*\*

ہیک کا چاند آج پوری آب و تاب سے مسکرا رہا  
تھا۔ اور یہ چاندنی میں نہائی ہوئی ایک رات تھی۔  
ستارے آج بھر مٹ کی شکل میں نکلے تھے اور  
مسکرا رہے تھے۔ گیسٹ روم میں آئینے کے سامنے  
کھڑا مدید ہر پچھلے دن سے زیادہ پیارا اور منفرد لگ رہا  
تھا۔ اس کی امی مدیجہ نے اسے بے ساختہ گلے سے لگا  
کر جو ملایا تھا۔

”میرا بیٹا بہت ہمارا لگ رہا ہے۔“  
”مگر آپ کی بھانجی سے کم۔“ اس نے اپنے عکس  
کو دیکھ کر اطمینان محسوس کیا اور آئینے کے سامنے سے  
ہٹ گیا تھا۔ وہ انہی کو چشم تصور سے دیکھتا مسکرا رہا تھا۔  
نیچے ایک چھوٹی سی محفل کا اہتمام تھا۔ ان کی شادی کی  
رسم ادا ہوئی تھی۔

”معا“ اس کی ماں باہر گئی تھی اور پھر لائے قدموں  
واپس آ گئی۔ ان کے چہرے پہ ہراس اور مردنی سی چھا  
رہی تھی۔ مدید قدرے پریشان ہوا۔  
”تم نے فلاح کو بھی بلا رکھا ہے۔ میرے منع کرنے  
کے باوجود۔“

مدیجہ تلی کا غصہ ناراضی اور برہمی۔ باہر مدیجہ  
چاپ سے آنا فلاح ٹھک کر کر گیا تھا۔  
”میرا دوست ہے امی اور کرن بھی۔ اس کے بغیر  
میری شادی کا فنکشن ناممکن رہتا۔“ مدید کے لبے  
میں فلاح کی دوستی اور محبت کا احساس سرچڑھ کے بول  
رہا تھا۔

”تم نے اس کا ساتھ نہیں چھوڑا۔ بڑا شخص ہے وہ  
بلکہ اس کا پورا خاندان۔ جو بھی ان کے خاندان میں  
شامل ہوا، برباد ہو گیا۔“ مدیجہ نفرت کی انتہا پہ کھڑی  
تھی۔ مدید نے شدت ضبط سے آنکھیں موند لیں۔  
”گند اور منحوس خون۔ جس کو لگا چاٹ گیا۔“

”بس کروں امی۔“ اس کی آواز پھٹ پڑی  
تھی۔ ”آپ کے بیٹے کی رگوں میں اس کا گند خون ہی  
دوڑ رہا ہے جب اسے لی فیکٹو سارے زمانے کی  
خاک چھاننے کے بعد بھی نہیں مل رہا تھا۔ تب یہی  
منحوس خون مجھے بچانے کے لیے آیا تھا۔“

باہر کھڑا فلاح شدت ضبط کے سارے گُر آزمانا  
لاٹے قدموں مگر ایسا اس حال میں کہ سرخ گلابوں کی  
ملا گیسٹ روم کی دیوہیز پر رکھی تھی اور رکھ کے جانے  
والا اور دور تک کہیں نہیں تھا۔

مدید اپنے کمرے سے نکلا اور ٹھک کر کر گیا۔  
اس کے پیروں کو سرخ گلاب چھو رہے تھے۔ جو تازہ  
تھے۔ مک رہے تھے اور جن کی پتیوں پہ تازہ گری  
ہوئی اوس چونکا تھی۔ یہ فلاح کی آنکھ سے نکلنے والے  
آنسو تھے جو گلاب کی پتیوں کے اوپر جم چکے رہے تھے  
اور مدید کو رو دینے پہ مجبور کر رہے تھے۔

\*\*\*

ہیک کے آسمان پہ باؤسی چھائی تھی۔ رات دہیز اور  
بھید بھری تھی۔ کان پڑی آواز بھی سنائی نہ دیتی تھی۔  
ہال میں مبارک سلامت کا شور تھا۔ نکاح کے بعد والا  
خصوص منظر۔ مدید کا دل بو جھل تھا۔  
حریر اسے کچھ دیر کے لیے دکھائی دیا تھا پھر نکاح کے  
بعد وہ بھی چلا گیا۔

مدید اس کے کچھ بغیر بتائے بھی جانتا تھا کہ فاتح کہاں اور کیوں چلا گیا تھا؟  
اس نے یقیناً ماں کی باتیں سن لی تھیں۔ اپنے آنے کی اطلاع ”گلابوں کی مالا“ میں پوکروہ چپکے سے لوٹ گیا تھا۔

نکاح کے بعد امی نے بے ساختہ اسے گلہ لگایا۔  
”خدا کا شکر ہے۔ وہ چلا گیا اور معاملہ بخیر و خوبی نمٹا۔“ مدید نے دکھ کا گہرا احساس اپنی خاموشی تلے دبایا تھا۔ امی سے کچھ کہنا سننا بے کار جو تھا۔

اور ہال کی چھت سے دور گیٹ روزمر کی رابرداری میں چلتا فاتح نکاح تک وہیں رہا۔ وہ ہال میں نہیں تھا مگر مدید کے نکاح میں باہر کھڑا کر بھی شمولیت کرنا رہا اور اپنا وعدہ پورا کرتا رہا۔

مبارک یاد کے شور نے اس کے قدموں میں۔  
بے چینی بھری تھی۔

وہ تیزی سے رانڈاری میں کھلتا دروازہ نیم وا کرتے ہوئے ٹیرس پہ آیا۔ وہاں گلابوں کا ایک گل دستہ رکھا تھا۔ مدید کے نکاح میں آنے سے پہلے فاتح نے ایک پھولوں کی دکان سے پھولوں کا ہار اور یہ گل دستہ آرڈر پہ بنوایا تھا۔

پھولوں کا ہار وہ گیٹ روم کے دروازے پہ چھوڑ آیا تھا اور گلابوں کا گل دستہ اس نے اٹھالیا تھا۔ یہ گل دستہ وہ انیہ کے لیے لایا تھا اور اسے دیے بغیر ساتھ لے جا رہا تھا۔

پھر جیسے ہی اس نے ٹیرس سے اترنے کے لیے بیڑھی پہ قدم رکھا۔ اچانک دروازہ کھلا تھا اور کوئی زرتار آچل لہراتا، اسے مجسم بتاتا، سامنے آکھڑا ہوا۔ فاتح دم بخودہ گیا اور سامنے والی مغرور۔

”بغیر مبارک یاد دیے جارہے ہو؟ کیا ہمارے نصیب میں تمہاری نیک تمنا میں بھی نہیں۔“ وہ اس کے سامنے کھڑی حسرت بھرے لہجے میں کہہ رہی تھی۔

”میں اور اک رکھتی ہوں کہ چاند کی تمنا نہیں کرتے۔ اس کا حصول ممکن نہیں۔ لیکن لوگ انزل

چاند لہ لہکتے اور سراپتے آتے ہیں۔“ وہ اس کے سر پر آتش افشاں چھا رہی تھی۔ فاتح کو لگا کہ وہ ایک منٹ بھی یہاں رکنا تو ہوا جائے گا۔

”نی زندگی کے اس موڑ پہ تمہیں اپنے لیے آسانی کی دعا کرنی چاہیے۔“ اس نے رکھائی سے کہا۔

وہ اسے حسرت بھری نگاہوں سے دیکھتی رہی۔ اس حال میں کہ اس کا اندم کی پالی جیسا سہرا روپ زرتار آچل سے چٹک رہا تھا اور اس کی کلائی میں ہیروں کا برسلسٹ دکھاتا تھا۔

”میں تو صرف تمہیں اتنا بتانا چاہتی ہوں کہ تم بہت پیارے انسان ہو۔ چاند کی مانند ملدو، اونچے اور نیچے سے دو۔“ اس کی آواز میں ہیک کے ٹھنڈے چشموں کی مٹھاس بھر گئی تھی۔

”کیا تم کچھ نہیں کہو گے؟“ انیہ اسے بولنے پہ اکسانا چاہتی تھی۔ وہ لب بلیچ کر خاموش تھا اور نفی میں سر ہلا رہا تھا۔

”میں تمہیں نئی زندگی کی مبارک باد دوں گا۔ تم میرے دوست کی زندگی کو اپنے خوب صورت وجود سے ہمیشہ آباد رکھو اور یاد رکھو کہ اونچے چاند کی بس اتنی سی حقیقت ہے کہ وہ اکیلا بھی ہے اور پیاسا بھی اور رشتوں کا مارا ہوا بھی۔“

فاتح کی آواز کسی کنویں سے برآمد ہوئی تھی۔ پھر وہ تیز قدموں سے پلٹا اور اندھیروں میں گم ہو گیا۔ انیہ نم آنکھوں سے اسے جاتا دیکھتی رہی اور ہاتھ ہلا کر اللہ حافظ کرتی رہی۔

معا“ اس نے پلٹ کر دیکھا اور دم بخودہ گئی تھی۔ اس کے پیچھے مدید کھڑا تھا۔ اس کا منگیت نہیں، اس کا شوہر کھڑا تھا۔ انیہ کا سانس اس کے زرتار آچل کے سائے تلے دب گیا اس کا دل اچھل کر حلق میں آگیا۔

\*\*\*  
رات ”شرانگیز“ تھی اور گنہ گار تھی۔

دور ہیک کے کھیتوں کی سمت ایک بھولا بھلا گاتا تھا اور پیچھے مڑ کر دیکھنے کی خواہش نہیں رکھتا تھا۔ ٹیرس پہ

لگے بلب کی روشنی میں زرتار آچل کے تاروں سے شاعیں پھولی تھیں۔ اور مدید کی غصہ اگلتی آنکھوں میں شعلے بھرنے لگے تھے۔

”وہ نیچے ہال میں نہیں تھا۔ وہ یہاں تھا۔ تمہارے پاس اور میں پانکھوں کی طرح اسے نیچے ڈھونڈتا رہا۔“ مدید کسی زخمی درد سے کی طرح غرا رہا تھا۔ اور اس کی غرائیں انیہ کی جان لرزاتی تھیں۔

انیہ ریٹک سے چٹنی مدید کو دیکھ رہی تھی۔ لگتا تھا جیسے وہ کسی کالوپینا چاہتا ہوں۔ ”میری پشت میں خنجر مار کے میرے یار نے اچھا نہیں کیا۔“ وہ دیکھتے ہی دیکھتے رونے لگا بے تحاشا رونے لگا۔

”وفاؤ! تو تو بڑے اتفاقی علم کا ہر تھا۔ کیا تجھے خبر نہیں پنجپی؟ منوعہ علاقوں پہ اپنی تلخ کے جھنڈے نہیں گاڑتے۔“ مدید سر پکڑ کے چیخا رہا۔ وہ کیا سمجھ رہا تھا؟ وہ کتنا غلط سمجھ رہا تھا؟

انیہ سسختیوں پہ ہاتھ رکھے سانس روک کے گھٹ گھٹ کر رو رہی تھی۔

”میں تمہیں مجنم سمجھتا رہا۔ اور تو انگارہ تھی۔ جس نے مجھے جلا کر رکھ کر دیا۔“ اس نے اپنا سر دیوار سے ٹچا تھا۔ انیہ اسے روکنا چاہتی تھی مگر روک بھی نہ سکی۔ کچھ کہہ بھی نہ سکی۔

پھر اس کی نگاہ انیہ کی سڈول کلائی میں چمکتے ہیروں پر پڑی۔ اس کے اندر آگ لگ گئی تھی۔

”ان ہیروں کی چمک نے تمہیں اندھا کر دیا۔“ وہ کسی زخمی درد سے کی طرح پھٹکا رہا تھا۔ انیہ کے اندر کوئی چیز تیزی کے ساتھ ٹوٹی تھی۔

”اب تم میرے ساتھ زیادتی کرتے جا رہے ہو مدید!“ وہ کھٹی آواز میں چیختی تھی۔

”تمہیں چاند کی تمنا تھی؟ کیا مل گیا چاند!“ مدید پوری شدت سے چلا رہا تھا۔

”میں نے چاند کی ”تمنا“ کب کی؟ میں نے تو چاند کو سرائے کی غلطی کی۔“ انیہ نے شوریدہ لہروں کی بے انت طغیانی میں ڈوب ڈوب کر ابھرتے ہوئے کہا تھا۔ ”تم نے مجھے دھوکا دیا۔“ وہ اپنا سر اب بھی دیوار

سے ٹخ رہا تھا۔ انیہ ریٹک سے ہٹ کر مدید کے قریب آئی تو ریٹک کی بک میں اس کا زرتار آچل اٹک کر پھٹ گیا۔

”میں نے کوئی گناہ نہیں کیا۔ کسی کو سراہنا گناہ نہیں۔“ وہ اس کے قدموں میں بیٹھ گئی تھی۔ پھر اس کے پیروں پہ اپنے تھالی ہاتھ رکھ دیے۔

”تم نے میرا اعتبار توڑا۔“ وہ ابھی تک کرا رہا تھا۔ پھر اس نے ایک نفرت بھری نگاہ اس کی کلائی پہ ڈالی تھی۔ ان ہیروں کی قیمت مدید کے بے لوث جذبوں سے زیادہ تھی۔ وہ آنکھوں میں اتاری دھند کو سمیٹتا ٹھنکے لگا۔

”تمہاری سوچ گرد آلود ہے۔“ انیہ اسے جاتا دیکھ کر پیچھے لپکی تھی۔ وہ اسے روک رہی تھی۔ اس کے پیچھے بھاگ رہی تھی۔

وہ اس کے آنسوؤں سے بے نیاز گری اور بھید بھری رات میں گم ہو کر کسی گناہم رستے کا مسافر بن گیا تھا۔

انیہ اس کے ہولے کو ڈھونڈتی منہ کے بل زمین پہ گری۔ اس کا ہونٹ پھٹ گیا اور چہرہ غبار آلود ہو گیا تھا۔ اس کی کلائی زمین پہ گرے پتھر سے ٹکرائی تو بریلیٹ کا بک نکل گیا۔ انیہ نے کھلے بریلیٹ کو نوچ کر اتارا اور نیوٹاپ کے کھیتوں کے بیچ میں سے گزرتی ندی کے حوالے کر دیا۔

”یہ ہمیرے تمہارے جذبوں سے زیادہ قیمتی نہ تھے۔“ وہ بُرا شوب رات میں کسی بیوہ کے سناگ کی مانند ٹی پی ہال کی طرف آ رہی تھی اس حال میں مدید تائی نے اسے دیکھا اور اپنا سر سویت لیا تھا۔

”میں ناکستی تھی۔ وہ اپنی بد بختی ہمیں سوغات کی طرح دے کے جانے لگا۔“ نیوٹاپ کے پھولوں پہ تاریکی کسی ناگن کی طرح چھن گاڑنے بیٹھی تھی۔

نیوٹاپ کے کھیتوں سے ایک بل کھائی ندی گزر رہی تھی۔

”مدید نے مجھے بد نیت سمجھا۔ مجھے خان سمجھا۔“ اس نے مدید سے کہا۔

”وہ میرا دوست تھا۔ مجھے اتنا گرا ہوا کیسے سمجھ سکتا تھا؟“ وہ کنکروں کی ڈھیری پر بیٹھ گیا۔  
 ”میں سب کچھ ہو سکتا ہوں عمریدانت نہیں۔“  
 حریر بغیر دیکھے بھی جانتا تھا۔ فالخ کی آواز آنسوؤں میں ڈوبتی اور ابھرتی تھی۔  
 ”اور تم کہتے تھے۔ میں اس کی شادی میں کیوں نہیں آتا۔ میں ان وحشتوں سے ڈرتا تھا۔“ وہ اونچی آواز میں رونے لگا۔  
 ”یہ سب ہوتا تھا۔ کسی بھی صورت میں۔ تم یہاں آتے یا نہ آتے۔ مدید بدگمان تھا۔ اور اس کی ماں اسے مزید بدگمان کرنے میں پیش پیش تھی۔“ بالآخر حریر نے کہہ دیا تھا۔ حریر چند بل کے لیے تھوڑی دیر پہلے گزر جانے والے لمحوں میں ڈوب گیا تھا۔  
 چند لمحے پہلے جب مبارک بار کا شور اٹھا اور چھوڑے بیٹھے رہے۔ پھر مشروبات سے مہمانوں کی تواضع جاری تھی تب حریر اپنا گلاس اٹھا کر کونے میں چلا گیا۔

مدید کی بے چین نگاہیں بار بار دروازے کی طرف اٹھ رہی تھیں۔ مدید اپنا قیمتی روپے سیٹھاتی مدید کے پاس بیٹھ گئی۔ اب وہ مکمل طور پر بیٹے کی برین واشنگ کر رہی تھیں۔  
 ”مدید! اب تم بڑے ہو جاؤ۔ فالخ کی انگلی پکڑ کر چلنا چھوڑ دو۔ قسمت نے تم پر ایسی مہمانی کی۔ تمام عمر فالخ کے نمبر چورنگی کے تین مرلہ گھر میں سک سک کر گزار دیتے۔ نوکری بھی نہیں۔ ہنر ہاتھ میں نہ تھا۔ زندگی نے تمہیں ایک موقع دیا ہے۔ اسے ضائع مت کرو۔“  
 ”میں اس موقع کو کس طرح ضائع کر رہا ہوں۔ وضاحت کریں گی آپ؟“ وہاں سے خفا تھا۔  
 ”میں تمہیں سمجھاتی ہوں۔ اپنی آنکھیں کھولو۔ اور فالخ سے آج کے بعد دور رہو۔ ہماری انہی خوب صورت بھی ہے اور نا سمجھ بھی۔ ایسے ”سوداہوں“ کے پیچھے لڑائیں اکثر پاگل ہو جاتی ہیں۔ تم انہی کو اس سے دور رکھو۔ تمہیں فالخ کی نظر مدید۔“ مدید کے اگلے الفاظ منہ میں ہی رہ گئے تھے۔ مدید غصے سے چیخ پڑا۔

”بس کر دیں امی! وہ اسی لیے یہاں آتا ہی نہیں تھا۔ آپ کی ان ہی باتوں کو سن کر وہ چلا گیا۔“ مدید رو دینے کو تھا۔  
 ”کہاں چلا گیا؟ ہمیں ہے وہ۔“ مدید چمک کر تیز لمبے میں بولی تھیں۔ مدید کے ساتھ ساتھ حریر بھی چونک گیا تھا۔  
 ”میں نے اسے ٹیرس کی طرف جاتے دیکھا ہے۔ ہاتھ میں گلاب تھے۔“ مدید نے ان پر ہم گرایا تھا۔ حریر کے ساتھ ساتھ مدید بھی چونک اٹھا۔  
 پھر مدید دلہن کو لینے اور چلا گیا۔  
 وہ انہی کے کمرے میں آیا۔ یہاں سے فوٹو گرافی کے بعد انہوں نے ایک ساتھ ہال میں جانا تھا۔ مگر انہی کمرے میں نہیں تھی۔ انہی کہاں تھی؟ اسے ٹیرس پر آوازوں کی سمجھنا ٹھٹھوس ہوئی تھی۔ وہ ٹیرس کے دروازے تک آیا تھا۔ لیکن اسے انہی کی غم آلود آواز نے روک لیا تھا۔  
 ”میں اور اک رکھتی ہوں کہ چاند کی تمنا نہیں کرتے۔ اور اس مقام پر تو پاگل نہیں کرتے۔ چاند بلندی پر ہے۔ اس کا حصول ممکن نہیں۔ لیکن لوگ ازل سے چاند کو دیکھتے اور سراپے آئے ہیں۔ اگر چاند کو دیکھنا جرم ہے۔ اگر چاند کو سراہنا ایک گناہ ہے تو میں ”گناہ گار“ ہونا چاہتی ہوں۔“  
 انہی کی ہیکلی آواز نہیں تھی۔ وہ کوئی تیز جھینے تھے۔ جو اندر کھڑے مدید کو جھلسا گئے تھے۔  
 مدید سے مزید کچھ سننا نہیں گیا تھا۔ اس کے سر پر آتش فشاں پھٹا تھا اور وہ اندھا دھند انہی کے سر پر پھٹ گیا۔  
 اور اس وقت حریر اسے اس صدما کی کیفیت سے نکالنا چاہ رہا تھا۔  
 رات سب خرابی سے آگے بڑھ رہی تھی۔ حریر کو فالخ کی آواز سوچوں کے تھوڑے سمجھنے لگائی تھی۔  
 ”مدید نے سوچا بھی کیسے؟ میں اس کی بیوی پر بری نظر رکھوں گا؟ میں کیا اپنے بھائی جیسا مردار خور ہوں۔“

میں کوئی ”گدھ“ ہوں؟“ وہ سک رہا تھا۔  
 ”اور وہ مجھے جانتا تھا۔ میرا خون اس کی رگوں میں دوڑتا ہے۔“ اس نے میرے لیے براگمان کیا تو کیوں کیا؟“ فالخ نے سارے ٹکڑے ایک ساتھ ندی میں اچھال دیے تھے۔ ندی میں بھنور بننے اور بگڑنے رہے۔  
 ”معا“ ندی کے پانی پر سکوت طاری ہو گیا۔  
 ”مسنو“ حریر! فالخ نے اپنا بھی چہرہ آستین سے پوچھ کر اپنا رخ حریر کی طرف کیا تھا۔  
 ”میں چاہتا تو دنیا کی ساری خوب صورت عورتوں سے عنایت کی بے وفائی کا انتقام لے لیتا۔ لیکن میں نے ایسا نہیں کیا۔ پتا ہے کیوں؟ اس لیے کہ میرے اندر ”حیوانیت“ نہیں۔ میرے اندر ”انسانیت“ موجود ہے۔ اور عورت کا تقدس بھی۔“ فالخ نے تھک ہاکر اپنا سر حریر کے کندھے پر گرادیا تھا۔ اور حریر ایسے سادگت تھا۔ جیسے ندی کا پانی۔ ایسے منجمد تھا جیسے برف۔ وہ اس پر اتنی آسانی سے کھل جانے لگا؟ یہ حریر کے گمان میں ہی نہیں تھا۔  
 وہ دونوں اپنی اپنی سوچوں میں غم ندی کے پانی کو دیکھتے رہے۔ وہ پانی جس کی شفاف سطح پر کوئی ہیرا دمکتا تھا۔ وہ دونوں چونک گئے تھے اور پھر ان ہیروں کی دمک سے بے نیاز ہو گئے۔  
 وہ سست رنگوں میں چمکتا قیمتی بریلیٹ ان کے قریب سے گزرتا پانی میں تیرتا آگے بڑھ گیا تھا۔



ظہران میں موسم ہل گیا تھا۔  
 ریگستانی علاقوں میں ایسی بارش برسی جو بیس سالوں میں نہ برسی تھی۔ موسم انتہا کا خوش گوار تھا۔ ٹھنڈی ہو ا چلتی تھی۔ جو رگ و جاہ کو مکا دیتی۔  
 افسون حرم کے بونے قد والے پام ہلکی ہوا کے دوش پر لہراتے تھے اور پتہ قد والی بھجوری بھاڑی کے پاس غم قیافہ کے ماہر بزرگ کالب بھی ٹھکانہ دینی تھا۔  
 وہ جو قیافے لگا تھا اور نا امیدوں کی آنکھوں میں

روشنیاں بھردیتا تھا۔ اس بزرگ نے مایوسی سے سر پٹختی روٹی چلائی افسون کو امید دلائی تھی۔  
 ”اسے کچھ نہیں ہوگا۔ وہ ایسے بہت سے ”جادوؤں“ سے گزر چکا ہے۔“  
 لیکن اس کے دل کو سکون نہیں آتا تھا۔ افرایم کو جو انجانا کائنات ہوا تھا۔ یہ ملک بھی ہو سکتا تھا۔ جان لیوا بھی۔ اس کے دل کی تباہ حالی کا کاشی کو پتا چلا تو وہ بھی دوڑا دوڑا ظہران پہنچ گیا۔ ”بھائی! لوگو“ میں تو اس کی جان تھی اور وہ دیواروں سے ٹکریں مارتی افسون کو اپنے انداز میں تسلی دیتا تھا۔  
 ”بھائی! کچھ نہیں ہوگا بھائی! ابھی تو اس کی شادی ہوئی ہے اور مجھے اس کے بچوں کا چاچا بننا ہے۔ بھائی! کو اللہ کی خیر ہے۔ اور آپ کی دعا۔ اللہ اسے آپ کے دل سے نکال نہیں سکتا۔ نہ آپ کی زندگی سے۔“ اور یہ کاشی کا یلین تھا جو افرایم نے موت کو شکست دے دی تھی۔  
 اور اس وقت ظہران کے ”دارالشفاء“ میں ایک روشن کمرے میں افرایم بستر پر لیٹا تھا اور اس کے قریب ”افسون حرم“ بیٹھی تھی۔ یا افسون جاں بیٹھی تھی یا افسون دل بیٹھی تھی۔ وہ افسون تھی سحر کرنے والی جادو میں جکڑنے والی۔  
 وہ افرایم کے لیے نازہ پھلوں کا رس نکال رہی تھی۔  
 اس نے خود ہی اپنی آواز سے اس خاموش فضا کا سحر توڑ دالا۔  
 ”مجھے آج پتا چلا ہے۔ محبت ایسی بھی ہوتی ہے؟ محبوب کو دل کا ٹکڑا ہوا ہے اور محبوبہ اونچی آواز میں روٹی، خوف سے کپٹتی اندھا دھند بھاگ رہی ہیں تاکہ اسے محبوب کو آنکھوں کے سامنے مرنا نہ دیکھ سکیں۔ یہ نہیں کہ محبوب کو بچانے کا کوئی سدباب کریں۔ کسی اسپتال میں لے کر جائیں۔“ وہ چپکٹی آنکھوں سے افسون کے چہرے پر پھیلتی خفت کو دیکھتا مسکرا رہا تھا۔  
 افسون نے جلتی نظروں سے اسے دیکھا اور خفگی



سے بولی۔

”ہاں تو نہیں دیکھ سکتی تھی مرتے ہوئے۔“  
”اور اگر وہ ”خطا کا پتلا“ نہ ہوتا تو میرا کیا بنتا  
افسون؟“ افرایم نے آنکھوں میں شرارت بھر کے  
اسے چھیڑا تھا۔

”تم میرے حصے کی خوشی تھے تمہیں کچھ بھی نہ  
ہوتا۔“ وہ سکون قلب کی لہر لہر کو اپنے من میں اترتا  
محسوس کرتے ہوئے دل فریبی سے بولی بھی اور پھر  
اپنے ذرا سہو کے لیے ”خطا کے پتلے“ کا لقب سن کر  
مسکراتے لگی تھی۔

”تم ہمیشہ بہت خوب — بولتی ہو۔“ افرایم  
نے دل کی پوری سچائی کے ساتھ کہا تھا۔

”ہاں“ میں اور میرا بھائی۔ ہم دونوں ”سحر بیان“  
مشہور ہیں۔ میرے لیے ایک اور خوش خبری بھی ہے۔  
وہ میرا گدھانما بھائی لوٹ آیا ہے۔“ افسون کی آنکھوں  
میں چمک برہ گئی تھی۔ پھر اس نے افرایم کو تکیہ کا  
سہارا دے کر بیٹھا دیا تھا۔ اب وہ اسے گھونٹ گھونٹ  
جوس پلا رہی تھی۔

”مبارک ہو۔ تمہارا خاندان مکمل ہو گیا۔“ افرایم  
نے پورے دل کے ساتھ کہا تھا۔

”خاندان تو تمہارے ساتھ مکمل ہو گا۔ ابھی تم اس  
میں نہیں ہو تو سب ادھورا ہے۔“ اس نے کتنی محبت  
اور سکون کے ساتھ افرایم کے ساتھ ایک اٹوٹ  
بندھن میں بندھنے کی خواہش کا اظہار کر دیا تھا۔  
افرایم کے چہرے کا رنگ بدل گیا تھا۔ وہاں پہ سرخی  
چھانے لگی تھی اور لال قداس کی آنکھوں میں جم رہا  
تھا۔

”تم سب کچھ جان کر بھی۔؟“ افرایم کے نیلے  
ہونٹ پھر پھڑک رہے تھے۔

”ہاں جان کر بھی۔ میں نے تمہارا دیا ہوا مسودہ  
پڑھ لیا ہے۔“ افسون کے اطمینان میں کوئی فرق نہیں  
آیا تھا۔

وہ اسے حیرت سے دیکھتا رہا۔

”تمہیں مجھ سے نفرت نہیں ہوئی؟“ وہ دھڑکتے

دل لے ساتھ پوچھ رہا تھا اور اگر افسون کہہ دیتی  
”ہاں۔۔۔ تو پھر۔؟“

”نہیں۔“ اس کا سکون قائم تھا۔ ”کیونکہ محبت اور  
نفرت ایک جگہ پہ نہیں رہ سکتے۔ مجھے تم سے محبت ہے  
تو نفرت کہاں سے ہوئی؟“ افرایم کے اندر سکون  
اترنے لگا تھا۔ پھر اس نے آنکھیں موند لیں اور بس اتنا  
کہا۔

”میں نے اپنا رانا نمبر آن کر لیا ہے افسون! اور اسی  
نمبر سے پاکستان کال بھی کی ہے۔ میں نے وہ طوطے گلے  
سے اتار دیا۔ جو میرے گلے کا جان لیوا پھندا تھا۔“ وہ  
دھیمی بو جھل آواز میں بولتا جا رہا تھا۔ ”راغب افرایم  
سے اس کے تمام جرم جان لینے کے باوجود محبت کرنے  
کا بہت شکریہ افسون!۔“ صحرائے عرب کے ریگستانوں  
میں کہیں دور دور تک ٹھونپے پھوٹ پڑنے کا عجیب و  
غریب موسم آگیا تھا۔



انادری کی موت کی خبر نے فاتح کے قدموں سے زمین  
کھینچ لی تھی۔ وہ مسافر جو جہاں بھر میں بھاگتا تھا اور کہیں  
سکون نہ پایا تھا۔ اسے اب واپس لوٹنا تھا۔ انادری دنیا سے  
رخصت ہو گئی تھی۔ اس خبر نے اسے جھنجھوڑ ڈالا تھا۔  
وہ اپنوں کے پاس لوٹ آیا تھا حریر اس کے ہمراہ آیا تھا۔  
اور پھر عثمانیہ کی رخصتی کا وقت قریب آگیا۔ اسے  
سفید کفن میں دھن بنا کر اس پیشے کے محل سے  
رخصت کر دیا گیا۔ وہ اپنے باپ کے بعد دوسری قیدی  
تھی جو دینا نائی اس ملا کی قید سے رہائی پائی تھی۔

ان دونوں ماں بیٹی کی دائمی رخصتی کے بعد بھی ابھی  
تک ان کی نامکمل موت کا ”مغمہ“ حل نہ ہو سکا تھا۔  
کوئی کہتا تھا۔ دیال کی شران پھٹ گئی ہے اور کوئی  
کچھ۔ کسی کو قتل کی واردات لگتی تھی اور کوئی اسے  
بھوت پرست کی کارستانی سمجھ رہا تھا۔

مہمان رخصت ہو چکے تھے۔ اور فاتح کی آمد کے  
ساتھ ہی بہت سارے لوگوں کے منہ بند ہو چکے تھے۔  
جن لوگوں کا اس کو غمی پہ قبضہ کرنے کا خیال تھا۔

فاتح کو دیکھ کر اڑن چھو ہو گیا اور فاتح نے آتے ساتھ  
ساری ذمہ داریوں کو نبھال لیا تھا۔ نانا کے بوڑھے  
وجود میں جہانے کہاں سے طاقت آگئی تھی۔ وہ فاتح کو  
بار بار گلے سے لگاتے اور جوم لیتے تھے۔ حتیٰ کہ نانی نے  
بھی اپنی قسم فاتح کی آمد کے ساتھ توڑ ڈالی تھی۔ وہ  
نواسے سے ملنے کی بے قراری لیے کشاکش کشاکش پہنچ  
گئیں۔

اور اب وہ دونوں میاں بیوی اسے کسی قیمتی متاع کی  
طرح اپنے درمیان بٹھا کر آنکھوں کی پیاس بجھا رہے  
تھے اور فاتح ہمارے ندامت کے خود سے نگاہ بھی نہیں  
ملا سکتا تھا۔ اس نے ان دو بوڑھے لوگوں کو کس جرم کی  
سزا دی تھی؟ وہ انہیں چھوڑ کر کیوں چلا گیا؟ جو کچھ ہوا  
تھا۔ اس کی تقدیر میں لکھا تھا تو پھر وہ آج تک کس سے  
بھاگتا رہا۔ خود سے یا ان دو بے آس لوگوں سے یا اپنی  
تقدیر سے؟

”وہ بے بدایتا نہیں آیا۔“ نانا کی مدھم آواز ابھری تو  
نانی نے ملل کے دوپٹے سے آنکھیں بے ساختہ صاف  
کی گئیں۔

”دل پہ زنگ لگا کر ایسا گیا کہ لوٹ کر نہ آیا۔“ وہ  
رونے لگیں وہ بہت کمزور دل ہو چکی تھیں بار بار  
رونے لگتیں۔

”وہ آگیا تو آپ اسے سینے سے لگالیں گی؟“ اب  
کے ایک اجنبی آواز سنائی دی تھی۔ ایک خوب  
صورت سا کتابی چہرہ، اجنبی سالجہ اور اکھڑی اکھڑی سی  
اردو۔

”ماپے (والدین) اپنے بچوں کو دھتکار نہیں سکتے۔  
وقتی طور پر ناراض ضرور ہوتے ہیں۔“ نانا کی آواز  
ابھری تھی۔ ”تو وہ آج بھی اس کا انتظار کر رہے تھے۔  
حریر نے اک نظر فاتح کی طرف دیکھا تھا۔ وہ بے  
تاش چہرے کے ساتھ بیٹھا تھا۔ اپنے بھائی کے ذکر پہ  
اس کے چہرے پہ کوئی رنگ نہیں آیا تھا۔ نہ نفرت کا نہ  
بیگانگی کا اور نہ ہی محبت کا۔

پھر وہ اٹھ کر کم صم بیٹھی۔ یہ کہ پاس آگیا تھا۔ وہ  
ابھی تک ستون کے ساتھ ٹیک لگا کر آنکھیں موندے

بیٹھی تھی۔ وہ اس کے قریب ہی دوڑا تو بیٹھ گیا تھا۔  
حریر اب نانا اور نانی سے رافع کے بارے میں بات  
کر رہا تھا اور وہ دونوں پورے شخص کے ساتھ رافع کی  
باتیں کر رہے تھے۔ جیسے اس سے اچھا کوئی اور  
موضوع ہی نہ ہو۔ اور نانا نانی کو دیکھ کر حیران ہو رہے  
تھے۔ وہ جو بہت کم گو ہو چکی تھیں۔ رافع کے موضوع  
پہ بے تکان بول رہی تھیں۔ جیسے رافع کے علاوہ کوئی  
اور بات ہی نہ ہو اور حریر ان دونوں کو شدید حیرانی میں  
جٹلا کر رہا تھا۔ وہ تھوڑی دیر بعد ایک ایسی بات کر رہا تھا  
جسے سن کر وہ دونوں حیرت زدہ ہو جاتے تھے۔ پھر نانی  
ناک پہ انگلی رکھ کر پوچھتیں۔

”پرنسے! تمہیں کیسے پتا؟“

”بس نانی صاحبہ! میرے پاس مڑکل ہیں سو ہی مجھے  
پتہ تے ہیں۔ آپ کا نواسا تو ایک زمانے میں سکر اشار  
تھا۔ گیتوں کی دنیا کا ستارہ۔ اس سے اچھا وائٹلن کوئی  
نہیں جانتا تھا۔“ حریر نے ان دونوں کے چہروں پہ پھیلی  
حیرانی سے محفوظ ہوتے ہوئے بتایا تھا اور فاتح اس کی  
ساری ”چلا کوبل“ کو جان چکا تھا۔ یہ جوان دونوں کے  
ساتھ کسلی کسلی کھلی جاری تھی اس کا پس منظر فاتح  
خوب جانتا تھا۔

”اور اس کی آنکھوں میں مدھ (شہد) جمارتا ہے۔  
ان دونوں بھائیوں کی آنکھیں اور بال سیم ہیں۔“ حریر  
نے ایک اور انکشاف کیا تھا جسے سن کر نانی کا دل بھر  
آیا۔ وہ حریر کو اپنے ساتھ بھیج کر جوتے ہوئے بولیں۔  
”بتانا۔ تو نے میرے رافع کو کہاں دیکھا؟ وہ اسی

ملک میں ہے؟ زندہ ہے یا نہیں؟ میں نے کئی دفعہ  
بڑے بھیاک خواب دیکھے۔“ وہ رونے لگیں اور یہ  
کے قریب بیٹھا تھا۔ گھر اسانس بھرنے لگا۔ اب حریر کیا  
کرے گا؟ وہ نانی پہ سچائی کو مشکف کر دے گا؟ وہ کسی  
بوڑھی عورت کے ممبر اور محل کو آزمانے والا نہیں  
تھا۔ وہ ان کے لیے مزید امتحان نہیں بنے گا۔ فاتح کو  
علم تھا۔ حریر کے ”سر پر اثر“ کے پیچھے کچھ ایسا ضرور  
تھا۔ جو اس کے دل اور خاندان سے جڑا ہوتا۔

”میں نے بہت دفعہ خواب میں رافع کو تکلیف

سے تڑپتے دیکھا ہے۔ وہ ہر دفعہ مجھے انہی میں کرا کیوں دکھائی دیتا ہے؟ حالانکہ میں نے اپنے منہ سے لپکے کبھی بددعا نہیں کی۔ میرے پاس تو اپنی بی بی کا دیا ہوا بڑا قیمتی سرمایہ تھا جو میرا ہی لٹ گیا۔ ”وہ منہ پر ملل کا دہنالیہ روئے لگی تھیں۔

”آپ نے اسے خواب میں ہمیشہ اذیت میں دیکھا۔ کیونکہ وہ اذیت میں ہی بیش بہا جٹلا رہا۔ وہ اپنے خاندان سے پھڑک کر ٹوٹ گیا تھا۔ وہ اپنے گناہوں کی وجہ سے بہت شرم سار تھا۔ اسے پچھلے دنوں انجانا کا اٹیک ہوا۔ وہ دل کے مرض میں مبتلا ہے۔ اس نے میری طرح اپنے خاندان سے الگ ہو کر بہت تکلیف جھیلی۔ جب ہم غلط قدم اٹھاتے ہیں تو پھر اس کی سزا بھی جی سنبھلتے ہیں۔“

حریر دھیمی آواز میں بتا رہا تھا اور تانا، ثانی ایک دم رونے لگے تھے۔ انہوں نے اپنے جوان بچوں کو مٹی تلے دبائے کا بار اپنے دل پہ جھیلایا تھا۔ اب اور صدے نہیں اٹھا سکتے تھے۔ وہ رافع کو کھو نہیں سکتے تھے۔ فلاح نے گردن موڑ کر حریر کی طرف دیکھا تھا۔ اسی طرح بے ساختہ بیہ نے بھی اپنے قریب بیٹھے فلاح کو دیکھتے ہوئے حریر کی طرف دیکھا تھا۔

”تمہارا دوست رافع سے کیسے ملا ہے کیا؟ یہ بہت ساری باتوں کو جانتا ہے۔“ بیہ نے اتنی دیر میں پہلی مرتبہ یاب کشائی کی تھی۔ وہ بڑی حیرانی سے حریر کو دیکھ رہی تھی۔ جو تانی کے بوڑھے لرزتے ہاتھ کو اپنے ہاتھوں میں دبائے کچھ کہہ رہا تھا۔ کچھ ایسا جو ان کے چہرے کی سپید رنگت میں سرری گھول رہا تھا۔ ان کے رخسار چمکنے لگے تھے۔

”رافع ظہران میں ہے۔ حریر کے گھر میں اور حریر‘ رافع سے وہیں ملا ہے کہ اسے اپنے ساتھ ضرور لاتا اگر اسے عثانیہ کے مرنے کی تب خبر ہوتی۔“ فلاح نے بے تاثر لہجے میں اپنی بات مکمل کی تھی اور بیہ چٹنی چٹنی نگاہوں سے اسے دیکھتی رہ گئی۔

کیا یہ سچ تھا؟ اور کیا رافع انہیں دوبارہ مل سکتا تھا۔ اس انکشاف نے عزا اور اندر آتے ارمیز کو بھی دنگ

لر دیا تھا۔ پھر اچانک بیہ کو خیال آیا۔ اس نے فلاح سے بے ساختہ پوچھا تھا۔ وہ دونوں ایک دوسرے سے ایسے غماظ تھے۔ جیسے بیچ میں اتنا وقت آیا ہی نہیں تھا۔ پھر بیہ نے گہرا سانس بھرا۔

”مدیر بھابی اور مدید کو دیا کے مرنے کی اطلاع نہیں دی؟“ اس نے اپنی بھابی اور بیٹھے کے متعلق پوچھا تھا۔

”انہیں کوئی قریب کی فلائٹ نہیں مل رہی تھی۔ وہ ایک دو دن تک بیچ جا جس گے۔“ فلاح نے جواب دیا۔ حریر کسی گہری سوچ میں گم تھا۔ وہ بار بار فلاح کو دیکھتا جیسے اسے کچھ بتانا چاہتا ہو اور فلاح بیہ سے کچھ پوچھ رہا تھا۔ کیا؟

”ان دونوں کی موت طبعی نہیں ہے۔“ فلاح کے انکشاف نے بیہ کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ لاؤنچ میں بیٹھا ہر شخص منجمد ہونے لگا۔ تانا ثانی عزا اور اس کی ساس۔ ارسل اور واصل تانیا۔ وہ سب آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دوسرے کو اشارے کر رہے تھے۔

”دیکھا، ہم نے کتے تھے۔ وہی ہوا تانا۔“ ارسل کی داوی کی آنکھیں چمکیں۔ فلاح نے اک نظر ارمیز پہ ڈالی تھی۔ پھر اس کی آنکھ کا اشارہ کر آہستہ سے بولا۔

”ان دونوں کو زہر دے کر مارا گیا ہے۔“ فلاح کے مزید انکشاف نے ہر دل کو دہلا کر رکھ دیا تھا۔

اب ہر کوئی تبصرے میں مصروف تھا۔ یہ کیسے ہوا؟ کس نے کیا؟ کس طرح سے ہوا؟

عزا اونچی آوازیں روئے لگی تھی۔ ”مجھے تو پہلے ہی شک تھا۔ انہیں کسی نے قتل کیا ہے۔“ وہ دھڑکن مار مار کر روتی رہی۔ فلاح نے اٹھ کر عزا کو پیار کیا اور پھر بیہ کا ہاتھ پکڑ کر ہسپتال کی بیڑھیاں اترنے لگا۔ اسے بیہ سے علیحدگی میں پوچھنا تھا کہ اس گھر میں گزشتہ رات کیا ہوا تھا؟ عثانیہ اور دیا کو کس نے قتل کیا؟

\*\*\*

ہسپتال ہمیشہ کی طرح نیم تاریک تھا۔ اندھیرے

میں گم صم سا۔ بہت ناک اور پر اسرار۔

وہ ہسپتال کے ٹھنڈے ہال میں چلتے ہوئے دیا کے کمرے میں پہنچ چکے تھے اور اب وہ دونوں ایک دوسرے کے قریب بیٹھے تھے اور خاموش تھے اور بیہ کی طرح خاموشی ان کے درمیان محو کلام تھی۔

ان دونوں کے درمیان کبھی اتنی بات چیت نہیں ہوئی تھی۔ بس عزا کی شادی کے دوران تھوڑی سی نوک جھونک اور بس۔ اس کی بلو جو فلاح کو ہمیشہ لگتا تھا۔ وہ بیہ سے قزوں پہلے ہی جان پہچان رکھتا ہے اور بیہ تو بھی ہی ایک داسی پھر داسیوں سے کیا سوال جواب؟ ”معاذ فلاح کی نرم آواز نے بیہ کو جھٹکا دیا تھا۔

”مجھے ارمیز نے میڈیکل رپورٹس دکھائی ہیں۔ اس نے تانا، ثانی کو اس لیے نہیں بتایا تھا کہ انہیں تکلیف ہوگی، لیکن اس نے مجھ سے کچھ بھی نہیں چھپایا۔ ان دونوں کی موت سم قاتل سے واضح ہوئی ہے۔ یہ ایسا مسلک زہر ہے جو اسپتال پہنچنے کی بھی مہلت نہیں دیتا۔ میں پوچھنا چاہتا ہوں بیہ! یہ سب کیوں کر ہوا؟“

”تم مجھ پہ شک کر رہے ہو؟“ بیہ نے اتنے آرام سے پوچھا تھا۔ جیسے کوئی بھی اس پہ شک کرنا۔ یہ اس کے لیے عام سی بات تھی۔ فلاح نے نفی میں سر ہلایا۔ ”ہرگز نہیں۔ میں تو بس حقیقت جانتا چاہتا ہوں۔ تب اس رات کیا ہوا تھا؟ کچھ ایسا انہوں نے جس سے تم جی ناواقف ہو، لیکن ہم کچھ کھوج تو لگا سکتے ہیں۔“ فلاح نے ملاعت سے اس کی بدگمانی دور کرنا چاہی تھی۔ وہ گہرے سانس بھرتی ٹھنڈے فرش کی ٹھنڈک محسوس کرتی دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی تھی۔

پھر اس نے دیا کا مہرہ از سر نو دیکھنا شروع کیا۔ وہ اس کمرے سے افزائیم بھائی کی ساری تصویریں اتار کر ایک گھر میں سنبھال چکی تھی۔ اس کے پاس کچھ ازمیز بھی تھیں۔ جو فلاح کی امانت تھیں اور جسے بیہ نے بڑھ لیا تھا تب سے اس کا دل اتنا ہی بو جھل اور افسردہ تھا۔ جیسے کسی بھاری چیز کے نیچے دبا ہو۔

”سمجھ میں نہیں آتا کہ اس سے شروع کروں۔؟ اس کمرے میں تمہارے باپ اور اپنے چچا زاد بھائی کی تصویریں دیکھ کر جو مجھ پہ گزری۔ وہ ایک ایک قیامت ہی تھی، لیکن ان تصویروں کی اس کمرے میں موجودگی کی وجہ سے مجھے معلوم ہوئی۔ اس نے مجھے قہر کر رکھ دیا تھا۔ مجھے پتا چلا کہ میری بہن تمہارے باپ کی تصویروں سے سفلی عملیات کرتی تھی۔ اس انکشاف نے مجھے ہلا کر رکھ دیا تھا۔“

وہ دھیمی بو جھل آواز میں کہہ رہی تھی اور فلاح بے چینی کے ساتھ اسے اپنی جگہ سے اٹھاتا دیکھ رہا تھا۔ بیہ نے بڈ کے نیچے سے تصویروں کا ایک گھر نکالا تھا۔ اسی گھر کے اندر ناکارہ بوسیدہ کھوپڑی کچھ زنگ آلود کیل کمانے، سونیاں، کپڑے کی پتلیاں اور ایک زنگ آلود بوسے کا مکان بھی رکھا تھا۔

فلاح ایک ایک چیز کو دیکھتا دنگ رہ گیا تھا۔ پھر بیہ نے اسے چند ڈانٹا دیں۔

”یہ دیا نے وقت آخر مجھے تمہارے لیے دی تھیں۔“ بیہ نے گہرا سانس بھرا اور دھیمی آواز میں کہتی رہی۔

فلاح ان ڈانٹوں کی وریق گردانی کرتا رہا۔ ایک ’دو‘ چار پانچ کھٹے مکسل فلاح ڈانٹ پر بڑھتا رہا اور بیہ اس کے قریب بیٹھی اسے دیکھتی رہی۔ ایک ننگ بے خود ہو کر وہ فیصلہ نہیں کر پاتا تھا دیا ظالم تھی یا مظلوم۔

پھر بیہ اچانک اٹھی اور ٹوٹا ہوا ایک مک دراز میں سے نکال لائی تھی۔ جو اس نے دیا اور عثانیہ کے مرنے کے بعد کمرے سے اٹھا کر محفوظ کیا تھا۔

”اس رات کچھ ہوا تھا؟“ فلاح بہت سنجیدگی سے پوچھ رہا تھا۔ بیہ سوچنے لگی۔ اس رات ہوا تو تھا۔ وہ ایک مرتبہ پھر اٹھی اور جلدی سے عثانیہ کا وہی فون نکال کر لائی جو فلاح نے عثانیہ کو گفت کیا تھا اور جس کی اسکرین پہ گر نے کی وجہ سے اسکرین چمکیا تھا۔

اس نے فلاح کے ہاتھ میں موبائل پکڑ لیا۔ جسے پکڑ کر وہ کچھ بھر کے لیے کہیں کھو گیا تھا۔ شاید عثانیہ کی یاد میں۔

”اور تم نے رافع کو اطلاع بھی نہیں دی۔ عتاب اس کی بیوی تھی۔“ کچھ دیر بعد فلاح نے سجدی کے کماؤ بیہ نشی میں سرھلایا تھا۔

”میرے پاس اس کا نمبر نہیں تھا اور جو تھا وہ بند پڑا تھا۔“ بیہ جواب دے رہی رہی تھی کہ اچانک فلاح نے کہا تھا۔

”رافع کا پرانا نمبر آن ہے۔ اسی رات سے جب عتاب کی فتنہ ہوئی۔ عتاب کے نمبر پہ آخری کال رافع کی تھی۔ اس کا مطلب ہے۔ مرنے سے پہلے اس کی رافع سے بات ہوئی تھی۔“

فلاح دبے دبے جوش کے ساتھ کچھ سوچتا ہوا عتاب کے نمبر سے اسی فون نمبر پہ فون کرنے لگا۔ بیہ خاموش اور تجسس تھی جبکہ فلاح بے حد مضطرب۔ رافع سے پچھلا سب کچھ بھلا کر فون پہ بات کرنا بہت مشکل تھا۔ لیکن اس نے عتاب کی خاطر یہ کڑوا گھونٹ بھر لیا تھا۔ کیا پتا، رافع ہی عتاب کی موت کا کوئی اشارہ دے دیتا۔ اور جیسے ہی فلاح نے ”ہیلو“ کہا۔ دوسری طرف سے رافع کی سسکیاں سنائی دینے لگی تھیں۔ وہ اس کے ہیلو کا بار ہی نہیں سہ سکا تھا اور اونچی آواز میں رونے لگا۔

”میں کم طرف ہوں۔“ آنسو اسے بولنے نہیں دے رہے تھے۔ وہ بار بار ہچکیوں کے دوران کچھ کہتا تھا۔ شاید معافی کے الفاظ۔ اور جب اس سے بات مکمل نہ ہو سکی تو کسی اور نے رافع کے ہاتھ سے فون لے لیا تھا۔ فون لینے والی نے اپنا تعارف افسون مشہدی کے طور پر کروایا تھا۔ اور اس نے کہا۔

”میں حریر مشہدی کی بہن ہوں۔ اور آپ کے بھائی کی ایک امانت سمجھ کر حفاظت کر رہی ہوں۔ اس کا دل بہت ڈسٹرب کرتا ہے۔ آج بھی ہارٹ پر ایلم کی وجہ سے ہاسپٹل میں ہیں۔“

”آپ کو اپنا تعارف کروانے کی ضرورت نہیں ہے۔ حریر نے مجھے سب کچھ بتا رکھا ہے۔“ فلاح کو بے ساختہ ٹوننا پڑا تھا۔

”تو کیا حریر نے ہماری سفارش کر دی؟“ وہ بے

ساختہ خوشی سے پوچھ رہی تھی۔

”آپ کو سفارش کی کیا ضرورت تھی۔ اس ٹالائق سے کہیں۔ واپس گھر آجائے۔ ٹائٹلی کا امتحان نہ لے۔“ فلاح نے ضبط کے بل صراط پہ کھڑے کھڑے کہا۔ یہ دیا تھا۔

”مگر اس نے بچوں کی طرح رونے کا شغل پورا کر لیا ہے تو ذرا مہمانی فرما کر اسے موبائل دیں۔ مجھے عتاب کے بارے میں کچھ بات کرنی ہے۔“ فلاح کی اتھاس پہ افسون نے موبائل رافع کی طرف بڑھا دیا تھا۔ جو عتاب کے نام پہ ایک مرتبہ پھر افسردہ سا ہونے لگا۔

”رائی!“ فلاح کے اس طرز خطاب نے رافع کے اندر آنسوؤں کی جھری لگا دی تھی۔ اسے لگا تھا جیسے کوئی مجبور ہو گیا۔ اس کا پچھرا بھائی پلٹ آیا تھا۔ فلاح کبھی بڑے موڈ میں ہوتا تو اسے اتنے ہی پیار سے بلاتا تھا۔ اس کا روٹھ بھائی مان گیا تھا۔

”تمہاری اس رات عتاب سے کیا بات ہوئی تھی؟“ فلاح نے کچھ دیر بعد بڑے محتاط انداز میں پوچھا تھا۔ تب رافع نے دھیمے لہجے میں سب کچھ بتا دیا تھا۔ سب کچھ جو اس نے عتاب سے کہا تھا۔

”میں نے اس سے معافی مانگی تھی۔ ان سب گناہوں کی جو مجھ سے سرزد ہوئے تھے۔ جس میں وہ ملوث نہیں تھی۔ اور جن میں اپنے بچ بن کی وجہ سے میں ملوث رہا۔ وہ تو بے قصور تھی۔ معصوم تھی۔ ہم سب نے ہی اسے اپنے لیے مطلب کے لیے استعمال کیا۔“ وہ دھیمی بو جھل آواز میں کہتا رہا۔

”اور اس کے علاوہ؟“ فلاح کے لہجے میں پنہاں سوال کی گہرائی کو وہ سمجھ گیا تھا۔ اس نے کچھ دیر کے لیے سوچا اور دھیمی پر غم آواز میں بولا۔

”میں اس کے قابل نہیں تھا۔ جو کچھ میں نے کیا تھا۔ وہ قابل معافی نہیں تھا۔ پھر بھی اس نے مجھے معاف کر دیا۔ اور میں نے اسے طلاق دے دی تھی۔ میں نے وہ آخری فون کال اسی لیے کی تھی تاکہ اسے اس نام نہاد تعلق سے آزاد کر دوں۔ مجھے اندازہ ہی

نہیں تھا۔ وہ زندگی کی قید سے ہی رہائی پا جائے گی۔“ وہ کہہ رہا تھا۔

”تم نے عتاب کو طلاق دے دی تھی؟“ فلاح کا دماغ چکر کر رہ گیا تھا۔ جو اب ”رافع اسے سارا قصہ سناتے لگا۔ اس نے کب عتاب کو فون کیا تھا؟ اور اس فون کال کے بعد کیا ہوا؟

اس رات آخر کیا ہوا تھا؟



رات پر آنکسی سوار تھی۔ جیسے رینگ رینگ کر چلتی۔ ست اور تھکی تھکی سی رات بامراد کی کچی کڑوں سے کوسوں دور تھی۔ سپیدہ سحر کی بام پر انگ گیا تھا۔

الہیدہ پیرانی کی تھی۔ باہر رات کی راج دھانی تھی۔ رات کی ساحرہ پالمکد عالیہ۔ جس کے اتوم پہ نخت سرخڑہ کے بولتی تھی۔

”صبح اقدس شاید بھی نہ طلوع ہو۔“ عتاب نے تھک ہار کر سوچا اور نگاہیں رات کی تاریکی سے ہٹا لیں۔

ابھی کچھ دیر پہلے رافع کی فون کال آئی تھی۔ اس کی پہلی اور آخری کال۔ وہ سوچنے لگی۔ رافع نے اس سے کیا کہا تھا؟ کیا۔۔۔ سوچ سوچ کر بھی اسے یاد نہ آیا تھا۔ اس کی یادداشت ایسے ہی کھونے لگی تھی۔ کچھ بھی یاد نہ آتا تھا۔ اور کبھی کبھی اچانک ایک فلم سی جلنے لگی تھی۔ جیسے ابھی اسے بہت کچھ اچانک یاد آ گیا تھا۔

رافع نے اسے طلاق دی تھی اور شاید معافی بھی مانگی تھی۔ عتاب نے سوچا۔ یہ الفاظ وہ پہلے بھی سن چکی تھی۔ اب اس میں کیا نیا تھا؟ کچھ بھی نہیں۔ وہ سوچتی رہی۔ اور پھر بھی اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھیکتی رہیں۔ اسے یاد آیا۔

یہ جو کچھ ہو رہا تھا۔ اس کی ماں کے غلط فیصلوں کی بدولت تھا۔

اس کے اندر بھانہ بھرنے لگے۔ آگ بھڑکنے لگی۔

”طلاق، طلاق، طلاق۔“

وہ دنیا میں صرف یہ تین لفظ سننے کے لیے آئی تھی۔ صرف یہ تین لفظ۔ وہ رونے لگی تھی۔ چیخنے لگی تھی۔ ”فلاح، رافع۔“ اس کی ماں نے ان دو مردوں کے درمیان اسے فٹ بال بنایا تھا۔ ایسی ذلت؟ ایسی خواری؟ ایسی رسوائی۔

وہ رونے لگی تھی۔ بے تحاشا رونے لگی۔

”مائیں ایسی ہوتی ہیں؟ ساری عمر سولی پہ بیٹھے دیکھیں۔ ایک جہنم کے اندر دھکیلے رکھیں۔ ننگے پیر کو نکلوں پہ چلائیں۔“ وہ اپنی جگہ سے اٹھی اور چلنے لگی۔ پھر وہ اچانک کچن کے قریب آکر رک گئی تھی۔ اس نے مڑ کر دیکھا۔ بیہ شاید لان میں تھی۔ اور آنکسی کی ماری رینگ رینگ کر چلتی رات میں محو تھی۔ اور اس کے کماں کہاں تھی؟ نیچے۔ سنٹ میں؟

اس نے چوہے پر پانی رکھا وہ کافی بھاری تھی۔ کچھ دیر بعد اس نے دو گ تیار کیے اور پھر دراز کھول کر اپنی مطلوبہ چیز نکالی۔ یہ ایک پڑیا تھی جو اس نے ان دنوں منگوائی تھی جب فلاح اسے چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ تب وہ زندگی سے چھٹکارا پانا چاہتی تھی۔

اس نے پڑیا سے سفید سفوف نکال کر دونوں گلوں میں ملایا اور کافی کامک اٹھا کر دیا کے کمرے میں آگئی تھی۔

اس نے دیکھا۔ دیا اسے نماز والے سنہری تخت پر لیٹی تھی اس کے ہاتھ میں بیج تھی۔

عتاب بھری آنکھوں سے اسے دیکھنے لگی۔ وہ ایک خوب صورت عورت تھی مگر کاش اس کا دل بھی اتنا خوب صورت ہوتا اس نے آگے بڑھ کر خاموشی کے ساتھ گک رکھا اور الٹے قدموں باہر آگئی۔ چند الفاظ اس کا پچھا کر رہے تھے۔

”جب زندگی کا ہماؤ موت کی طرف چل رہا ہو تو اے میرے سیاہ اعمال مجھ سے دور ہو جاؤ۔“

مجھے کہیں کا نہیں چھوڑا۔ اور تم نے دھوکہ دی سے سارے رشتے بنائے۔ اسی لیے سارے رشتے ٹوٹ پھوٹ کر بکھر گئے۔ اور تم نے اپنی بہن کا دل توڑا۔ اس کی محبت چھین کر میرا فیصبا بنا دی۔ اور

دیکھو ماں! تمہاری عنایہ کتنی بد قسمت ہے۔ یہ بہت اس کا نصیب بھی نہیں بن سکی۔ فالج مجھے پھوڑا گیا۔ اور رافع کو میں نے از خود پھوڑ دیا۔ اور آج اس نے میرے پاگل پن سے تنگ آکر مجھے طلاق دے دی۔ کتنی بد قسمت ہے عنایہ! کہ اس کے نصیب میں کسی کا پیار نہیں۔ وہ روتی رہی، زنجی رہی، جیتی رہی۔ پھر آئینے کے سامنے کھڑی ہو گئی۔

اور میں عنایہ کا کشف ہوں۔ میرا باپ ایک جذباتی آدمی تھی۔ جسے میری ماں جیسی ساحرہ سے محبت ہو گئی تھی۔ اور میری ماں اچھی عورت نہیں ہے۔ وہ ایک ”حاسد“ عورت ہے۔

میری ماں کو میری اکلوتی پھوپھو سے بڑی نفرت تھی۔ ایک زمانے میں وہ اس کی سہیلی تھی۔ بعد میں تو اس نے اسے اپنے دشمنوں سے بھی بدتر سمجھا۔ کوئی دشمنوں کے ساتھ بھی ایسا نہیں کرنا جو کچھ میرے ماں نے پھوپھو کے ساتھ کیا۔

میں نے زندگی بھر اپنی ماں کی محبت نہیں دیکھی۔ ہاں اس کی مار کے ان منٹ نشان میرے جسم پر موجود ہیں۔ اور روح ایسے ان گنت زخموں سے بھری پڑی ہے۔ اور میں ایسی بد بخت تھی جسے ماں باپ کا پیار ہی نہ ملا۔

پھر ماں کی گھٹیا چالوں کی بدولت میری شادی فالج سے ہوئی۔ میں نے اپنے باپ کے بعد وہ پہلا مرد دیکھا تھا۔ بہت قریب سے۔ ایک انوث رشتے میں بندھ کر وہ میرے باپ سے بہت مختلف تھا۔ میرا باپ ایک غصہ ور جذباتی انسان تھا۔ وہ میری ماں پر چیخا چلا تا اور اسے نوکروں کے سامنے مارتا تھا جبکہ میرا شوہر دنیا کا اچھا ترین انسان تھا۔ جس نے عورت کے احترام اور عزت کے ساتھ اس کی نسوانیت اور وقار کا بھی خیال رکھا تھا۔

میں اس کے لیے ایک ”ان چاہی“ دلن کے روپ میں تھی۔ اس نے مجھے ہمیشہ ”من چاہی“ بیوی کی طرح برتاؤ کیا۔ وہ میری زندگی کا آٹھ تھا۔ میری ماں کی غلط چالوں نے فالج کو مجھ سے ہمیشہ کے لیے دور کر دیا

تھا۔ میں نے فالج کو کھو دیا تو رافع مجھ پر مسلط کر دیا گیا۔ وہ میرا بچپن کا دوست تھا۔ کزن تھا۔ اور کبھی الفت کی نسبت بھی رہی تھی لیکن اب میرے لیے صرف اچھی تھا۔ مجھ پر فالج کے بعد زندگی کی ہر خوشی حرام ہے۔ حرام ہے۔ حرام ہے۔ یہ میرا خود سے وعدہ تھا۔ آج رافع نے مجھے ہر تعلق سے آزاد کر دیا۔

میرے دل پر اب کوئی بوجھ نہیں۔ اور میں بہت خوش ہوں دیا! مجھے تم سے رہائی مل رہی ہے۔ اب وہ آئینے کے سامنے سے ہٹ چکی تھی اور اس نے کافی کا پورا ٹمک خالی کر دیا تھا۔ اس نے رات کی تاریکی میں اپنا مقدر کھوجتی ہے کہ کراچے ہوئے اندر ملایا تھا۔

پھر اس سے چند باتیں کیں۔ اور دم آخر صرف اتنا کہ۔

”میرا ایک کام کر دینا۔ بیہ! اس اے بتا دینا۔ کہ عنایہ کو اس سے بہت محبت تھی۔ باقی کچھ بھی نہیں تھا۔ نظر کا دھوکا یا قیاتی لگاؤ۔“ اس نے ایک لمبی آہ بھری اور چپ ہو گئی تھی۔

”کس سے؟“ ”بیہ! ابھی۔“ ”کیا رافع سے؟“ اس نے سوالیہ انداز میں پوچھا تھا۔

”نہیں۔“ ”عنایہ نے ابھی سانسوں کو ہموار کیا تھا۔ ”فالج سے“ ”اب وہ آنکھیں موند رہی تھی۔ اور پھر اس نے آخری پھٹکی لی اور دنیا سے منہ موڑ کر بہت دور چلی گئی۔

ہسٹنٹ کی نیم تاریکی میں بیہ کی آواز گونجتی تھی۔ اور وہ پچھلیاں لیتے ہوئے عنایہ کی زندگی کے مختصر باب کو ختم کر رہی تھی۔ اور اس نے دیکھا تھا۔ فالج کی آنکھوں کے کونے نم تھے۔ اور وہ گہری افسردگی کو اپنے اندر اترا محسوس کر رہا تھا۔ آج اس ذلت کا اختتام ہو گیا تھا جو عنایہ کے اس دن والے اقرار کی بدولت اس کے اندر پھاس کی طرح جھپتی تھی۔ آج اس پھاس کا بھی اختتام ہو گیا تھا۔



یہ بادلوں سے ڈھکا ایک رستہ تھا۔ اور خوب

صورت سی ایک گنڈنڈی تھی۔ جس کے آخری سرے پر ایک جیسے فراق اپنے وہ بچیاں کھڑی تھیں۔ ان کے بابلوں میں ایک جیسے ربن تھے۔ اور پونیوں کا اسٹائل بھی ایک جیسا تھا۔

وہ دونوں بچیاں آنسو بھری آنکھوں سے گنڈنڈی پر چلتی اس حسین صورت کو دیکھ رہی تھیں۔ جو ایک سنگ مرمر سے تراشا ”بت“ تھی۔

وہ کسی ملکہ کی طرح چل رہی تھی۔ اپنی راج ہنس سی گردن اٹھا کر۔ اس کے ہاتھ میں پھولوں سے بھری ایک نوکری تھی۔ جس پر نظر پڑی تو ایک دم وہ چیخ پڑی۔ نوکری کے اندر سنہری تاج والا ایک سانپ بیٹھا تھا۔ کبھی وہ اپنا ڈنک نکالتا اور کبھی اس کے دودھیا ہاتھ پر اپنی زبان پھیلاتا۔

وہ ایک چیخ کے ساتھ سنہری تخت پوش سے اٹھ گئی۔ وہ پسینے سے ترتر خوف کے مارے کانپ رہی تھی۔ جو اس نے دیکھا تھا۔ وہ خواب تھا یا حقیقت؟ وہ اونچی آواز میں رونے لگی۔ اس کا دم گھٹ رہا تھا۔ حلق خشک تھا۔ اس نے تخت کے سامنے رکھا کافی کا کب اٹھالیا۔ کافی بد ذائقہ تھی۔ پھر بھی دینے ایک سانس میں مک خالی کر دیا۔

پھر اس نے دیکھا۔ اس کے ارد گرد ایک ہجوم اکٹھا ہو رہا تھا۔ بد وضع عورتیں بد صورت مرد۔ جن کے جسم پر لمبے لمبے کانٹے تھے۔

”تم لوگ کون ہو؟“ اس نے خوف سے تھر تھراتے لمبے میں پوچھا تھا۔ جواباً وہ ہنسنے لگے۔ لمبے لمبے دانت دکھانے لگے۔ ”ہم“ وہ ”عمل“ ہیں۔ جو تم نے کالی راتوں میں دھاگے باندھ کر کیے۔“ کوئی اس کے کانوں میں چلا رہا تھا۔ دینے اپنے کانوں پر ہاتھ رکھ لیے۔ اس کی آنکھوں کے سامنے ایک فلم چل رہی تھی۔

افراہیم کی شادی۔ افراہیم کی خوشیاں، افراہیم کی کامیابیاں۔

وہ دیا کی نفرت دنیا کو سازش کے تحت سیر میوں سے گرا کر اس کی جان لینے کا منصوبہ۔ افراہیم کی زندگی کو شیطانی عملیات کے ذریعے جنم نہانا۔

نفرت دور نفرت کا سلسلہ۔ جان چھڑکنے والے شوہر کا دل برداشتہ ہو کر زندگی سے دمن چھڑا جانا۔

زیبا کے بچوں سے نفرت۔ اپنی بیٹی سے بیزاری۔

رافع کو ہر کانٹا۔ اپنی بیٹی کو نفرت کی انتہا پر فٹ بال بیٹا۔ بیہ سے فالج کو بچپن لینا۔

ماضی کے کسی جھجھوکے سے جھانکتی ماں سے نفرت۔

دادی سے نفرت۔ ہر رشتے سے نفرت۔ محبت تو اسے بس خود سے تھی۔ اپنے آپ سے تھی۔ اس نے خود کو چاہا۔ اپنی پرستش کی۔

اس نے اپنے صدمہ کدے میں افراہیم کی تصویریں محبت میں نہیں رکھی تھیں۔ وہ ان تصویروں کو پھونکنس مادے کے لیے لالی تھی۔ اس نے یہ سب کیوں کیا؟

افراہیم کی محبت میں؟ ہر گز نہیں۔ محبت تو اسے کسی سے نہیں تھی۔ اس نے تو یہ سب نفرت میں کیا۔ افراہیم کے پھپھوں سے ملنے والی اور جو اس کے آس پاس تھے وہ نفرت سے چلا رہے تھے۔

”مجھے افراہیم سے محبت تھی۔“

”نہیں تھی۔“ وہ کانوں پر ہاتھ رکھ کر چلا رہی تھی۔ ”دیکھو میرا دل اس میں کچھ بھی نہیں ہے۔ نہ ماں کی محبت، نہ اس کی جدائی کا غم، نہ باپ کے جانے کا غم، نہ افراہیم کے نہ ملنے کا کرب نہ کاشف کی جدائی کا سوگ اور نہ عنایہ کے اجڑنے کا دکھ۔ دیکھو میرا دل خالی ہے۔ سویرا، بیابان، سنسان۔“

”کیسی بد بخت عورت ہو تم۔ ایسے سیاہ دل کی مالک۔ مفلس، کنگال۔“ وہ بہت سے لوگ تھے۔ عجیب صورت والے۔ نفرت سے اسے دیکھتے اور تھوک جاتے۔

پھر اچانک ایک سفید براق کپڑوں والا ہولا جلوہ گر ہوا۔ ایک خوب صورت مرد۔ چمکی آنکھوں والا۔ ”منع کیا تھا نا۔۔۔ نہ بربادی کے راستے۔ چلو خدا اپنے پیاروں کے چراغ بجھنے نہیں دیتا۔ لیکن مجھے عقل



نہیں آئی۔ گڑھے میں بیٹھ کر اپنے لیے کڑا کھوڑی رہی۔ دوبارہ سُن اپنے لیے۔ وہ تو تب ہی مرے تھے جب ان کی موت آئی۔ اور تو نے انہیں کتابچہ کرنا چاہا لیکن خدا کو ان کی جدائی گوارا نہ تھی۔ اپنے پاس بلایا تو اکٹھے ہی بلالیا۔ وہ مرکز بھی جانا نہ ہوئے تیرے برے عمل تیرے ساتھ رہے۔ دیکھو! اس کا آشیانہ اب بھی آباد ہے۔ اور تیرا آشیانہ آج پھر برباد ہے۔ وہ وہی آواز میں زہر پھونکا چلا گیا تھا۔ یہ عبد اللہ تھا یا اس کا وہم جاسن کے چڑ تلے کھڑے رہ کر اسے برے عمل سے ”اوں ہوں“ کی آواز کے ساتھ روکنے والا۔

دیا نے تھک کر تخت کے کنارے سے سر نکال دیا تھا۔ وہ ہار گئی تھی۔ نفرت کی ایک لمبی جنگ لڑنے کے بعد ہار گئی تھی۔ اس نے تیج اٹھائی تھی۔ تیج بڑھنے کے دوران اس پر غنودگی سی طاری ہو گئی۔ ”جب زندگی کو ٹکا لگا ہو اور موت کی طرف ہماؤ چل رہا ہو۔ جب سانس سینے کی قید میں سر پٹختی ہو۔ اور روح لمبی اڑان بھرنے کے لیے تیار ہو تو اسے میرے بد اعمال! مجھ سے دور ہو جاؤ۔ مجھ سے دور ہو جاؤ۔“ اس نے دونوں ہاتھ جوڑ کر جیسے التجا کی تھی۔ لیکن اب اس کی مہلت ختم ہو چکی تھی۔ اب تو بس فنا کا سفر باقی تھا۔ یہ ان ہی دنوں کی بات تھی۔ جب حریر ابھی ہیک میں ہی تھا۔ اور مدید کے ساتھ ٹیولپ کی کٹائی کا ناپسندیدہ کام کروا تھا۔ اور پھر اس کا سر کمال خالوان پھولوں کو شہر کی بڑی تجارتی منڈی میں منگے داموں بیچ آتا۔

ان ہی دنوں اسے اپنی بہن کے ای میل ایڈریس سے چھوٹے بھائیوں کی ای میل موصول ہوئی تھی۔ حریر کا دل بلوں اچھل پڑا تھا۔ اس نے ای میل کو سہ بار پڑھا۔ اس کا یہ مطلب تھا اپنے ای میل ایڈریس سے ای میل بھجوانے والی خود افسون مشدی تھی۔ حریر کی بہن۔

اسے واپس بلایا جا رہا تھا۔ اور ساتھ اس کی کچھ ”خدمات“ کی بھی ضرورت معلوم ہوئی تھی۔ یہ ای

میل افسون نے حریر کو حیر کے ذریعے بھجوائی تھی۔ اسے اپنی ناک عزیز تھی۔ سو ہندوق حیر کے کندھے پہ رکھی تھی۔ چلو گئی بات نہیں۔ حریر کو اپنا مطالبہ یاد آیا۔ جس کی وجہ سے وہ گھر بدر تھا۔ کیا ضروری تھا؟ وہ ابھی اپنا مطالبہ افسون کے ”کلام“ سے پہلے منوالیتا۔ ”لیکن یہ کیا؟ ان باکس میں ایک اور ای میل قریب بھی پڑی تھی۔ حریر نے بے تابی سے کھولی۔

”تمہارے ناجائز مطالبے کی ہمارے نزدیک اب بھی کوئی وقعت نہیں۔ یہ مت سمجھنا۔ تمہارے ”مطالبے“ سے کسی بھی قیمت پر نظر ثانی کی جائے گی۔ ہم آئینے کی جگہ کسی اور کو نہیں دے سکتے۔ وہ کوئی جو ”بھی“ ہو۔“ افسون کی وہی انٹی فیصلہ کن نخوت۔ حریر کا منہ پھول گیا۔ ہونہ۔

اور پھر اس نے ناک بھوں چڑھا کر پوری ای میل پہ نگاہ ڈالی تھی۔

اگر تمہیں ظہران کا سب سے زیادہ قابل اور مٹھا ہوا ماہر نفسیات سمجھ کر ایک پیچیدہ کیس دیا جائے تو اس کیس کی تم کتنی فیس لوگے؟ اور ظہران آنے میں کتنے دن لگاؤ گے۔ ادھر دار الشفاء میں میرا ایک ”مریض“ تمہارا منتظر ہے۔ کسی ماہر نفسیات سے اپنی ذہنی الجھنوں کو ڈھسک کرنا چاہتا ہے۔ مجھے تم سے بہتر کوئی بھی ماہر نفسیات نہیں نظر آتا۔ تمہاری قوتِ مشاہدہ کمال کی ہے۔“

اس ”تعریف“ پر واری جاتے ہوئے حریر مشدی اس کے کچھلے سارے گناہ معاف کرتے ہوئے ای میل کا جواب لکھنے لگا۔

”مجھے ظہران آتے ہوئے چند گھنٹے لگیں گے۔ میں ظہران پہنچ جاؤں گا۔ لیکن اس سے پہلے مجھے ”مریض“ کے کچھ کوائف“ ایک تصویر اور اس کا کچھ بائیو ڈیٹا سینڈ کرو۔ اور ”ہاں“ فیس میں حریر مشدی پھر ”مطالبہ“ ہی لے لگا۔ اپنے والد صاحب کو بتا دیتا۔

”ہاں۔“

حریر نے ہونٹ کا کونا بنا کر لپٹ لپٹ آف کیا اور

مدید کے ساتھ باقی مشقت کے لیے نکال پڑا۔ پھر افسون نے ای میل کی تھی۔ اس میں افسون کے ”مریض“ کی تصویریں بھی تھیں۔ اس کا نام ”قومیت“ ولدیت۔ وہ سب کچھ جو انتہائی صدمے میں مبتلا کردینے کے لیے کافی تھا۔ افسون کے مریض کی تصویروں نے حریر کو بری طرح سے چونکا دیا تھا۔ اس نے ایک ایک چیز کو غور دیکھتے ہوئے اپنا سر تھام لیا تھا۔ حریر کو ٹیولپ کے کھیت میں اتری وہ رات یاد آئی۔ جب وہ دونوں ندی کے کنارے بیٹھے تھے اور فاع اپنی زخم زخم زندگی کا ایک ایک آنسوؤں بھیگا ورق کھولتا تھا اور حریر اندر تک اتری رنجیدگی کے ساتھ اس کا لفظ لفظ اپنے دل میں اتارنا تھا۔

فاع اور رافع؟ یہ دو کردار؟ دو مریض۔ ایک ہی کہانی کے دو حصے دو کردار۔ دونوں اپنے اپنے احساس زیاں میں ڈوبے ہوئے۔ وہ دونوں جو اس کے ”مریض“ نہیں تھے۔ لیکن حریر نے زبردستی ان کو اپنا مریض بنایا تھا۔ رافع یعنی فاع کا بھائی؟ ظہران میں؟ افسون کے قریب نہیں؟

ان ساری باتوں کا جواب اسے افسون کی اگلی ای میل سے مل چکا تھا۔ اس نے اپنے ”برادرانہ“ جذبات کا گلا گھونٹ کر ایک آہ بھری۔

”صد شکر کہ تمہیں کوئی پسند آیا۔ تم راستے سے ہٹو گی تو میری باری آئے گی۔“

حریر افسون کی ای میل پڑھتے ہوئے حیران تھا۔ زندگی کے اس سفر میں لوگ ایسے بھی ایک دوسرے سے ٹکر اچاتے ہیں۔ جیسے کڑیاں ایک دوسرے سے ملتی جائیں۔ جیسے اچھی ڈوروں کے سرے سمجھتے جائیں۔

اس نے ایک ٹھنڈی سانس بھری اور دنیا جہاں کے تجسس کے ساتھ رافع کی زندگی میں کھو گیا تھا۔ حریر نے ابھی تصویر کا ایک سرف دیکھا تھا۔ جو اسے فاع نے دکھایا تھا۔ اب اسے تصویر کا دوسرا سرف دکھنا تھا۔ اور اس کے لیے ضروری تھا کہ وہ رافع سے ملاقات کرنے ظہران پہنچ جاتا۔

ویسے بھی آئینے کے ہاتھ سے بنے پرانے کھائے ایک مدت ہو گئی تھی۔ حریر کو بے طرح اپنے یاد آنے لگے۔ وہ تک چڑھی سی رعب جہانی بہن، نٹ کٹ سے چھوٹے بھائی۔ حلیم سے روشن خیال والد صاحب۔ جنہوں نے اپنی بیٹی کی ”پسند“ پہ سمجھوتا کر لیا تھا۔ اور وہ سب کی قلم میں ہلکان بابا کی لٹائی بیگم۔ حریر کو یاد آیا۔ وہ کیا کچھ پیچھے چھوڑ آیا تھا؟ اپنی محبتیں رشتے، چاہتیں اور مطالبہ بھی۔

اس کا دل بڑی ہی بے قرار ہوا تھا۔ دل چاہتا، اڑتے ہوئے ظہران پہنچ جائے۔ اسے ”افسون حرم“ میں۔ ظہران کے تپتے سورج تلے اس کا عالمی شان محل۔ جسے وہ اپنی بے کار زندگی میں گھو کر مار آیا تھا۔

اور اب اسے واپس جانا تھا تو تکہ افسون نے اسے بلایا تھا۔ چاہے کسی وجہ ہی سے۔ سب سے بڑھ کر حریر کو اپنے ”مریض“ سے ملنے کی دلچسپی اور اشتیاق تھا۔ فاع کا چھڑا ہوا بھائی؟

اور پھر اگلے دو دنوں میں وہ ظہران افسون حرم میں اپنے اپنوں کے درمیان موجود تھا۔ اس حال میں کہ حریر کے چھوٹے بھائی اس کی وہ درگت بتا رہے تھے کہ اللہ کی پناہ۔ انہوں نے اس کا افسون حرم کی بالکونیوں میں کھڑے ہو کر ایسا والمانہ استقبال کیا کہ کیا ہی کوئی کسی اپنے پیارے کا کرتا ہو گا۔

سارے ظہران کے گندے اندرے اور ٹماٹر انہوں نے گولیوں کی طرح اس پہ برسائے تھے۔ ایسا برا استقبال؟ حریر مارے خیالت اور غصے کے پھڑپھڑا کر رہ گیا تھا۔ اور جو اب ”حمیر اور عمیر کی ہنسی۔ وہ سچ رہے تھے۔ ”لوٹ کے بدھو کھر کو آئے۔“ وہ غصے میں مل کھانا اندر آیا تو سامنے ہی بہت سے لوگ کھڑے تھے۔ اس کے اپنے، بابا آئینے افسون اور کوئی ایسا بھی تھا۔ جو اسے پہلی نظر میں بری طرح سے ٹھنکا گیا۔

وہ ہوہو فاع تھا۔ اپنی آنکھوں بال اور ہونٹ کے تل سے۔ حریر اسے دیکھتا رہ گیا۔ وہ اپنی مشابہت سے ہی نہیں تاثرات سے بھی فاع ہی تھا۔ ویسا ہی دکھ، کرب، اذیت اس کی آنکھوں سے

جھلکتی ہوئی۔ ایک چیز اس کے اندر فاح سے زیادہ تھی۔ اور وہ تھی۔ ندامت، ملال، پچھتاوا، شرم ساری۔ احساس زیاں۔ جس کی وجہ سے حریر نے اگلے کئی دن بعد بھی اس کی آنکھوں کو جھکا ہوا پایا تھا۔ وہ کبھی آنکھ اٹھا کر بات نہیں کرتا تھا۔ اس کا قیام افسون حرم میں تھا۔ اور حریر جانتا تھا کہ وہ کس قدر مجبور ہو کر افسون حرم کے مسمان خانے میں رہنے پر مجبور تھا۔ اس کے بابا نوزان شمدی کی دھمکیوں کے باعث۔

”یاد رکھنا“ ہماری بات نہیں مانو گے تو ظہران کی حوالات میں بھجوا دیں گا۔ انہیں میزبانی کا موقع دے آنا۔ ہماری میزبانی تو ہمیں پسند نہیں۔ بلکہ ناک تلے نہیں آتی۔“ اور جب میزبان ایسے جان نچھاور کرنے والے ہوں تو مسمان کب تک خرے دکھاتا؟ بالآخر اسے جھکنا ہی تھا۔

رافع سے مل کر حریر کو بہت جلد فاح کی کسی ایک بات پر یقین ہو گیا۔ جو فاح نے کہا۔ لفظ بہ لفظ ٹھیک تھا۔ لیکن جو رافع کہہ رہا تھا۔ وہ سچائی کے ساتھ ساتھ اقبال جرم تھا۔ ایک ڈاکٹر اور مریض کے رشتے کو سمجھتے ہوئے رافع نے اسے ایک ایک درد کو کھول دیا تھا۔ اس نے سر جھکا کر اقرار کر لیا۔ ”میں نے اپنے بھائی کی بیوی۔ بری نظر رکھی۔ میرے اس گناہ کی یہ سزا عمر بھر کے لیے کافی ہے۔ میں کبھی اپنوں سے نہیں ملوں گا۔ اور ہمیشہ کے لیے اس بھیڑ میں کھوجاؤں گا۔“

وہ سر جھکا کر درد پا تھا۔ رافع کے ایک ایک درد کو سنتا اس کے درد کا دریاں کرتا حریر کبھی سانس بھرتا ایک فیصلے پہ پہنچ کر مطمئن ہو گیا تھا۔ شرمندگی، پچھتاوا، ندامت اور توبہ ہر بڑے سے بڑے گناہ کو معاف کر دیتے ہیں۔ اور وہ تو اتنے عرصے سے قریہ قریہ بھٹکتا اپنے لیے معافی کا ایک لفظ سننے کے لیے مڑ رہا تھا۔ سسک سسک کر تڑپ تڑپ کر۔

فیصلہ مشکل تھا لیکن ہو گیا۔ حالانکہ افسون حریر کے اس فیصلے پہ خوش نہیں تھی۔ اس نے حریر کے ساتھ جھگڑتے ہوئے کہا۔ ”میں نے تمہیں اس کا

علاج کرنے کے لیے کہا تھا۔ ایک ڈاکٹر ہونے کی حیثیت سے اس کی میحالی کرو۔ میں نے تم سے یہ نہیں کہا تھا۔ تم لائے سیدھے مشورے بھی دو۔“ تب حریر کو اسے سمجھانے میں بہت وقت لگا تھا۔ لیکن وہ افسون کو سمجھانے میں کامیاب ہو گیا تھا۔

”وہ اپنوں کے بغیر ادھورا اور نامکمل ہے۔ کوئی بھی انسان اپنوں کے بغیر نامکمل ہوتا ہے۔ تم اسے یہاں اپنے ساتھ رکھو گی تو وہ تمہارے جذبات کی قدر کرتا نہیں جائے گا۔ کیونکہ وہ ایک ہارا ہوا انسان ہے۔ تمہارا اکیلا ہے۔ اسے سہارے کی ضرورت ہے۔ جو تم سے مل جائے گا۔ مگر وہ خوش نہیں رہے گا۔ اس احساس ندامت کے ساتھ۔ تو بہتر ہے اسے اپنے ”اصل“ کی طرف لوٹنے دو۔ تاکہ جب وہ تمہارے پاس واپس آئے تو خالص تمہارا ہو کر آئے۔ اس کے دل پہ کوئی بوجھ نہ ہو۔ آنکھ میں کوئی پچھتاوا نہ ہو۔ دل چین اور سکون سے بھر ا ہو۔“

اس کی نرم گفتگو اور دل پر اثر کرنے والا لہجہ افسون کے دل پر اثر کر گیا تھا۔ تاہم وہ پھر بھی تذبذب کا شکار تھی۔

”تم کیا کرو گے؟“ اس نے فکر مند سے پوچھا تھا۔

”کچھ زیادہ نہیں۔ اس کا بھائی دینی میں ہے۔ اسے یہاں لاؤں گا۔ سمجھاؤں گا کہ جزا اور سزا کا اختیار تمہارے ہاتھ میں نہیں ہے۔ تم ایک انسان ہو۔ ایک بہت اچھے انسان۔ تمہیں درگزر کا اختیار دیا گیا ہے۔ تمہیں اپنے اسی اختیار تک محدود رہنا چاہیے۔“ حریر نے گہرا سانس بھر تے ہوئے سنجیدگی سے کہا تھا۔

”وہ آجائے گا کیا؟ مجھے لگتا ہے رافع سے مختلف ہو گا۔ غصے میں بھرا ہوا۔ نفرت کا مارا ہوا۔ اس کی بیوی نے اسے رسوا کیا۔ اس کے بھائی سے اظہار محبت کر کے وہ کیسے پھولے گا سب کچھ۔“ افسون کی آنکھوں میں پریشانی تھی۔ اضطراب تھا۔ رافع کو کھودینے کا دوسوہ تھا۔ حریر نے اسے تسلی دی۔

”وہ نہ آیا تو میں رافع کو وہاں لے جاؤں گا۔ میں

سب کچھ ٹھیک کر لوں گا۔“ حریر کی سنجیدگی نے اسے ایک نامعلوم گھبراہٹ میں مبتلا کر دیا تھا۔ وہ خوف زدہ سی اپنے بھائی کو دیکھتی رہی۔

”تم رافع افراہیم کو وہاں لے جاؤ گے؟ اگر افراہیم واپس نہ لوٹا تو؟“ وہ بے چینی بھرے لہجے میں چینی۔

”یہ تمہارے لیے افراہیم کے جذبات کی آزمائش ہوگی۔ افراہیم کو واپس جانا ہو گا۔ اور تم اسے نہیں روکو گی۔“ حریر نے افسون کا ہاتھ نرمی سے پکڑ کر دیا تو وہ نرم آنکھوں سے مسکرا دی تھی۔ وہ افراہیم کے لیے قربانی دینے پر تیار ہو گئی تھی۔

اس نے انتظار کی سولی پہ خود کو چڑھا کر اپنی محبت کے کنڈن بننے تک کی ”جدائی“ کا سفر آج سے ہی شروع کر دیا تھا۔ آج حریر کو کہہ بی چلے جانا تھا۔ اور آج رات ہی رافع نے سارے عذاب اس کے حوالے کر کے اپنا پرانا نمبر آن کر لیا تھا۔ اسے پاکستان میں ایک پہلی اور آخری کال کرتا تھی۔ اس فون کال میں رافع نے اپنی نام نہاد بیوی سے کچھ کہا تھا۔

”میں اس قابل نہیں کہ کسی سے بھی معافی مانگ سکوں۔ لیکن مجھے تم سے ہر صورت معافی مانگنی ہے۔ جو طوق تمہارے گلے میں میرے نفس کی سرکشی اور تمہاری ہاں کے جلاہانہ فیصلے کی بدولت لٹکا ہوا ہے۔ اس طوق سے تمہیں رہائی دینا چاہتا ہوں۔ میں اپنی اب تک کی زندگی میں کوئی اچھا کام کرنا چاہتا ہوں۔۔۔ عنایہ! میں تمہیں طلاق دیتا ہوں۔ اس عذاب ناک بندھن سے آزاد کرتا ہوں۔ اس رشتے سے جو میرے اور تمہارے دونوں کے لیے شرمناک ہے۔“

جب وہ روتے ہوئے فون پر بات کر رہا تھا تب۔ افسون اس کے پاس نہیں تھی۔ لیکن اس نے رافع کی ایک ایک بات کو سن لیا تھا۔ اور اس کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی تھی۔ افراہیم کا یہ انتہائی قدم؟ بعد میں اس کا ایک مرتبہ پھر اسپتال میں داخل ہونا، افراہیم نے یہ فیصلہ جلد بازی میں نہیں کیا تھا۔ اسی دن حریر دینی فاح کے پاس چلا گیا تھا۔ اسی رات عنایہ کا

انتقال ہو گیا تھا۔ اور پھر اگلے چار دن بعد فاح کی فون کال نے برسوں کے رنگ اتار دیے تھے۔ اس نے اپنے بھائی کو واپس بلانے کا مشورہ جان فرسنا دیا تھا۔ اس نے رافع کے اندر سے ہر کانٹا نکال دیا تھا۔

اس رات ہوائی اڑے کے بڑے بال میں معمول سے زیادہ گہما گہمی تھی۔ یا اس کی نگاہ کا واہمہ یا کمال؟ اسے تو ہر جگہ ایسا ہی ہجوم دکھائی دے رہا تھا۔ اور اس ہجوم سے وہ ہر جگہ بھاگتا پھر رہا تھا۔ اس شمال سے لے کر جنوب تک، مشرق سے لے کر مغرب تک پھیلی وسیع و عریض دنیا میں کیا اس کے لیے تنہائی کا کوئی ایک گوشہ موجود تھا؟ کوئی ایسا ٹھکانہ جہاں وہ اکیلا بیٹھ کر مٹی بھر کے ”اسے“ رو لیتا۔ اسے یعنی ”عنایہ“ کو۔ اور عنایہ کو رونے کے لیے اس کے پاس ایک آنسو بھی نہیں تھا۔ کیوں؟

وہ آج بھی ظہران سے جا رہا تھا۔ لیکن افسون سے بھاگ کر نہیں۔ افسون کو بتا کر۔ اور آج وہ اسے ایئر پورٹ۔ ”پکڑنے“ نہیں۔ چھوڑنے آئی تھی۔ جہاز اب ہزاروں فٹ کی بلندی پر تھا۔ افسون اس سے بہت دور رہ گئی تھی۔ اور وہ اپنے دوشے ہوؤں کو منانے کے لیے افسون کی آنکھوں میں ”منظر“ بھر کے جا رہا تھا۔ کون جانے رافع افراہیم کو واپس لوٹایا نہیں؟

\*\*\*

یہ جھگڑے برآمدوں والا گھر تھا۔ سال کے بارہ مہینے اس گھر میں ٹھنڈک ہی رہتی تھی۔ واوی کا یہ گھر ٹھنڈا اور پرسکون تھا۔ اس ٹھنڈے گھر میں مختصر سے افراد تھے۔ دادا، دادی، فاح، رافع اور عنایہ۔

عزہ شادی کے بعد اپنی سسرال میں تھی۔ وہ ایک خوش حال زندگی گزار رہی تھی اور کم کم یہاں آتی تھی۔

اس جھگڑے برآمدوں والے گھر کے پچھواڑے میں ایک عظیم بننے والے موسیقار کا امانا دفن تھا۔ ایسا موسیقار جو اپنے فن میں عروج کمال سے پہلے ہی طبعی

موت مر گیا۔ یا اسے مار دیا گیا۔ اس نے "حق" لکھ کر جنوں کو ختم کر دیا گیا۔

اس کا وائلفن "اس کا جھوٹا سا پارسی کارڈ" اس کے تخلیق کیے ہوئے تھے اور اس کی تصویریں۔ وہ کمرہ جہاں پچھلے گیسٹ سے آنے والے زائرین کا جھگڑا لگا رہا تھا اور ادائی کو بہت غصہ آتا۔

"استغفر اللہ ساری دنیا کے نئے اکٹھے ہو گئے۔ اب جانے کس کس کی قبر سے مردوں کو جگائیں گے۔" اور دادا تو ذرا لحاظ نہ کرتے تھے۔ لاشیں اٹھاتے اور دھل چاڑھ لٹے۔

"میرا لی گھوٹے ڈوم۔ میرے گھر میں حرام کام نہیں ہوں گے۔ نکل جاؤ یہاں سے۔" ان کے گیتوں سے نفرت گزرتے وقت کے ساتھ رافع سے بھی لپٹ گئی تھی۔

عناہ کا جنوں اسے کھو دینے کا دکھ جب اسے پاگل کر رہا تھا۔ جب وہ کمرہ بند کیے گئی کئی گھنٹے وائلفن یہ اپنی انگلیوں کو زخمی کرتا۔ تب نائی دروازہ بجایا کر ٹھک جاتی تھیں۔

پھر ایک وقت میں دستک کا اندازہ مل گیا تھا۔ رافع چونکا، ٹھٹھکا اور کسی طوفان کی طرح اٹھ کر دروازے تک گیا۔ پھر اس نے دروازہ کھولا اور دھاڑے بند کر دیا۔

عناہ اس کی حالت زار پر رو رہی تھی۔ وہ اس کی مجرم تھی۔ اپنی ماں کی فریاد برادری میں اس نے رافع کا خون کر ڈالا تھا۔ اس کے جذبات کا اس کے دل کا اس کی روح کا اس کی محبت کا۔

وہ رافع کے دکھ میں پور پور غرق تھی۔ اور اپنے تئیں اس کے دکھوں اور رستے زخموں کا دوا کرنا چاہتی تھی۔ اس نے بڑے غلط وقت رافع کو ڈھارس دینی چاہی تھی۔ اس کے زخموں پر مرہم رکھنا چاہا تھا۔

"سارا تصور ماما کا ہے۔ انہوں نے مجھے مجبور کیا۔ ورنہ میں نے تو ہمیشہ تمہیں چاہا۔ تم سے محبت کی۔ تمہیں دل میں بسایا۔" وہ ایک خواب کی کیفیت میں روتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ اور رافع اسے جھنجھوڑ رہا

تھا۔

عناہ کے بال بکھر گئے تھے۔ اس کا دوش گر رہا تھا۔ "یہ تمہیں اسے اور پوری چاہت تھی۔ جو تم نے میری آنکھوں کے سامنے فالخ کا گھر بسایا۔ مجھے دن رات زخمی کرنے کے لیے۔ تم تو میری تمہیں عنایہ۔ پھر فالخ کی کیسے بن گئیں؟" وہ روتے لگا۔ بچوں کی طرح جیسے اس کا من پسند کھلونا چھن گیا تھا۔ جسے وہ دوبارہ حاصل کرنے کے لیے دوا دیا کر رہا تھا۔

"میں تو اب بھی تمہاری ہوں۔" یہ عنایہ نے کیا کہہ دیا تھا۔ اسے خود سمجھ میں نہ آیا۔ رافع تو بالکل تھا۔ دیوانہ تھا اور شاید وہ کسی نشے میں بھی تھا۔ عنایہ کو خود مختار رہنا تھا مگر اس میں اتنی عقل نہیں تھی۔

رافع نے اسے کمزور پڑتے دیکھ کر حتم لیا۔ وہ اس کے ہاتھوں میں لرز رہی تھی۔ وہ رافع کی بانہوں میں تھی اور بے بسی سے رو رہی تھی۔ اس کا دل بند ہونے لگا۔ دماغ بند ہونے لگا۔ وہ فالخ کی بانہوں میں بھی یا رافع کی؟ اسے اندازہ ہی نہیں تھا۔ وہ اپنی عزت و وقار اور انسانیت کو کھو چکی تھی۔

اور اسے اس حال میں نہ صرف وادی بلکہ فالخ نے بھی سلاخوں والی کھلی کھڑی میں سے دیکھ لیا تھا۔ وہ ایک انتہائی نازیا صورت حال تھی۔ کوئی انہیں اس حالت میں دیکھ کر کسی بھی نتیجے کی انتہا پہنچ سکتا تھا۔ اور فالخ تو ایسے جیسے کوئی پتھر تھا۔ جس میں جان ہی نہیں تھی۔ یہ داتا تھے جو چلا رہے تھے اور اپنی لاشیں سمیت رافع کے سر پہ کھڑے برس رہے تھے۔

"بد ذات، بد نیت۔ میرے گھر میں غلط کام کرنا ہے؟ اپنے بھائی کی "معزت" کو روندنا ہے؟ آستین کے سانپ نکل جائے۔ نکل جا۔" دادا پاگل ہو رہے تھے۔ اسے جو توں اور لاشیوں سے مار رہے تھے۔

"اپنے نیک ماں باپ کے نام پہ ایک دھبہ ہے تو۔ نکل جا بے غیرت۔" وہ اسے گلایاں دیتے اور جوتے مارتے تھے۔ یہ آوازیں آج بھی رافع کو نیرامت کے گڑھے میں دہاتی تھیں۔ اسے سروں رلاتی تھیں۔

پھر جب وہ دیامی کے گھر سے ہمیشہ کے لیے طوفانی

بارش میں نکل آیا تھا۔ وہ سیدھا تانا کے پاس آیا تھا۔ ان کے قدموں میں گرا تھا۔ ان سے ہر طرح کرکڑا کر معافی مانگی تھی۔ ساری رات فالخ کے دروازے پہ بیٹھ کر روتا تھا۔ نائی کے قدموں میں گرا تھا۔ تانا کے قدموں میں گرا تھا۔ فالخ سے غائبانہ معافیاں مانگتا تھا۔ مگر "شر خطا" کے اس خطاوار کے لیے کسی کے پاس معافی کا ایک لفظ نہیں تھا۔

وہ دھتکارا ہوا تھا۔ ٹھوکریں کھایا ہوا تھا۔ اور اس نے خدائے کریم نے اپنا کرم کر دیا۔ اس کے لیے توبہ کے دروازے کھول دیے گئے تھے۔ وہ جرم کرنے میں اکیلا نہیں تھا۔ عنایہ اپنی بے وقوفی اور لاشروائی میں اس کے ساتھ تھی۔ بیکراں رحمت کی بارشیں افراہیم پہ برسی تھیں۔ کیونکہ وہ ہدایت کا طالب بن چکا تھا۔ دیا اور عنایہ اس سے مستثنیٰ تھیں۔ وہ ہدایت کی طلب گار نہیں تھیں۔

\*\*\*

وہ دونوں ڈوختے سورج کی شعاعوں کو الوداع کہہ رہے تھے۔ ان سے کچھ فاصلے پہ فالخ موجود تھا۔ ریٹنگ پہ کنبیاں نکالے کمری سوچ میں ڈوبا ہوا۔ وہ لوگ تین دن پہلے ڈن ہیٹ سے پاکستان پہنچے تھے۔ مدید کو اپنی اکلوتی چھو بھٹی کی گمانی موت کا بہت مددہ تھا اور عنایہ کے لیے دل بہت دکھتا تھا۔ ابھی کوئی اس کی جانے کی عمر تھی؟

اس کی ماں اب بھی ویسی ہی تھی جیکھی اور روکھی۔ لیکن اپنی زبان کے جوہر یہاں پہ دکھانے سے قاصر تھی۔ رافع بھی کل شام کی فلائٹ سے گھر آگیا تھا۔ اور جب سے آیا تھا۔ تین چار مرتبہ قبرستان کا چکر لگا چکا تھا۔ جہاں پہ ماما اور بابا تھے۔ اموں، دیا اور عنایہ تھے۔ دل ایسا بو جھل اور ویران تھا کہ کہیں بھی ٹھہرنا نہ تھا۔ اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی تھی۔ دل کو معافی کا سند یہ ملا اور توبہ نے قبولیت کی معراج تائی تو دل موم ہو کر پھل گیا تھا۔ اور آنکھوں سے سیل رواں بننے لگا۔

فالخ اسے زبردستی قبرستان سے واپس گھر لایا تھا اور بیٹے نے اسے نیند کی گولی اور چائے پلا کر سلا دیا۔ فالخ اور یہ کو اندازہ تھا۔ اب وہ جب اٹھے گا تو پہلے سے بہتر ہوگا۔ بو جھل سوچوں سے آزاد ہوگا۔ اور خود کو پہلے کی نسبت ہلکا پھانکے گا۔

جب دل کا غبار آنسوؤں کی صورت دھل جائے تو ساری کدورتیں رنجشیں عداوتیں ختم ہو جاتی ہیں۔ فالخ ریٹنگ پہ کنبیاں نکالے اب اطمینان سے دیا کو سوچتا ہوا اپنے ماں باپ کی گزشتہ زندگی میں کھو گیا تھا۔ جو ماضی کا ایک حصہ تھی۔

اس رات جب بابا گھر چھوڑ کر غصے میں نکل آئے تھے۔ تب بھلا کیا ہوا تھا؟ فالخ سوچنے لگا۔ سوچوں میں ڈوبنے لگا۔

اس رات افراہیم گھر سے نکل آیا تھا اور اب ایک سنسان کوشے میں سر تھا کہ کر بیٹھ گیا تھا۔ وہ جانتا تھا۔ وہ گھر میں روپا کے سر پہ کیسا مگر آکر آیا ہے۔ اور وہ اس صدمے کے زیر اثر ابھی تک ساکت ہوئی۔

اور جب تک اس کے حواس ٹھکانے آتے تب تک افراہیم واپس گھر چا چکا ہوتا۔ اور گھر جانے کے بعد افراہیم اسے سنبھال لے گا۔ اسے روپا کو سنبھالنا آتا تھا۔ مگر ان حالات کو کیسے سنبھالتا؟ جو ہر گزرتے دن کے ساتھ بگڑتے جا رہے تھے۔

وہ سوچتا رہا۔ شروع سے لے کر اب تک۔ روپا کی نہ سمجھ میں آنے والی کیفیات یا بیماری سے شروع ہونے والا سلسلہ امی کی موت۔ روپا کا دل بدن ذہنی شکستگی کا شکار ہونا۔ گھر سے آکٹا ہٹ "افراہیم سے ذہنی" جسمانی، روحانی دوری۔ ایک خاتم ہونے والی خواست کا احساس۔

یہاں آنے سے پہلے وہ ایک اور جگہ پہ بھی گیا تھا۔ کسی سے ملنے اور پھر اس نے اپنے ذرا پور کے ہاتھ کسی کو پیغام بھی بھجوا دیا تھا۔ وہ ایک ایک پہلو پہ غور کرتا رہا۔ ایک ایک نکتے کو سوچتا رہا۔

کڑیوں سے کڑیاں ملتی رہیں۔ اور پالا نراس کا دماغ ایک جسمی نتیجے پہ پہنچ گیا تھا۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور کچھ سوچتا ہوا سیاہ نازکول پہ چلنے لگا۔ آگے ہار اس نے مین روڈ سے ٹیکسی پکڑ لی تھی۔

ٹیکسی ایک پرانے ٹکے کی ٹیلی سڑک پر آرکی تھی۔ ٹیکسی ڈرائیور کرایہ لے کر چلا گیا تھا۔

افراہیم نے گہرا سانس بھرا اور تالا لگے دروازے کی طرف دھکا تو کبلی باڑپ ہاتھ جما کر دیوار پہ چڑھا اور پھر دوسرے ہی سنے وہ دیوار کھسکا کر تھا۔

اپنے پرانے گھر میں۔۔۔ اپنے باپ کے گھر میں۔ جہاں اماں کی خوشبو تھی۔ اور ان کے پیروں کی آہٹ، ان کے دھیمے قدموں کی چاپ۔ وہ ایک ایک آہٹ کو دل کے کانوں سے سنتا تھا۔ اور اس کی آنکھوں کے کنارے نم ہوتے ہوتے چھلک پڑتے تھے۔

وہ جھانڑیوں اور نوکلی گھاس میں دھنسنے پیر اٹھاتا چپس کے صحن میں چلنے لگا۔ دھول اور مٹی سے اٹا ہوا فرش۔ جگہ جگہ کوڑا۔ پتے، ٹنڈیاں، لکڑی کے گٹھے، کلنڈر پلاسٹک کے ٹھیلے۔ وہ جھونکے جھونکے قدم اٹھاتا اندرونی حصے کی طرف آیا۔ ایک ایک کمرہ کھولتے ہوئے وہ عجیب سے احساسات کا شکار تھا۔

اس گھر میں وہ زندگی کے بے شمار ادوار گزار کر گیا تھا۔ بچپن، لڑکپن، جوانی۔ اور شادی کے بعد کا مختصر عرصہ۔ وہ رویا کو عروسی لباس میں سجا کر اسی کمرے میں لایا تھا۔ وہ جس زندہ کمرے کی بند کڑیاں کھولنے لگا۔ روشن دان، دروازے کھولے اور مٹیاں جلائیں۔ آن کی آن میں پورا گھر روشن ہو گیا تھا۔

پھر وہ اس کو نے میں گیا جہاں پہ رویا کی جائے نماز ویسی کی ویسی ہی رکھی تھی۔ کھوئی یہ سچ بھی موجود تھی۔ وہاں۔۔۔ پر کچھ بھی آگے پیچھے نہیں تھا۔

وہ اس کمرے سے نکل کر چٹن میں آگیا۔ کچن کے حالات بھی ویسے ہی تھے۔ برتنوں میں چمک مفقود تھی۔ غبار آلود اور گرد میں اٹنے اسی چٹن میں ایک مرتبہ بریانی کے اندر سے سوت کے کیڑے نکلے تھے۔ جنہیں دیکھ کر رو بچا چلا کر حواس باختہ ہو گئی تھی۔ اور

بریشان تو افراہیم بھی بہت تھا۔ پھر وہ تیلے کو پچھلے صحن کی دیوار کے پار اٹ آیا تھا اور اگلی کئی راتیں پریشانی سے سو نہیں پایا تھا۔

پھر وہ چلتا ہوا برآمدے میں آگیا۔ گرل کے پار گھنا کمری شاخوں والا پتھر جس کے نیچے کوئی مصلے بچھا کر نماز پڑھتا رویا کو دکھائی دیتا تھا اور اس کے سامنے تیز طوفان میں دیا بھی جلتا تھا۔ تھی نا جیالی کی بات؟ انسانی عقل سے بہت آگے تک کی؟ اب وہ لائسنس جلتی چھوڑ کر میٹھیوں کی طرف آ رہا تھا۔ اس نے پہلے میٹھی پہ قدم رکھا اور جانے کیا کچھ نہیں یاد آیا تھا۔ رویا کا تیلے کے چھلکے سے پھسل کر گرنا اور شدید تکلیف کی حالت میں موت و زندگی کی کشمکش میں سے گزرتا۔ اور منڈیر سے جھانکتی انادیہ۔ جس کے ہاتھ میں کیلا ہوتا نہ ہو نامنڈیر پہ رکھی نوکری سارا راز فاش کر رہی تھی۔

وہ تیزی سے میٹھیاں چڑھتا اور آگیا تھا اور پھر دوسرے ہی پل وہ برابر والے صحن میں تھا۔

اندھیرے میں ڈوبا ہوا مکان کسی وحشت ناک ساحہ کی طرح خاموش کھڑا تھا۔

اسی صحن میں اسے تائی چلتی پھرتی دکھائی دیتی تھیں۔ ایک خاموش اور بے ضرر کردار۔۔۔ کچھ لوگ ایسے بھی تو ہوتے ہیں جو دکھ جھیلنے دنیا میں آتے ہیں اور اسی خاموشی کے ساتھ دنیا سے چلے جاتے ہیں۔

کسی بھی جزا اور سزا کے پیچھے پٹکان ہوئے بغیر کسی بھی نفرت و حسد کے جذبات سے مبرا۔

کتنے قیمتی اور انمول لوگ ہوتے ہیں وہ۔ جو دنیا سے تکلیف کی حالت میں اٹھتے ہیں لیکن آگے ان کے لیے کوئی بھی تکلیف کوئی بھی مشقت نہیں ہوتی۔ آگے ایسے لوگوں کے لیے موتی کے گھر ہوتے ہیں۔ اور سکون سے بھرے ٹھٹھے جام۔

اور اسی گھر میں ایک ظالم اور سنگ دل کردار بھی تھا۔ دادی کا کردار۔۔۔ ایک بے حس اور سخت دل عورت۔ مہر لگے دل والی عورتیں۔ سنگ دل عورتیں اور ان ہی میں سے ایک وہ بھی تھی۔ دادی جیسی دادی

کا پر تو مشکل ناسی عادتیں مزاج، نخوت اور وہی سنگ دل۔

یہ وہی صحن تھا جس میں اس نے تائی کو بہت دفعہ پٹنے دکھا تھا۔ وہ اتنی خاموشی سے مار کھاتی تھیں کہ شاید انہیں نہیں کسی اور کو یقیناً جا رہا ہو۔

پھر نائی کی وفات اور بعد میں دادی کا انجام؟

دکھ دینے والے خود بھی سکھی نہیں رہتے۔ اگر تائی نے بنا کسی شکوے، انتقام یا بدلے کے آنکھیں چپ چاپ موند لی تھیں۔ تو قدرت نے ان کا انتقام پورا پورا لیا۔ ایک ذرے کے برابر بھی کہا زیادہ نہیں۔

ویسا ہی سسک سسک کر تنہائی، تکلیف اور اذیت و بیماری کے ہاتھوں رنگ رنگ کے مرتا۔ جس رزق کو دادی نے نائی اور ان کے بچوں پہ تنگ کر رکھا تھا۔ وہ دادی پہ قدرت کی طرف سے تنگ ہو گیا۔ دم آخر تک وہ پانی کا ایک قطرہ بھی حلق میں اتارنے سے قاصر تھیں۔

اگر ہر انسان اپنے انجام کے بارے میں پہلے سے باخبر ہو تو وہ اتنی خود سری اور اڑ میں کیوں رہے؟

افراہیم نے گہرا سانس بھرا اور نارنج کی روشنی سے صحن میں جگہ جگہ پھیلے کوڑے سے پتہ چانچا کسی ایسی چیز کی تلاش میں۔۔۔ رہا جو اسے مطلوبہ جگہ تک پہنچا دیتی۔

اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹی کدال، کھربلی اور بیلچہ بھی تھا۔ جو کہ گھر سے آتے ہوئے ساتھ لایا تھا۔

وہ کچھ دیر کے لیے سوچتا رہا۔ اور پھر کھارے پانی والے ٹکے کے قریب آگیا۔ اس کے ساتھ چوترہ تھا۔ جس کے اوپر مٹی کے بنے چولے تھے۔ افراہیم کے گھر کی دیوار کے بالکل ساتھ۔

اس نے گہرا سانس بھرا اور کدال کو چولے کے اوپر مارا۔ ایک دو تین اور جو بھی ضرب کے ساتھ چولے اٹھ کر دوڑ جا گئے تھے۔ اس نے نارنج کی روشنی خضے سے گڑھے میں اتاری۔ پھر اس نے ہاتھ مار کر کچھ۔۔۔ چیزیں برآمد کی تھیں۔ یہ چند تعویذ تھے۔ کچھ کیلیں تھیں اور کچھ غلیظ کتہیں۔

افراہیم کا دل تیز تیز دھڑکنے لگا۔ اس کا اتانے کار نہیں گیا تھا۔ اس نے چرمی ٹھیلے میں سارا سامان ڈالا اور مکان کے پچھلے اور کچے حصے کی طرف آگیا۔ ایسی چیزیں یا تو ایک ٹھیلوں میں دفن کی جاتی ہیں۔ یا آگ جلاتے والے چولوں میں۔

جس سے وہ مل کر آ رہا تھا۔ اس نے افراہیم کے ساتھ غلط بیانی نہیں کی تھی کیونکہ وہ تاجو کا چھوٹا بھائی تھا۔ اور غلط بیانی کی سزا کو بہت اچھے طریقے سے جانتا تھا۔

وہ لڑکا اس کے دفتر میں چوکیدار تھا اور افراہیم کو بہت اچھی طرح سے جانتا تھا۔ دراصل یہ سارا سلسلہ اس کی گاڑی چلنے کے بعد ہوا تھا۔ اس کے قیمتی نقصان کی اطلاع دفتر میں بھی پہنچی تھی۔ پھر یہ خبر پھیلنے عملے تک بھی گئی۔ وہیں پہ تاجو کا بھائی بھی تنگ گیا تھا۔

افراہیم کو لگا تھا وہ بہت مرتبہ اسے کچھ بتانا یا کہنا چاہتا ہے۔ ایک دن افراہیم نے اسے ایک میل میں بلا کر پوچھ لیا اور پھر وہ و سیم تائی لڑکا اسے سب کچھ بتانا چلا گیا تھا۔ اپنی بسن کا لالچ، تاجو کا انادیہ کو چلاؤ ٹونے کی طرف راغب کرنا، انادیہ سے پیسے لے کر کھانا۔ وہ برا سرا ر عملیات اور تعویذ دھاگے اور آخر میں و سیم نے اسے یہ بھی بتایا کہ وہ نموس چیزیں کس کس جگہ دفن تھیں۔ افراہیم کا جیسے دماغ ٹھول گیا تھا۔ غصے، اشتعال اور نفرت کے بھانپنا جل اٹھے تھے۔ پھر اس نے اپنے اشتعال اور غصے کو قابو کیا تھا۔ اس نے خود پہ قابو پایا کیونکہ یہ جوش میں گناڑنے والا کام نہیں تھا۔

یہاں آکر اسے یقین آچکا تھا کہ و سیم نے جو کہا تھا۔ سچ کہا تھا۔ افراہیم وہ سارے ثبوت اکٹھے کرتا رہا جو اسے کسی کے منہ پہ مارنے تھے۔

اماں کا ذہن پسماندگی کی طرف مائل کرنے کا یہ موجب تھا۔ اور ہر چہرے کے اندر رویا کا چہرہ دکھائی دیتا تھا۔

اس عمل کے پیچھے یہی بھانپنا خواہش پوشیدہ تھی تاکہ اماں رویا سے بدگمان ہو جائیں۔ رویا سے نفرت کرنے لگیں۔



ماہنامہ شعاع مارچ 2017 166

بیوٹی بکس کا تیار کردہ

# سونہی ہیرائل

SOHNI HAIR OIL

- گرمے ہوئے بالوں کو روکتا ہے
- بے بال آگاتا ہے
- بالوں کو مضبوط اور چمکدار بناتا ہے
- مردوں، عورتوں اور بچوں کے لئے
- یکساں منید
- ہر موسم میں استعمال کیا جاسکتا ہے



قیمت - 150/- روپے

**سونہی ہیرائل** 12 جڑی بوٹیوں کا مرکب ہے اور اس کی تیاری کے مراحل بہت مشکل ہیں۔ ہر ایک جڑی بوٹی کی مقدار میں تیار ہونے سے یہ بازار میں باقی دوسرے شمعیں دستیاب نہیں، کراچی میں دستی خرید یا جاسکتا ہے، ایک بوتل کی قیمت صرف 150/- روپے ہے، دوسرے شمع والے سنی آؤڈیج کر جڑی بوٹیوں سے منگوائیں، ہر جڑی بوٹی سے منگوانے والے سنی آؤڈیج حساب سے بھجائیں۔

- 2 بوتلوں کے لئے 350/- روپے
- 3 بوتلوں کے لئے 500/- روپے
- 6 بوتلوں کے لئے 1000/- روپے

**نوٹ:** اس میں ڈاک خرچ اور ٹیکس چارج شامل ہیں۔

**منی آرڈر بھجئے گئے لئے ہمارا پتہ:**

بیوٹی بکس، 53- اورنگزب مارکیٹ، پیکٹور، فور ایم ای، جناح روڈ، کراچی  
دستی خریدنے والے حضرات سونی ہیرائل ان جگہوں سے حاصل کریں  
بیوٹی بکس، 53- اورنگزب مارکیٹ، پیکٹور، فور ایم ای، جناح روڈ، کراچی  
کتبہ عمران ڈائجسٹ، 37- اردو بازار، کراچی  
فون نمبر: 32735021

جائے۔ اس سے معافی مانگ لے۔ لیکن وہ ایسا نہیں کر سکا تھا۔ وہ بے بس پتھر پر گرا رہا۔ خود کو ملامت کرتا۔ خود سے نفرت کرتا۔

پھر چنانچہ اندی کے پانی میں سرسراہٹ ہوئی تھی۔ مدید کا سر پتھر سے اٹھا اور وہ لمحہ بھر کے لیے دم بخود رہ گیا تھا۔ پانی کی شفاف ابلق سطح پہ کوئی ہیرا بڑی شان سے دکھتا تھا۔ اور بڑی سبک خرمی سے پانی کی موجوں پہ سوار آگے بڑھ رہا تھا۔ مدید نے ایک جھٹکے سے خود کو پتھر سے اٹھایا اور دوسرے ہی بل وہ ہیروں سے دمکتا بریلیٹ اس کے ہاتھ میں تھا۔

پھر اس نے آواز کے مخالف سمت چلنا شروع کر دیا۔ پھر اس نے واپس کا سفر کرنا شروع کر دیا۔ اسے بالآخر واپس مڑنا ہی تھا۔ پلٹنا ہی تھا۔ اپنے مدار کی طرف، اپنے کھر کی طرف، اپنی ٹھکرائی ہوئی جنت کی طرف، وہ کھر جس کے چوٹی برآمدے میں ابھی تک اس کی اجڑی دلن سرسبز بوڑھائی اپنے ”جرم“ کی بھیانک سزا پہ حیران پریشان بیٹھی تھی۔

مدید کو اپنی دلن کے پاس جانا تھا۔ اس کی ویران آنکھوں میں ستاروں کی چمک بھرتی تھی۔ اس کی خالی سونہی کلانی کو روشن کرنا تھا۔ فالخ کاویا ہوا تختہ اس کی سندر کلانی میں سجنا تھا۔

اور سب سے بڑھ کر اپنی ماں کی توہم پرستی، تمام وسوسوں اور خدشات کو غلط کرنا تھا۔ انہیں ایک گڑھا کھود کر پیشہ کے لیے اس میں دفن کرنا تھا۔ تاکہ اس کی ماں کو پتا چل سکے کوئی انسان بد بخت یا منحوس نہیں ہوتا۔ بلکہ وہ اپنے نصیب اور مقدر کا دکھ، امتحان یا آزمائش بناتا ہے۔

یوں مدید ایک گمنام رستے کی طرف بڑھتا رک گیا تھا۔ اپنے گھر اپنی جنت کی طرف پلٹ گیا تھا۔ وہ جنت جو آج بھی اس کے آس پاس بکھری تھی۔ اور اسے فالخ جیسے دوست پہ فخر محسوس ہوتا تھا، جو سوچ کا ہی نہیں اخلاقی اور کردار کا بھی اعلیٰ انسان تھا۔ اور اس وقت فالخ جیسا پیارا انسان اپنی زندگی کی سب سے بڑی الجھن میں گم تھا۔ اور حریر سے اس کا

کسی آواز پر ٹھٹکا تھا اور پتھر کی ٹھوک سے زمین پہ جاگرا تھا۔ اس کا ہاتھ پتھر کی ٹوک سے گر کر کھانے کی وجہ سے پھٹ گیا تھا۔

اسے ہوا کے دوش پہ لہراتی یہ آواز بہت قریب سے آتی سنائی دی تھی۔ کرب و درد میں ڈوبا لہجہ۔ ٹوٹتا بکھرتا اور شکستہ کے احساس میں لہولہاں۔ یہ فالخ کا لہجہ تھا۔ یہ آنسوؤں میں ڈوبی آواز فالخ کی تھی۔ مدید جیسے پتھر پر گرا ہی پتھر گیا تھا۔

”اس نے میرے بارے میں برا گمان کیا تو کیوں کیا؟ میں اس کی بیوی تھی۔ نظر رکھوں گا؟ میں کوئی اپنے بھائی جیسا مرد ہوں۔ میں کوئی گدھ ہوں؟“

وہ بری طرح ٹوٹ کر رو رہا تھا۔ اسے مدید کی بدگمانی نے توڑ ڈالا تھا۔ اسے مدید کی نفرت نے کچڑی کچڑی کر دیا تھا۔ وہ لہولہاں تھا۔

مدید کو لگا جیسے اس کا دل پھٹ جائے گا۔ اس کا دل چاہا وہ بھاگ کر اٹھے اور فالخ کے منہ پہ دونوں ہاتھ رکھ کر اسے خاموش کر دے۔ وہ اپنا کرب سہ روپ فالخ کے الفاظ اور لہجے کے آئینے میں دیکھنے کا حوصلہ نہیں رکھتا تھا۔

”کوئی جائے اور اس کم نصیب کو پتا آئے۔ وہ کیوں اپنے دروازے پہ آئی خوشیوں کو ٹھوکر مار رہا ہے۔ وہ اپنا آپ بدگمانی کے پرزخ میں کیوں گرا رہا ہے؟ وہ اپنی ماں کے خدشات کو یقین کی انتہا پہ کھڑا کیوں کر رہا ہے؟ حریر! اسے بتاؤ فالخ ایسا نہیں فالخ ایسا بالکل نہیں وہ مدید ہے جو اپنی بیوی کی ایک نگاہ، صرف ایک نگاہ کی گستاخی برداشت نہیں کر سکا۔ صرف ایک پسندیدہ نظر کی۔ اور اسے دلن کے روپ میں دھتکار آیا۔ وہ مدید ہے کم ظرف۔ اپنا ظرف اور دل کشادہ نہیں کر سکا۔ اس کا دل تنگ بڑ گیا۔ اور یہ میں ہوں فالخ۔ جو اپنی بیوی کی بے وفائی کو جان کر بھی نہ اسے دھتکار سکا نہ چھوڑ سکا۔ تو بتاؤ حریر! انظار طرف کون؟“

فالخ کی زخمی ادھیڑی آواز مدید کے منہ پہ طمانچوں کی طرح بڑی تھی۔ مدید دم بخود رہ گیا۔ اس کا دل چاہا وہ بھاگ کر فالخ سے لپٹ جائے۔ اس کے قدموں میں گر

ہونے سے بچ گیا۔ اس نے خطا کی اور اس خطا پر شرمندہ ہو کر توبہ کے لیے گھٹنوں کے بل مہل کیا۔ اور یقینی طور پر یہ ہماری ماں کی دعاؤں کا اثر تھا۔ ماں کی دعاؤں کے حصار نے فالخ کو بھٹکنے سے بچالیا۔ اور توبہ کے دروازے رب کریم نے اس پر کھول دیے۔ مجھے میرا چھڑا ہوا بھائی مل گیا۔ فالخ ہمارے درمیان آ گیا۔ ہمارا آشیانہ پھر سے عمل ہو گیا اور ماں ہمیشہ کما کرتی تھی اللہ اپنے چرائیوں کو بچھنے نہیں دیتا۔“

ماں کن چرائیوں کے ہمیشہ جلنے کی بات کرتی تھی۔ ایک میں یعنی فالخ افراتیم اور ایک میرا نا سمجھ اور جذباتی سا بھائی فالخ افراتیم۔“

وہ حریر کے پاس بیٹھا تھا۔ جھکے پر آمدوں والی چھت کے اوپر اس نے مدید مالتے چھیل رہا تھا۔ عتاب اور دیا کے چالیسوں کے فوراً بعد دادا نے وہ گھر بند کر دیا تھا۔ اور یہ سب لوگ یہ سمیت مٹانے کے گھر میں شقت ہو چکے تھے۔ اس گھر میں ایسا کون تھا؟ جس کے لیے ادھر قیام کیا جاتا؟

مدید اور اس کی والدہ بھی یہیں تھیں۔ اس کا نضیال تو کسی قابل نہ تھا۔ جوانیہ جیسی مہمان کو ٹھہر سکتا۔ انیہ، نائی اور مدید یہاں بہت آرام اور سکون سے تھے۔ ان کی فلاٹ ایک ہفتہ بعد کی تھی۔ تب تک ان کا قیام مٹانے کے گھر میں ہی تھا۔

آپ سوچتے ہوں گے۔ مدید تو اس رات نہ ہاں اپنی شادی والی رات انیہ سے بدگمان ہو کر اسے سو جان سے ٹھکرا کر انیہ کے کھیتوں میں ہمیشہ کے لیے گم ہو گیا تھا تو پھر انیہ اور مدید ایک کیسے ہوئے؟

اور یہ اس وقت کی بات تھی جب وہ انیہ کی ”پکار“ کو اپنی ٹھوکروں سے اڑا کر ٹیوپ کے کھیتوں کو چیرتی ندی کے کنارے چل رہا تھا۔ اس حال میں کہ مدید کا چہرہ آنسوؤں کی برسات سے بھینکتا تھا اور وہ آئین کو موڑتا اور ہاتھ کی پشت سے آنکھوں کو رگڑتا۔

آنسوؤں کی دھند اس کے گمنام رستوں کو دھندلائے رہتی تھی۔

معاً دل میں سلگتے نفرت کے شعلوں میں گھر مدید

سدا ب چاہتا تھا۔ وہ لفظوں کا جادو کرتا تھا۔ اسے لفظوں کو اپنے من پسند قالب میں ڈھالتا آتا تھا۔  
”جانے وہ حسد کی کون سی قسم تھی۔ جس میں جتنا ہو کر دیا نہ دوسروں کی زندگیوں میں چنگاریاں بھرس  
فالخ نے حیرے پوچھا تھا۔  
حریر اٹھ کر فالخ کے قریب آگیا۔ مدید اب بھی  
ماٹوں کے شغل میں مصروف تھا اور عقیقی ٹھنکی کے  
سامنے بیٹھا تھا۔ ٹھنکی کے پار اس طرف پلنگ کے اوپر  
رافع نیم دراز تھا۔ جس طرح مدید کا سارا دھیان حریر کی  
طرف تھا۔ اسی طرح رافع کا سارا دھیان بھی حریر کی  
طرف تھا۔ وہ تینوں بہت خاموشی کے ساتھ حریر کو سن  
رہے تھے۔

”دنیا کا ہر مذہب سب سے پہلے انسانیت کا درس  
دیتا ہے۔ جو انسانیت کے رتبے سے گرے وہ انسان  
نہیں، حیوان بن جاتا ہے اور مجھے یہ کہہ دینے میں کوئی  
قباحت نہیں ہے۔ دیا نای وہ عورت اپنے اندر  
”حیوانیت“ رکھتی تھی اور مجھے افسوس سے گستاخ رہا  
ہے۔ آپ میں سے ہر کوئی اس کی حیوانیت کو تسکین  
پہنچاتا رہا۔ اس کی ناجائز خواہشات کو قبول کر کے۔

وہ ہر احساس سے غلابی تھی اس لیے آپ اس سے  
کسی بھی رحم دلی کی توقع نہیں کر سکتے تھے۔ وہ ایک  
حیوانی جذبے کے تحت اپنے سے وابستہ ہر انسان کو  
”زک“ پہنچاتی رہی۔ اپنے شوہر اور بیٹی تک کو نہیں  
بخشا۔ تو پھر بیانی رشتے اس کے نزدیک کیا معنی رکھتے  
تھے؟ اسے جس جس نے تکلیف دی۔ حتیٰ کہ رائی  
کے دانے برابر بھی اس نے اپنا بدلہ دینا کر لیا تھا۔

یہ سلسلہ تب سے شروع ہوا جب اس کی حقیقی تائی  
نے اس کو ٹھکر آکر ایک عام لڑکی کو اہمیت دی اور اسے  
اپنے شان دار بیٹے کی دلہن بنا کر لے آئیں۔ دراصل  
اس کے ذہن میں تب سے ہی نفرت و حسد کے بیج نمو  
پانے لگے تھے۔ جو وقت گزرنے کے ساتھ بڑھ کر نتاؤر  
درخت بنتے رہے۔ وہ اپنی نفرت میں اس حد تک پہنچ  
چکی تھی کہ شاید ہی رويا کے بیج اس کے بد اثرات  
سے محفوظ رہتے؟ میں ابھی بھی کہتا ہوں۔ یہ جو تم اتنی

ٹھوکروں، سانحوں اور جھوٹوں کے بعد بھی اپنی جگہ پر  
تن کے کھڑے ہو، صرف اور صرف اپنی ماں کی  
ابھائیوں، نیکوں اور دعاؤں کی بدولت۔  
بندہ دیا؟ وہ ایک بد قسمت عورت۔ جس نے پوری  
زندگی اپنے سے وابستہ رشتوں کو اذیت دی۔ اس کی  
حکومت کو تب نزال آیا جب اس کا شوہر اپنے بہنوئی  
کے انکشاف کرنے پر دیا کے اندر کی سزاؤں اور شر کو پائی  
تھا۔

تمہارے ماموں نے دیا کو شدت سے چاہا تھا۔ وہ  
اس کے باطن کا کرمہ روپ نہ سہ سکے اور جلد ہی  
زندگی ہار گئے۔ اب دیا کے لیے حکومت کرنے اور  
رعایا پر حکم چلانے کے لیے صرف وہ مظلوم کردار  
موجود تھے۔ اس نے اپنی سلطنت پر تشدد زد کو ب والا  
اپنا رب دابو سے ہی قائم رکھا اور یوں اپنی من پسند  
راج دھانی میں مرضی کے فیصلوں سے خوش ہوتی  
رہی۔

ہاں اس نے زندگی میں پہلی مرتبہ دھوکا کھا کر عنایہ  
کی خوشی کا اپنے تئیں اہتمام کرنا چاہا تھا۔ اس نے اپنی  
مرضی سے ایک بساط بچھائی۔ آپ سب ایک عورت  
کی جذباتی بلک میلنگ کا شکار ہو گئے اور دیا شاید پہلی  
مرتبہ عنایہ کی خوشی کا احترام کرتے ہوئے غلط فہمی میں  
ماری گئی۔ پھر اسے اپنی غلطی کا بڑے غلط وقت میں  
احساس ہوا۔ وہ ایک مرتبہ پھر غلط فیصلوں کا شکار ہوئی  
اور اس نے عنایہ کی زندگی میں اپنے لیے نفرت بھردی  
تھی۔

عنایہ کی پہلی طلاق کے بعد دیا کے لیے عنایہ کے  
پاس نرمی، عزت مان اور فرماں برداری میں سے ایک  
جذبہ بھی نہیں بچا تھا۔ حتیٰ کہ رحم بھی نہیں۔  
وہ دنیا کا بہترین تجزیہ نگار تھا۔ وہ حریر تھا۔ لفظوں  
کے ریشم بننا، اوچھڑنا اور مرضی کے معالی نکالنا۔ وہ لمحہ  
بھر کے لیے خاموش ہوا تھا تو ہر طرف بے چینی پھیل  
گئی تھی۔ بے قرار سافالغ اسے دیکھنے لگا۔ رافع نے  
پلنگ پر کروش بدل کر اپنے اضطراب کو ظاہر کیا تھا اور  
مدید کیونکہ کھانا بھول گیا تھا۔

”معا“ حریر نے دوبارہ ٹوٹے سلسلے کو جوڑتے ہوئے کہا۔  
”غلط اور ناجائز فیصلہ کچھ بھی ہو۔ کبھی کامیاب  
زندگی کی ضمانت نہیں بنتا۔ ایسا ہی ایک غلط فیصلہ میں  
بھی کرنا چاہتا تھا۔ اپنی ماں الفیہہ کا اپنے باپ فوزان  
مشہدی سے دوبارہ نکاح کروا کے تب مجھے ماں مظلوم  
لگی تھی۔ لیکن میری بہن افسون نے میرا غلط فیصلہ  
ماننے سے انکار کر دیا تھا اور یوں میں گھر سے نکل آیا۔  
یہ میری ناراضی کا ایک اظہار تھا۔ جس کا شاید سب کو  
خیال ضرور تھا۔ لیکن وہ میری ناجائز خواہش کے  
سامنے ڈٹ گئے تھے۔ تب ہی ہماری زندگیاں سانحوں  
سے محفوظ رہی تھیں۔ غلط فیصلوں کے سامنے ایسے  
ہی ڈٹ جانا چاہیے۔ ایک دیوار بن جانا چاہیے۔

جبکہ یہاں ایسا نہیں ہوا۔ عنایہ کی زندگی کا وہ سری  
مرتبہ فیصلہ بھی اس پر مسلط کر دیا گیا۔ تب وہ ذہنی اور  
جذباتی طور پر ٹوٹ چکی تھی اس کی بیماری اس فیصلے  
کے خلاف ایک مزاحمت بن کر اترتی اور شاید تب ہی  
رافع کو بھی اپنی ”خطا“ کا احساس ہو گیا تھا۔ وہ نہ امدت  
سے سر جھکا کر اپنے خاندان کی نگاہوں سے اوچھل  
ہو گیا۔ لیکن اس کے بعد کیا ہوا؟

عنایہ کی دن بہ دن بگڑتی ذہنی حالت۔ دیا کی  
لا پرواہی۔ ایک ماں ہونے کے ناتے وہ کسی بھی مقام پر  
اس کی سچا نہیں بنی۔ اس نے بیٹی کا درد بانٹنے کی  
ضرورت محسوس نہیں کی۔

اسے صرف ایک بیماری نہیں تھی۔ اسے صرف  
حسد اور اشتقام کی بیماری نہیں تھی۔ وہ ذہنی طور پر دو  
بڑی بیماریوں کا شکار تھی۔ سٹیزسک یعنی دو سروں کو  
ستانے، ذہیل و خوار کرنے اور ذلت کے عمیق گڑھے  
میں گرا کر ان پر حکومت کر کے خوش ہونے کی  
بیماری۔

اور ٹرو کولینٹ یعنی انتہائی وحشی، انتہائی بے رحم  
اور انتہائی سنگدل۔

اس کی ان بیماریوں کا بہت بچپن میں علاج ہوتا تو یہ  
ممکن تھا کہ وہ ابھی صحت مند زندگی گزارتی۔ اور نہ خود  
ایب نارمل ہوتی اور نہ دوسروں کو کرتی۔

وہ لمحہ بھر کے لیے رکا اور پھر گہرا سانس بھرتے  
ہوئے بولا، وہ سب سانس روکے اسے سن رہے تھے۔  
”اور رہی عنایہ تو اس سارے قصے میں عنایہ ایک  
ایسا کردار ہے۔ جو آپ سب کی نگاہوں میں ہی نہیں،  
بلکہ پوری دنیا کی نظر میں سب سے زیادہ قابل رحم،  
مظلوم اور معصوم کردار ہوگی؟ آپ سب کے دل میں  
عنایہ کے لیے ڈھیر ساری نرمی اور ڈھیر ساری ہمدردی  
ہے۔ کیونکہ بظاہر وہ سب سے زیادہ قابل رحم کردار  
تھی۔ مگر میری نگاہ میں وہ قطعی طور پر ”ہمدردی“ کے  
لائق نہیں۔“

حریر کے ان الفاظ نے ان سب کے اندر بے چینی  
بھردی تھی۔ رافع بے قراری سے ایک مرتبہ پھر کروش  
بدلنے لگا۔ فالخ اسے یک نیک دیکھنے لگا۔

”یقیناً“ وہ بہت صابر تھی۔ اپنی ماں کی ہر مار، ہر  
تکلیف کو چپ چاپ سہہہ جانے والی۔ اسے ڈنڈوں  
کے ساتھ اوچھڑ دیا جانا، وہ تب بھی اپنی ماں کا ہاتھ نہ  
روکتی۔ یہاں تک بھی اس کی فرماں برداری سمجھ میں  
آتی ہے۔ لیکن اپنی ماں کے جوتوں، لالٹوں، ٹھونسوں  
اور ڈنڈوں کے جواب میں ایک لفظ منہ سے نہ نکالتا اور  
ایک بھی آنسو تکلیف کا اوکا دیا کر کے نہ گراتا؟ کیا یہ صبر  
تھا؟“

صبر بھلا کیا ہوتا ہے؟ صبر کی تعریف میرے سامنے  
یہ نہیں۔

صبر وہ پرہیز گاریوں کا نام ہے۔ یعنی نفس، اعمال نیک  
اور افعال پسندیدہ پر کارند ہو۔ ان کاموں کے کرنے  
میں عہدہ اس سے کوئی یا سستی ظاہر نہ ہو۔ میرے  
نزدیک اپنی ماں سے ظالمانہ حد تک مار کھانے کے بعد  
”ف“ نہ کرنا صبر نہیں تھا۔ وہ کچھ اور ہی تھا۔ کچھ ایسا  
جو آپ کے ذہن شاید قبول نہ کرے۔

وہ ”اُذیت پسندی“ تھی۔ مجھے کہنے میں کوئی عار  
نہیں کہ عنایہ بہت ”اُذیت پسند“ تھی۔ اسے ماں کے  
دیے دکھ گرب اور تکلیف سے جو اذیت ملتی تھی۔ وہ  
اسے نفسیاتی طور پر تسکین پہنچاتی تھی۔  
اس نے رافع سے دستبرداری کا فیصلہ تب کیا جب

اس کی ماں نے اسے بر تشدد انداز میں فالج کی طرف مائل کرنا چاہا۔ وہ اس تشدد میں انوکھی لذت کو محسوس کرتے ہوئے سر جھکائی تھی۔ پھر اس اذیت پسندی کی تسکین کے لیے اور بھی بڑے مواقع تھے۔ جب لوگ اس سے ہمدردی رکھتے اور اس کی ماں سے نفرت کا اظہار کرتے۔ وہ تب بھی بڑی تسکین محسوس کرتی تھی۔

اس نے اپنی کم عقلی میں ایک غلطی کی تھی۔ رافع سے بلاوجہ ہی اظہار محبت کر کے جسے فالج نے اپنے کانوں سے سنا اور عنایہ کے دادا نے بھی۔ تب فالج کے کسی بھی انتہائی فیصلے سے پہلے عنایہ کے دادا اور داوی نے اسے اپنی طرف سے کھلی بے حیائی کا ارتکاب کرتے دیکھ کر گھر سے نکال دیا تھا۔

عنایہ کے لیے یہ کھلی بے عزتی تھی۔ اس تو پہن نے اسے نیم پاگل کر دیا۔ وہ دادا اور داوی سے خفا ہو گئی۔ وہ ساری دنیا سے خفا ہو گئی تھی۔ وہ اپنی ماں سے خفا ہو گئی تھی۔

پھر کیے بعد دیگرے دیا کے بھیانک فیصلے۔ رافع سے عقد خالی اور عنایہ کی اذیت کا ایک اور سفر۔ اس نے پھر بھی ماں کو نہیں روکا۔ حالانکہ اس نے ذہنی، روحانی، قلبی طور پر رافع کو قبول نہیں کیا تھا۔ نہ کرنا تھا۔ پھر بھی اس نے دیا کے سامنے سر نہیں اٹھایا۔ یہ نہیں کہ وہ بہت فریاد بردار تھی۔ یا بہت صابر تھی۔ بس وہ اذیت پسند تھی۔ خود کو تکلیف میں دیکھ کر تسکین حاصل کرتی تھی۔

حریر خاموش ہو گیا تھا۔ جیسے کہنے کے لیے اس کے پاس اور کچھ نہ ہو۔ تاہم سننے والوں کو بہت کچھ سننے اور زندگی کو آگے بڑھانے کے لیے میسر آ گیا تھا۔



پھر زندگی کا یہ سفر کا نہیں۔ آگے بڑھتا گیا۔ آگے چلا گیا۔

فالج اپنی فیملی میں ترقی کرتا رہا اور رافع قاتل سے بھی بہت آگے نکل گیا۔ اس نے حریر کی گتھکو کو اپنے لیے

زاہرہ تصور کیا اور کامیابی کے سفر پر نکل کھڑا ہوا۔ اس نے اپنی تعلیم مکمل کی۔ اسلامک لاء میں پڑھنا لمایا۔ بی ایچ ڈی کی اور دو دھیرے دھیرے زینہ بہ زینہ آگے بڑھتے ذہنی اسکا رہن گیا۔

پھر اس نے اپنے آبائی گھر کو اگر ایک عالی شان قرآن اکیڈمی بنائی اور زندگی کے اس سفر کو اپنے اور انسان باپ کے لیے رحمت اور جنت کا نمونہ بنا دیا۔ گزرتے سالوں میں نانا نے فالج اور بیچہ کی شادی کر دی تھی۔ وہ ایک بھر پور ازدواجی زندگی گزار رہے تھے اور ان کے پیارے سے بیٹے کو دیکھ کر رافع کی ساری محنتیں اتر جاتی تھیں۔ محمد ولی اپنے باپ سے بڑھ کر سچا کالا ڈلا تھا۔

مدید ذہن ہیک میں ٹیولپ کی پیدوار کا سب سے بڑا کاشت کار بن چکا تھا۔ ایک بیٹی اور بیٹے کے ساتھ اس کی زندگی مکمل اور بھرپور تھی اور مدید خود آج بھی فالج کے لیے انتہائی دیوانہ تھا۔

ان کی زندگیاں ہر قسم کے آسیب سے پاک ہو چکی تھیں۔ آسیب وہ نہیں ہوتا جو گروہوں میں پھونکوں کے ذریعے انسانوں پر مسلط کیا جاتا ہے۔ بلکہ آسیب انسانوں کے اندر ہی موجود ہوتا ہے۔ جب وہ انسانیت کا لہو اتار دے تو خود خود آسیب میں ڈھل جاتا ہے۔ ابھی دیا نے سوچا تھا۔ وہ افراتیم اور اس کے بچوں کا نام و نشان مٹا دے گی۔ لیکن ایسا نہ ہو سکا۔ اس کی ہزار سفلی چالوں کے باوجود۔ روہا اور افراتیم اپنی زندگی اور وقت پورا کر کے مرے۔ کہ ہر انسان اپنے وقت مقرر سے آگے پہلے نہیں جاسکتا۔ دیا کے لاکھ براچانے کے باوجود روہا کے گھر کے چراغ روشن تھے۔ انہیں کوئی بھی طوفان بجھا نہیں سکا۔ بلکہ ان چراغوں کی روشنیوں سے دور دور تک چراغیں ہوتا چلا جا رہا تھا۔

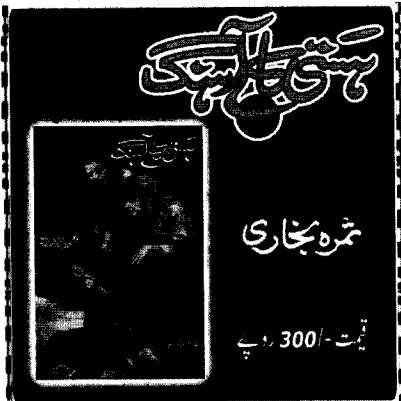
اور خود دیا کا انا نام و نشان مٹ گیا تھا۔

اس نے جو قبر افراتیم اور روہا کے بچوں کی خاطر ان کے لیے برا سوچ کر کھودی تھی۔ اس میں وہ خود بھی گری اور اس کی بیٹی عنایہ بھی گری۔

اگر انتقام لیا تو انتہاؤں پر جا کر، اگر اپنے شوہر کو

تکلیف دی تو انتہاؤں پر جا کر، اگر اپنی بیٹی کو اذیت سے دوچار کیا تو انتہاؤں پر جا کر۔ وہ ایک انتہا پسند عورت کی اذیت پسند بیٹی تھی۔ ان دونوں ماں، بیٹی میں ایک چیز مشترک تھی اور وہ چیز بھی شدت پسندی۔ ماں نفرت کی انتہا تک شدت پسند تھی۔ عنایہ اذیت کی انتہا تک شدت پسند تھی اور ان دونوں ماں، بیٹی کی اس شدت پسندی نے انہیں اپنی ہی کھودی قبر کے کڑھے میں اتار دیا تھا اور حریر فالج کو نہ بھی بتا تا تو وہ تب بھی جان گیا تھا۔ عنایہ اپنی ساری کوششوں کے باوجود پس منظر میں تھی۔ یہ اپنی کسی بھی کوشش کے بغیر صرف نیکی، اچھائی، صلہ رحمی اور حلیم قلبی کے باعث آج بھی منظر پر تھی اور فالج کے دل میں بھی اور یہی۔ یہ کے صبر کا صلہ اور قناعت پسندی کا پھل تھا۔ وہ ایک صبر کرنے والی ماں کی بہت صابر بیٹی تھی۔ اس نے اپنے تمام تر صبر کا ہمراہ کیا تھا اور وہ رافع افراتیم تھا۔ ایک ان دیکھی بدنامی کا طوق لیے مگر مگر ٹھٹھا اور دھکے کھاتا۔ وہ جو راندہ دغا گاہ تھا۔ خدا نے اسے تمام لیا۔ اسے عزت، علم، حلم اور مرتبے سے سرفراز کیا۔ اسے دین و دنیا کا علم دیا۔ اس کے آبائی گھر میں خدا کی رحمتوں کا ٹیکراں نازل تھا۔ اور اسی گھر کی نئی تعمیر شدہ بلڈنگ کے کما تھے پر اس کے باپ کا نام چمکتا تھا۔ یہ چراغ روشن تھے اور رافع کی زندگی کے بعد بھی روشن ہی رہتے۔ پھر ایک دن ظہران سے سنرا کارڈ رافع کے تپے پہنچا تھا۔ یہ شادی کی تقریب بہ سعید کارڈ تھا۔ مدید تو اپنے خاندان کے ہمراہ ظہران پہنچ بھی گیا تھا۔ اسی سنرے کارڈ کے ساتھ رافع کے لیے ایک نامہ بھی تھا۔ اسی میلان پر ہی کے ہاتھ سے لکھا ہوا۔ محبتوں کے قافلے تو اہ و انجم کی منزلوں کی طرح ہوتے ہیں۔ بغیر رے اپنے مدار میں چلتے چلے جاتے ہیں۔ ان کا کوئی پڑاؤ نہیں ہوتا۔ ان کی کوئی منزل نہیں ہوتی۔ سفر، محبت کے مسافروں کے نصیب میں ازل سے لکھا ہے۔ انہیں ریکنا نہیں، چلتے چلے جانا ہے۔ یہ نامہ رافع سے پہلے فالج کے ہاتھ گھا تھا۔ اس نے نہ صرف نہایت عقیدت سے پڑھا، بلکہ اس کا جواب بھی لکھ کے بھیج دیا تھا۔ ”مہم معزز میزبانوں کو

تکلیف سے دوچار کرنے عنقریب پہنچ رہے ہیں۔ شہزادی افسون جان! خاطر جمع رکھیے۔ اور اپنے باوا کے محلوں کو بھول جائیے۔ ہمارا رافع گھر داماد بننے کے لیے بالکل تیار نہیں۔ آپ کو اپنی سرسراہٹ، نفس نفیس تشریف لانا ہی ہوگا۔ رافع کی بے رنگ زندگی میں رنگوں کو آنا ہی ہوگا۔ آخر افسون جان نے رافع افراتیم کو پانا ہی ہوگا۔“ نامہ خوشبوؤں میں لپٹا ظہران کی فضاؤں میں تیرتا ہے مڑہ جاں فزا سنا چکا تھا۔ افسون جان پہ مبارک باد کا فیضان آچکا تھا اور آج رافع افراتیم بڑے دنوں بعد مسکرا رہا تھا اور اس کی مسکراہٹ پہ ریگستانوں میں شگوفے کھلتے تھے اور افسون جان کی بچیہ اسود کے کالے پانیوں جیسی آنکھوں میں سفید کنول تیرتے تھے۔ وہ اپنی قرآن اکیڈمی کی ذیلی سڑک پر جیبوں میں ہاتھ ڈالے مسرور سا گھر کی طرف جا رہا تھا اور یہیں کہیں ایک پگلی سی عورت پتھروں کو اٹھاتی اور جھولی میں بھرتی آتی جاتی بھاتی۔ رافع اسے اکثر تاسف سے دیکھتا اور نگاہ چرا جاتا تھا۔ وہ بھی برہنہ ہوتی اور کبھی کسی بھیس میں لپٹی۔ وہ بنا جو تھی۔ جو ”شہر خطا“ میں اپنے سیاہ گناہوں کی سزا بھگتتی پتھروں سے جھولی بھرتی سڑکوں پر اندھا دھند بھاگتی تھی۔ بھاگتا اس کے مقدر میں لکھا گیا تھا۔



مژدہ بخاری

قیمت: 300 روپے



## مومنہ صدف جلد دہوی

وہ ایک ایسا ہی فقیر، ایسی ہی ہنسی تھی جو کبھی اس درویش کا مقدر مانی جاتی تھی اور پھر سالہا سال وہاں نہ گونجی تھی۔ اور اب گونجی تو — تو سب ہی چٹنیاں گرا دی گئیں، بوبے باریاں کھول دیے گئے کہ وہ ہنسی ہر اور گردش کرتے ہوئے ہر گوشے میں سما جائے۔ کہیں تو قید ہوتی، ٹھہر جائے اور اس لیے بھی کہ سب جان لیں کہ کیا ہوا اور کیسے ہوا۔؟

عمو جان ٹوٹے عد سے والا چشمہ جمائے چھت سے جھانکنے لگے تو بڑے بھیا مسواک چھوڑ کر غسل خانے سے باہر نکل آئے سویرا بھا بھی گئی کے سنے ہاتھ لیے بڑ آمدے میں اکٹری ہو میں بجاہر چلائی میں سے مکھن نکالتی تائی کے ہاتھ تھے تو بھی اماں کے گھٹنے میں سر دیے دبک گئی۔ اور اماں انہیں تو جیسے بیٹھے بیٹھے لقمہ ہی ہو گیا۔ انہیں یقین کرنا مشکل ہو گیا۔ یقین تو اس بچی نیند سے نکلے پیر بھاگنے والے چاند کو بھی نہیں ہوا تھا، جس کے دائیں پیر میں سوئی جیسے کے سب خون کی لیکر بڑ آمدے سے مکھن تک چھلتی چلی گئی تھی۔ اور وہ بڑی فرصت سے اس فقرے والی کو دیکھنے لگا تھا۔

راجہ بازار کے پرانے محلے کی اینٹ سے اینٹ جڑی ہوئی تھی، کتوں نے سر — نکال دکھا، کتنے چوبارے چڑھ کر جھانکنے کھڑے ہوئے۔ اس نے آخری بار تب وہ فقیر سنا تھا جب وہ لڑکھن کے آخری زینے پہ کھڑا تھا یا شاید اس سے پہچلے زینے۔ بات پرانی تھی مگر اتنی پرانی بھی نہیں تھی کہ اسے ٹھیک سے یاد نہ رہتی۔ بیٹھا ماضی خروماغوں کو بھی خوب یاد رہتا ہے۔

دو چٹیاں بنائے، درمیانے گول موبل کر کے انہیں

آتا ہے۔ مسکراتا، ہانپیں پھیلا کر، سر جھکا کر خوش آمدید کہتا، اپنے پر اٹھاتا۔ ان میں جیسے دو عم زاد اور دو ماں، جائے دکھانا ہے، کل ملا کر تین لڑکے اور ان تینوں کے مابین وہ لڑکی نما لڑکا۔ ان ہی جیسی چٹلون قیص پنے، بال انگلی کی پور برابر کٹوائے، سر پہ ٹوپی جمائے، پیروں میں کھینیاں چڑھائے۔ تنگ گلی میں بلا گھمائی، سب کے چھتے چھترائی، گیند کراتی، کچھ اچھائی، چھتیں پھلا گئی، وہ ”پیمان“ عرف ”پری“ تھی۔

ان تین لڑکوں سے بھی بڑھ کر لڑکا، جو لڑکا بن کر دکھانے میں کوئی کسر چھوڑ بھی دیتی تو بایہ کہہ کر پوری کر دیتے کہ اس کھر میں چار پنے ہیں۔ تب ہی اماں سچ کرتیں، تین بچے اور ایک بچی۔ تو وہ جوابا کاپچہ اور اماں

کی بچی تھی، وہ چاند کی جڑواں اور اس سے پورے دو منٹ چھوٹی تھی، جسے وہ تنفہ کی طرح سینے سے لگائے گلی گلی پھرتا تھا۔ جو چاند کی دیکھا دیکھی میں آتی ہوں، ”میں آتا ہوں“ کہا کرتی۔ کوہ کراس کی سائیکل پہ سوار ہو جاتی اور اس کے ساتھ پورے راجہ بازار کی سیر گولا کنڈا چوستے، ریوڑیاں کھاتے، پان چباتے، کیا کرتی۔

اماں کی سلائی کے لیے ڈوریاں، بٹن، نلکیاں خریدی جارہی ہیں تو تائی جی کے لیے مسالے، راندے اور چھلے اپنے لیے، بھی اردو بازار سے گنتائیں تو کبھی عمو جان کے لیے بوہری بازار سے دو داؤں کی شیشیاں، اور ہوا کے سنک سائیکل اڑاتی، وہ واپس کاسفر چاند کو پیچھے بٹھا کر طے کرتی۔ گھر پہنچنے سے پہلے وعدے کم و عیدیں ہوتیں کہ اگر کسی کو پتا چلا کہ وہ سائیکل چلاتے بھرے بازار میں سے گزر کر آئی ہے تو وہ پھر اس کی شکل کو ترس جائے گا۔ اور چاند بھلا جھلا تھا کہ کسی کو پتا کراس کی شکل کو ترستا۔ وہ اس کا دم چھلا تھا تو وہ اس کی دم چھلی۔ اماں لاکھ منع کرتیں کہ مت اسے بازار لے کر جایا کر، مگر مینے میں ایک آدھ چکر تو لگ ہی جایا کر تھا۔ اور تائی بر ملا کہتیں۔

”اور اگلی کاسیہ بڑ گیا ہے اس بھاگوں والی پر۔“

لڑکھن سے وہ ہاتھ آگے بڑھی تو اماں نے دو دھمو کے اسے جڑے اور تین چاند کو اور زبردستی اسے گھر بٹھایا۔ شرت چٹلون سے قیص شلوار تک حدیث کر لائیں۔ انگلی پور برابر بال پھر شانوں کو چھونے لگے۔ اور سر پہ موجود ٹوپی کو دھونے نے ہٹاتے ہوئے اپنی جگہ بنا ڈالی۔ ”میں آتا ہوں۔“ ”میں آتی ہوں۔“ کا سفر تمام ہوا تو کہیں جا کر بیان عرف پری انہیں کواچھی لگی اور مائی کو بس گزارے لائق۔

گھر تو بٹھا ڈالا مگر چھت کی خالی منڈیر پر چڑھنے کی پابندی کیسے عائد کرتیں۔ بھائیوں کے ساتھ چھت پہ چڑھنے سے بھلا کون روک سکتا ہے۔ اماں دوانت عکوسی رہ جاتیں۔

”کوئی لڑکی ایسے اپنے بھائیوں کے ساتھ چھت پر چڑھی دیکھی ہے کبھی؟“

اور وہ اماں کی بات پہ ہنس ہنس کر دہری ہوتی سرنفی میں ہلا ملا کر کہتی۔ ”کبھی نہیں اماں جی، کبھی بھی نہیں۔ لڑکیاں کیوں اپنے بھائیوں کے ساتھ چھت پہ چڑھنے لگیں؟ وہ تو دوسروں کے بھائیوں کے ساتھ



چڑھتی ہیں نا اہل۔“ اور اماں کی تو آنکھیں ابل رہی ہیں۔  
 باہر آنے کو تیار ہو جائیں اس بات کو سنتی۔  
 ”تو یہ سب دیکھتی ہے اوپر جا کر؟ اور تیرے بھائی؟“  
 ”وہ سب بھی تو دیکھتے ہیں نا اماں! تو کیا میں نہ دیکھوں؟“

”وہ لڑکے ہیں؟“

”لڑکے ہیں یا بے حیا ہیں؟“

”بھائیوں جیسی نہیں بننا چاہیے۔ سمجھی۔؟“

اور وہ معصومیت سے سر ہلا کر دہرائی ”بھائیوں جیسا نہیں بننا چاہیے۔“

پھر چاند کتنی بار اسے بلانے آیا مگر وہ نظریں پڑا کر اماں کو سختی جو ایسے میں بس چولہے چڑھی ہندیا کو تنکا کرتی تھیں۔

”چل بنا پری!“ چاند اسے کھینچتا۔ کم بخت چاند بھی تا کھینچنے کی فطرت سے نہ باز آیا کبھی۔ آسمان نہ ہو تو جہاں کو بھیجے اور پھرت پھرت ہو تو بیان کو ”تیرے بغیر میں ادھر ہوں۔“

”جامیرے بھائی، چاند پورانی اچھا۔“ آنکھیں ڈبڈبا جاتیں اور کتابیں کھول کر بیٹھ جاتی۔

”تو گڈی نہیں اڑانے کی اب؟“ وہ تعجب سے سوال کرتا۔

”میں گڈی توڑا ہی اڑاتی تھی، میں تو خود ڈور سنک اڑتی تھی۔ اب میری ڈور کسی اور ہاتھ میں تھما دی گئی ہے اور وہ مجھے اڑانا نہیں چاہتے۔“

\*\*\*

اماں اور تائی کی بدولت بھائیوں سے قربت بندرتج کم ہونے لگی تو کتابوں سے بڑھنے لگی۔ پھر اسکول کے بعد کالج جانے کی ضد پکڑی۔ کالج، جس کی شکل کبھی بھائیوں تک نے نہ دیکھی تھی وہ وہاں جانے کی ضد کرنے لگی۔ اماں اور عمو جان موٹی بازار میں گوشتے تلے کے کام سے وابستہ تھے اور ایسی ہی ایک دکان پرانے قلعے میں بھائیوں کو بھی کھول دی جسے تینوں مل کر سنبھالتے۔

”لڑکیاں کہاں پڑھتی ہیں اتنا۔؟“  
 ”تعلیم کی کب سے صنف ہو گئی؟ مرد اور عورت سب پر فرض ہے۔ دونوں محض سے کلاس میں آئیں گے تو بھی سیکھتے ہوئے آئیں گے۔ مجھ تک تو یہی بات پہنچی ہے۔ کیا آپ تک صرف مردانہ حصہ آیا؟“

”تعلیم کا سایہ پڑ گیا ہے بھانگوں والی پس۔“ تائی کا منہ بنا۔

”تعلیم کا سایہ پڑے تو بھانگوں والی ہی ہوئی تا پھر۔“

”تیرے بھائیوں نے کب اتنا پڑھا۔؟“ اماں نے ناگواری سے دیکھنے کی حد ہی کر دی پھر۔

”خود تو کہا تھا کہ بھائیوں جیسا نہیں بننا۔ اب بھائیوں جیسا بنارہی ہو۔“

”لوگ تھو تھو کریں گے کہ بسم اللہ کلا تھ والوں کی لڑکی نے پڑھنا شروع کر دیا اور بھائی ان پڑھ رہے گئے۔“

”تھو تھو اس پہ نہ کریں جو نہ پڑھے اس پہ کریں جو پڑھے۔ پھر تو ایسوں کو بھی پڑھنے کی ضرورت ہے۔“

”بڑی سبکی ہوگی۔“ تائی نے کانوں کو ہاتھ لگا کر ”جابل رہتے سبکی نہ ہوئی، عالم ہوتے سبکی ہونے لگی۔“

اور اس بحث کا اختتام ایسا ہوا کہ جہاں تک بھائی جانے لگی پری وہاں تک اڑ کر جانے لگی۔ اماں کو اگلی فکر نے گھیرا کہ بڑھی کبھی لڑکی کے لیے پھر ایسا بر کہاں سے آئے گا؟ کون بتائے گا گھر تک کون لائے گا؟

”اجائے گا پری کے لیے تو کوئی شہزادہ آئے گا بابو ساروپ دھار کر۔“

ابا اسے شاید بچ کی بری سمجھ بیٹھے تھے کہ اس کے لیے کسی شہزادے کے خواب سجانے لگے۔ سو وہ ابا کی اجازت سے کالج جانے لگی۔ بیان سے کیا بیان ابا نے بھایا تو پری نے بھی پری ہونے کا حق ادا کرتے اڑ کر کتابوں کے صحراؤں میں ساربانوں کے ہمراہ رخت سفر باندھا۔ وہ سفر جس پہ ابا نے بڑے ہن سے ”من لگا کر کہا تھا کہ جہاں تک تعلیم جانے گی وہاں تک پری اڑ

کر جائے گی۔ سو اسے ایک ایسی دنیا میں پرواز بھرنے کی اجازت بنا ڈور کے دے دی گئی جس کا کوئی انت نہ دیکھا نہ سنا۔ علم مزرع حیات، علم مزرع موت۔ بس انت ہی ہوا پھر۔ ابا کی روح نے آسمان میں جاتے جاتے اسے اڑتے دیکھا، آنسو بہائے نہ چاہتے ہوئے بھی پر کائے اور اسے واپس زمین والوں میں بھیج دیا۔ اور بتایا دل پر کے پری زمین پر مادی گئی۔ علم کے پھوٹے سوتے خشک سالی میں بدل گئے۔ بیان ابا نے کیا تھا عمو نے نہیں کہ بھایا جاتا۔ ابا نہ رہے تو بیان کہاں باقی رہنا تھا؟ اور بچ میں بیان کو لگا اسودہ پائی نہیں ہے۔

”یہ پڑھائیوں کے چوٹیلے اپنے گھر جا کر پورے کرنا ابا۔“ تائی نے زبان اور سر دونوں ہلانے اور اس نے نہ زبان ہلائی نہ سر ہایا کہ بعد بھائی بیاہ دیے گئے اور وہ الگ ہوتے گئے۔ پھر اگھر سونا ہونے لگا۔ صرف ایک چاند کنوارہ رہ گیا اور ایک۔

وہ سرخ رنگ پسندی تو اماں کہتیں۔ ”کنواری لڑکیاں سہانوں والے رنگ نہیں پہنتیں۔“ وہ لالچ رنگ اور ڈھ کر لال رنگ اتار دیتی۔

وہ شادی بیاہ۔ میک اب کرتی تو تائی رگڑ رگڑ کر منہ دھوا دیتیں۔ ”کنواری لڑکیاں یوں بنی سنواری نہیں ہیں۔“ اس روز کے بعد وہ بھی بنی نہ سنواری۔

وہ کالا رنگ پسندی تو تائی ڈینگنے لگتیں۔ ”کنواری لڑکیاں ایسے مامی رنگ نہیں پہنتیں۔“

اور وہ اماں تائی کی شکل دیکھتی رہ جاتی کہ کنواری لڑکیاں پھر کرتی کیا ہیں؟ ان کے لیے ہر بات میں ”نہیں ہے تو ہاں“ اس بات میں ہے؟

”چنگ اڑانے کی۔؟“ چاند دکان سے لوٹتے ہی اس کی کلائی تھام کر اسے کھینچنے لگتا۔

”اماں مجھے ڈانٹیں گی وعدے وعید یاد کرائیں۔“

”اور چاند اس پہ چپ اور ڈھ لیتا اور پری دکھ۔“

پھر ایک کے بعد ایک رشتہ ٹھکرایا جانے لگا۔

”چوہ بڑھی لڑکی کو کسی کم پڑھے سے کیسے بیاہ دوں۔؟“ اماں کیا کی بات۔ خود قائم ہو گئیں۔ تعلیم بھلے وہاں تک نہ گئی ہو مگر شہزادے کا انتظار تو اماں کو

سوتے سے اٹھانے لگا۔ گھر میں رہتے کام ہی کتنے تھے بھلا۔؟ دو گھنٹے کم اور بس کام ختم۔ وہ کام بنیاتی اور پھر سارا دن دل بسلاتی۔ دل بسلانے کو بھی کچھ چاہیے ہوتا ہے، کوئی بندہ، کوئی مشغلہ۔ اور وہاں نہ بندہ تھا نہ کوئی مشغلہ۔ فراغت ایسی ملی کہ بستر سے جا لگی۔ پہلے درد حقیقہ رہنے لگا، پھر گردے کا درد۔ ٹیسٹ گرائے گئے تو سب ٹھیک تھا۔ تائی اور اماں سارا دن بستر پر پری کو آوازیں لگاتی رہتیں۔

”پری بستر سے اٹھ جا، تھوڑا چل پھر لے۔“ وہ اٹھ جاتی، چل پھرتی۔

”پری جھاڑو لگا دے۔“ وہ جھاڑو لگا دیتی۔

”پری“ اٹا کوندہ کر روٹیاں بنا دے۔“ وہ آٹا کوندہ کر روٹیاں بنا دیتی اور بلاواری خانہ صاف کر کے اپنی پرانی کتابوں کو کھولتی، انہیں دباغ میں گھولتی۔ پرانی کتابوں کا پرانا سبق نیا سمجھ کر دہرائی، رٹے لگلی رہتی۔

”پری کبھی ہنس بھی دیا کر۔“ اور بس اماں اور تائی کا کہا گیا ایک یہ کام ہی اس سے نہ ہوتا۔

”کچھ تو میری مرضی کا بھی ہو گا ورنہ ہی سہی۔“ پھر درد حقیقہ نے ایسا جکڑا کہ وہ بستر کو محبوب ٹھہری اور تائی اٹھتے بیٹھتے کہتیں۔ ”یہی بیمار لڑکی کو کون بیلے آئے گا؟“

”شہزادہ نما بابو۔“ اماں، ابا کی بات دہرا کر رو دیتیں۔ بات کو تھوں چڑھی تو آتے رشتے بھی جاتے رہے۔ اب خرے ادھر سے نہیں، ادھر سے ہونے لگے تھے۔ دم، درد، طبیب، حکیم، تعویذ سب کو دیکھا مگر افاق نہ ہوا۔

پھر چاند ہی ضد کر کے اس کے سارے ٹیسٹ کرانے لے گیا۔ ٹیسٹ بھی ٹھیک رہے بس وہی ٹھیک نہ رہی۔ ڈاکٹر نے صاف کہا ”دماغی دباؤ ہے۔“

اس کی شادی کر دیں۔“ رات گئے وہ اماں کے پیروا بنے لگا۔

”اماں پری کی شادی کر دیں۔“ وہ ٹھیک ہو جائے گی۔



وہ ابھی چند روز قبل ہی اس نئے مکان میں شفٹ ہوا تھا اور یہ آواز جیسے معمول کا حصہ تھی۔ جانے کیا مسئلہ تھا اس عورت کے ساتھ؟ ہر وقت چپچیپ چٹھاٹائی ہی رہتی تھی۔ کبھی بچوں پر برستی، کبھی برتنوں کو زور زور سے بٹختی، مگر اسے لگتا اس کے عتاب کا زیادہ تر نشانہ یہی لڑکی بنتی تھی جس کا نام مہو تھا۔ وہ کمرنگ برس کے چاچلے تھی اور اب مہو کی دبی دبی سسکیاں سنائی دے رہی تھیں۔

انہر کچھ بے چین سا ہوا تھا، دل چاہ رہا تھا اٹھ کر ایک بار دیوار پار دیکھے تو سنی، آخر ایسی کیا کی تھی اس

سرمای کی نرم گرم دھوپ نے آنگن میں ڈرا جھلیا تھا، نکھ استھرا سا آسمان آج کچھ زیادہ ہی پیارا لگ رہا تھا۔ جھاگ کی مانند بڑے بڑے سفید بادلوں کے پہاڑ سے نیلے افق پر پھیلے تھے۔ چھت پر دیوار کے ساتھ کین کی کرسی لگی تھی جس پر بیٹھا وہ چائے سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ سامنے میز پر اخبار پھیلا ہوا تھا۔ چڑیوں کی چھماہٹ گونج رہی تھی۔ آج اتوار تھا اور کچھ فراغت بھی تھی۔

”تاخیر چاکر کر دیا بھلا اس صورت کے ساتھ کون پسند کرنے والا ہے ہمیں، مگر یہ بات تمہارے بھائی کی سمجھ میں نہیں آئی، آئے دن کسی نہ کسی رشتے والے کو لے کر آجاتے ہیں اس پرنت نئی فرمائشیں مکرختہ ہو گئی میری اب کھڑی اپنی رونی منخوس صورت کا ماتم نہ کرنی رہتا جلدی سارا بچن سمیٹ کر نیچے آؤ، پیرنوں کا ڈھیر رکھا ہے دھونے کے لیے۔“ نسوانی پاٹ دار بھدی آواز نے اس کی سماعت کو جھنجوڑا تھا۔ یہ آواز دیوار پار سے آرہی تھی۔

نبی کیسے پہلے سی ہو گئی؟ یہ سب نظر کا دھوکا ہے جو ہر اس نظر کو ہوتا ہے جو غماہ کو جاچتی ہے۔ وہ پھر سے پنی کرنے لگی۔

”تو سلیم کے ساتھ خوش نہیں ہے۔۔۔ اس نے تجھے پابند کیا ہے؟“

”سلیم مجھے کیا پابند کرے گا، وہ تو خود پابند ہے۔ میرا لال جوڑا پھنسا میری ساس کو پسند نہیں تو میرا کالا رنگ اوڑھنا میرے سر کو۔ میرا چھت پہ جانا میرے دیور کو برا لگتا ہے اور میرا بچنا سنورنا میرے میاں کو اور میرا پڑھنا سب کو ہی اچھا نہیں لگتا۔ کتاب کھول لوں رسالہ یا اخبار۔۔۔ وہ ہر نظر کی گالی بن جاتی ہے۔“

”تو یہاں اگر پڑھ لیا کر۔“

”جائز کام بھی چھپا کر کروں۔“

”شادی کے بعد بہت کچھ سنا پڑتا ہے پری۔“

”ہر مسئلے کا حل شادی نہیں ہوتا، تھوڑی سی آزادی ہوتا ہے۔ جو بیٹیاں ماں باپ کی دلیہ پھل کے سانس نہ لیں، وہ میاں کے ہاں جا کر سانس بھریں گی اس کی کیا گارنٹی ہے؟“

”گارنٹی تو کسی بھی چیز کی نہیں دی جاسکتی۔“

”لیکن تھوڑی کوشش تو کی جاسکتی ہے۔ کوئی جیل۔۔۔ وسیلہ۔“

”لڑکیوں کی آزادی کا یہ معاشرہ قائل نہیں۔“

”لڑکیوں کی بربادی کا قائل ہے؟ سب نہ کرنے دو لیکن کچھ تو کرنے دو۔“

”نصیب میں ہو تو سب ہو جاتا ہے پری۔“

”نصیب کا ہی رونا روتے رہے تو کبھی کچھ نہیں ہوگا چاند۔“

”میاں کا رنگ چڑھ گیا ہے بھانپوں والی کو۔“ تائی باہر سے اونچی آواز میں بھرو کر رہی تھیں۔ اندر چاند کی پٹی مکمل کرنی پری زخمی نظروں سے چاند کو دیکھ کر اٹھنے لگی۔ اس نے ہاتھ حمام لیا۔

”پری۔“

پری کی نظریں مرکز اپنی کلائی پہ گئیں اور کلائی سے بھائی پہ۔

”پری نہیں بھل پری۔“

اماں حیران، پریشان۔ ”یہ کہاں کی سہمیں اور کس سے کرے گا اس کی شادی؟“

”سلیم کیسا رہے گا؟ قدر دان ہے، خوش رہے گا۔“ اماں سے رائے مانگ کر اپنی رائے دی۔

”وہ کالا بھگت۔“

”سانولا بے کلا نہیں۔۔۔“

”کم پڑھا لکھا۔ پری بی اے ہے۔“ اماں نفی میں سر ہلانے لگیں۔

”بی اے ہے، سی اے نہیں۔ اماں! کسی روز ذہنی دیاؤ سے دماغ الٹ جائے گا پری کا۔“ اور دماغ تو اماں کا الٹا پھر زامو قطار روٹنے لگیں۔

”میں سلیم کو ہاں کر رہا ہوں۔“ اور دروازے پہ کھڑی پری وہیں سے ہٹتی چاند۔

اس کے پیچھے تھا وہ اس کے پیچھے چھت تک آیا تھا۔

”جس نے پہلی سانس بانی ہو اس پہ گمان ہوتا ہے کہ وہ آخری اس بھی بنائے گا۔“

”تو شادی کے بعد ٹھیک ہو جائے گی۔“ وہ نظریں چر کر بولا۔

”پہلے مرض کی تشخیص تو کرنی ہوتی۔“ وہ شاکی نظروں سے ماں جانے کو تک رہی تھی۔

”سلیم تجھے پڑھائے گا۔ اس نے پیمان باندھا ہے۔“

”ضرور باندھا ہو گا پیمان، پیمان کا کام ہی بندھ جانا ہے۔ چاہے یہاں بندھے یا وہاں۔“ چاند نے ہاتھ اس کے سر پہ دھر دیا۔ نہ وہ ہنسی نہ وہ روئی۔

خون کی لیکروں میں جبرگئی تھی جیسے چاند وہیں جم گیا تھا۔

اور وہ اپنے دوپٹے کے پلو کو پھاڑے چاند کے پیر پر باندھا رہی تھی۔

”ان جو بڑے عرصے بعد ایسے ہنسی ہے۔“ وہ اپنے پیر پہ اس کے ہاتھوں کو پٹی باندھتے ہوئے کچھ رہا تھا۔

”ایسے کیسے؟“ اس نے ہاتھ روک کر چاند کو دیکھا۔

”پہلے جیسی۔۔۔ کھل کر۔“

وہ ہنسنے لگی۔ ”میں بندھ گئی تو سوچا نبی کھول دوں، ایسا نہ پنے کی بات ہے جب میں پہلے سی نہیں رہی تو





لڑکی میں اس کا بڑی شدت سے دل چاہا ہوا تھا۔ اس لیے کہ وہ کتنی بد صورت ہے، کیونکہ اس کا: ب میں لہلی رشتہ مسترد ہوتا تو اس کی بھانج ہر بار اس کی صورت کو ہی مورد الزام ٹھہرائی تھی۔

وہ کرسی سے اٹھا پھر رک گیا۔ ”نہیں یہ بہت ہی معیوب اور غیر اخلاقی حرکت ہو جائے گی۔“ دل کو سمجھا کر ہلایا، مگر دوسری جانب کی بن بادل برسات

بنک بھر لیا جائے بار بار وہ اپنے باپ سے اس سلسلے میں بات کر چکا تھا، مگر مرموزین جواب بوڑھا ہو چکا تھا بغیر لالچھی کے چلا نہیں جاتا تھا۔ سماعت اونچا سننے کی عادی تھی، مگر اس ایک معاملے میں وہ کچھ بھی نہیں سنا تھا۔ یوں باپ، بیٹے کی درمیانی فضا کچھ کشیدہ تھی اور موبو باپ، بھائی اور بھابھی کے درمیان پس رہی تھی۔

ابانے پاؤں اٹھی سیڑھی رکھائی تھا کہ پاؤں بہت گمیا، مہو نے بمشکل انہیں تھام رکھا تھا، لیکن بغیر کسی سہارے کے وہ ان کا توازن بحال نہیں کر سکتی تھی۔

”چھاپے،“ ہمیں سے گر کر مگر مہب جائے۔“

بڑبڑاتے ہوئے وہ دوبارہ سے اپنے کام میں مصروف ہو گئی۔

مہو کی چیخیں بڑھتی جا رہی تھیں۔

لیا تھا اس کا دل چاہ رہا تھا وہ اس کے ابا سے ملے جائے، لیکن اس کی بھابھی کی تیز دھار نظریں اسے مہو بہ باتیں بنانے کا موقع مل جاتا اور اس لڑکی کی رسوائی تو اسے کسی طور گوارا نہیں تھی۔

تو پھر اب کیا کرے؟ گھر میں کوئی بڑا بھی نہیں تھا۔ وہ ماں، باپ کی اکلوتی اولاد تھا اور وہ تو کب کے راہ عدم سدھار چلے تھے۔ ایک چاچی بھیس جو ایک تو دوسرے

نے اسے ہنوز بے چین کیے رکھا تھا۔

وہ بچن سمیٹ کر برتن دھونے کے بعد باہر نکلی تو مخصوص خوشبو کا بھونکا اس کے نشتوں سے لکرایا اتنی دلکش اور معطر سی خوشبو نے جیسے اس کے اندر کے بوجھل پن کو زائل سا کر دیا تھا۔ وہ کتنی ہی دیر کھڑی اس خوشبو کو اپنی سانسوں میں اتارتی رہی یہ کسی مردانہ پرفیوم کی خوشبو تھی، مہو نے اکثر اس خوشبو کو دیوار کے اس پار محسوس کیا تھا۔

”گلتا ہے یہ بندہ پرفیوم کی پوری بوتل ہی خود پر اُنڈیل لیتا ہے۔“ وہ اکثر یہ بات سوچتی اور پھر مسکرا دیتی۔

”مہو آج میرے لیے کھیر بنانا۔“ وہ ابا کے کمرے میں بیانی کا جگر رکھنے آئی تو ابانے نئی فرمائش کر دی تھی، موبو بچکتے ہوئے ابا کو دیکھنے لگی۔ بھی بیٹھا، بھی جٹ پٹا، لگتا تھا ابا کو اپنی صحت کی کوئی فکر نہیں تھی۔ آرام سے آنکھیں موندے لینے تھے۔ اندر ہی اندر جزیبہ ہوتے وہ کمرے میں بھری چیزیں سمیٹنے لگی۔ تب ہی ابا کی آواز ایک بار پھر مہو کی سماعت سے لکرائی، جس نے اسے بھونچا کر دیا تھا۔

”باہر دھوپ نکلی ہے تو مجھے پھت پر لے چلو۔“

اس نے ہاتھ روک کر حیرت سے ابا کو دیکھا اور اگلے ہی پل جیسے رو ہانسی ہو گئی۔

”کوئی میرے ابا کو پچائے۔“ اس نے چیختے ہوئے پکارا تھا۔ دیوار پار سے اُترنے ایک ہی جست میں چھلانگ لگائی اور بھاگ کر اس کے ساتھ ابا کو سہارا دے کر اوپر لایا۔ ابا کے چہرے پر یہ فحالت تھی اور مہو کے حواس ابھی تک بحال نہیں ہوئے تھے اسے کلثوم بھابھی سے نفرت محسوس ہوئی، کیسی عورت تھی یہ ایک کرتے مرنے ہوئے کو بچانے کی خاطر بھی آگے نہیں بڑھی تھی۔

احمر کچھ دیر ابا کی پاس بیٹھ کر چلا گیا وہ ڈھنگ سے اس کا شکریہ بھی ادا نہیں کر پائی تھی۔ لیکن رات دیر تک اس شخص کے متعلق سوچا تھا۔ وہ دیباہی تھا جیسا کسی بھی لڑکی کا خواب ہو سکتا تھا۔ پر کشش، بلوقار، خوش لباس۔

شہر میں تھیں۔۔۔ پر انہیں کتنا تو فضول ہی تھا۔ وہ تو بڑا کام بھی لگاؤ دیتیں اور اپنا رشتہ خود لے کر جانا کتنا معیوب لگتا سیبا ہر دروازے کی کھنٹی بجی تھی، جس نے سوجوں کار نکال کر آواز دیا تھا۔

مہو دروازے کی کھنٹی پر انگلی رکھے دوپٹے سے چہرہ صاف کرتی، بار بار پیچھے ہٹ کر میں جھانک رہی تھی۔ گھبراہٹ اس قدر تھی کہ سخت سردی میں بھی ٹھنڈے سینے آ رہے تھے۔ ابانے آج نیا حکم سنا دیا تھا۔

”مہو آج دروازے کا اس روز پھت پر آیا تھا اسے بلا کر لاؤ“

میں ملنا چاہتا ہوں اس سے۔“ اور اب وہ کھنٹی پر انگلی رکھے حواس باختہ سی کھڑی تھی۔ اُترنے دروازہ کھولا اور اسے سامنے دیکھ کر حیران رہ گیا۔

”وہ ابا آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔“ یہ کہہ کر وہ سر ہٹ واپس بھاگی۔ احمر زیر لب مسکراتے ہوئے تیار ہونے لگا۔

”ابا میں اکیلے آپ کو کیسے پھت پر لے جا سکتی ہوں۔“ مگر مرموزین کی خند کے آگے اس کی ایک نہیں چلی تھی وہ ابا کو سہارا دے کر یہ بیٹھیں تک ملائی۔

”بس بس۔۔۔ اب اتنا بھی بوڑھا نہیں ہوا، خود چڑھ سکتا ہوں، تم بس میرے پیچھے چلو۔“ اب یہ نئی پابندی تھی ابا کو کوئی کسی بات کے لیے رضامند نہیں کر سکتا تھا وہ اپنی مرضی کے مالک تھے اور دوسروں کو بھی اسی پر چلاتے تھے۔ بھابھی باہر تل پر بچوں کو نہلاتی کن اکیہول سے دونوں باپ بیٹی کو دیکھ رہی تھی۔

”خزل بڑھا، ساری جائیداد پر سانپ بن کر بیٹھا ہے، قبر میں لے کر تو نہیں جائے گا، کلثوم تو ہی صبر کر لے۔“ بڑبڑاتے ہوئے آخر میں جیسے خود کو دلاسا دیا تھا۔ ”شہر میں خوب بڑا سا گھر لوں گی، بچے انگریزی اسکولوں میں پڑھیں گے تو کراچاکر ڈاؤن میرے کیا ٹھاٹ ہوں گے، بڑی نیکم صاحبہ بن کر کھوموں گی۔“ اس کی سوجوں کو دھکا مہو کی دلدوز چیخوں نے لگایا تھا۔

آج بالآخر اس نے مہو کو دیکھ ہی لیا تھا اور ابھی تک وہ فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا کہ کیا تھی وہ۔ کوئی ساڑھ یا جادو کرنی، کتنی چہرے کے خدو خال ایسے دل نشیں جیسے کسی مجسمہ ساز نے صدیوں کی ریاضت سے انہیں سنوارا ہو۔ گہری سانولی رنگت اور اس پر بڑی بڑی روشن آنکھیں، اتنی خوب صورت گہری خاموشی اور دلکش آنکھیں اس نے آج سے قبل بھی نہیں دیکھی تھیں، ہاں ایک کمی تھی اس کے چہرے پر ہلہلہری کے داغ تھے، جس نے اس کے حسن کو گمنا دیا تھا۔

لیکن اسے ان داغوں سے کیا سرو کا۔ وہ تو اس کی آنکھوں کا اسیر ہوا تھا۔ جس نے نیند اور دل کا قمار لوت

وہ گھر آیا تو ابانے مہو کی دوڑیں لگوا دیں، کبھی چائے منگوائی، کبھی اسٹینکس، پھر بھی یہ کم لگا تو اٹلے ہوئے اندرے اور نکٹس تلنے کو کہہ دیا تھا۔ ابا بول کسی کی خاطر تو کبھی نہیں کرتے تھے شروع کے چند سوالات کے بعد مہو کے ابا نے جوابات اسے ہی وہ بہت عجیب تھی۔ وہ اس کے دونوں ہاتھ تھامتے ہوئے بڑے التجا آمیز انداز میں کہہ رہے تھے۔

”تم میری بیٹی سے شادی کرلو، میں اپنی ساری جائیداد تمہارے نام کر دوں گا۔“ دروازے کے اس پار کھڑی مہو نے یہ بات خود سی اور جی بھر کر مزید ہوئی۔ پھر ابا اور اس کے درمیان جانے کیا طے ہوا، ہر ایک کے لاکھ سمجھانے اور بھائی کے منع کرنے کے

”خوشبو میں بسا بہ شخص خود نہ جانے کیسا ہو گا۔“ یہ خیال کہ وہ کیسا ہو گا، خود خود اس کے دماغ میں چھپنے لگا تھا اور پھر آج تو بھابھی کے ہاتھوں تازہ بے عزتی کا صدمہ یہ سوچ کر کچھ اور بھی بڑھ گیا تھا۔

”کیا ساری باتیں دیوار بار بٹھے اس شخص نے بھی سنی ہوں گی۔“ اس کی پلکیں ایک بار پھر ہلک گئیں۔ اسے لگ رہا تھا کبھی یہ شخص اگر اس کے سامنے آیا تو وہ مارے فحش کے نظریں نہیں اٹھائے گی۔ عجیب بلکائیں سامعوس ہو رہا تھا اسے جیسے بھابھی کچھ بھی کہہ لیتی پھر اس شخص کے سامنے نہیں۔

جانے کون تھا یہ شخص جسے دیکھا نہیں تھا۔ جانتی نہیں تھی۔ پھر بھی جیسے حواسوں پہ چھا گیا تھا۔



باوجود ابا نے دس دن کے اندر اندر اس کا لگان کر دیا تھا۔ اس کے دل میں احمر کا مقام کچھ بدل سا آیا تھا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ یہ شخص جائیداد کی خاطر اس سے شادی کر لے گا۔ دل نے جو خوش گمانوں کا عمل تعمیر کر رکھا تھا۔ وہ محسوس کا حیرت انگیز تھا اور اس حیرت کو آج جیسے کسی نے آگ لگا دی تھی۔ اس کی رخصتی کے دو روز بعد ابا چل بے اسے احمر کے ساتھ زیادہ وقت گزارنے کا موقع ہی نہیں مل رہا تھا۔ وہ کچھ روز صدمے میں رہی، پھر سنبھل گئی۔

\*\*\*

احمر نے اس کا ہر طرح سے خیال رکھا تھا۔ اس پر اپنی محبت، دولت، خواب سب بچھل کر دیا تھا، مگر وہ بھی کہ نہ سیراب ہوتی تھی نہ آسودہ۔ احمر کی اصلیت نہ جانتی تو خود کو دنیا کی سب سے خوش قسمت لڑکی تصور کرتی، مگر اب دل نہیں مانتا تھا۔ اس کی محبت کو، جذبہ لٹائی نظروں کو، حسین خوابوں کی رہ گزر کو، خود کو آئینے میں دیکھتی تو یہ احساس مزید بچوکے لگانے لگتا کہ وہ احمر کے قابل نہیں تھی۔ اس کے ابا نے ساری جائیداد کے عوض اس کو احمر پر مسلط کیا ہے۔ اور احمر وہ اس کا گریز اور محتاط ساند اذیت کھاتا حیران رہ جا کر کہ کیا چیز ہے جو دونوں کے مابین دیواریں کر کھڑی ہے، وہ روز ایک اینٹ ہٹاتا ہے اور اگلی صبح وہ اینٹ پھر سے جڑ جاتی ہے۔

”مہمو! کیا تم میرے ساتھ خوش ہو؟“ دونوں ہاتھ اس کی پشت پر رکھے، وہ ہل بناتی مہمو سے پوچھ رہا تھا۔

”جی۔۔۔“ اس نے مختصر ”کہا۔

”مجھے کیوں نہیں لگتا۔“ اس نے بات کو طول دینا چاہا۔

”جانتا نہیں۔۔۔“ وہ معصوم بن گئی۔

”کیا تم کسی بات پر مجھ سے ناراض ہو یا پھر میری طرف سے۔۔۔“ دل میں کوئی بدگمانی ہے تو مجھ سے

”کو۔۔۔“ اس نے اس کا حوصلہ بڑھایا۔

”نہیں۔۔۔“ اس نے نفی میں سر ہلایا۔

”چھتاؤ میں تمہیں کیسا لگتا ہوں۔“ مشکل

سوال آیا۔

”مجھے۔۔۔“ اس نے بھی اچھے بچوں کی طرح جواب دیا۔

”بس اچھے۔۔۔“ اس نے منہ بسور لیا۔

”جی۔۔۔“ وہ سعادت مندی سے بولی۔

”اچھا آج کیا کھاؤ گی۔“ اس نے ٹھنڈی آہ

بہری۔

”جو آپ کو پسند ہو۔“ اس نے بات ہی ختم کر دی۔

”یہ کی ہے نا اچھی بیویوں والی بات۔“ اس نے پھر بھی سیرا ہا، وہ خاموش رہی، لیکن ہار اسے بھی منظور

نہیں تھی۔

”تمہیں کھانا پانا آتا ہے۔“

”جی۔۔۔“

”کیا کچھ بناتی ہو۔“

”سب کچھ۔۔۔“

”یہ انٹرویو مجھے پسند نہیں آ رہا، اب کچھ مجھ سے

بھی پوچھنا۔“ اس نے بڑے لاڈ سے فرمائش کی۔

”کیا پوچھوں۔“ وہ سپاٹ نظروں سے اسے دیکھنے

لگی۔

”یہی کہ ان سمندر جیسی آنکھوں میں کب ڈوبا تھا

اور دیکھو ابھی تک مجھے تیرا کی نہیں آئی۔“ وہ کہہ کر

خود ہی ہنسا، پھر اپنی والدانہ محبت بھری نظریں اس پر جما

دیں۔

وہ جی بھر کر جزبہ ہوئی اور سوچا ”اس سے تو اچھا تھا یہ

بولتا ہی رہے۔“

\*\*\*

بہت دن ہوئے دیوار پار سے بھابھی کی مخصوص آوازیں نہیں آرہی تھیں۔ مہمو نے دیوار کے ساتھ آٹھ دس اینٹیں جوڑ کر رکھیں اور پھر ان پہ چڑھ کر منڈر کے اس پار جھانکا۔ دونوں بچے چابیانی پہ سے بیٹھے تھے اور بچن سے کھٹ پٹ کی آوازیں آرہی تھیں، پھر بھائی کا چہرہ نمودار ہوا، ان کی نظر مہمو پہ پڑی تو اسے دیکھ کر منہ پھیر لیا۔ مہمو کے دل پہ جیسے ہوسا سا پڑا تھا۔ وہ اینٹوں سے نیچے اتر گئی۔ دل جیسے کسی تادیہ

بو جھٹلے دے نہ لگا تھا۔ حلق میں پھنسا سا لگا اور آنکھیں لبالب آنسوؤں سے بھر گئیں۔ وہ کتنی ہی دیر روٹی رہی تھی۔ احمر نے اس کی سرخ آنکھوں کا سبب پوچھا تو تال گئی۔

”کیا بھائی اس سے ناراض ہے۔“ یہ خیال ہی کس

قدر جان لیوا تھا، ایک ہی تو بھائی تھا اس کا، بس ایک رشتہ، مگر وہ بھی خفا ہو جاتا تو۔۔۔ اور وہ بھائی کے بچوں کے بغیر کیسے رہے گی۔ پھر ایک روز بھابھی آئیں اس کے پاس۔ سوچی ہوئی آنکھیں، مہمکجا حلیہ۔

بھابھی نے اس کے سامنے دونوں ہاتھ جوڑ دیے۔

”مہمو، پلیز مجھے معاف کر دو۔ میں نے تمہارے ساتھ

بڑی زیادتی کی ہے۔ ابا نے ساری جائیداد احمر کے نام

کر دی ہے اور تمہارے بھائی نے اس کا ذمہ دار مجھے

ٹھہراتے ہوئے گھر سے نکال دیا ہے۔ میں بچوں کے

بغیر نہیں رہ سکتی۔“ وہ رو رہی تھیں، مگر گڑا رہی تھیں،

انتہا میں کر رہی تھیں اور مہمو کا دل جیسے قطرہ قطرہ پھسل

رہا تھا۔

\*\*\*

”میں احمر سے کیسے بات کروں اور اتنی بڑی جائیداد

سے وہ کیوں دستبردار ہو گا اور اگر جائیداد کے ساتھ اس

نے مجھے بھی چھوڑ دیا تو۔۔۔ میں بھلا اس کے بغیر کیسے

رہوں گی۔“ سوچ سوچ کر وہ رو پائی ہو گئی تھی۔

”مہمو، کھانا تو ٹھیک سے کھاؤ۔“ احمر نے اسے

دوسری بار نوکا تھا۔

”میں کھا چکی ہوں۔“ اس نے بے دلی سے پلیٹ

بچے سر کالی۔

”تم پریشان ہو۔“ وہ اس کے چہرے کا ہر رنگ

پھا جاتا تھا۔

”ہاں۔۔۔“ کچھ سوچ کر اس نے اثبات میں سر ہلا

دیا۔ احمر کی استفہامیہ نگاہیں اس پر جمی تھیں۔ وہ اس کے مزید بولنے کا منتظر تھا۔

”میں چاہتی ہوں آپ ساری جائیداد میرے بھائی

کے نام کر دیں۔“ وہ اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے

اعتماد سے بولی تھی۔ وہ کچھ دیر اسے دیکھا رہا، پھر مسکرا دیا۔ ”ابا کا ذہنی توازن آخری دنوں میں ٹھیک نہیں تھا“ اسی لیے انہوں نے آپ سے ایسی۔۔۔“ اس کا لہجہ بھیک گیا، وہ بے بسی محسوس کرنے لگی تھی۔

”پہلی بات تو یہ ہے۔“ آخر احمر نے ہی اس کی

مشکل آسان کرنے کا سوچا۔ ”میں نے جائیداد کی خاطر

تم سے شادی نہیں کی تھی، تمہارے فادے نے مجھے ایک

آفر کی تھی، جسے میں نے ٹھکرا دیا تھا اور پھر اپنا مدعا پیش

کیا تھا۔ وہ ساری جائیداد میرے نہیں، تمہارے نام

ہے، میں بھی یہی چاہتا ہوں کہ تم اپنے بھائی کا حصہ ان

کے نام کر دو، لیکن میں بس تمہاری بھابھی کو تھوڑا

سبق دینا چاہتا تھا، تم جانتی ہو تمہارے رشتے میں سب

سے بڑی رکاوٹ وہ تھیں۔ مجھے بھی آکر تمہارے

خلاف ورغلا یا تھا کہ میں تم سے شادی نہ کروں، لیکن

چونکہ یہ دیوار پار کا معاملہ تھا تو مجھے سارے حالات کی

خبر تھی۔“ وہ مزے سے بتا رہا تھا اور وہ بانٹا لکھیں جھپکے یہ

سارے انکشافات سن رہی تھی۔

”تو پھر آپ نے مجھ سے شادی کیوں کی؟“ وہ حیران

ہوئی۔

”تم سے شادی تمہارے لیے کی، کیونکہ تم مجھے

پہلی نظر میں ہی اچھی لگی تھیں۔“

”میں۔۔۔؟“ ایسا لگا جیسے اس کے گرد گلاب بکھر گئے

ہوں رائج پہلی بار وہ جیسے دل سے مسکراتی تھی، کسی نے

اس کو بھی اس کی ذات کا اعتماد دیا تھا۔

”ہاں تم صرف تم۔۔۔“ احمر نے اس کے دونوں ہاتھ

تھام لیے۔ آج اس نے کوئی مزاحمت نہیں کی محبت کی

خوشبو نے اس کے گرد حصار سا بنادیا تھا۔

اور وہ سوچ رہی تھی دیوار کے اس پار اگر احمر نہ ہوتا

تو اس کی زندگی کیا ہوتی۔



کے بجائے وہ ہمیں کی سڑکوں کے اندھے ان میں گول ٹول گھومتے رہے۔ انسان اپنے جسم کے کتے نہیں کرتا جب تک وہ صاحب اولاد نہیں ہو جاتا۔ پھر کوئی ایک دل بن جاتا ہے، کوئی جگر، کوئی میٹھی، کوئی پوری زندگانی۔ ماسٹر علی بخش کی میٹھی کمزور پڑنے لگی اور روشنیوں دھندلا گئیں مگر ساعت بڑھ گئی اور انہیں یوں دور، اتنی دور جاکے بھی اس کے رونے کی آواز صاف سنائی دینے لگی۔

آستین سے اپنی آنکھیں پونچھتے وہ واپس پلٹے تو تیتیم خانے کی میز پر بیٹھیں۔ وہ بد دعا بنی پڑی تھی اور اس بار زیادہ شدت سے چلا رہی تھی۔

رونا کچھ پیدائش کا تھا، کچھ بے قدری کا۔

اندھیرا کچھ رات کا تھا، کچھ نصیب کا۔

جیسے ہی انہوں نے اسے بانسوں میں لیا۔ ان کے ہاتھوں پر کتنے ہی کیرے چڑھ دوڑے۔ سیاہ۔

زہریلے۔

”جس کا اتھاڑ ایسا الٹا تھا۔ اس کے خوش گوار انجام کا سوچا جاسکتا ہے؟“

\*\*\*

آبلہ پا کوئی اس دشت میں آیا ہوگا ورنہ آندھی میں دیا کس نے جلایا ہوگا جیوا جی مینشن وادری کی تین منزلہ چھپرہ بلندنگ کی کرائے کی کھولی میں ماسٹر علی بخش اسے اپنے ساتھ لپٹائے لے آئے۔ اس کے رونے کی شدت نے سارے شہر کی نیند خراب کر دی تھی۔ کھولیں میں اس کے رونے کی گونج تھی۔ پل کے اس اور اس پار ساری دنیا اس تھی پانی میں جلدی سے ہلدی کھول کر ماسٹر علی بخش نے اس کے جسم پر لگائی شروع کی۔ بستر پر لیٹی اقبال نے اپنا منہ دوسرے رخ پھیر لیا تھا۔

”ماسٹر جی، بیجا چوت ہے؟“ تھے خان سارنگی نواز نے ان کی کھولی کے چھٹے پردے کے باہر کھڑے ہو کر پوچھا۔

”جی خان جی۔“ ماسٹر علی بخش نے رندھے گلے سے کہا۔

”یوں لگا ماسکلی کے ہاتھوں میں ہے۔“

خورشید جو سہمی بیٹھی تھی جلدی سے آگے بڑھی۔

”باپو جی یہ تو بہت ہی خوب صورت ہے۔“

چور نظموں سے اقبال نے اسے دیکھا جو سوتے ہوئے بھی سبک رہی تھی۔ اس کا دل کسی نے چتی ریت پر پھینک دیا۔

تھیمٹر کے اندھروں میں چھپی بیٹھی کسی وقت وہ بھی ایسے ہی سکسی تھی۔

”تکلیفوں نے آتے ہی چل دیا۔ یہ جنم ہوا اس کا۔“ وہ کرا رہی تھی۔

”میں نے تو اس کا نام ”مہ جیوں بانو“ سوچ لیا ہے۔“

ماسٹر علی بخش نے ٹوٹے ہوئے ساز کی بکھری سی آواز میں کہا۔

اقبال خاموش رہی۔ خورشید نے آگے بڑھ کر اسے بانسوں میں لپٹا لیا تو وہ ٹوٹے بنانہ نہ سکی۔

”نہ خورشید، کیسے تڑپ تڑپ کر سوئی ہے، تمہارے چھوٹے سے اٹھ گئی تو۔“ خورشید نے کچھ خائف سا ہو کر اس کو دیکھا اور پھر تھک کر اس کے گال کو چوم لیا۔

”ہمارا منہ دیکھو! ہماری کھولی میں روشنی ہو گئی۔ یہ تو مانو جگنو ہے۔“

”نصیب کے اندھروں میں کتنے بھی جگنو لا کر جگمگا لو، اندھیرا اندھ نہیں پڑتا۔“ اقبال نے تخی سے کہا۔

”اقبال! اس کا نام مہ جیوں بانو ہی رکھ لیں نا پھر؟“

ماسٹر علی بخش کی آواز کانپ رہی تھی۔

”مہ جیوں نام رکھنے سے یہ مہ نصیب تو نہیں ہو جائے گی۔“

ایک آنسو اقبال کے گلے سے پھسل کر اس کی پیشانی پر گر گیا۔

”مال کا آنسو اتھاہ سمندر تھا، زندگی کے سمندر کو بھی اس نے بھی ”آنسو“ پایا۔“

\*\*\*

”یہ دنیا ایک قفس ہے۔ جس کے اندر رہ کر انسان کسی بھی نوعیت کی جدوجہد کرتا ہے اور زندہ رہتا ہے۔“ (ڈائری)

وہ دونوں کلکتہ تھیمٹر میں کام کرتے رہے تھے۔ علی بخش پٹی ماسٹر ہارمونیم بجاتا اور ضرورت پڑنے پر چھوٹے موٹے کردار بھی کر لیا کرتا تھا۔ اقبال کمال کی رقصہ تھی۔ اداکاری بھی کرتی اور گاتی بھی تھی۔

ایک بار رقص کرتے، ہارمونیم بجاتے، پٹی ماسٹر علی بخش کو وہ دل دے بیٹھی تھی۔ اس کے رقص کی چال بدل گئی،

من کی آتما ٹھہر گئی۔ ماں کو چھوڑ چھاڑوہ علی بخش کے ساتھ اقبال بانو بن کر رہی۔

ماں سے ویسے بھی رخصت تو لینی ہی تھی، چلو ایسے ہی سی۔

ناکیز شروع ہوئیں تو ہارمونیم بجائے کام جاتا رہا۔ وہ دونوں، بیٹی آ گئے کئے فلموں میں کام کریں گے۔ لیکن انہیں فن کے مطابق تو نہیں، بمشکل ضرورت مطابق کام ملا۔

اتنا کہ کھانے کو باسی روٹی مل جاتی۔ تینوں وقت نہ سہی تین میں۔

سے کسی ایک وقت سہی۔

ماسٹر علی بخش، ہارمونیم بجانے میں اپنا ثانی نہیں رکھتا تھا۔

سر ساگر اس کی روح میں بہتا تھا۔ ساز، راگ، الاپ، میں اس کی زندگی کی دھارا، سہمی۔

ہارمونیم کی گنجیوں میں اس کی سائیس مقید تھیں۔ اپنی یہ سائیس وہ ہندی فلموں کو دے کر انہیں امر کرنا چاہتا تھا۔

تھا وہ ایک بڑا موسیقار بننا چاہتا تھا۔

اقبال نے ہم سندری کی گود میں آنکھ کھول، تھیمٹر میں جھپکی تھی۔

اگر فلموں کو اس کی ضرورت نہیں ہوگی تو پھر کس کی ہوگی۔ کلکتہ تھیمٹر میں اس کے رقص کی مانگ تھی۔

اس کا رقص اشارے کنایوں سے مبرا، بے خودی کی کوکھ میں سانس لینے لگا تھا۔

داوری کی کھولیں میں ناک تک فن میں دھنسنے فنکار، پیٹ کی بھوک کی آگ میں جھلکتے تھے۔

داور کی ان کھولیوں میں تھا ہی کیا، بھوک، بدو، مہندگی اور جی جان کو روگ لگا نا اندھیرا۔

اقبال سارا سارا دن اسٹوڈیو کے چکر لگاتی رہتی۔ خوش امید نے کچھ سڑھلق میں کچھ

رنگ رقص میں کچھ حرف اداکاری میں زندہ چھوڑ رکھے تھے اور وہ سمجھتی تھی کہ کچھ نہ کچھ بن ہی جائے گا۔

یہی سب علی بخش کرتا۔ وہ جتنا اعلیٰ پائے کا ہارمونیم نواز تھا، اتنا ہی بد نصیب فنکار تھا۔

گر میوں میں جب دس ضرب دس کی کھولی میں پانچ افراد کی سائیس جنم کی دھونکی بن جاتیں،

اور وہ اس جنم کو کچھ سرد کرنے کے لیے فٹ پاتھ پر آکر سوتا تو اس پر کھلتا کہ وہ تو کسی ساز اور سر کو پچاننا ہی نہیں۔

ستار، ہارمونیم، سارنگی، طبلہ اس کے خنجر میں تو بچ سکتے ہیں، حقیقت میں نہیں۔

ہارمونیم پر انگلیاں ٹھہر کر سر تو ٹکا لے جاسکتے ہیں، ان ہی انگلیوں کو پیشانی پر نچا کر،

”خوش بختی کے راگ“ نہیں۔

ان کے ساتھ بچوں کو بھی بھوکا رہنے کی عادت ہو گئی تھی۔

وہ جانتے تھے ماں تین چار دن کی روٹی پکا کر کپڑے میں لپیٹ دیتی ہے اور کام ڈھونڈنے جاتی ہے۔

انہیں یہ روٹی نیاز، مرج کے ساتھ کھاتے رہنا ہے۔

جہیں کو خورشید اور بدھو (مہ لقا) دیکھ لیتیں ورنہ علی بخش اسے گود میں لیے خیالوں ہی خیالوں میں موسیقار بنے سازندوں کو ریاض کر رہے ہوتے۔

علی بخش کے خون کی گرمی اسے اس کے باپو جی کے خواب سناری ہوئی کہ ”ایک دن میری بیٹی دھنوں سے پورا ہندوستان گونے گا۔ آل انڈیا ریڈیو صبح وشام میرے گیتوں کو نشر کرے گا۔ شہیت کاری میں میرا نام ”سا اورپا“ سروں کی طرح جاندہ رہے گا۔“

اقبال کے ساتھ خورشید بھی فلموں میں چھوٹے چھوٹے کردار کرنے کے لیے چلی جایا کرتی تھی۔

ورنہ سارا دن وہ تینوں نہیں مل کر کھیلا کرتیں۔

ان کی کھولی کے سامنے باپو جی کے دوست ماسٹر جی رہتے تھے۔

جو ان ہی کی طرح ہارمونیم بجاتے تھے۔ وہ ناک تاک کر ان کی کھولی میں پتھر پھینکتی تھیں۔

ایک دن ان تینوں نے اتنے پتھر پھینکے کہ وہ بھنا کر ان کے باپو جی کے پاس آئے اور ان کی شکایت کی۔

باپو جی نے دل لگا کر انہیں مارا۔ سب تو رو رو کر چپ ہو گئیں لیکن مہ جیوں کی

صورت پر اداسی کچھ ایسی سٹ آئی کہ بابو بی۔ اے۔ ایل، بے قرار کر گئی۔

”منا! ایسے دوسروں کو تکلیف دو کی تو خود بھی اسی ہو جاؤ گی۔“ انہوں نے اس کی پیشانی پر دم کر کہا۔ وہ اپنی چھوٹی تھی کہ بات تو ٹھیک سے سمجھ نہ سکی لیکن لفظوں کو اپنے دل پر محسوس کیا۔ غرت میں محسوسات ویسے بھی بہت متحرک اور بیدار ہوتے ہیں۔ یتیم خانے کی بیڑیوں پر ہی وہ بیدار ہو گئی تھی۔ پھر آنکھ جھپکی نہ اٹھ سکی۔

ایک دن اقبال خوشی سے دیوانی ہوئی گھر لوٹی۔ اندھیری کھولی غنماتے دیے میں بھی جھلک کرنے لگی۔ اسے ایک بڑی فلم، ”پچھو اور مضبوط کردار کے ساتھ مل گئی تھی۔ یوں بھی اقبال اب اپنی خواہشوں کو نئی جتیں دینے لگی تھی۔ اگلے اکروہ ہیروئن بننا بھی چاہتی تھی کہ اس میں سب گن تھے، فن، حسن، ادا، آواز، رقص۔ تو اب وہ اس خواب کو ہمہ جہت میں ڈھال چکی تھی۔

”اگر جان ہو تو معاون کردار بھی کسی سے کم نہیں ہوتا۔ ہیرو ہیروئن کو پچھاڑ کر رکھ دیتا ہے۔“ ان ہی دنوں علی بخش کو بھی جیسے تیسے ایک فلم کی موسیقی ترتیب دینے کا موقع مل گیا۔ اس کا دیرینہ خواب پورا ہونے جا رہا تھا۔ وہ موسیقار بننے جا رہا تھا۔ بھوکے پیٹ وہ ساحل پر ٹھلا کرتا، ناروں بھری رات میں سرگرم چھیڑے رکھتا، راگ بھاگ اس کی سانسوں سے اکھیلیاں کرتا۔ وہ علی بخش نہیں تھا جو دن بھر اسٹوڈیو کے چکر لگاتا، اور پھر راتوں کو براہ الاپتا۔ اب وہ روز مع روز امتحان ہارمونیم کو صاف کرتا اور اپنی خوابیدہ دھنوں سے لاڈ لیا کرتا۔

”زندگی کے یہ دن تھے جب بنا کھائے بھی ان کے بھرے پیٹ تھے۔ باسی روٹی کے چند ٹکڑے بھی مانو بہت ہی تھے۔ کھولی کی ٹھن میں ٹھنٹیاں بجتی تھیں۔ بنا غاڑے کے ماں کی کاچرو چمکتا دکھتا تھا۔ نقاہت پر بھی بابو بی کے گل اٹاری تھے۔

چپ چاپ۔۔۔ چپ چاپ من سن سی زندگی۔“ (ڈائری)

ایک دن وہ گھر واپس آئے تو چپ چاپ جت لیٹ گئے۔ اتنے خاموش، اتنے ٹھنڈے کہ ان پر مرنے کا کماں ہوا تھا۔ اس دن ساری ہی کھولی پر موت کا گمان تھا۔ پورا ہندوستان راگھشس بنان کی سانسوں پر سوار تھا۔ موت کے اس کھیل میں ماں بھی شامل ہو گئی وہ کیوں پچھے رہتی۔ علی بخش اپنی ماسٹر کبھی موسیقار نہیں بن سکتا۔ یہی اس کی تقدیر ہے۔

اقبال بانو، کسی بڑے کردار کے لیے پیدا نہیں ہوئی تھی۔ یہی دلیل تھری۔۔۔ بات فن سے شروع ہوئی، بھوک تک آئی اور پھر خوابوں پر تھری گئی۔ فنکار بھوکا مر جاتا ہے، فن نہیں چھوڑتا۔ فن چھوڑ دیتا ہے، خواب نہیں چھوڑتا۔ خواب چھوڑتا رہتا ہے تو سانس بھی چھوڑتا ہے۔ ان کی سانسیں کچھ اٹکی تھیں، کچھ بس آخری دموں پر تھیں۔ دونوں کو ہی جو فلمیں ملی تھیں وہ ان کے ہاتھ سے جاتی رہیں۔ زندگی اس بازی کی بات پر بھی ہمت سے لگانے لگی۔

”آہ! ہم سب اداس ہی کیوں رہتے ہیں۔“ (ڈائری)

جو چکر مانی ہم سندری سے شروع ہوا تھا وہیں چکراتا رہا۔ زندگی کی کھوہ میں چھپے سارے دکھ ان کی کھولی میں اکٹھے، ماں، بابو بی، پھر سے چھوٹے موٹے کاموں کے لیے اسٹوڈیو کے چکر کاٹنے لگے۔ کبھی کام مل جاتا بھی انکار۔ کبھی پیسے آجاتے کبھی آس۔ ماں اپنے ماضی کو ٹھکڑے کی طرح یاد کرنے لگی جب ہم سندری پانچ بچوں کو اکیلے پال پوس رہی تھی۔ پھر ٹھیکر کی بھیڑ، من کا جنرل منتر۔ اسے یہ دکھ ستانے لگتا کہ فن میں انتہائی اتنت کے بعد بھی دکھ کا اتنت کیوں

نہیں ہوتا۔ کلکتہ، کلکتہ، بمبئی کی سڑکوں کی دھول چاٹنے پر بھی انہیں کہیں ٹھکانہ کیوں نہیں ملتا۔ ایسا کون سا مہاساگر ہے جو ان کی نیا سے بار نہیں ہو رہا۔ ہندوستان کی اتنی بڑی فلم عمری میں، ایک ان ہی کے لیے اتنی سی جگہ نہیں ہے کہ وہ کسی رات تو مستقبل کے سانسے خوابوں کی آس پر بس چپ چاپ سو سکیں۔

سانے کی کھولی میں ماسٹر نوٹشواؤ کے یہاں جب رات گئے، ساز بجتے تو وہ سب اندر آنکھیں چھت سے لگائے بس چپ چاپ آنسو بہایا کرتے، خورشید اور مدھوسو جاتیں لیکن اس کی نیند بھی جیسے ماں بابو بی کی سانسوں سے جڑی، ان کے سنگ جاگ رہتی۔

”یہ تنہائی اس قدر خاموش ہے کہ زندگی اس طرف چھپتے ہوئے ڈرتی ہے۔“ (ڈائری)

کھولی میں ٹوٹے خوابوں، بے انت بھوک کے علاوہ بھی کچھ تھا۔ ”ماں کی کہانیاں۔“ جس دن ماں اسٹوڈیو سے کچھ زیادہ ہی دل شکستہ ہو کر واپس آئی اس رات کی کہانی تو کمال کی ہوئی۔

”رانی نے سوچا کہ اسے دریا میں کود کر جان دے دینی چاہیے۔ جیسے ہی وہ چھلانگ لگانے کے لیے بڑھی اسے وہاں اپنی صورت دکھائی دی۔ اس نے اپنی سندرتا دیکھی، دکھا کہ اس کی پیشانی پر چاند چمکتا ہے، آنکھوں میں سورج سے دیے روشن ہیں۔ اس سے وہ چراغ بجھانے نہ گئے، چاند کو گناہ نہ کیا۔ وہ چپ چاپ اپنے محل لوٹ آئی اور طاؤس بجائی گیت گانے لگی۔ اس کے گیت مسافر سنتے اور اپنی راہوں پر واپس لوٹ جاتے۔“

مہ جبیں نے رانی کو تو دھونڈ نکالا لیکن وہ چاند سورج نہ کھوج سکی۔ لیکن جب وہ بڑی ہو گئی تو اس نے ماں کی کہانی کا راز پایا۔ پیشانی کا چاند وہ بھی، سورج سے دیے خورشید، مدھو اور بابو بی، ماں کہانی سناتے کچھ ایسا سماں بنا دیتی کہ آسمان کے کنارے اس کی آنکھوں کو چھوٹے لگتے۔ سورج کی کرنیں اس کے آنچل میں

### ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے بہنوں کے لیے خوبصورت ناول

قیمت	کتاب کا نام	مصنف
500/-	بسا ناول	آمنہ پاش
1000/-	ذرموم	راحہ جبین
500/-	زندگی اک دوشی	رخسانہ گارہدان
200/-	خوشبو کا کٹی گھر نہیں	رخسانہ گارہدان
500/-	شہول کے دروازے	شازبہ چودھری
250/-	حیرت نام کی شہرت	شازبہ چودھری
450/-	دل ایک شہریتوں	آسیہ مرزا
500/-	آئیوں کا شہر	فاخرہ افکار
600/-	بہل بھلیاں تیری گلیاں	فاخرہ افکار
250/-	پھلاں دے دنگ کالے	فاخرہ افکار
300/-	یہ گلیاں یہ چارے	فاخرہ افکار
200/-	میں سے محبت	غزل مرزا
350/-	دل آسے ڈھونڈ لایا	آسیہ مرزا

لیے لائی یا کوئلے سے جلاسا کا ہاتھ۔۔۔  
 ”منا! کیا ہوا تمہیں؟ تم تو روہنے کو ہو؟“۔۔۔ نہیں  
 کے ہونٹ کپکپا گئے یوں جیسے کوئلہ سلگتا بھی ہو اور  
 آگ بھی نہ پکڑتا ہو۔  
 ”کیا ہوا منا؟ تمہیں بھوک لگی ہے؟“ ناچار اس  
 نے جلی ہوئی پھیلی ہی سامنے کر دی۔ اقبال تڑپ  
 اٹھی۔ پھیلی پر مرہم لگا تھا اور دیکھو تو مہ جبین مٹھی گو  
 بند کیے چپ ہی تو لپٹی تھی۔  
 ”تم نے مجھے بتایا کیوں نہیں۔۔۔ مجھے خود بھی خیال  
 نہ آیا کہ تم یوں ہاتھ کو مٹھی بنائے کیوں گھوم رہی  
 ہو۔“  
 ”آپ کو اور پریشان کیسے کرتی ماں جی؟ آج درد ہے  
 کل نہیں رہے گا۔ مرہم لگا دیا ہے، زخم جاتا رہے  
 گا۔“ اقبال نے اس کی پھیلی کو چوم لیا۔ ”درد کو ابھی  
 جانا ہو گا۔“ پھر چوٹائی باریجوا ”درد کو جانا ہو گا۔“  
 مہ جبین کی ساری محبت ماں کی اس درجہ کی محبت پر  
 پکھل گئی اور اس نے خود کو ماں کے قدموں میں جھکا  
 پایا۔ وہ اندر ہی اندر زار و قطار رونے لگی۔ محبت کے  
 اس اولین احساس نے اسے بھسم کر ڈالا اور بس بیس  
 سے اس نے خود بھسم ہونا شروع کر دیا۔  
 جانے آج اقبال کو اتنی فرصت کیسے ملی کہ وہ اس  
 کے تاثرات کو غور سے دیکھتی رہی۔ خورشید اور دھوپ  
 دونوں میں وہ بات نہیں سمجھتی تھی۔ مہ جبین میں بھی یہ بانو  
 کے دودھ کا اثر تھا یا علی بخش کی ٹپٹی بھری دھنوں کا کہ  
 وہ یوں تان سین کا راگ الاپتی جا رہی تھی۔ اس  
 کی آنکھوں کی گہرائی یوں کہ پلٹ کر واپس نہ ہو۔  
 محسوسات میں اتنا درد و مانو جسم جنگل ہے اور دھڑا دھڑ  
 کٹ رہا ہے۔  
 ”منا! فلوں میں کام کرو گی؟“ اپنی تقدیر سے  
 نظریں چڑا کر اقبال نے اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر پوچھا۔  
 اس نے سسم کرماں کو دیکھا۔ ”آپ نے تو کہا تھا  
 میں بڑی ہو جاؤں گی تو اسکول جاؤں گی۔“ ڈاکٹر بنوں  
 کی۔  
 ”بھوکے پیٹ انسان مروتو سکتا ہے لیکن کچھ بن۔“

نہیں سلگتا۔ تم ڈاکٹر کیسے بن جاؤ گی۔“  
 ”پھر میں کیا بنوں گی؟“  
 ”اپنا نہیں جان سکتی تو تمہارا کیسے جان لوں۔“ ماں  
 کی آنکھیں جو کپکپا رہیں۔  
 ماں اسٹوڈیو کا کام کے لیے بھی جاتی، اور پتار بھی  
 رہتی۔ شاید ماں کو اپنا سارا فن کھولنے کے استیج پر ہی  
 دکھانا تھا۔ وہ بٹاری کی انت پر پتھر کر، پھر سے لوٹ  
 آتی۔ ایسے کھاستی کہ جیسے آخری سانس دے بیٹھے گی  
 اور پھر سے نئی سانس بھانک لیتی۔  
 ان ہی بیماری کے دنوں میں جب وہ گھر ہوتی اسے  
 اداکاری سیکھاتی۔ اسے بیمار ماں کے سر ہانے رونے کے  
 لیے کہتی۔ مری ماں کو لوٹ آنے کے لیے کہتی۔ وہ تو  
 بیمار ماں کا چہرہ دیکھتے ہی تار تار ہو جاتی کہ آنسو گڑا جھنا  
 بنے بہہ نکلتے۔ ماں کے یاد کرائے مکالے بولتے ہی غم  
 سے صحر ہو جاتی۔  
 دونوں ماں بیٹی کا یہ کھیل کھیل تھا بھی اور نہیں  
 بھی۔ مہ جبین پورے من سے وہ کرتی جو ماں کہتی  
 لیکن پھر بھی من اودھائی ریتا۔ اس کا دل کھولنے کے باہر  
 ان بچوں کی آوازوں میں بھی اٹکا ہو تا جو اپنا سارا بچپنا  
 لیے کھیل رہے ہوتے، آنکھوں پر پٹی باندھے دھما  
 چوکر کڑی عمارت پر ہوتے، ورنہ پتھروں کی ڈھیر یا لہ تار ہے  
 ہوتے۔ اور اندر دھب۔  
 ”دودھ لینے جاتی ہونا اپنے بابو جی کے ساتھ؟ دودھ  
 والا کیسے دودھ دیتا ہے؟“  
 ”ارے بھیا، گایا ہمارا دودھ نہیں امرت دیوت  
 ہیں۔ جرابائی کے دیکھو نہ امرت دھار من میں بہہ نکلتے  
 تو ہم کا بھئی نہ کھبو۔“  
 کتنی ہی دن وہ دودھ والا بیٹی رہی۔ اس کی طرح چٹک  
 کر، اسی کی طرح سردھن کر، اسی کی طرح پوے لہرا لہرا  
 کر۔ اقبال تھوڑا محظوظ ہوتی، بھسم مسکراتی، بھسمی دل  
 تمام لیتی اور اکثر بس چپ سی ہو جاتی۔  
 اب جیسے ہی ماں ٹھیک ہوتی اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے  
 اپنے ساتھ اسٹوڈیو لے جانے لگی۔ جب وہ ایک سے  
 دوسرے، تیسرے، چوتھے اسٹوڈیو جانے لگی تو اس نے

جان لیا، ماں کی راتیں نیند سے خالی کیوں ہوتی ہیں۔  
 اس کے من کا رت دم سا دھ کیوں ہے۔ جب وہ  
 گھنٹوں فلسا زوں کے دفتروں کے باہر بیٹھتی،  
 چپراہوں کی منت کرتی، اسٹنٹ ڈائریکٹروں کے  
 فارغ ہونے کا انتظار کرتی تو مہ جبین جان گئی۔  
 اقبال بانو رات بھر کھاستی ہائے ہائے کیوں کرتی  
 ہے۔  
 \* \* \*  
 ”وجہ جی! سنا ہے آپ نئی فلم شروع کر رہے  
 ہیں۔ ایک بچی چاہیے آپ کو؟“ اقبال نے پوچھا۔  
 ”ہاں چاہیے تو۔ کیا نام ہے بی بی کا؟“ انہوں  
 نے اپنی کرسی پر بیٹھے بیٹھے مسکرا کر اسے دیکھا۔  
 ”میرا نام مہ جبین ہے۔“ ماں نے کہا تھا اپنا نام  
 فوراً ”خودی بتا دیا کرو۔“  
 ”بہت پیاری بچی ہے تمہاری اقبال۔ خورشید تو کام  
 کرتی ہی ہے یہ بھی کرے گی کیا؟“  
 ”جی یہ بھی کام کرے گی۔ مایوس نہیں کرے گی  
 آپ کو۔“  
 وجہ بھٹنے بچی کی آنکھوں میں دیکھا اور کہے بنا  
 رہ نہ سکے۔  
 ”بہت معصوم ہے یہ تو۔ دیکھو آنکھیں ستاروں کی  
 طرح چمکتی ہیں۔ یہ خورشید اور دھوپ سے نہیں ملتی؟“  
 اقبال بھی ہنس دی۔ ”سب ہی یہی کہتے ہیں۔ خدا  
 کرے قسمت بھی ہم سے نہ ملے۔“ دوپوٹیاں کپے  
 سفید شلوار، پھول دار قمیص میں چپ سی۔ سسم  
 چھپانے کو ہولے سے مسکرا دیتی۔  
 وجہ بھٹنے ہمیش بابو کو بلا کر انہیں اس کے  
 سپرد کیا۔ وہ ماں سنگ آفس سے باہر اسٹوڈیو میں آگئی۔  
 اسٹنٹ ڈائریکٹر ہمیش بابو اسے کچھ دیر تک دیکھتا  
 رہا۔ اس وقت مہ جبین نے خود کو بڑا بے مول سا پایا۔  
 وہ روہنے کو ہو گئی۔  
 ”میں نے اسے کچھ مکالے یاد کرا دیے ہیں۔ آپ  
 ہاں تو یہ آپ کو ایک کر کے دکھائے گی۔“ اقبال

ہمیش بابو کی نظروں سے سسم سی گئی کہ کہیں مہ جبین کو  
 تان ہی نہ کہہ دے۔  
 ”اچھا! ذرا کر کے تو دکھاؤ بی بی۔۔۔“  
 مہ جبین نے سسم کرماں کو دیکھا۔ تو کیا یہ وہی دیو  
 ہے جس کی کمانی ماں نے سنائی تھی۔ جو سنگھار پر  
 شانت بیٹھا سناپ نیو لے کا تماشہ دیکھتا ہے اور بہت  
 پرسن ہوتا ہے۔ ماں نے اسے آنکھوں ہی آنکھوں میں  
 گھورا۔ ماں جب گھر سے باہر ہوتی تو وہ بس اقبال بانو  
 ہوتی، ہم سندری کی بیٹی جس نے اکیلے پانچ بچے پالے  
 تھے۔ جو بال و دھوا تھی، معاشرے سے بغاوت کرتی،  
 روایت کی رسی پھلتا گئی، گھر سے نکل گئی تھی۔ گھر سے  
 باہر مہ جبین کو کہیں ماں نہ ملتی۔ وہ اس عورت سے ڈر  
 جاتی جو اس کے سامنے تن کر کھڑی اسے حکم دیتی۔ وہ  
 کھولی والی ماں کو تلاش کرتی پھرتی اور ماں اس سنگ  
 ایک بالکمال اداکارہ بنی گھومتی۔  
 ”چلو بی بی! اٹکل کو کر کے دکھاؤ۔۔۔ کچھ بھولنا  
 نہیں۔۔۔ کھمیں۔“ اصل حکم ماں کی آنکھوں میں نہیں  
 تھا، آواز میں نہیں۔ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی،  
 اسٹنٹ ڈائریکٹر کو دیکھنے سے گریز یا وہ تھوڑی دور جا  
 کر کھڑی ہو گئی۔ پھر اس کی طرف سے رخ موڑ لیا۔  
 کچھ پل گزرے اور پھر وہ دوبارہ پلٹی تو اس کی آنکھوں  
 میں یہ ڈھیروں ڈھیر آنسو تھے۔  
 ”ماں۔۔۔ مجھے چھوڑ کر جا رہی ہو۔۔۔ تو لو پہلے میرا گلا  
 دیا دو۔۔۔ تمہارے بن جی کر میں کیا کروں گی۔“ رو کر  
 تڑپ کر، مہ کر اس نے کہا اور چپ ہو گئی۔ مکالے کی  
 ادائیگی تو اتنی اچھی نہیں رہی تھی کہ وہ گھبرا رہی تھی۔  
 لیکن اس کا رونا ”آنکھ کا درد“ چہرے کا کرب کمال کر گیا۔  
 ”دوبی بی بی یہ مکالے یاد کر لے گی؟“  
 اقبال نے کسی قدر چٹک کہا۔ ”یاد بھی کرے گی اور  
 کر کے بھی دکھائے گی۔“  
 ”ٹھیک ہے، کل بی بی کو سرسل کے لیے لے  
 آئیں۔“  
 اقبال نے غیر یقینی سے اسے دیکھا۔ ”تولید ریس  
 مہ جبین کی ہوئی؟“



”رہسہل میں دیکھیں گے۔ پتی پہا۔ اسی کام بھی نہیں کیا۔ اتنے لوگوں میں سہم سہم سہم سہم بھول سکتی ہے۔ مجھے تو کر کے دکھایا ہے۔ لیکن نہ دکھایا تو؟“

”میش بابو! کیا آپ مجھے جانتے نہیں؟ اداکاری اس کے خون میں ہے۔“ میٹیش بابو مسکرایا۔  
”اگر خون اتنا ہی اثر رکھتا ہو تو کیا تو کیانی کی نسل، مہا کیانی ہوتی۔“ اقبال خاموش ہو گئی۔ مہ جیں کا ہاتھ پکڑ کر گھر لائی۔ اور یوں ہر روز اسے رہسہل کے لیے لے کر جانے لگی۔ ہر رات سونے سے پہلے وہ اس سے پوچھتی۔

”منا! آج جو رہسہل میں کیا وہ یاد ہے؟“

”ہاں ماں!“  
”میش بابو تمہاری رہسہل سے بہت خوش ہیں۔ لیکن دیکھو رہسہل اور شوٹنگ میں بہت فرق ہوتا ہے۔ جب تم سیٹ پر کیرے کے سامنے جاؤ گی تو سب بھول جاؤ گی۔ کیرے کی آنکھ کا بوجھ نہ پناؤ گی۔“

”جیں ڈر گئی۔“  
”تو میں کیا کروں ماں؟“ اقبال نے اسے اٹھا کر اپنے سامنے بٹھالیا اور اس کی آنکھوں میں دیکھنے لگی۔ جیسے وہ چھکار بھی رہی ہو اور منت بھی کر رہی ہو۔

”تمہاری نالی کہا کرتی تھی شیر سے ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ شیر سے بھی سامنا نہیں ہو گا۔ وہ جنگل میں رہتا ہے وہیں رہے گا۔ بھی ہماری بستیوں کی طرف نہیں آسکے گا۔ مہ جیں! ہمیں کیرے سے ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ وہ وہیں بڑی پر کھڑا رہ جائے گا۔ بھی دھاڑ نہیں سکے گا۔ اور تم دور آسمان تلک چلی جاؤ گی۔ ستارہ دن جاؤ گی۔“

”تمہیں مہ جیں کو اسٹوڈیو لے کر نہیں جانا چاہیے تھا اقبال! وہ تو ابھی اسکول بھی نہیں گئی۔ تھوڑا بہت کلام تو خورشید بھی کر رہی ہے۔ مہ جیں بہت معصوم ہے اسے نہ لے جاؤ۔ اس دن لہک لہک کر گڑیا کی شادی پر گیت گارہی تھی۔ اس کی لہک نے میرا دل مٹھی میں جکڑ لیا۔ ہم اسے نکیت سکھائیں گے،

وہ گانے گائے گی۔ اس کی آواز میرے زخموں پر مرہم بنتی ہے۔“

”ہماری غمیت اس کے پیٹ کا نامور بن جائے گی ماسٹر جی۔“

”یہ اس کی کھیل کی عمر ہے۔ یہ تو سوچو۔“

”سیٹ پر کھیل لیا کرے گی۔“

”آگن کے کھیل اور اسٹوڈیو کے میدان میں بہت فرق ہوتا ہے۔ گڑیوں اور کیرے کے ڈبے میں کوئی میل نہیں۔ ہم تینوں کے جانے سے کیا ہو گیا جو اس کے جانے سے ہو جائے گا؟“

”ہم تینوں نے اپنا فن نہیں قسمت آزمائی ہے۔ یہ بھی آزمائے گی۔“

”خود کو اتنے دھوکے نہ دو اقبال! مجھ سے پرلے درجے کے موسیقاروں کو کتنی کئی فلمیں مل گئیں۔ ان کی دھنوں کے ریکارڈ بننے لگے۔ بھونڈی رقصاؤں، سستی اداکاراؤں کو کیسے کیسے کردار مل گئے فلوں میں۔ یہاں تم ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھی ہو۔ ہماری کلاء جی ہو تو ہو، ہم سب کی قسمت بہت کھوئی ہے۔ اس کے اندر آس نہ جگاؤ۔ فن کی پیاس لگ گئی تو کب سے مٹے گی؟“ اقبال نے تیکھی نظروں سے علی بخش کو دیکھا۔  
”تم اپنی ہارمونیم اپنی پچھینک ڈالو لیکن مجھے اس کی قسمت کا سکھ آزمائینے دو۔ مجھے کہتے ہو کہ میں خود کو دھوکا نہ دوں، دھوکا تو تم خود کو دے رہے ہو۔ کیا میں جانتی نہیں کہ ابھی بھی تم کتنے بڑے بڑے خواب دیکھتے ہو۔ اگل انڈیا ریڈیو پر تمہیں اپنے گانے سنائی دیتے ہیں۔ ہمیں کی سڑکوں پر تمہیں اپنی فلوں کے پوسٹر لگے دکھائی دیتے ہیں۔“ یہ کہتے ہوئے اقبال نے پرہ اٹھا کر آواز دی۔

”منا! آجاء۔ وقت ہو گیا ہے اسٹوڈیو جانے کا۔“  
ماں کی آواز سے پہلے ہی احساس نے جاگ کر کھیل سے اس کے ہاتھ روک دیے تھے اور وہ اپنی بھولی سے کہہ رہی تھی۔

”کنیز! جی! جی! بلا رہی ہیں۔ جب میں واپس آؤں گی تو کھیلوں گے۔“

صاف کپڑے پہنا، بال سنوار، اقبال اس سے مکالے سننے لگی۔ ایک بار پھر سے رہسہل کروائی اور وہ دونوں سیٹ پر آگئیں۔ مہ جیں نے اسٹوڈیو کی اونچی چھت کو دیکھا۔ بجلی ہوئی ایک چڑیا اور چکر رہی تھی۔ بڑی بڑی وٹنی لائٹوں کو دور اوپر کئی کئی آدمی چڑھے سیٹ کر رہے تھے۔ وہ ڈر گئی کہ ضرور کوئی اس پر آکرے گا۔

کتنے بہت سے لوگ تھے وہاں، سب مصروف۔ وہ ایکلی وہاں مجسمہ تھی۔ اس کے دجود میں کوئی جنبش نہ ہوئی۔ ماں کسی سے بات کرنے لگی تھی۔ اس نے اتنے سارے لوگ اتنا بڑا اسٹوڈیو اونچی چھت چھت پر بڑی بڑی وٹنی لائٹیں، کیمرو، ٹرائی لٹٹ پہلی بار دیکھے تھے۔ جنگل کی ہلا نہیں۔

ماں نے غلط کہا تھا شیر جنگل میں ہی رہتا ہے۔ اس نے آنکھیں میچ لیتا چاہیں کہ اسٹنٹ ڈائریکٹر نے اس کا ہاتھ پکڑا اور اسے کیرے کی پوزیشن سمجھانے لگا۔ وہ چپ چاپ سنتی رہی۔ میس سے اسے عادت ہوئی چپ چاپ ہدایات سننے کی۔ پھر اس نے اسے اداکاروں سے ملوایا۔ ایک گڑیا اس کے ہاتھ میں دے دی گئی۔ کچھ ہی دیر میں شارٹ تیار ہو گیا۔ کیرے کی ٹرائی ٹرائل لینے کے لیے کھونٹے لگی۔ وہ اس ٹرائی کے درمیان میں کھڑی تھی۔ ایکلی، چپ کمر، انٹرمنٹر۔ ماں کی آنکھوں سے نیم سندری جھانک رہی تھی، کھولی کا پٹا پارہ، بابی روٹیاں ہارمونیم کی گونگی پیٹی کپکے مسلے خواب، روپاسی خواہشیں، سستی زندگی۔ ان سب کے دلوں میں بہتے دھوکوں کے مہاساگر۔ لائٹ۔ کیمرو۔ ایکشن۔

روشنی اس کے چہرے پر پڑی۔ کیرے کی آنکھ نے شیر سامنے کھولا۔ ساری دنیا نے چپ سا دھلی۔

”میں ہوں مہ جیں۔ علی بخش چینی ماسٹر کاریاض اقبال بانو کا نرت۔“

اسٹوڈیو کی دیواریں گر گئیں۔ دیوانوں کا جھوم دیواروں سے اندر آنے لگا۔

تجربہ کار کی گوری۔ صاحب بی بی کی چھوٹی ہوس۔

سارا ہندوستان دائرے میں سمٹ آیا۔ ہزاروں سال نرگس جس بے نوری پر روتی ہے۔ میں ہوں وہ ”صاحب جان“



اس کا پہلا اشارت کامیاب رہا تھا۔ بے بی کے لیے سب نے تائیاں بجا لی تھیں۔ دائی بی پر ماں کے ہاتھ میں پہلے دن کی کمانی پچیس روپے تھی اور ماں کے پیر زمین پر نہیں پڑتے تھے۔ اسٹوڈیو میں جلتے، سڑک کو پار کرتے ٹرام میں بیٹھے، کھولی کی طرف آتے اس دن کئی بار ماں کے چہرے پر مسرت کے وہ رنگ نظر آئے جو اس کی کسی ساڑھی میں نہ تھے۔ ماں بنگالی گانا گنگنا رہی تھی۔ گھر واپس پر اس کے ہاتھ میں مٹھائی تھی اور ماں کے ہاتھ میں کھانے بنے کا سامان۔

کھانا کھا کر مہ جیں کتیز سے کھیلنے کے لیے اس کی کھولی میں گئی تو اس کی ماں بولی۔  
”رات کو بھی کوئی کھیلتا ہے بنا؟“

”رات۔!“ مہ جیں کی آنکھیں ڈھپلا گئیں۔ اس رات سوتے ہوئے اسے سب بھول گیا۔ کڑیا، کیمرو، تائیاں، مٹھائی، سینما۔ یاد رہا تو بس اتنا ”رات کو بھی کوئی کھیلتا ہے بنا۔“

کتنے ہی دن وہ روز ماں کے ساتھ جاتی رہی۔ ایک دن سیٹ پر ملی لائی گئی اور وہ ڈر کر ماں کے پلوں میں دبک گئی۔ اس نے جیج مانی چاہی لیکن میٹیش بابو، جو اس کے سر پر کھڑے تھے ان کے ڈرے خاموش رہی۔  
”بے بی! یہ بی بی آپ کا منہ ایسے چالنے گی۔“ وہ کھڑے ہوتا رہے تھے۔

سارا اسٹوڈیو اوپر نیچے سے مل رہا تھا۔ وہ بی بی سے کسی بچھو کی طرف خوب زدہ ہوتی تھی۔ وہ تھر تھر کانٹے لگی۔ اس نے ماں کے پلوں میں دبک جانا چاہا لیکن ماں کی نظر میں ایسی کڑی تنبیہ تھی کہ اس کی جان پیروں کے راستے نکلنے لگی۔ شوٹنگ شروع ہوئی۔ بی بی اس کے قریب آئی اور اس کا منہ چاٹنے لگی۔ اس کے دل کی دھڑکن موت بن گئی۔ نہ رگ تلواری تلے آئی۔

آسمان اس کا گلا دوپٹے کو جھک آیا۔ ایک بڑی دانی لائٹ اوپر سے آکر عین اس کے سر پر گر گئی۔ پھر بھی تکلیف تم نہ ہوئی اور لی اس کا منہ چاٹتی رہی۔ ہاٹی رہی۔

میں سے اسے تکلیف نہ کر بھی کام کرتے رہنے کی عادت پڑی۔

\*\*\*

مدھو جانتی تھی وہ پلی سے ڈرتی ہے اور یہ کہ آج سیٹ پر پی لی لائی گئی تھی۔ جب وہ مشکل سوچائی تو وہ اس کے کان کے پاس آئی اور میاؤں میاؤں کرنے لگی۔

مہ جبین نے وہ چیخیں ماریں کہ ننھے خان کی سارنگی موتی رام کے آرگن پر نرنج طاری ہو گیا۔ باسٹرو شاو کی دھن نے بھنگ کر جنگل کی راہ لی۔ چھپرہ بلڈنگ، دادر پل کے اطراف، جہاں جہاں کوئی خواب میں بھی محو کلام تھا وہ بھی گونگا ہو گیا۔ سڑکیاں چلاتے چلاتے وہ بے ہوش ہو گئی۔

اندھیروں میں برائے نام روشنی ہوئی

بستیوں میں کسی کے درد کی نگار ہوئی

جو کیرے کے سامنے نہ کر سکی وہ کھولی میں کر دیا۔

ماں کی آنکھوں کی تیرگی اور باپ کے ہار مونیم کی پٹی خاموشی سے اسے دیکھتے رہے۔

\*\*\*

رات دہلی۔ دن لکھنؤ۔ یہاں امروہ کی چاندنی رات، مرحوم انیس حسن کے گھر کے آنگن میں رتے جھکے تنگ جھلملا رہی تھی۔ بڑی آپا کی شادی کی ڈھولک تھی۔ سفید اجلی چاندنیوں پر لڑکیاں اپنے رنگین اچھل پھیلے، کچھ سنٹائے، ڈھولک بجاری تھیں۔ ان کی مائیں غمخیز گائو تکیوں سے کمر نکالے تخت پر براجمان تھیں۔ بچے ادھر ادھر دوڑتے پھرتے تھے۔ ادھر بڑے کمروں میں گانگریس کو کٹڑے کٹڑے کیا جا رہا تھا۔

امیر حیدر ادھر مروانے میں تھا نہ ادھر ڈھولک کے زناٹے میں۔ وہ درمیانے میں تھا کہ دور پرے کی بوا کے

تخت کے آس پاس منڈلا رہا تھا۔ کب سے ان بوا کے چاندی کے پاندان پر نظر رکھی ہوئی تھی جس پر پھوٹی ہندری لگی تھی اور چلیاں بواجی کے پلو سے بندھی تھیں۔ پاندان بواجی کے ٹھٹھے سے کچھ ایسے چپکا تھا جیسے اس میں ان کا دل ہو، اور اسے الگ کرتے ہی بواجی فوت۔ یہ تو ہوا جاتی ہوں۔

بتائے جی کو خراب کرتے میٹھی سپاریاں، بالوشانی اور چم چم کس قدر بد مزہ۔ اصل لطف تو اس جندری والے پاندان میں ہی تھا بس۔

رات کا دوسرا پھر بھی بیت جانے کو ہوا۔ بواجی کے سونے کے آثار سرے سے نظری نہ آئے تو امیر حیدر نے کھسک کر بواجی کے تخت پر جگہ بنائی۔ بواجی اپنے رنگیلے، چپاٹے اچھل کو پوچھنی تک کھینچے ساگ گیت گارہی تھیں۔ اندر آپا شرم سے زعفران ہو رہی تھیں۔ لڑکیوں کا جوم بھی عجیب سحرانگیز تھا۔ پر پان کو چرا کر کھانے لینے کی مستی بھی کم نہیں تھی۔ آخر پاندان تک اس کا ہاتھ پہنچ گیا اور پلو بھی ہاتھ آ گیا۔ جیسے ہی اس نے جندری میں چالی ڈالی، بڑے بھیارضا حیدر کی پولیس لٹکارنے لے گیا کپڑا کر رکھ دیا۔

”امیر حیدر، یہ کیا گستاخی ہے؟“ ڈھولک تھی، سب کے چہرے ادھر امیر حیدر کی طرف گھوم گئے اور بوا دھک سے رہ گئیں۔ ماں، بیٹیں، مانو شرم سے ڈوب مریں۔

”کیا کر رہے ہو؟“ جواب نہ ملنے پر سامراجی جلال عود آیا۔ جبکہ سب کو نظر آیا تھا کہ کیا ہو رہا تھا۔ امیر حیدر نے پاندان کو وہیں چھوڑا اور چلا کہ اندر کسی کمرے میں دوڑ جائیں کہ بھائی جان نے سامنے آ کر اسے روک لیا۔

”یہ کیا کر رہے تھے۔ چوری؟“

”میں تو بس پان۔“ سب اسے دیکھ رہے تھے

ورنہ وہ اتنا نہ سہتا۔

”ایسے چرا کر۔ جانتے ہو نا چوری دانے کی ہوا خزانے کی چوری ہی ہوتی ہے۔ تمہاری انہی حرکتوں نے ہمیں عاجز کر دیا ہے۔ یوں کرو گے خاندان کا نام

روشن۔“ غصے کی شدت سے آواز سارے گھر میں گونجنے لگی۔ سب ہی عورتیں اپنے دل تمام کر رہ گئیں۔ اس سے پہلے کہ کوئی قریب جا کر دونوں کے درمیان آتا، ایک گونج دار پھٹنے امیر حیدر کو دور جا پٹا۔ باپ کے مرنے کے بعد بھائی جان ہی تو گھر کے بڑے تھے۔ یوں اتنے لوگوں میں پھیر بھی مار سکتے تھے اور گلا بھی دیا سکتے تھے۔

جب وہ نشن سے اٹھا تو کیماری کی مٹی نے اس کی کچھ ایسی درگت بنا دی تھی کہ ماحول کی سفاکی کے باوجود خاندان کی لڑکیاں اس کی دھول مٹی صورت پر کھکھلا کر بس دیں۔ دن بھر جو لڑکائیوں کا ہوتا رہا تھا اب وہ یوں جو کر بن گیا ہے۔ انہیں تو بھی برا مزا آیا۔ سولہ سترہ سالہ امیر حیدر کھڑے کھڑے وہیں جل کر دھواں ہو گیا۔ اماں نے بڑھ کر پلو سے منہ صاف کرنا چاہا لیکن وہ کوندے کی طرح گھر کے اندر گم ہو گیا۔ یہ لڑکا اگلے کئی سال گھر سے گم رہا۔ اس نے امروہہ ہی چھوڑ دیا۔

رات کالا پانی ہے۔ امروہہ چیل کی سلاخیں۔ وہ لاہور چلا آیا۔ برٹنل نے فیس کی عنایت کی اور وہ پڑھنے لگا۔ کمائیاں لکھنے لگا، اشعار کہنے لگا۔ امروہہ اس کے خوابوں میں آتا رہا لیکن وہ خواب میں بھی چل کر امروہہ نہیں گیا۔ اس کی کمائیاں اور شاعری اسے بھیڑ میں الگ کرتی گئی اور وہ راست بنانا آگے بڑھتا رہا۔

گلتے سے ہوتا۔ بھی آتا۔ دوستوں نے یقین دلایا۔

”بھئی جاؤ، فلم لکھو، تم سے بڑھ کر کون اس فن کے لائق ہو گا۔“

مدرسے کا لائق فائق، اردو، عربی، فارسی کا ماہر، زبان و بیباں پر حاکم، انداز و اطوار میں شانہ، مزاج میں نواب امیر حیدر۔ کسی نہ کسی طرح ایک بڑی فلم کمپنی کے مالک سے ملنے میں کامیاب ہو گیا۔ کچھ کچھ اس تک اس کی شہرت پہلے ہی پہنچ چکی تھی کہ ایک لڑکا ہے، اچھا لکھ لیتا ہے۔ دیکھ لیں۔ لیکن جیسے ہی انہوں نے امیر حیدر کو دیکھا انہیں مایوسی ہوئی۔ انیس بیس سال کا، مونچس لگائے، دھان پان سال کا لکھا

گلا۔ بھی فلم۔ بچوں کا کھیل تھوڑی ہے۔

”تم۔“ تم تو لکھت نہیں دیکھتے۔ وہ کہے بنا رہ نہیں سکے۔

”میں دیکھنے کی چیز تو نہیں جناب۔ سننے کی چیز ہوں۔“ سراب مودی مسکرا دی۔

”چلو پھر سننا۔ دیکھتے ہیں تم کتنا سننے کی چیز ہو۔“

امیر حیدر نے ہاتھ میں پکڑی فائل کھولی اور یہ جان کر کہ جو فائل وہ کمرے سے اٹھا کر لے آیا ہے وہ تو خالی ہے، اس کا سر گھوم گیا۔ اسے سراب مودی کے پاس آنے کی زیادہ جلدی تھی یا وہ اتنا پر جوش ہو گیا تھا کہ یہ تک نہ دیکھ سکا کہ فائل میں اس کے لکھے کلمہ کلام سرے سے موجود ہی نہیں ہیں۔ سراب مودی امیر حیدر کو دیکھ رہے تھے۔

تو کیا وہ ان سے کہہ دے کہ وہ تو خالی ہاتھ آ گیا ہے۔ ذہن میں تو بہت کچھ ہے لیکن ہاتھ میں کچھ نہیں۔ جس شخص کے اس کے ہا پر کام لینے والوں کی بسی لائن لگی تھی، وہ اس انسان کے اس کے اندر بیٹھا تھلہ زندگی کہیں اس پہلے موقع کی بربادی کو زندگی کے آخر تک نہ لے جائے۔

سراب نے امیر حیدر کو دیکھا کہ چلو میاں، دیر کیوں کر رہے ہو۔ پیٹ نہ اس کی پوچھنی پر چکا لیکن کھڑے ہو کر اس نے جلدی سے اپنا نسخہ ان سے موٹ لیا۔ خالی فائل کو کتاب کی طرح کھول کر ایسے پڑھنے لگا جیسے اندر کوئی مسوہ ہی تو رکھا ہے۔

”کس نے پکارا ہمیں؟“

”جہاں پناہ۔“ کاندھے پر اٹھائے مرہ وجود کو

فریادی، جمائے کے سامنے کرتا ہے۔

”کس نے ظلم کیا تم پر۔ تم نے۔ تم نے مبادولت کی رعایا کی جان پر ہاتھ ڈالا۔ تم نے ہماری حکومت کی ساکھ پر چوٹ کی۔ تم نے ایک انسان کا خون کیا۔ تم گردن مار دینے کے لائق ہو۔ جو انسان اخلاق کے دائرے سے نکل جائے، اسے دنیا کی حد سے بھی باہر نکل جانا چاہیے۔ تمہارے لیے ہمارے انصاف نے سزا موت تجویز کی۔ ایک ملال کی غلطی، مائو کے

سارے مسافروں کو لے ڈوبتی ہے۔ علم کی قبیل کی جائے۔

وہ اپنی ہی دھن میں بولتا جا رہا تھا یہ جانے بغیر کہ سراب اپنی سیٹ سے اٹھ کر باہر جا چکے ہیں۔ باہر سے کھٹ پٹ کی آوازیں بھی اسے چونکنے پر مجبور نہ کر سکیں اور جیسے وہ پہلا سراب مودی کو عین اپنے پیچھے کھڑا لیا۔ ان کے ہاتھ میں ایک کاغذ تھا۔ وہ نا بھیجے سے سراب مودی اور کاغذ کو دیکھنے لگا۔

”یہ لوسہ تم تو کمال کے آدمی ہو۔“ وہ سمجھا کہ شاید انہوں نے دیکھ لیا ہے کہ فائل میں کوئی مسودہ موجود نہیں۔ اب وہ اس پر طنز کر رہے ہیں۔

”جی۔ وہ میں۔۔۔ دراصل۔“

”یہ اپنا کنٹریکٹ تو تین سو روپے ماہوار پر آج سے تم میری فلم کپنی یونٹن کے لیے لکھو گے۔“ امیر حیدر نے کنٹریکٹ کو ہاتھ میں لیا اور حیرت سے سراب مودی کو دیکھا۔

”عدل جتا گیر پر جو کچھ تم نے مجھے ابھی سنایا ہے اس پر فلم لکھنا چاہو گے؟“

”ضرور جناب۔۔۔ اس کا مرکزی خیال مجھے شبلی نعمانی کی ایک نظم کو پڑھ کر آیا تھا۔ فلم کا نام ”پکار“ ٹھیک رہے گا؟“

”پکار“ یونٹن کی ہوئی۔۔۔ تم اس کا اسکرپٹ لکھو امیر حیدر۔“ وہ کرسی پر بیٹھ گئے۔

اپنے ہاتھ میں پکڑے کنٹریکٹ کو دیکھتے ہوئے وہ ہولے سے مسکرایا۔ پھر میز پر دونوں ہاتھ رکھ کر ذرا سا جھک کر کہا۔

”ابھی آپ نے ہی مجھے کمال کا آدمی کہا۔ کمال کا یہ آدمی امروہ سے ہے۔ مجھے ”کمال امروہی“ کہیں۔ کیونکہ آج ابھی سے میں ”کمال امروہی“ ہوں۔“

☆☆☆

”اگر میری قسمت مداری کے بندر جیسی ہی بنانا تھی تو مجھے انسان بنادینے کا مطلب۔“ (ڈائری)

روز اسٹوڈیو جانا جیسے بحرہ میں ڈوب مرنے کے

لیے کو جاننا۔ سانسیں پتھر ہو جاتیں، آنکھیں ستارا ہو جاتیں، من بھاگ جانے کو چاہتا۔ شوٹنگ کے وقفوں میں وہ ادھر ادھر دیکھتی رہتی۔ اسے سب بڑے بڑے دیو لگتے، یا مٹھینیں، کیا انسان۔ ان دیوؤں میں اس نے خود کو کبھی پر نہ سمجھا۔

جس دن شوٹنگ مکمل ہوئی، اس دن اس سے وہ گزرا واپس لے لی گئی جو اسے ہلانے کے لیے دی گئی تھی۔ آنسو کچھ اس کرب سے اس کی آنکھوں سے نکلے کہ اقبال نے اسے فوراً اپنے سینے میں سیٹھ لیا۔

”اور پیسے آجائے دو۔ میں تمہیں ویسی ہی گزرا لے دوں گی۔“ چار پانچ سالہ۔۔۔ جہیں نے سر اٹھا کر اس کو دیکھا۔

”آپ تو کتنی ہیں جو لوگ مر جاتے ہیں وہ واپس نہیں آتے۔“

وہ پہلی گزرا تھی جو اس کے ہاتھوں سے چھین لی گئی تو وہ اس کے لیے مر رہی ہوئی۔ رات بھر وہ جاتی رہی۔ اپنی گزرا کے مر رہے وجود سے لپٹ کر روتی رہی۔ پھر اس نے گزرا کی قبر بنادی۔ دل کے گھٹان میں قبرستان بننے کی ابتدا ہو گئی۔ کتبے لگنے لگے۔ جمعراتیں نہ شب راتیں، وہ رات ان پر درو کر سونے لگی۔

☆☆☆

کافی دیر سے وہ اس کھولی کو ڈھونڈنے کی کوشش کر رہا تھا جس کے بارے سے بتایا گیا تھا کہ وہاں ماسٹر علی بخش کی دو چھوٹی بیٹیاں جیلر فلم کے کردار کے لیے مناسب رہیں گی۔ کمال ان میں سے کسی ایک کو ان کی فلم کے لیے دیکھ لے۔ جیسے ہی وہ ان کھولیوں کے قریب آیا اسے عجیب سی الجھن ہوئی۔ ایک لمحے کو سوچا کہ کیسے لوگ ان چھوٹے چھوٹے بدبودار ڈروں میں رہ لیتے ہیں۔ پچھلی رات کچھ بارش ہوئی تھی اس کی بھی بسانہ تھی۔ اس نے ناک پر رو مال رکھا اور ادھر ادھر چند لوگوں سے ماسٹر علی بخش کے بارے میں پوچھا۔

کچھ ہی دیر میں وہ اس کھولی کے سامنے کھڑا تھا جہاں چار پانچ سازندے بیٹھے اپنے سازوں کی مرمت کر رہے تھے۔ وہیں اسے علی بخش بیٹھے مل گئے۔ وہ باہر ہی کھڑے ہو کر باتیں کرنے لگے۔

مدھو کو بلایا گیا لیکن اس نے دوسری بچی کو دیکھنے کے لیے بھی کہا۔ علی بخش نے مدھو کو بہن کو بلالانے کے لیے کہا۔ کمال ادھر سامنے سازندوں سے بات کرنے لگا۔

”آداب۔۔۔ میں ہوں۔۔۔ جہیں۔۔۔ فرمائیے۔“

آواز کی ٹھنک، انداز کی مدھرتا نے کمال کو یکدم پلٹ کر دیکھنے پر مجبور کر دیا۔ ماسٹر نوشاد ہارمونیم کے تختے اٹھائے، ٹو بے کی تختیاں ٹھیک کرنے میں جتے تھے کہ اسی ساعت کتنی ہی تختیاں سازوں کی لہرس بناتی ”آداب! میں ہوں۔۔۔ جہیں۔“ کے سنگ ہوتی کانوں کے پردوں پر چھن چھن رہیں۔

اس کے عین نیچے ایک معصوم صورت چھ سات سالہ بچی کھڑی تھی۔ اُدھ کھایا آم ہاتھ میں تھا، کچھ منہ پر لگا تھا۔ کمال مسکرا دیا۔

علی بخش سے بات کر کے جب وہ واپس لوٹا تو بھروسے جیسے رائیں ”آداب! میں ہوں۔“

۔۔۔ جہیں نے کی صورت اس کے کانوں میں گونجتی رہیں۔ ستار کے دو تار آپس میں آٹے۔

”بہت دن گزرے،“ وہ ٹرام میں اپنے دوست کے ساتھ بیٹھا تھا کہ جب ٹرام چھپرہ بلڈنگ کے پاس سے گزری تو اس نے بے اختیار ہاتھ اٹھا کر اشارہ کیا اور کہا۔

”ایک دن میں یہاں سراب مودی کی فلم کی کاسٹ کے لیے آیا تھا۔“

”اس چھپرہ کھٹ سی بلڈنگ میں سراب کی فلم کی کاسٹ کے لیے؟ ایسا کون رہتا ہے یہاں جو ان کی فلم میں کام کرے؟“

کمال ہنس دیا۔ لیکن پھر سنجیدگی سے کہا ”آئے والے وقت کی بہت بڑی ہیروئن۔“

”تم گانگ بن گئیں تو دنیا کو بہت رلاؤ گی

۔۔۔ جہیں۔“

اس کی آواز کے سوز پر طبلہ نواز کبھی کبھی اس کے سر پر چپٹ لگا کر کہتے۔ فلم کی تلاش میں اسٹوڈیو جانے کے ساتھ ساتھ وہ گانا بھی سیکھنے لگی تھی۔ ماں تو خود بہت اچھا گالیتی تھی، اسے بھی سیکھنے کے لیے بٹھادیا۔ وہ کمر سیدھی کے گردن، پیٹ کو ایک بل کیے، استاد جی کے سامنے سنگیت سیکھنے کے لیے بیٹھتی تو اس کی آواز میں کھولی کی کتنی ہی راتیں اندھیرا کرنے لگتیں۔ ایسے ہی اس کی آنکھیں گمبیر ہوتی گئیں، اس کی آواز تشریح ہوتی تھی۔

اس کا بچپن اسٹوڈیو کے شور ہنگامے، روشنیوں اور کمرے کی ٹرائی کے گرد گزرا تھا۔ اسے ماہر کی دنیا غیر حقیقی لگنے لگی۔ وہ فلم کے سیٹ پر ہوتی تو لگتا جیسے سیٹ پر ہی رہے گی، زندگی ہمیں تمام ہو جائے گی۔ فلم میں اس جیسے دو تین اور بچے بھی شامل ہوتے تو اس کی ان سے دوستی ہو جاتی۔ شوٹنگ کے وقفوں میں وہ آپس میں کھیلتے۔ فلم کے مکمل ہوتے ہی گزرا کی طرح یہ دو ستیاں بھی اس سے چھن جاتیں۔

اب کبھی وہ ماں جی کے ساتھ اسٹوڈیو، اسٹوڈیو فلم کی تلاش کے لیے جاتی۔ کبھی باپ جی کے ساتھ اور کبھی ماسٹر نوشاد کے ساتھ۔ اس نے چار پانچ فلموں میں کام کر لیا تھا، اسی لیے ماں کو عین ساہونے لگا تھا کہ فلم نگری کے ساتھ جو سنگم ان سب کا نہیں بن سکا، اس کا بن جائے گا۔ ایک دن شاید وہ کچھ نہ کچھ بن جائے گی۔ ایک دن مدھو کی ضد پر باپ جی انہیں جیسے تیسے میلہ دکھانے لے آئے۔ گلابی ساڑھی پہنے ایک من موہنی سی لڑکی نے اسے روک لیا۔

”تم فلموں میں کام کرتی ہو نا۔۔۔ میں نے تمہیں دیکھا ہے۔“ مہ جہیں شرما گئی۔ لڑکی نے ہاتھ میں کچھ کھانے پینے کی چیزیں پکڑی ہوئی تھیں، وہ اس نے مہ جہیں کے سامنے کیں۔

”لو کھاؤ۔۔۔ اچھا ذرا یہ تو بتاؤ، جب تم بڑی ہو جاؤ گی تو کیا کرو گی۔۔۔؟“

”پڑھوں گی۔۔۔ ساری دنیا گھوموں گی۔۔۔ گانا گاؤں

گی۔ ”وہ یہ کہنا ہی چاہتی تھی کہ آپاؤرا ہو لیں۔“  
”کیا کرے گی مطلب؟ بڑی بڑی فلموں میں نام کرے گی۔ بڑی سی موثر میں کھوے گی۔ یہ بڑے بڑے بنگلوں میں رہے گی۔ سارا ہندوستان اس کے آگے پیچھے ہو گا۔“

”باپ رے۔۔۔“ لڑکی، آپا کی بات پر کھلکھلا کر ہنس دی اور اس کے گال پر پیار کر کے چلی گئی۔ مدھو اور آپا دونوں ہی میلے میں اترائی اترائی پھریں کہ جیسے سارا ہجوم ہی تو جانتا تھا کہ دیکھو وہ فلموں میں کام کرنے والی بے بی چلی جا رہی ہے۔ اسے لگا سب اسے ہی دیکھ رہے ہیں۔ اب اسے کہیں غلطی نہیں کرنی ورنہ شارٹ گٹ ہو جائے گا۔ وہ فلم سے نکال دی جائے گی۔

اس کے ہاتھ سے گرم جلیبی پھسل کر گری اور وہ اسے اٹھا کر کھانہ سکی۔ ”بھئی دیکھو تو بے بی گندی چیزیں کھاتی ہے۔“ سارا میلہ اُجڑ گیا۔ بڑی بڑی لائٹیں لگ گئی، کمرے کی آنکھ کھل گئی، ڈائریکٹر کی بھینس تن گئیں۔ ساری دنیا اسٹوڈیو کے سیٹ میں بدل گئی۔ اور وہ تنہا کھڑی رہ گئی۔

”کس سے چھوٹ کر میں کہاں چلی جانا چاہتی ہوں۔“ معلوم نہیں۔ معلوم نہیں۔ (ڈائری)

☆☆☆

کچھ دن وہ اسکول گئی لیکن پھر اگلی فلم مل گئی تو دوبارہ نہ جاسکی۔ ماسٹر جی گھر پر بھانے آجاتے تھے۔ اپنی کتابیں وہ ہر جگہ ساتھ رکھتی تھی۔ جب شوٹنگ میں وقفہ ہوتا پڑنے لگتی۔ سب اسے ”کتابی بیجہ“ کہتے۔ شروع شروع میں وہ کتابیں چھپا لیتی تھی لیکن پھر ایک ایک بیرونی نے اسے دیکھ لیا۔

”تم اپنی کتابیں کیوں چھپا لیتی ہو؟“ گال چھو کر کہا۔ ”مجھے یہ ڈر رہتا ہے کہ کوئی انہیں مجھ سے چھین لے گا۔“

”تم کسی فلم کے سیٹ سے تو نکالی جاسکتی ہو لیکن کتابوں کی گمری سے نہیں۔ تم سے سب کچھ چھینا جا

سکتا ہے تمہاری پڑھنے کی لگن کو نہیں۔“

وہ بات سمجھ گئی اور اس سے یہ خوف جاتا رہا کہ گریا کی طرح اس سے کتابیں بھی چھین لی جائیں گی۔ یہ کتابیں اس کی تھی۔ لفظوں کے بچے کرتے جب وہ نپٹے پڑھنا سیکھ گئی تو اس نے اسٹوڈیو کے میک اپ روم کے ایک دروازے سے ایک کانڈیلا پالا۔ وہ کسی اسکرپٹ کا پھنسا کانڈیلا تھا۔ اس پر ایک سطر لکھی تھی۔

”زندگی کی قید و بند میں میرا قصور اتنا ہی رہا کہ میں نے وہ دل پائی ہے ہر ایک نے تختہ دار بنایا۔“

وہ اتنی حساس تھی کہ ادھوری بات کا پورا احساس پیا گئی۔ کانڈیلا ہاتھ میں لے کر زمین پر بیٹھتی چلی گئی۔ یکدم اس کے دل میں درد ہوا۔ اپنے دل کے تختہ دار بن جانے کا خوف اسے لاحق ہوا۔ وہ حساس تھی اتنی حساس تھی تصدیق ہو گئی۔ آنسو بے اختیار اس کی آنکھوں سے بہنے لگے۔

بابو جی سے وہ ایک سی فرمائش کرتی۔ نارل پانی، تانہ پھول اور کتاب۔ ایک ملا کھولی کے باہر لا کر رکھ دیا گیا جس پر گلاب کے دو پھول کھلے تھے۔ جنہیں وہ آتے جاتے سمجھتی رہتی۔ نارل پانی تیلوں، بہنوں کو لے جا کر بابو جی پلا لاتے۔ اور کتاب۔

فلم کے سیٹ پر ایک اداکار کتاب بڑھ رہا تھا۔ وہ کتنے دنوں تک ہمت کرتی رہی کہ کاش گھڑی دو گھڑی کے لیے اس سے کتاب مانگ کر دیکھ سکے۔ کتاب ہاتھ میں پکڑ کر دیکھنے کی شدت اس انت پر غم گئی کہ اسے دن کی روشنی میں رات کے ستارے دکھائی دینے لگے۔ بہت دنوں بعد ہمت جمع کرتی، خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتی ان کے پاس گئی۔

”جب آپ یہ کتاب بڑھ لیں گے تو مجھے دیکھنے کے لیے دیں گے؟“ اداکار نے چونک کر اسے دیکھا پھر ہنس دیا۔

”میں یہ کتاب دوبار پہلے بھی پڑھ چکا ہوں۔ تم اسے دیکھ بھی لو اور پڑھ بھی لیتا۔ یہ کتاب تمہاری ہوئی۔“ تمہیں نے مرجانے کی حد تک خوشی محسوس کی اور کتاب کو پکڑ لیا۔

”ماسٹر جی کیا میں بھی یہ سب لکھ سکتی ہوں؟“ جب وہ کتاب کو کتنی ہی بار پڑھ چکی تو ایک دن ماسٹر جی کو دکھانے لگی۔

”ہاں! کیوں نہیں۔ بس یہ خیال رہے کہ شاعری ٹٹو کی سواری نہیں کہ پیٹھ پر ہاتھ رکھ کر اس پر بیٹھ گئے۔ یہ تو اپنے آپ ہوتی ہے تمہیں۔“

”ساری کتابیں اپنے آپ ہوتی ہیں۔“

”نہیں! لیکن جو اپنے آپ ہوتی ہیں وہ امر ہوتی ہیں۔ وہ خدا کی دین ہوتی ہیں، روح کی پکار ہوتی ہیں۔ مجھو جد کی کیفیت۔“

”میں بھی امر ہونا چاہتی ہوں۔ میں شاعری کروں گی۔“

”پر تم تو اداکاری کرتی ہو۔۔۔“

وہ تجھ سی گئی۔ ”میں فلموں میں کام کرنا چھوڑ دوں گی۔ جب ہمارے پاس ایک گھر ہو گا۔ بابو جی کے پاس اپنی موٹر اور اتنے پیسے کہ خورشید آپا کی شادی کر سکیں۔“

”اتنے پیسے کبھی اکٹھے نہیں ہوتے تمہیں۔“

”ہو جائیں گے ماسٹر جی۔ دیکھیں نا میں پانچ فلمیں کر چکی ہوں۔ فلم بہن کے لیے گانا بھی گایا ہے۔ کے لی لال جی نے ”لال حوٹلی“ کے لیے بابو جی سے بات بھی کر لی ہے۔“ اس نے کاپی پر لکھنا شروع کیا۔

”میں سمجھ گیا مہ جنہیں۔“ ماسٹر جی نے اس کا ہاتھ روک دیا۔

”دیکھا ماسٹر جی۔۔۔ آپ بھی سمجھ گئے نا۔“ وہ خوش ہو گئی۔

”تمہارے بابو جی بتا رہے تھے تم نے طرح طرح کے پتھر اکٹھے کرنے شروع کر دیے ہیں۔“

وہ پٹ پٹ ماسٹر جی کو دیکھنے لگی اور خاموشی سے سر جھکا دیا۔ یہ تب کی بات ہے جب ایک فلم کی آؤٹ ڈور شوٹنگ کے دوران اسے ایک پتھر ملا تھا۔ جسے اس نے اپنی جیب میں رکھ لیا تھا۔ پتھر کی بناوٹ کچھ ایسی تھی کہ اسے لگا کہ وہ ایک چھوٹا سا بوٹا انسان ہے۔ جب خاموش، لیکن سانس لیتا ہوا۔ جیب میں اس پتھر کو

رکھے رکھے وہ شوٹنگ کرتی رہی۔ اسے پہلی بار لگا کہ وہ وہاں اکیلی نہیں ہے۔ کھولی کی سہارا، اسکول کی ہم جو لیاں اس کے تنگ ہیں۔ شوٹنگ کے وقفے میں وہ پتھر کو جیب سے نکالتی اور اس سے باتیں کرنے لگتی۔ وہ بھی اس سے باتیں کرتا۔

”وہاں! یہ تو بولتا بھی ہے۔“

وہ ہنس دی۔ وہ بھی ہنس دیا۔ یوں روزیہ پتھر اس کی جیب میں رکھا شوٹنگ کرنے آتا۔ واپس گھر جانا رات کو اس کے ساتھ سوتا۔ اب وہ جہاں جاتی پتھر اکٹھے کرتی رہتی۔ کمرے میں پتھروں کو جا بجا گھولوں کی طرح سجا دیا۔ وہ ان کے ساتھ مل کر روتی، ہنستی، باتیں کرتی، غصہ کرتی، انہیں ڈانٹ دیتی۔ بابو جی نے ایک دن اسے پتھروں سے باتیں کرتے دیکھ لیا۔

”منایہ کیا کر رہی ہو۔۔۔ لوگ پاگل کہیں گے۔“

”جہیں نے ڈر کر اپنے سارے مادھو چھوڑ دیے۔“

”مجھے منظور ہے لیکن انہیں کوئی کچھ نہ کہے۔“

☆☆☆

فلم ”پکار“ ریلیز ہوئی اور کمال کی مکالمہ نویسی کے ڈٹے چاروں طرف بجتے لگے۔ فلم کی کامیابی نے اس بیس سال کے لڑکے کو صف اول کے کہانی نویسوں میں لے جا کر رکھ کر دیا تھا۔ آج سے کئی سال پہلے وہ گھر سے بھاگ آیا تھا۔ لاہور کے ایک کالج کے ٹیٹ کے باہر بیٹھا، بڑی آس سے آتے جاتے طلباء کو دیکھ رہا تھا۔ پر پہل نے کچھ اس کی نظروں میں بھلایا، کچھ اس کے حلقے سے اور اسے کالج میں اپنی سرپرستی میں داخلہ دلوا دیا۔ گھر، خاندان، امروہہ سے دور، نئے شہر کی زندگی، امتحان، مسلسل کھیں۔ لیکن اصل امتحان ”سینما اسکرین“ تھی۔ پہلے تو اسی بات کی بہت شہرت رہی کہ ایک کم عمر لڑکے کو سراب مووی کی فلم مل گئی ہے۔ پھر فلم بن کر مکمل ہو گئی تو سب ہی شہر سے کہ فلم تو حضور ہی بنے گی۔ سراب مووی کو اپنی غلطی کا احساس ہو گا۔ کتنا عجیب تھا لیکن نہیں مانے اب سب سمجھ میں آجائے گا۔



غلطی کا احساس ہوا، لیکن ان لوگوں کو اس غلطی کے پتے کا انتظار تھا۔ ”امیر حیدر“ کو کمال فانی بننے سے کوئی نہ روک سکا۔ اس کی فلم کی عمر اہل سے لدے اخبار امروہہ شہر میں بھی بڑھے گئے۔ جو یہ اعلان کر کے گیا تھا کہ میں اس شہر میں ہی رہوں گا: اب یہ شہر میرے نام سے پچانا جائے گا۔ شہر کو پچان مل گئی تھی لیکن شہر کو ابھی کمال واپس نہیں ملا تھا۔

داوی نے درود کر زمین آسمان بھگو ڈالے تھے۔ اپنے چنپن کی واپسی کے لیے انہوں نے کوئی وظیفہ، نقل، مفت میں چھوڑی تھی۔ کوئی ایسا جانے والا نہیں بچا تھا جسے امیر حیدر کی تلاش کے لیے ہندوستان بھر میں دوڑایا نہیں گیا تھا۔ لیکن ان کا چنپن واپس نہیں آیا۔ داوی کی آنکھوں کی بینائی، آنسوؤں کے رستے بستی رہی۔ کمال کو اپنے پیچھے شاید ہمیشہ سے ہی عورتیں رلانے کا شوق رہا تھا۔

کام کا جنون، نام کے جنون کے سنگ تھا۔ کچھ عزت نفس کا پاس تھا، کچھ ساری دنیا کو بچھا ڈینے کی دھن۔ جتنی اس کے نام کی شہرت ہوئی جاتی، اتنا ہی اسے دلی سکون ملتا۔ اس کی عزت اور عزت نفس کچھ گلی کی سی تھی۔ وہ عزت کرنا چاہتا تھا لیکن پہلے اسے اپنے لیے ساری عزت چاہیے تھی۔ اسے دینے سے پہلے لینا آتا تھا۔ وہ کچھ وصول کر کے دان کرنا چاہتا تھا۔

وہ بے حد خوب صورت اور وجیہ انسان تھا۔ اس کی شخصیت کی دلفریبی اتنی قدرتی تھی کہ وہ جہاں سے گزرتا اس کی دھاک بیٹھ جاتی۔ بار بار اس نے رنگین شیشوں کے پیچھے لک چھپ آجکل دیکھے۔ امروہہ میں مدرسے میں یار نے میں وہ اگر بہت خاص نہیں تھا تو عام تو ہرگز نہیں تھا۔ وہ امیر حیدر تھا۔ اس کی چال میں خاندان کا نام وقار دیدہ ہی نہیں تھا اس کی چال میں کمال بھی تھا۔

کمال امروہی۔ وہ دنیا کو زیر بار رکھنا چاہتا تھا۔ محبت کو باندی، کامیابی کو پیشانی کا تلمک۔ اس کے لب و لہجے کی فصاحت اس کی سنجیدگی کی نقاشی اتنی دلفریب تھی کہ ہم ہی لوگ خود کو اس کی طرف مائل ہونے سے

روک پاتے تھے۔ خواتین کو اکثر یہ دھوکا دیتا کہ کمال ان ہی سے ایسے بات کرتے ہیں۔ لیکن پھر وہ جان ہی جانتیں کہ کمال کے انداز میں محبت کا وہم تو ہوتا ہے لیکن یقین نہیں۔

جہاں اندیشی اس کے فن اور قلم کی دلدادہ ہونے لگی تھی وہیں اس کی ذات کے اس بھاؤ سے خائف ہونے لگی۔ اس کی اتنا کے چھینے جب اڑتے تو کچھ لوگ منہ پر رومال رکھنے پر مجبور ہو جاتے۔ اس کے لیے سوالیہ نشان ہمیشہ موجود رہتے۔ اسے چاہیے کیا؟ کیا صرف کامیابی یا سب کچھ؟ اگر سب کچھ تو کیا کچھ نہیں؟

اندیشی کی بہت سی لڑکیاں، اسے پسند کرتی تھیں۔ جن فلمی محفلوں میں وہ جاتا تھا وہاں وہ عورتوں میں ہی مقبول رہتا تھا۔ ایک بار اس نے ایک ہیروئن کو محبت نامہ لکھا۔ اس ہیروئن نے اسے اپنے میک اپ روم میں بلایا۔

”یہ خط آپ نے مجھے لکھا ہے؟“ کمال صرف مسکرایا۔

”میں نے سنا تھا آپ اچھے انسان ہیں۔“ اپنی گردن بلند کیے وہ آئینے میں دیکھ رہی تھی۔ پھر وہ پھولے ہوئے پف کو اپنی گردن پر سج سج رکھنے لگی۔ ”کیا اچھا انسان محبت نہیں کر سکتا؟“ اس کے پیچھے کھڑا وہ اسے سامنے آئینے میں دیکھ رہا تھا۔

”کر سکتا ہے لیکن ایک ہیروئن سے نہیں۔“ ہیروئن کو بلانا صرف ہیرو کے بس کی ہی بات ہے۔“ ماچس کی نیلی جلا کر اس نے خط کو آگ لگا دی۔ جلتا ہوا ”محبت نامہ“ اس کے پیروں میں چمکتا رہا۔ پھر اس نے راکھ کو پیروں سے مسل دیا۔ بھائی سے پھڑکے بعد یہ دوسرا پھڑ پھڑ تھا جو اسے پڑا تھا۔ پہلے اس نے امروہہ چھوڑ دینے کا قصد کیا تھا، اور چھوڑ بھی دیا تھا۔ تو کیا اب اس نے ”ہیروئن“ کو چھوڑ دینے کا فیصلہ کیا تھا؟

نہیں۔ اس نے ایک ”بڑی ہیروئن“ کو پالینے کا ارادہ کر لیا تھا۔



اقبال کو زندگی کے اسٹیج پر ہر کردار کرنا تھا۔ وہ بس سات کرداروں پر راضی نہیں تھی۔ وہ اداکارہ، رقاصہ، گلوکارہ، بن کر امر بھی ہو جانا چاہتی تھی اور اب یوں بیماری، نقاہت سے مرمت بھی جانا چاہتی تھی۔ ایک وہ دن تھا جب وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر فلموں کے ایوانوں میں خوشامدیں، تکراریں، نقائص کرتی تھی۔ ایک وہ دن آیا جب وہ اس سے پوچھا کرتی کہ آخر وہ یہ کام چھوڑ کیوں نہیں دیتی۔ اسے بھی چاندی کی کٹوری چاہیے تھی، اب وہ مٹی کے پیالے پر راضی ہو جانے پر تیار تھی۔ وہ طاؤس کی طرح کسی تنہا زندگی کے ہاتھوں کا ساز بھی رہنا چاہتی تھی اور اک تار اپنی کسی فقیر کے ہاتھ میں بھی۔ بیماری میں ویسے بھی انسان دنیا کی بے ثباتی کو جان لیتا ہے۔ بے ضرر ہو کر خواہشوں کی پرستش کو گناہ سمجھتا ہے۔

ماں کی کچھ حسرتیں پوری ہو چکی تھیں لیکن جب اچھا کھانا اچھا گھر، زیادہ پیسے، چاندی کا پاندان، اقبال بیگم نام ملا تو زندگی کو رنگ لگنے لگا۔ وہ ایسے بیمار رہنے لگی کہ اس نے ساری نعمتوں، راحتوں کے ذائقوں کو چھٹلے دروازے سے باہر نکلنے دیکھا۔

”میری ماں، تمہاری ٹالی بال دھوا نہیں۔ ان کے نصیب میں یہ وہ بن کر جینا ہی لکھا تھا لیکن انہوں نے خاندان اور روایات سے بغاوت کر کے تمہارے ناتا پیارے لال سے شادی کی۔ خاندان چھوٹ گیا۔ تمہارے ناتا پیارے رگمرگے تو انہوں نے زس بن کر کمانے کی کوشش کی لیکن وہ اتنے پیسے نہیں کما سکتی تھیں کہ ہم پانچ بہن بھائیوں کو پال پوس سکتیں۔ ایک دن وہ پھر سے واپس ٹھیکر چلی گئیں۔ جس دن وہ دوبارہ ٹھیکر گئیں، اس دن میں نے ان کی کالج سی آنکھیں کچی کرچی دیکھیں۔“

وہ اور ماں دونوں سمندر پر چل قیدی کے لیے آئی تھیں۔ ماں جب سے بیمار رہنے لگی تھی، اسے پانی میں ڈوبتا ابھرتا سورج دیکھنے سے بہت سکون ملتا تھا۔ صبح کی ساری ہوا، اسے زندگی کی سانس لگتی تھی۔ بڑے جتنوں سے وہ ان سانسوں کو اپنے اندر اتار لیتی تھی۔

رات کے سکوت میں لہروں کا شور اسے ڈھارس دیتا تھا۔ ”زندگی کے ساحل پر ابھی بہت ریت پڑی ہے، تم قدم بہ قدم بس چلتی جاؤ۔“

”میں اپنی پوری زندگی میں آج تک وہ انسان نہیں ڈھونڈ سکی جس نے قربانی دی ہو اور اسے دیوی، دیوتا بنا دیا گیا ہو۔ میں ایسے کسی انسان کو نہیں جانتی جس نے اپنا آپ مار دیا ہو اور اسے سنگھاسن پر بٹھادیا گیا ہو۔ میری ماں کے دکھ کلک کاٹیکا بنے رہے۔ تن تھا اس کا بچوں کو پالنا، خاندان سے بغاوت کی ہزار بار، شام کا سورج ڈوب رہا تھا۔ ہوا، ماں کے سیاہ کھٹے پال اڑا رہی تھی۔“

”میں جانتی ہوں مناکہ تم پھر جمع کرتی ہو۔ راتوں کو تمہیں ان سے باتیں کرتے سنا ہے۔ تمہیں ان کے ساتھ پھوٹ پھوٹ کر روتے بھی دیکھا ہے۔ ماں سے آنکھیں چرانے کا وقت بھی نکل گیا۔ ماں نے اس کے دونوں ہاتھ پکڑ کر، اس کی آنکھوں کو صاف پڑھ لیا۔“

”تمہاری شاعری بڑھی ہے میں نے، تمہاری ٹالی کے بابو جی، رابرڈر ناتھ میگور کے بڑے بھائی تھے اس حساب سے وہ تمہارے رانا ہوئے لکھنا، رکھنا تمہارے خون میں ہے۔ فلمیں نہیں کرنا چاہتیں تو چھوڑ دو۔“

”اب چھوڑ کر کیا کروں گی ماں۔ جب تک بڑی بڑی لائٹوں کی روشنی میری آنکھوں میں نہیں پڑتی، اسٹوڈیو کی چم پھل میرے کانوں میں نہیں گونجتی، مجھے اپنے زندہ ہونے کا احساس نہیں ہوتا۔ میرا بچپن ان سیٹوں پر گزرا ہے۔ اب شاید مرکز ہی کسی سیٹ سے نکلوں۔“

”شکایت کر رہی ہو؟“

”شکایت کا وقت کہاں رہا۔ میں نے اپنی سانسیں نہیں لیں جتنی سہ سہل کی ہیں۔ اب کیسے زندہ رہوں گی ان کے بنا؟“

”تم ہیروئن تو نہیں بننا چاہتیں مٹا؟ نہ بننا، کبھی نہ بننا۔ شادی کرنا، اگلا کھانا یاد رکھنا، ہیروئن نہ بننا۔ فلمیں

وہی معمولی کردار۔ لیڈ میں تو کبھی نہیں آئیں تم منہ۔“  
”فلم میں کام تو کام ہوتا ہے یا جی۔ معمولی کیا اور  
غیر معمولی کیا۔“

”بس یوں سمجھو کہ اب تک تم فلموں میں کام کرتی  
رہی تھیں۔ اداکاری تو اب کرو گی۔“  
”اور کام کر کے کیا کرو گی؟“

”فلموں میں کام نہیں کرو گی تو کیا کرو گی؟ اتنی بڑھی  
کسی تو ہو نہیں کہ کوئی اور کام کرو۔ میں نے ساری عمر  
یہ خواب دیکھے کہ میں ایک بڑا موسیقار بنوں۔ فلمیں  
میری دھنوں کے بغیر اور میری مانی جائیں۔ لیکن مجھے  
کوئی فلم نہیں ملی اور تم۔“

”میں نے تو کبھی کوئی خواب نہیں دیکھا یا جی۔“  
”جب ہیروئن بن جاؤ گی تو ہر رات خواب دیکھ کر  
سو جا کرو گی۔“ وہ خاموش کھڑی سختی رہی۔  
”تمہیں کیا نام دیا ہے وجے جی نے آج سے تمہیں  
کامی ہو۔“

☆ ☆ ☆

کمال، بہمنی، نائیکز کی فلم ”محل“ ڈائریکٹ کر رہے  
تھے اس فلم کی دھوم بہت پہلے سے ہی تھی۔ اسے  
کسی نئے چہرے کی تلاش تھی۔  
”آپ ماسٹر علی بخش کی بیٹی کو دیکھ لیں۔ بہت  
تعریف ہوئی ہے اس کے کام کی۔“  
”کیا نام ہے اس کا؟“  
”مہ جی۔“

وہ تقہر لگا کر ہنس پڑا۔ ”اگر ہندوستان کے تمام  
یوسف خان اپنا نام دیپ کمار رکھ لیں گے تو وہ دیپ  
کمار نہیں بن جائیں گے۔ یہ بھی کوئی نام ہے اس  
نام کی لڑکی نہ خوب صورت ہو سکتی ہے نہ اچھی اداکارہ۔  
ہر انسان جو کیمرے کے سامنے آتا ہے وہ اداکار نہیں  
ہوتا۔“

مہ جی اپنے میک اپ روم میں بیٹھی میک اپ  
کروا رہی تھی۔ جری منہ اس کے کان کے پاس لاکر خبر  
سنا رہا تھا۔ اس نے بلند بانگ تقہر لگایا۔

المیوں کے بغیر نہیں چلتیں اور پھر ان میں کام لے  
والوں کی زندگیاں بھی۔“

ماں کی زبان کے لفظ ”نیگور“ کے ان لفظوں میں  
ڈھل گئے جو اس نے زندگی سے دور رہ کر موت کے  
قریب ہو کر کھوئے تھے۔

”مجھ سے وعدہ کرو منا کہ تم اب کوئی فلم نہیں کرو  
گی۔“ نجانے ماں کیوں اتنی ہلک گئی تھی۔ اس کے  
پاس تھا ہی کیا جس پر وہ وعدہ کرتی۔ نہ زبان نہ کلام  
نہ استحقاق۔ جس وقت ماں اس سے وعدہ لے رہی تھی  
اس وقت بابو جی فساد وجے جی سے باتیں کر رہے  
تھے۔ وجے جی نے مہ جی کو اپنی اگلی فلم ”بچوں کا  
کھیل“ کے لیے سائن کر لیا تھا۔

”علی بخش! فلم کا نام تو بچوں کا کھیل ہے لیکن یہ فلم  
بچوں کی نہیں ہے۔ بلی بھی بڑی ہوئی ہے۔“  
”آپ نے ہمیشہ مہ جی کو اچھی فلمیں دی ہیں۔  
پہلی فلم بھی آپ نے دی تھی۔ اب یہ اتنی بڑی فلم  
بھی آپ ہی دے رہے ہیں۔“

”مہ جیوں کا کام ہی اتنا اچھا ہے کہ یہ بتاؤ علی بخش کہ  
اور کام کرو گے بے بی سے؟“ علی بخش اس سوال پر  
تھوڑا سا جوکے۔

”کام تو کر رہی ہے۔“  
”اگر آگے بھی کام کرنا ہے تو اس کا نام بدل دو۔“

☆ ☆ ☆

”زمین مصروف ہے سب کچھ نکل لینے کو۔ اللہ  
روشنی جانے کو ہے۔“ (ڈائری)

ماں جی اسٹوڈیو لے گئیں تو بابو جی نے روکنا چاہا۔  
ماں جی کو بیماری نے دنیا کھوکھلی دکھائی تو وہ فلم نگری سے  
خائف ہو گئیں۔ لیکن اب بابو جی خائف ہونے پر تیار  
نہ تھے گھر آتے ہی انہوں نے اسے اپنے پاس بلایا۔  
”تمہیں نئی فلم ملی ہے اور کیا نام بھی۔“

”بابو جی اور کام کرنا ضروری ہے؟“ انگلیاں  
مروڑتے اس نے پوچھا۔

”تم نے ابھی کام ہی کیا کیا ہے؟ بچوں کی فلمیں؟

”میتا چند اجی ایسے کیوں ہنس رہی ہیں؟“ یل  
اپ مین نے پوچھا۔  
”نہ میں خوب صورت ہوں۔ نہ اچھی  
ایکٹریس۔“  
”کس دیوانے نے کہا ہے یہ؟“

”آج رہنے دو میک اپ۔ یہ شارٹ بنا میک اپ  
کے ہو گا۔“ اس نے میک اپ مین کا ہاتھ روک دیا۔  
اس کے دل میں ایک دم ابال اٹھا۔ وہ دوسرے  
تیسرے درجے کی فلمیں کر رہی تھی۔ کمال جیسا بڑا  
ڈائریکٹر یہ بات کہہ سکتا تھا۔ لیکن وہ کیا کرتی بڑی  
فلمیں کیسے حاصل کرتی۔ سب اس کا کام تو پسند کرتے  
تھے لیکن اسے بڑی فلمیں نہیں دیتے تھے۔ فلم بچوں  
کا کھیل کی خوب شہرت رہی تھی لیکن پھر اس کے بعد  
اسے دوسرے درجے کی دھارمک اور نامور لا فلمیں  
ہی ملیں۔

اب میتا کماری کا نیا گھر تھا جہاں روشنیاں بھی نئی  
تھیں۔ وہاں پر بندے پچھتاتے، دریچوں اور بالکونیوں  
میں پھول میکتے، موسم بد ملتے۔ ماں اہتمام سے بنگلہ  
کھانے بناتی، بنگلہ میں ہی گنگنائی، لیکن یہ ہمار  
مارچ کے اس پر تک رہی جب تک ماں زندہ رہی اور  
پھر مارچ ہمیشہ کے لیے ”خزاں“ ہو گیا۔  
باہوئی دل شکستہ زیادہ تھے کہ بار مونیہ کی بیٹی کو بھول  
گئے یا انہوں نے کوئی قسم کھالی تھی۔ پہلے اسے لگتا تھا  
کہ وقت آئے گا کہ باہوئی پھر سے کوشش کریں گے۔  
لیکن شاید انہوں نے جان لیا تھا کہ اس گھر میں ایک ہی  
انسان کامیاب رہ سکتا ہے۔ میتا۔

وہ ایسی ہیروئن نہیں تھی جو اسکرین بڑھتی اور پھر  
پاں یا ناں کہتی۔ اسے تو بس کام کرنا تھا۔ فلمیں چاہیے  
تھیں۔ جو تھوڑا بہت اس کا نام بنا تھا وہ اسے تیسرے  
درجے کی فلمیں ہی دیا رہا تھا۔ یہ تیسرے درجے کی  
فلمیں بھی نہ ملتیں تو وہ کیا کر لیتی۔ کوئی بھی فلم اس کے  
بغیر ادھوری نہیں تھی۔ وہ کسی ایک بھی کہانی یا فلم کی  
ضرورت نہیں تھی۔  
”کیا میں بھی بڑی ہیروئن نہیں بن سکوں گی۔“

میرے نصیب میں ایسی فلمیں کرنا ہی لکھا ہے؟“ وہ  
وجہ جی سے کہہ رہی تھی۔  
وہ ہنس دیے۔ ”کیسی باتیں کر رہی ہیں چند اجی۔۔۔  
وقت بدلتے وقت نہیں لگتا۔“

”وقت بدلتے زمانے بھی تو لگ سکتے ہیں۔“  
”پہلے بھی تمہیں ایسے بے چین ہوتے نہیں دیکھا  
میتا۔ تمہیں جو کام ملا تم نے کیا۔“ وہ حیران ہوئے۔  
”پہلے کام کر رہی تھی، روزی کمادتی تھی۔ جن سے  
میں نے شگیت سیکھا ہے وہ کہا کرتے تھے۔ ”شگیت  
اتھا سمندر ہے۔“ گانگ اس کا ایک قطرہ لی لیں تو  
سمجھو بہت ہے۔“ اس بات نے میرے دل میں گھر کر  
لیا۔ میرا فن بھی تو سمندر ہی ہے۔ کیا میں اس سمندر  
کے کنارے کھڑی ہونے کے لائق بھی نہیں۔“  
”اداکاری کے لیے میں نے تمہیں آج سے پہلے  
انتا سچیدہ نہیں دیکھا۔“

فلم نگری کے ایک بڑے نام، وجے بھٹ نے غور  
سے اسے دیکھا۔ ماسٹر نوٹا نے ان سے کہا تھا جو فلم  
ولپ اور نرگس کو لے کر بنائی جا رہی ہے اس میں  
”میتا“ کو لے لیں۔ ان کی آنکھیں سنکر گریٹا کے  
چہرے پر ٹھہر گئیں۔

”بچپن میں جس کیمبرے سے ڈر لگتا تھا“ آج اس  
سے عشق ہو گیا ہے۔ ”جوانی کی دہلیز پر کھڑی لڑکی کے  
دل کا پہلا عشق اس کی آوازی کھٹک پر کھٹک رہا تھا۔  
”اپنے کام سے عشق تو عبادت ہے۔ ایسے ہی  
لوگ تو پھر اہم ہوتے ہیں۔“

”میں نے تو کبھی امر ہونے کے خواب نہیں دیکھے۔  
بس میرا فن بلند ہو جائے۔“  
”سننا ہے جب کوئی یا سا ہوتا ہے تو اسے کنوئیں کا  
کنارہ مل ہی جاتا ہے۔ لیکن کنوئیں سے پانی نکالنے کا  
انتظام اسے خود کرنا پڑتا ہے۔ پینڈے کے پانی کو اوپر لا  
کر اپنی پیاس بجھا سکو گی چند اجی؟“

میتا نے اس بڑے فلمساز کی آنکھوں میں دیکھا  
دیکھا کہ وہاں حقیقت کی حکمرانی کتنی وسیع ہے اس  
نے اپنے اندر جھانکا اپنے من کی گمراہیوں میں اٹھا

سمندر میں جو ٹھنڈا پڑا تھا، دور کنوئیں کے پینڈے سے  
لگے پانی کو۔ اس کی سانس دھونکی کی طرح چلتے لگی۔  
اپنی سولہ سترہ سالہ زندگی میں پہلی بار۔۔۔ اپنی آوازی  
پوری کھٹک۔۔۔ اپنے حسن کی ساری ممک۔۔۔ اپنے  
فن سے کامل عشق کے ساتھ اس نے کہا۔  
”ہاں! میں لاؤں گی۔ اپنی پیاس بجھاؤں گی۔ ورنہ میتا“  
میتا کماری ہو کر نہیں مرے گی۔ ایک ٹوٹے ہوئے ساز  
کی ادھوری دھن بن کر بکھر جائے گی۔“  
”لو پھر“ ”بیجو باورا“ ”تمہاری ہوئی۔“



”آپ آئے“ آپ نے مجھے خط لکھا اور پھر آپ  
نے مجھے بھی چین سے سوئے نہیں دیا۔“  
کچھ وقت گزرا، ممبئی ٹائمر کی فلم تماشا کے سیٹ پر  
ایک شخص آیا۔ جس کی فلم محل کی غیر معمولی مقبولیت  
نے اسے شہرت کی بلندیوں پر لے جا کر کھڑا کر دیا تھا اور  
وہ ہندوستان کے سکہ بند ہدایت کاروں، فلمسازوں اور  
کہانی نویسوں کی صف میں جا کھڑا ہوا تھا۔  
یہ شخص کمال امر دھوی کے علاوہ اور کون ہو سکتا  
تھا۔

کچھ اس کی مروانہ وجاہت، کچھ اس کی جاو اثر  
آنکھیں، اور بانی کا سب اس کی تحریر پھونکی باتیں۔ وہ  
نظر بند کرنے کے سارے اختیار اپنے پاس رکھتا تھا۔  
عالم نیا شاہ جہاں کی طرح سنجیدہ ہو جانے، اور شہزادہ  
سلیم کی طرح ہلکے جانے کا وصف وہ اپنی ذات کے  
نماں خانوں میں مقید رکھے ہوئے تھا۔

وہ وہاں کسی سے ملنے آیا تھا۔ شوٹنگ میں وقفہ چل  
رہا تھا۔ وقفے میں سب ہی آرام کرتے تھے لیکن وہاں  
ایک چیز تھی جو محو آرام نہیں تھی۔ وہ اسے ہی دیکھ رہا  
تھا۔ حیدر آبادی چیل میں بٹا ایک گورا پیر۔ اس پیر پر  
سرخ نیل بولے بننے لگے۔ انگلیوں پر چھلے بن گئے  
اطراف کیہیں نقش ہوئیں۔ پیر کی انگلیوں میں  
مغالی انگوٹھیاں آجڑیں۔ ذرا اوپر پانچب آبدھی اور  
کمال کے دل کو چھو کر۔ چھن، چھن، چھن۔۔۔ چھن۔۔۔ کرنے

گئی۔  
غلام رسول کی دھن، مضرب سے ستار کو چھو کر  
نکلے۔  
”کاش! یہ پاؤں زمین پر نہ اتریں۔“  
وہ جو کوئی بھی تھی کرسی پر ٹانگ پر ٹانگ رکھے،  
ایک پیر ہلاتے، کتاب کو محبت نامے کی طرح بڑھ رہی  
تھی۔ اتنی محبت اگر کتاب کے نصیب میں تھی تو  
”محو محبت“ وہ کس درجے کی ہو گی۔ اس کے سفید  
پہناوے نے ساری دنیا کو سفید کر دیا تھا اور رنگین  
بھی۔ اس کے لمبے سیاہ بال، چاندنی رات کے راہی  
رہے تھے۔ سیاہی کے ساتھ چاندنی بھی چڑالائے تھے۔  
اس کی پشت سے نمایاں ہوئی اس کی گردن، جس میں  
لفظ ایک بل سانس کی آدورفت کو ظاہر کر رہا تھا۔  
کمال کا دل اس کی دھڑکنوں کی تلاش میں نکلا۔  
”جیسی کو کتنی ریل پڑوں پڑھا گئی چلی گئی۔“  
اسٹنٹ ڈائریکٹر نے کمال کو یوں اسے دیکھتے پایا تو  
دونوں کا تعارف کرانے کے لیے آگے بڑھنا چاہتا تھا  
لیکن کمال نے ہاتھ کے اشارے سے اسے روک دیا  
اور اکیلا ہی آگے بڑھ گیا۔ گھوم کر کرسی کے پاس پہنچا۔  
چاندنی گھر کر دن میں ڈھل آئی۔ کتاب کے الفاظ  
مفہوم بدل کر سفری میں سمٹ آئے۔ اس کی آنکھیں  
ایک بارگی اٹھیں۔ ایک لمحے کے لیے اس کی آنکھوں  
میں شرارہ لپکا پھر وہ فوراً ”مسکرا دی۔“  
”آپ۔۔۔“ اس کے عین سامنے کھڑا کمال اسے  
پچاننے کی کوشش کر رہا تھا۔  
”میں ماسٹر علی بخش کی بیٹی اجونہ خوب صورت ہے  
نہ اچھی ایکٹریس۔ میرا بد صورت سامنا مہ جبین ہے  
آداب۔“ ہاتھ کو پیشانی تک لے جا کر اس نے کہا  
کمال ایک لمحے کو چوٹکا اسے چھوڑ دھولی ”مہم کھلتی چچی  
یاد آگئی۔“ ”آداب۔۔۔ میں ہوں مہ جبین فرما کیے۔“  
”میں کمال امر دھوی ہوں۔“ اس نے سوجھا آخر وہ  
اس لڑکی کو کیسے بھول گیا۔ یہ گناہ وہ اکیسے  
”کون کمال۔۔۔؟“ میتا نے آنکھوں کی چمکدھم کر  
لی۔ بے نیازی نمایاں کر دی۔

”آپ کمال امروہوی کو نہیں جانتیں؟“  
 ”میں ایسے کسی بھی شخص کو نہیں جانتی۔ جو مجھے نہیں جانتا۔“ اس نے گردن کو تھوڑا اڑا لیا۔  
 وہ مسکرا دیا۔ ”جب میں محل فلم بنا رہا تھا تو میں نے کہا تھا ”کون چندا“ لگتا ہے آپ تک وہ خبر پہنچ چکی ہے۔“  
 ”اگر آپ نے یہ کہا تھا کہ کون چندا، تو اس میں آپ کی بد نصیبی تھی میری نہیں۔“  
 ”اور یقیناً ”میری بد فاقی تھی۔“  
 اس نے کچھ اس انداز سے سر جھکا کر اپنی غلطی تسلیم کی کہ چند اپنے بالوں کی کچھ لٹوں کو جھٹک کر ہنس دی۔ اور ہنستے ہنستے اس نے اپنے ٹپلے ہونٹ کو دانت میں دبا کر چھوڑ دیا۔ کمال نے جھٹکل اس منظر سے نظریں ہٹائیں اور نظریں جھکا کر اس کے پیروں کو دیکھا۔  
 ”تمہارے پاؤں بہت حسین ہیں مینا۔ انہیں زمین پر نہ اتارا کرو۔ ٹپلے ہو جائیں گے۔“ کہا اور وہ چلا گیا۔  
 مینا ہکا بکا کھڑی رہ گئی اور وہ دور۔ دور ہوتا گیا۔ اتنا دور کہ کہیں بہت پاس آگھرے۔  
 دور بہت دور سے ایک ٹرین آرہی تھی، وہ اس کا مسافر لا رہی تھی۔ اس کا دل دار اس کا محبوب۔  
 ”تمہارے پاؤں مینا۔“  
 دھرتی پر اس نے اپنے پیروں کو پھول پایا۔ دل کو گلستان۔  
 وہ یہ جان نہ سکی کہ اسے کس بات نے زیادہ خوش کیا ہے۔ کمال کی تعریف نے یا ایک کامیاب کہانی نویس اور ہدایتکار کی تعریف نے۔ اس بات نے کہ اب شاید وہ اسے اپنی کسی بڑی فلم میں لے لے گا۔ یا اس بات نے کہ اب وہ اکثر اس سے بھگلام ہوا کرے گا۔  
 رات نے سونے نہ دیا۔ دھرتیوں نے رنج جگا لیا۔  
 ”وہیں تھم کے رہ گئی ہے۔ وہیں تھم کے رہ گئی ہے۔“

میری رات ڈھلتے ڈھلتے۔



اقبال بنگہ، جوہل کے نام سے تھا، کے درجوں میں موسم پھر سے منکنے لگے تھے۔ پھولوں کا ڈھیر لگائے، کھڑکی کی دلیز پر بیٹھی، وہ کتاب پڑھ رہی تھی۔ ملازم نے کسی کے آنے کی اطلاع دی۔  
 ”کون ہے۔“؟ جب شوٹنگ نہیں ہوتی تھی تو اسے کسی سے بھی ملنا بہت مشکل لگتا تھا۔  
 ”وہ بولے نام نہیں بتائیں گے۔ آپ کو بلا کر لاؤں۔“  
 ”ایسا کون باقی آیا ہے جو ہمارے گھر آکر ہمیں ہی کچھ بتانے سے انکاری ہے۔“ وہ ہنس دی۔ دوپٹہ سنبھالتی آگئی۔  
 اتفاق سے وہ ننگے پاؤں تھی۔ قالین پر اس کے پیروں کی مدھردھک سے اس نے مڑ کر اسے دیکھا۔  
 اس سے پہلے پیروں کو۔ وہ سمٹ سی گئی۔ جی چاہا پیروں کو ہاتھوں میں سجالے۔  
 ”کمال آپ۔“؟ کوئی آکر کہہ دیتا کہ آسمان زمین پر آگیا ہے تو وہ اتنا حیران نہ ہوتی جتنا کمال کو اپنے گھر دیکھ کر ہوئی۔  
 وہ کھڑا تھا، اس کی حیرانی پر زیر لب مسکرا دیا۔ ”سنا ہے آپ کس پاس بہت سی کتابیں ہیں؟“  
 اسے یاد نہ آیا کہ وہ جو الفاظ ادا کر رہا ہے، ان کا مطلب کیا ہے۔ یہ کتاب کیا چیز ہوتی ہے۔ وہ ایک ٹک اسے دیکھ رہی تھی۔  
 ”سنا ہے آپ کے پاس بہت سی کتابیں ہیں۔“  
 پہلے وہ مسکرایا اور پھر ہر لایا۔  
 ”وہ چونکی، آس پاس دیکھا، کچھ کچھ یاد آیا۔“ ج۔  
 جی بہت سی ہیں۔ آپ کون سی پڑھیں گے؟“  
 ”سب۔۔۔ جو نہیں کھنکھی گئیں وہ بھی۔“ پینٹ کی جیبوں میں ہاتھ دے کر، اس کی طرف جھک کر بہت قریب ہو کر وہ کہہ گیا۔  
 مینا نے بے اختیار ہاتھ کو دل کی طرف اٹھتے پایا۔

ہونٹ کو دانت سے کاٹ کر چھوڑا اور ساری دنیا میں شور مچاتی اپنی دھڑکن کو ہولے سے ڈانڈا۔ وہ اسے اپنے کتابوں کے ذخیرے کس پاس لے آئی۔  
 ”یہ اتنی کتابیں آپ پڑھ چکی ہیں یا نمائش کے لیے رکھی ہیں۔ یہ دیوان، یہ ٹائل؟“  
 ”نمائش کی چیزیں قسمت گاہ میں بھی ہیں، یہ میرا کمرہ۔ آپ کو تو یہاں لے بھی آئی، ورنہ کم ہی لوگوں کو یہاں آنے کی اجازت ملتی ہے۔“  
 کمال نے ایک کتاب اٹھائی، اس پر اس کا اپنا شعر لکھا تھا، مختص ناز بھی لکھا تھا۔ ”تو آپ شاعری بھی کرتی ہیں؟“  
 ”جی۔۔۔ کبھی کبھی ہو جاتی ہے۔۔۔“  
 دوسروں کی کتابوں پر کیوں لکھتی ہیں۔؟  
 ”شاید کسی کی تحریر کو اپنا عنوان دینا چاہتی ہوں۔“  
 کمال نے کتاب ہاتھ میں لیے لیے، مڑ کر اسے دیکھا، پھر فاصلہ کم کر تاہیں اس کے سامنے جا کر کھڑا ہو گیا۔  
 ”ایک فلم تحریر کی ہے میں نے۔ عنوان ہوگی؟“  
 ”کیا عنوان۔؟“ آپ سے وہ تم ہوئی۔ وہ مسکرا دی۔  
 ”انارکلی۔“ دونوں ہاتھوں میں کتاب دبائے، سینے سے لگائے وہ اسے ایسے دیکھ رہا تھا جیسے وہی تو اس کا سلیم ہے۔ انارکلی حیرت سے آنکھیں پھٹا کر اسے دیکھتی رہی۔ آج تک وہ تیسرے درجے کی فلمیں کرتی رہی تھی۔ اب اسے ایک ایسی فلم دی جا رہی تھی جس پر ہر کوئی بات کر رہا تھا۔  
 ”میں انارکلی ہوں گی؟“  
 ”پورے ہندوستان میں تمہارے علاوہ اور کوئی نہیں۔“  
 ”پورے ہندوستان میں تمہارے علاوہ کوئی اور نہیں۔“ اسے لگا یہ فقروہ فلم کے لیے نہیں کہا گیا۔ وہ خاموشی سے گیت ہو گئی۔  
 ”ماسٹر علی بخش آئیں تو ان سے کہہیے گا، کمال امروہوی آئے تھے۔ اندیشی کی سب سے خوب

صورت اور یا کمال اداکار وہ فلم ”انارکلی“ میں کاسٹ کرنے۔ اس کے قریب سے گزرتے اس کی پیدائشی پر ابھی تک مٹھی لٹ کو اپنی انگلی سے چھو کر کہتے وہ چلا گیا۔  
 اس بار پھر وہ چلا گیا۔ لیکن خود کو وہیں چھوڑ گیا۔  
 مینا کس پاس۔  
 کتاب کمال کے ہاتھ میں تھی، لیکن وہ اسے پڑھ نہیں پڑھا تھا۔ کتاب ایک اسکرین تھی جس پر چوڑی دار، نیکے دامن پر سرخ آنچل لہرا رہا تھا۔ وحشت و محبت بیک وقت ایک ہی نگاہ میں، وہ کتنی بار دیکھ چکا تھا لیکن یوں ہلکان نہیں ہوا تھا۔ باقر علی کالی دیر اسے یوں گم سم دیکھ کر ہنس دیا۔  
 ”کس اسکرپٹ پر کام کر رہے ہیں جو یوں بدھا گیا میں ہیں؟“  
 ”میں نے مینا کماری کو انارکلی کے لیے سائن کر لیا ہے۔“  
 ”لیکن فلسا تو نہیں مان رہا۔“  
 ”کیسے نہیں مانیں گے ممکن لال جی۔۔۔ ماننا ہی پڑے گا۔“  
 ”آپ مینا کے لیے اتنے بھند کیوں ہیں؟ انارکلی کے لیے تو کوئی بڑی ہیروئن ہونی چاہیے۔ جیسے مدھوبالا۔“  
 ”باقر علی! تمہیں میری ”صاحب جان“ یاد ہے۔“  
 ”مینا ہی وہ صاحب جان ہے۔“  
 ”جس فلم کو مینا آپ کا خواب ہے، اس کے لیے آپ ایسی لڑکی کا نام لے رہے ہیں جو معمولی فلموں میں کام کرتی ہے۔“  
 ”اگر مینا صاحب جان نہ بنی تو یہ فلم بھی نہیں بنے گی۔“  
 ”کون سی فلم۔ یہ انارکلی۔؟“  
 ”نہیں، میری پائیز۔“  
 ✨ ✨ ✨  
 ”ڈھونڈ۔۔۔ کھوج، کہتے ہیں ختم نہیں ہوتی کہیں



چلے جاؤ بس چلتے جاؤ۔“ (ڈائری)

وہ تینوں مہاشیہو گھومنے آئے تھے۔ ”ہا ہا ہا“ اس کی کیا ہوئی، انارکلی، نورجہاں اور پھر فت ہاتھ میں پہلی بار دیپ کمار کے ساتھ اسے سنا کر آیا کیا تھا۔ بابو جی نے کہا وہ اسے اور مدھو کو گھماتے ہیں۔ اس کا تو پہلے ہی دل چاہتا تھا کہ وہ وادیوں میں کھو جائے پھر کوئی اسے آواز دیتا ڈھونڈنے آئے۔ مدھو کو یہ فکر لاحق تھی کہ پھر یہاں نہیں وہ کتنی مصروف ہو جائے۔ کب وقت ملے کب وہ ساتھ مل کر گھومیں۔

”بابو جی بڑی فلمیوں کے لکھنے کے بعد یہ باہر نکلا کرنے کی تو دیکھیے گا کیسے بھیر لگ جایا کرے گی۔ کھڑکیاں ٹوٹ جائیں گی سینماؤں کی۔“ شام کو پھاڑیوں میں ٹٹلتے، راہ چلتوں نے جب مینا پر کوئی خاص توجہ نہ دی تو مدھو کے بغیر نہ رہ سکی۔

بابو جی ہنس دیے۔ ”مدھو! مجھے لگتا ہے کہ یہ حسرت تمہاری ہے۔“

”ہماری اتنی قسمت کہاں تھی کہ ہم مینا بنتے۔ دیکھیں ذرا جس لڑکی کو آپ یم خانے کی سیڑھیوں پر چھوڑ آئے تھے آج وہ کتنی بڑی اداکارہ بننے جاری ہے۔“

مینا نے بابو جی کے چہرے کے دیے جھٹے دیکھے تو ان کے گلے میں بانیں ڈال دیں۔

”مجھے تو یہ مسرت بے حال رکھتی ہے کہ آپ بمبئی کی سڑکوں پر روتے پھرتے تھے۔ پھر واپس آکر آپ نے مجھے بانسوں میں سمیٹ لیا۔“

”کچھ اس لیے بھی تم میرے اور اپنی ماں جی کے دل کے نور قریب ہو گئی تھیں۔ خدا کے کھیل ہیں شاید اسی چنگاوی سے ہماری محبت کی آگ بجھ گئی تھی۔“

وادی میں بادل بھی ان ہی کی طرح گھومتے پھرتے تھے، ٹھہرنے ہوئے تھے۔ یہ تاب گڑھ، بھولائی کا مندر، افضل خان، اور بندے شاہ کا مقبرہ اور پھر رانج سو سیڑھیوں۔ ڈھیر ساری چیزوں کو جیسے پہلی بار دیکھا۔ کتنے نئے پھولوں کو کھوجا، انہیں چٹا خوشبوؤں کو اس نے قید کرنا چاہا۔ نیلی گھٹی (میلونیل) کو وہ ٹھوڑی پر ہاتھ

رکھ کر دیکھتی رہی۔ کتنے ہی پتھروں نے اس کا راستہ روک روک لیا اور اس نے وہ سارے پتھر چن لیے۔ اب تو یہ پتھر گنگنا تے بھی لگے تھے۔ آسمان کے رنگ رات کو نکشلاں سنگ سنگ بدلتے رہے۔ دور نیچے وادی میں کھڑی ہو کر، دور اور ستاروں کے جھرمٹ کو دیکھنا خوش نصیبی سے کم تو نہیں ہوتا۔

”یہاں تو اللہ اگتے ڈھیر سارے ستارے ہیں۔ آہ ہر شام کیسی پاک پاک سی ہے۔ زمین پر یوں دور تنگ پیر رکھتے چلے جانا اللہ!“ (ڈائری)

خاموشی، تنہائی اور سکون ہمیشہ سے اسے مطلوب رہے تھے۔ وہ یہ تو نہیں چاہتی تھی کہ ساری دنیا سو جائے، بس اتنا کہ ساری دنیا کچھ خاموشی کو بھی سن لے۔ چاند کے پار جا کر، دلدار کے ساتھ جا کر، وہ شاعری کرتی۔

یوں تیری رہ گزرے دیوانہ وار گزرے تو نے بھی ہم کو دیکھا ہم نے بھی تجھ کو دیکھا تو دل ہی ہار گزرا ہم جان ہار گزرے

صبح مدھو نے اسے اٹھایا تو وہ تب بھی ہولے ہولے گنگنا رہی تھی۔ رات کی پھڑی تان۔ صبح تک نہ ٹوٹی۔

”تو دل ہی ہار گزرا۔ ہم جان ہار گزرے۔“ مدھو نے دل تھام لیا۔ ”اللہ سے رحم مانگو مونا! کیسی جان سے جانے کی باتیں کرتی ہو۔“

اپنے رنگین آنچل کو لہرا کر اوڑھتے، کھڑکی کی چوکت میں کھڑے ہو کر اس نے دونوں بازو پھیلا کر سامنے پھیلی وادیوں کو راز دار بنا کر انگڑائی دی۔ پلٹ کر مدھو کو دیکھا اور گلابی مسکراہٹ سجا کر کہا۔

”چھم چھم کرتی پیا نل جیسی۔ کھن کھن کرتی چھاگل جیسی۔“

مدھو نے اسے چونک کر دیکھا۔ ”تم بہت خوب صورت لگ رہی ہو۔ میں نے آج سے پہلے تمہیں اتنا

حسین نہیں دیکھا۔ دل چاہتا ہے تمہارے قدموں میں جھک جاؤں۔“ ”جھک تو میں گئی ہوں۔“ مینا نے زیر لب کہا ”رات بھر دو آنکھیں۔ اور میرے دیاؤں۔“ ”بمبئی واپسی پر بھی وہ زیر لب یہی گنگنا رہی۔“ ”تم دل ہی ہار گزرے، ہم جان ہار گزرے۔“ ”نجانے وقت کی آنکھ میں بال آیا تھا، یا اس کی قسمت ہی زیادہ اونچائی پر جا کر بیٹھ گئی تھی کہ دھڑام سے نیچے آگری۔ ان کی کار کا ایکسپلنڈ ہو گیا۔ جس وقت اس کے اوسان خطا ہو رہے تھے اس وقت بھی وہ یہی کچھ گنگنا رہی تھی۔“ ”ہم جان ہی ہار گزرے۔“



فلم انارکلی کی لوکیشن دیکھنے کے لیے کمال، دہلی میں موجود تھا۔ کتنے دنوں سے وہ لوکیشن دیکھ رہا تھا لیکن پسند آکر بھی اسے کچھ پسند نہیں آ رہا تھا۔ ملی ماراں میں کچھ دوستوں نے رات کو محفل غزل بھی سنا لیکن وہ اوب کر اٹھ گیا۔ ساری شاعری، ساری غزلیں، سارا چین و قرار کہیں دیک گیا اور دل کو بڑی بے کلی لگی رہی۔ رات بھر اس کی نیند ایسے ٹوٹی رہی جیسے کوئی اسے جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر اٹھا رہا ہو، چھم چھم کمرے میں بج رہا ہو۔

رات کاٹنا ہوئی۔ نیند دیوانی۔

صبح ہوئی کی بالکونی میں چائے پیتے، اخبار پڑھتے، وہ چونک کر کچھ اس بے قرار سے اٹھا کہ تپائی ساری کی ساری فرش پر آگری۔ دہلی کی ساری دھول اس کی آنکھوں میں گھس آئی۔

”ادا کارہ مینا کماری، اپنے والد اور بہن کے ساتھ مہاشیہو سے واپس بمبئی آتے ہوئے کار حادثے میں بری طرح سے زخمی ہو گئی ہیں۔“

یہ مئی، یہ ظالم مئی۔ وہ جہاز سے بمبئی اور بمبئی سے پونا پہنچا۔ مینا کو دیکھتے ہی جیسے اسے یقین سا ہو گیا، کہ یہی لڑکی اس کی موت کی وجہ بنے گی۔ اس کا دل چاہا

گھٹنے نیک دے۔ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔ وہ زندہ تھی۔ لیکن یہاں تک کے سفر میں اس نے کتنی ہار اس کا جنازہ دیکھ لیا تھا۔ کتنی بار اسے قبر میں اتار دیا تھا۔ وہ جاگ رہی تھی لیکن آنکھیں موندے بیٹھی تھی۔ مدھو جوس کا گلاس لیے اس کی منت کر رہی تھی کہ وہ کچھ پی لے۔ وہ اپنے آنسوؤں سے انکار کر رہی تھی۔ اس کا ایک ہاتھ بری طرح سے کھلا گیا تھا کہ ڈاکٹر ہاتھ کو کاٹ دینے پر غور کر رہے تھے۔ ایک کٹے ہوئے ہاتھ کی لڑکی کو لوگ بھنگن کا کردار تو شاید دے دیں، نور جہاں یا انارکلی کا کیوں دیں گے؟

”کیا ہوا مینا۔؟“ پھولوں کو ہاتھوں میں لیے، اس کے سامنے آکر وہ پوچھنے لگا۔

”آپ۔۔۔ یہاں۔؟“ اپنی آنسوؤں سے بھری آنکھیں اس نے فوراً کھول دیں۔

”کیسی ہو۔؟ دور رہی ہو۔؟“

”میرا ہاتھ کھلا گیا۔۔۔ میں۔۔۔“ اتنے سے لفظ ادا کرتے اس کی سانس پھول گئی۔

وہ جو بندے سے دو قدم دور کھڑا تھا، دو قدم سمیٹ کر قریب ہوا۔ مدھو کے ہاتھ سے جوس کا گلاس لے کر اس نے اپنے ہاتھ میں پکڑ لیا۔ اور اس پر ذرا سا جھک گیا کہ ان دونوں کی آنکھوں میں فاصلہ بہت کم رہ گیا۔ گلاس کو اس کے ہونٹوں سے لگا دیا۔

”تم زندہ ہو۔۔۔ تو میں زندہ ہوں۔۔۔ کیا یہ کافی نہیں؟“

مینا اپنی نگاہ سمیٹ نہیں پائی تھی کہ اس سے بھی کہیں پیسے نہ پورے دل سے پورے شوق سے کمال امر ہو ہی پر شمار ہو گئی۔ اس سے پہلے تک اس نے جتنا بھی در گزر سے کام لیا، چارہ نہ ملا۔ وہ اس کے وجود میں سمٹ جانے کے لیے بہت شوق سے بکھری۔

”ہاں بات کچھ اور تھی کچھ اور ہی بات ہو گئی اور آنکھ ہی آنکھ میں تمام رات ہو گئی۔“

”مینا کماری کا ہاتھ کھلا گیا ہے۔“ یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح فلم ٹکری میں پھیلی۔ وہ بری طرح سے زخمی ہے، مر بھی سکتی ہے، ورنہ فلم کرنے لائق تو

”میری انار کلی!“



”محبت وہ سفر ہے جس میں انسان اکیلا ہی اپنا راز دار اور ایمان دار ہوتا ہے۔“

جو نصیب میں نہیں تھا وہ جاتا رہا، فلمیں، لوگ، بہت کچھ اور بھی۔ کچھ انگریز ڈاکٹروں نے علاج کیا، کچھ باہر سے منگوائی دوائیوں نے اثر کیا، بائیس ہاتھ کی دو انگلیاں بے کار کر کے ہاتھ سلامت رہا۔ دو تین زیر تحویل فلمیں تھیں جن سے اسے بہت امیدیں تھیں لیکن سینما کا کیا کینجہ کہ یہاں کوئی شرط نہیں لگ سکتی۔ سینما تو سب جو ہے اچھا اسکرپٹ بھی پٹ سکتا ہے۔ پچس پچس کمائی اور کردار بھی سلور گولڈن جوبلی کر سکتے ہیں۔ مکھن لال دیوالیہ ہو گیا اور انار کلی نہ بن سکی۔ چار چھ ریل شوٹنگ ہوئی اور فلم ہمیشہ کے لیے بند ہو گئی۔ اسے ”نور جہاں“ کے جانے کا بہت دکھ تھا۔ لیکن کمال کا سوتی تو ڈھارسا رہتی۔ حادثہ ہوا تو کیا کچھ حاصل ہو گیا۔

کمال کے خط میٹا نے اپنی سانسوں سے زیادہ سنبھال کر رکھے تھے۔ رات میں وہ جانے کتنی کتنی بار انہیں پڑھتی۔ بستر پر ان خطوں کو پھیلاتی۔ کھڑکی سے آتی ہوا جب انہیں پھر پھڑکتی تو لفظ کمال بن کر اٹھ کھڑے ہوتے۔

”کاش دو اکی طرح درد بھی خریدے جاسکتے ہیں تمہارے سارے درد خرید لیتا منجھو۔“

وہ مجھوم جاتی، ہزار ہزار بار۔

”میں اس دن کی گواہی دینے کے لیے تیار ہوں جس دن تم سدا ہو رہی کہ تمہیں میرے لیے بنایا گیا۔“

منجھو کھٹکرا کھٹکرا کر رات کو کمال کو کمال کر دیتی۔ حل کے دروازے وا کئے وہ بہت اہتمام سے کمال کا استقبال کرتی۔ اس کی آنکھوں کے ستارے کشمکش بن گئے۔

”جان چندن منجھو! میں تمہاری آواز کی اس کھٹک کا دوا نہ ہوں جو میرا نام لیتے تمہاری سانسوں سے سفر کرتی، میری سماعتوں سے آمتی ہے۔ جی چاہتا

مشکل سے ہی رہ سکتی ہے۔ یہ انواہیں اہماروں کی زینت بننے سے پہلے، فلم اہوانوں کی لعنت بنیں اور ایک ایک کر کے اسے ان فلموں سے نکالا جائے گا۔ وہ بمبئی میں سائن کر کے آئی تھی۔ جو کمانی شروع ہی کی تھی وہ اہتمام پذیر بھی ہو گئی۔ جیسے دعا کو قبولت کے بعد راستے میں روک لیا گیا تھا۔

وہ بدترین ذہنی دباؤ کا شکار ہو گئی کہ بس مری جائے گی۔ اگر اس نے یہ ٹھان ہی لی تھی کہ اسے بڑی فنکار بننا ہے تو تقدیر ایسے دشمنی پر کیوں مٹی تھی۔ پھیلی میں آکر سب ریت کی طرح پھسل گیا۔ تو کیا یہ بات وراثت کی طرح نصیب میں بھی لکھ دی گئی تھی کہ علی بخش کے خاندان میں، اقبال کی اولاد میں سے، کوئی فنکار نہیں بنے گا۔ کوئی اپنی پاس نہیں بچھپائے گا۔“

”جو ہمارا نہیں ہوتا وہ ہمارے پاس بھی نہیں رہتا۔“

کمال نے اسے تسلی دی۔

”چھن جانے سے پہلے، ہمیں معلوم بھی تو نہیں ہو تا کہ کیا ہمارا نہیں تھا۔“

کمال نے چونک کر مینا کو دیکھا۔ ”تمہاری باتیں مجھے حیران کر دیتی ہیں۔“

”آپ کی سرزہ۔۔۔“ اس کی زبان سے پھسلا اور یکدم اس نے اپنی زبان اپنے دانتوں میں دبالی۔

”تم تو خود سارہ ہو۔۔۔ کرو تو میرے سحر کا۔۔۔ پھونک دو مجھ پر خود کو۔“ اس کے زخمی ہاتھ کو کمال نے اپنے ہاتھ میں لے لیا اور اسے اپنی پیشانی پر رکھ دیا اور آنکھیں بند کر لیں۔

ساری دنیا سو گئی۔ ہاتھ انتر منتر جنتر پڑھ کر آنکھوں پر پھونکتا رہا۔

دل خودم سادہ تھا ساگ راگنی ہوا۔

اب روزہ وہ بمبئی سے پونا ہسپتال کا ر چلا کر کے آتا اور پھولوں کے ڈھیر اس کے کمرے میں سجا دیتا۔ جاتے ہوئے اسے ایک خط دے جاتا۔ پھر وہ بھی خط کے بدلے خط دینے لگی۔ چار مہینوں بعد جب وہ ہسپتال سے گھر جاری تھی تو اس کے کچلے ہوئے ہاتھ پر لمبی سفید پیشیوں پر لکھا تھا۔۔۔

تھوڑی بہت خریداری وہ کر چلیں تو پان کی دکان کے سامنے کھڑی ہو گئیں۔ مدھو گئی پان لے کر آئی اور مدھو نے تو نصاب بھی امار دیا لیکن جیسے ہی اس نے

ہجوم بے قابو ہو رہا تھا۔ لوگ تھے کہ بڑھتے ہی جا رہے تھے جیسے ریڈ پور نشرو گیا ہو کہ وہاں ”ہنجیو پوراکا گوری“ ماسٹر علی بخش کی مینا کماری کھڑی ہے، جاؤ جا کر اس کی آرتی اتار لو۔

”بچپن کی محبت کو دل سے نہ جدا کرنا۔“

”میتا نے کبھی چاند کو سورج ہوتے نہیں دیکھا تھا  
اپنی قسمت کو یوں بدلتے دیکھ کر دیکھ لیا۔“  
اخبارات، رسائل، آل انڈیا ریڈیو کو اور کوئی کلام  
میں تھا سوائے ”بیجو بارو کی گوری“ کے بارے میں  
کچھ نہ کچھ لکھتے رہنے، نشر کرتے رہنے کے۔  
دلپ کمار کے بعد اب انہیں ایک میتا ملی تھی،  
مگر اگر لکھنا نہ گیا تو قلم توڑ ہی تو دیے جائیں گے۔

مہو واجب۔ بس کم کم کم۔  
کمال کا کچھ یا قری علی اس کا ولی تھا۔ وہ برقع میں مدھو  
کے ساتھ آئی تھی۔ عام معمول کے کپڑوں میں ایک  
سرخ دوشنبہ، وہ تھا جو وہ اپنے بیگ میں رکھ کر لانے میں  
کامیاب ہو پائی تھی۔ باپو ہی سے چھپ کر وہ نکاح کر  
چکی تھی۔ مینا کمال ہو کر کمال کی دوسری بیوی بن چلی

تھی۔ بابوئی کو کچھ شک تھا لیکن اتنا یقین نہیں تھا کہ وہ ایسے نکاح کر سکتی ہے۔ ایک کمالی لویس، بدایتکار کی حیثیت سے انہیں کمال پسند تھے لیکن اپنی بیٹی کے شوہر کی حیثیت سے نہیں۔ کمال عرصہ پہلے امرتسر میں شادی کر چکا تھا۔ اس کے دو بیٹے اور ایک بیٹی تھی۔

چاہ کر بھی وہ بابوئی سے شادی کی بات نہیں کر سکتی۔ دل ہی دل میں وہ سارے دلائل بابوئی کو دے چکی تھی اور جان چکی تھی کہ وہ کبھی کمال کے لیے نہیں مانیں گے۔ دونوں کو یہی طے کرنا پڑا کہ وہ نکاح کر لیتے ہیں۔ پھر بابوئی کو راضی ہونا ہی پڑے گا۔ رخصتی پھر ہو جائے گی۔

اور رخصتی ہوئی۔ نکاح وہ کر چکی تھی۔ شوٹنگ سے آنے کے بعد رات گئے تک وہ کمال سے فون پر لمبی لمبی باتیں کرتی رہتی تھی۔ ایک دن ملازم نے کچھ شک محسوس کیا اور بابوئی کو بتادیا۔ اسی رات گھر میں طوفان اُٹھیا اور اسے کمرتا ہی پڑا۔

”ہمارا نکاح ہو چکا ہے بابوئی۔“

سانے نے اس نے موت کا یقین پھینک دیا۔ بابوئی اسے ایسے دیکھنے لگے جیسے وہ ان کی بیٹی نہ ہو بازار میں کھڑی فاحشہ ہو۔

”تم نکاح کر چکی ہو؟“ یہ لفظ اتنی دیر بعد ان کے منہ سے نکلا کہ گمان ہوا وہ گوٹکے ہو چکے تھے۔

”جی۔۔۔ میں تو مناسب وقت کے انتظار میں تھی۔ آپ کو خود بتانا چاہتی تھی۔“

”چھپ کر نکاح کے بعد کون سا وقت مناسب رہ جاتا ہے؟ میرے مشورے کے بغیر تم نے آج تک کوئی فلم نہیں کی، تم نے نکاح کر لیا؟ تم مہ جیس ہی ہوتا؟ میری بیٹی؟“

”ہمیشہ آپ کی بیٹی ہی رہوں گی۔ میرا یہ نکاح قبول کر لیں۔ اپنی خوشی سے مجھے کمال کے ساتھ رخصت کر دیں۔“

”تم تو ابھی بیس سال کی بھی نہیں ہوئیں۔ بیس

فیصلے تم نے اپنی زندگی میں خود سے نہیں کیے اور تم نے خود سے عمر میں پندرہ سال بڑے آدمی سے چھپ کر نکاح کر لیا۔“ ایک ایک کر کے سارے سر پرانی ماسٹری آنکھوں سے بہنے لگے۔

”آج میں نے جان لیا کہ مٹاؤ میری بیٹی تھی اب وہ ”میتا کمار“ بن چکی ہے۔ بہت بڑی بہو سن۔ جاسین مینا جی! دوبارہ اس غریب کو اپنی شکل مت دکھائیے گا۔ اگر کہیں تو ہم آپ کے اس گھر سے نکل جاتے ہیں۔“

مینا کے دل میں کسی نے تیز دھارانی اتار دی۔ ”مجھے معاف کر دیں۔۔۔ ایسے نہ کہیں۔۔۔ میں مر جاؤں گی۔“

”تم نے کمال سے طلاق نہ لی تو میں مر جاؤں گا۔“

بات گھر سے نکلی اور فلم گھر کی تک پہنچی۔ جہ گویاں ہونے لگیں۔ دکھ سے اس کی آنکھیں اندر دھنسنے لگیں۔ وہ کھلا کر رہ گئی۔ گھر کے تباؤ نے اس پر اتنا دباؤ ڈالا کہ کیمرے کے سامنے وہ بہت بن کر کھڑی ہو جاتی۔ اپنے مکالے بھول جاتی۔ وہ باب کو پا لیتی تو کمال کو چھوڑتا پڑتا، کمال کو حاصل کر لیتی تو باپ کو بھولتا پڑتا۔

بابوئی نے مدھوسے بھی بات چیت بند کر دی تھی۔ گھر میں ایسا سنا سنا رہنے لگا تھا جیسا ماں کی موت کے دنوں میں رہا کرتا تھا۔ بابوئی کسی بھی صورت سامنے کے لیے تیار نہیں تھے۔ انہیں کمال داما کی حیثیت سے قبول ہی نہیں تھا۔

مینا کمال کی فلم سائن کر چکی تھی، اس کی شوٹنگ شروع ہو چکی تھی لیکن وہ بابوئی کے عہد کے ہاتھوں مجبور تھی۔ انہوں نے صاف صاف کہہ دیا تھا۔

”اگر تم کمال کی فلم کے سیٹ پر گئیں تو واپسی پر تمہیں گھر کے دروازے بند ملیں گے۔“

”میں نے غلطی کی ہے تو مجھے معاف نہ کر کے آپ غلطی نہ کریں بابوئی۔ ایسے دکھ میری زندگی کے دن کم کر دیں گے۔“

”میں محبوب صاحب کو ہاں کہہ چکا ہوں مگر ان کی فلم امر میں تمہیں نام نہا کرنا ہے۔“ بابوئی نے اس کے

آنسوؤں کی قطعا ”کوئی پرواہ نہ کی۔ اور کمال اور اپنے درمیان اسے لے آئے۔“

”میں امر نہیں کروں گی۔“

”کون ہے جو محبوب صاحب کو ہاں کہہ سکتا ہے؟“

جانتی ہو تاکہ فلم کے ہیرو دلپ کمار ہیں۔“

دل پر پھر کہہ رکھ امر کی شوٹنگ پر جانے لگی۔ چار پانچ دن بمشکل گئی پھر چھ دن معاہدہ توڑ کر بمبئی ٹاکیز میں کمال کی فلم ”دانا“ کے سیٹ پر کیمرے کے سامنے جا کر کھڑی ہو گئی۔ اور اسی دن گھر واپسی پر اسے گھر کے دروازے بند ملے۔ بابوئی نے اسے چلے جانے کے لیے کہہ دیا۔

”میں نے تم سے کہا تھا کہ تم نہیں جاؤ گی۔ اب تم اس گھر سے بھی چلی جاؤ۔“

”میں ان سے طلاق نہیں لوں گی۔ آپ کو بھی چھوڑ کر نہیں جاؤں گی۔ ضد چھوڑیں بابوئی۔“

”تم نے یہ نکاح کرتے ہوئے ایک بار بھی میرے بارے میں نہیں سوچا؟“ اب وہ اسے مینا کہتے تھے۔

”مجھے سے جو ہو سکا وہ میں نے آپ کے کہنے پر کیا۔ کیا کبھی میں نے کوئی شکایت کی؟“

”تو تم بھی لوگوں کی زبان سیکھ آئی ہو۔ ساری دنیا کہتی ہے مینا کا باپ اس کی کمالی کھانا ہے۔ بولو مینا! کیا تمہیں بھی یہی لگتا ہے؟ میں نے تمہاری کمالی کھائی ہے؟“ مینا خاموش کھڑی رہی۔

”ایک دن میں نوشاکر کے پاس گیا اور اس سے کہا کہ وہ میرا ہارمونیم لے لے اور مجھے اس کے بدلے کچھ پیسے دے دے۔ جاتی ہو کتنے پیسے؟ پچیس روپے؟ جو تمہاری ایک دن کی فلم کی کمالی تھی، وہ میری ساری زندگی کی ریاضت کی کمالی تھی۔ وہ ہارمونیم مجھے تم تینوں سے بڑھ کر عزیز تھا۔ لیکن تمہیں بھوکا دیکھا تو اسے لے جا کر بیچنا چاہا۔ اگر میں موسیقار بن جاتا مجھے سنگیت کے علاوہ کچھ اور آتا تو تمہیں ”مینا کمار“ نہ بننے دیتا۔“

”مجھ پر آپ کا حق سلامت ہے بابوئی۔ میری بوٹیاں کر دیں۔“ روتے روتے وہ ان کے قدموں میں

کر گئی۔

”تمہارے لیے فیصلہ نہیں کر سکا تو تمہارے خون کا کیا کروں گا۔“

”وہ میرے شوہر ہیں۔ اب کچھ نہیں ہو سکتا۔ انہیں اجازت دے دیں کہ وہ مجھے رخصت کر دیا کر لے جائیں۔“

”تمہارے نکاح میں تمہارا باپ ہی ولی نہیں بنا تو جاؤ مینا! اب خود ہی رخصت ہو جاؤ۔ کیا انسان ہے وہ جس نے تم سے چھپ کر نکاح کر لیا؟ کمال گئی اس کی شرافت؟ کیا اسے یہ گوارا ہو گا کہ اس کی بیٹی یوں چھپ کر نکاح کرے؟“

اس نے ان کے ہاتھ لجا جت سے پکڑ لیے۔ ”بھول سمجھ کر معاف کر دیں۔ ایسے نہ کہیں۔“

”تم ہی وجہ نام ہو گی، تم ہی سہ بدنامی ہو گی، معلوم نہ تھا۔ میرے دکھ کا دوا تمہاری کوئی معافی نہیں کر سکتی۔ اب لوٹ جاؤ مینا۔ تمہاری واپسی ہوئی بھی تو تم علی بخش کو پہلے جیسا نہ پاؤ گی۔ شیشہ ٹوٹ کر بھی بھی جڑا ہے۔ تم ایک بہت بڑی بہو سن بننے جا رہی ہو اور میری حیثیت صرف ایک کمالی کھانے والے باپ کی ہی رہے گی۔ دنیا کبھی یہ سمجھ نہیں پائے گی کہ علی بخش موسیقار نے مہ جیس کو اپنی ساری تپسیا اقبال بانو نے اپنے رقص کا سارا زنت دیا تو پھر کھولی میں رہنے والی ”مہ جیس“ مینا کمار کی بیٹی۔“

”میں آپ کی تپسیا ہی ہوں بابوئی۔ مجھے یوں احوال نہ چھوڑیں۔“

”چلی جائیں، جائیں مینا جی! اس گھر میں آپ کو علی بخش تو شاید مل جائے گا لیکن ”مہ جیس کا باپ“ نہیں ملے گا۔“ بابوئی نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے گھر سے باہر لے جا کر کھڑا کر دیا اور دروازہ بند کر دیا۔

وہ دروازہ پختی پختی رہی، پختی رہی۔ گھر کے باہر کھڑی وہ اتنی شدت سے رو رہی تھی کہ ماں کے مرنے پر بھی کیا روئی ہو گی۔ گھر کا دروازہ پھر بھی نہ کھلا۔ باپ کے گھر کی دہلیز پر سر پٹختے پٹختے اس نے فن کے رازوں کو، غم کے سارے پالیا۔



اور ہاں اب اس نے جان لیا۔ اب وہ ایک بڑی اداکارہ بننے کی۔ دکھ نے اس کی روح میں اندہ کالی شروع کر دی ہے۔ ویک اس میں رینگ رینگ آ رہی ہے۔ اب۔ ہاں اب۔

جب ساز لوٹے۔ تب موسیقار بنے۔ جسم نے روح آہیں ڈھلے تو ”فکار“ بنے۔ جانے اس نے کس سپرد عاکی تھی۔ دعا کی قبولیت کے آثار تھے۔ فن کا سمندر چوڑا تھا بنا پھنسا اور اس کی لہریں اس کے پیروں سے آپٹیں اور وہ شدت کرب سے چلا آ رہی۔

میں سے وہ ”مینا کماری“ بنی۔

\*\*\*

”دروازوں پر دیے جل رہے ہیں لیکن ان کے اندر۔ چار دیواری میں کتنا گھپ اندھیرا ہے۔ بے شکل اندھیرا اور دروازوں پر دیے جل رہے ہیں۔“ (ڈائری)

وہ فلموں کی ہیروئن تھی لیکن ایک عام لڑکی تھی۔ عام لڑکی بن کر ہی محبت کی، شادی کی، اور اسی طرح دلہن بن کر رخصت ہونا چاہتی تھی۔ لیکن اب وہ شہوار قیصر میں، پیچھے گاؤں کے ساتھ اپنی رخصتی خود ہی لے کر کمال کے گھر آ گئی تھی۔ کمال کا ہاتھ اس کے ہاتھ میں تھا وہ اسے ہزار طرح سے بھلا رہا تھا۔ تسلیاں دے رہا تھا۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔

”تم سے محبت میرا قصور ہے۔ باپو جی نے مجھے اپنے سنگیت سے زیادہ چاہا ہے اور میں انہیں تم سے زیادہ نہ چاہ سکی۔ جب میں نکاح کرنے جا رہی تھی تو تم نے مجھے سمجھایا کیوں نہیں کہ ہم پہلے باپو جی کو منائیں گے۔ ان کی رضامندی سے نکاح کریں گے۔“

باپو جی نے آج مرنے کی باتیں کیں۔ انہوں نے کہا ”مینا جی“ مجھے منانے والا باپ مجھے ”مینا کماری“ کہہ رہا ہے۔ وہ مجھ سے پوچھتے ہیں کہ کیا وہ اس گھر سے نکل جائیں جو میرے پیسوں سے بنا ہے؟ وہ کہتے ہیں کہ کیا وہ ان نوالوں کو بھی منہ سے نکال نکال کر میرے ہاتھ

میں دے دیں جو وہ کھا چکے ہیں۔ میں کیسی اولاد ہوں؟ میں نے کیا کر دیا؟ مجھے یہ کیوں لگا کہ میں تمہیں کھو دوں گی۔ اب دیکھو میں نے ایک کو کیا کر دوسرے کو کھو دیا۔ کیا حیثیت تھری میرے باپ کی؟ میرے شوہر کے مقابلے میں کمتر؟ میرا۔۔۔ میرا باپ تم سے مقابلے میں ہار گیا۔ میں نے اسے ہرا دیا۔“ ہسٹریائی ہو کر وہ بننے لگی۔ پھر رونے لگی۔ پھر قہقہے لگانے لگی۔ باپ کا دلایا آپٹ مل گیا۔ آٹھ کا سارا کاٹل پھیل گیا۔

آئندہ کبھی مینا کو کیرے کے سامنے رونے کے لیے کسی مصنوعی سہارے کی ضرورت نہیں پڑی۔ غم کے سائے ہر فلم کے ہر منظر میں نظر آئے۔ اس کی آنکھ ہمیشہ بھیگی ملی۔ اس کی مسکن ہمیشہ زخمی دھکی۔

اور یوں وہ۔۔۔ ”گریٹ ٹریجڈی کو مین آف انڈین سینما“ کہلائی۔

”ہندی سینما کے استھان کی نئی ملکہ۔ بیجو باوراک گوری۔ مینا کماری۔“ (اخبار)

”بیجو باورا“ پر فلمی تاریخ کا پہلا فلم فیئر ایوارڈ اسے مل گیا۔ سارا ہندوستان، پوری فلم نگری انگشت بندھا رہ گئی۔ صرف بیچ لوگوں کو ایوارڈ دیے گئے تھے۔

ان میں سے ایک مینا بھی تھی۔ فلمی تاریخ کے پہلے ایوارڈ کو حاصل کر کے اس نے تاریخ رقم کر دی تھی۔ بڑی بڑی ہیروئنوں کو اس انیس بیس سال کی ابھرنی ہوئی اداکارہ نے پیچھے چھوڑ دیا تھا۔ ایک بڑا اداکار

”دلپ کمار“ ایک بڑی اداکارہ بننے جا رہی ”مینا کماری“۔ ایوارڈ نے جیسے دونوں کو ہم پلہ کر دیا تھا۔ اس ٹرائی نے اس پر کامیابی کی پہلی سرنگائی۔ ایوارڈ ہاتھ میں لیے اس کی تصویر ہندوستان کے ہر اخبار میں چھپی۔ لوگوں نے اپنی پیاری ”گوری“ کی تعریفیں کاٹ کاٹ کر سنبھال کر رکھیں۔ سروق کے لیے اس کی تصویریں حاصل کرنے کے لیے بڑے بڑے رسالوں کے ایڈیٹروں کی جوتیاں گھنے لگیں۔

اگلے ہی سال، ایک بار پھر سب کو پچھاڑتے

ہوئے، ایک اور تاریخ رقم کرتے ہوئے اس نے ”شری چترجی“ کے مشہور ناول پر مبنی فلم ”پریتا“ پر بھی ایوارڈ حاصل کر لیا۔ یوں رہی تھی سب کچھ پوری ہو گئی۔ عروج کے ستارے کا پورا آسمان اس کا ہوا۔ لوگوں نے کہا ”پریتا“ میں وہ کسی بھی بنگالی عورت سے زیادہ بنگالی لگی ہے۔ لڑکیاں لہنتا کی محبت میں ڈوب گئیں۔ اس کے سنگ رو میں اس کے سنگ نہیں۔ ”وہ تم جیسی پتی کی قدر نہیں کرتے؟“

”میں ان کے کاموں کا دو چار نہیں کرتی۔۔۔“ اپنے شوہر سے محبت کرنے والی ہر لڑکی نے اس فقرے کو اپنی نوک زبان پر پایا۔ اخباروں نے اسے مثالی ہندوستانی لڑکی کا خطاب دیا۔ گھر گھر وہ ایک ایسی لڑکی کے روپ میں یاد کی جانے لگی جو محبت کو مذہب سے بڑھ کر نبھاتی ہے۔ یہی اس وقت کا آغاز تھا جب دلپ کمار کے بعد لوگ اس کے نام سے ٹکٹ لینے لگے۔ سینماؤں میں بھیج لانے کے لیے پوسٹر اس کا نام کافی تھی۔ ”مینا کماری“ وہ فلم ساز، کہانی کار، ہدایت کار جو اب تک مینا کے مستقبل کا فیصلہ کرتے آئے تھے، اب ان کے مقدر کا فیصلہ مینا کے ہاتھ میں آ گیا تھا۔ کسی ایک فلم کے لیے اس کی ”ہاں“ اخبار کی خبر بن جاتی۔

”فلم بھل رائے کی ہو اور اداکاری مینا کماری کی۔ ایسی فلم کا انتظار کسے نہیں ہو گا۔ مینا کماری نے“ وہ دیکھتے زمین ”سائن کرلی ہے۔“ (اخبار)

\*\*\*

زندگی کا خاکہ پہلے سے نہیں کھینچا جاسکتا۔ کب کیا ہو گا کیوں اور کیسے ہو گا یہ سوچا تو جاسکتا ہے لیکن اس ہونی پر اختیار نہیں رکھا جاسکتا۔ اگر باپو جی نے کمال کو قبول نہیں کیا تھا تو کمال کے گھر والوں نے بھی اسے قبول نہیں کیا تھا۔ ہنگامہ دونوں طرف رہا تھا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ امروہہ میں انھنے والا شور ان کے گھر تک نہیں آیا تھا۔ وہ دونوں اپنے گھر میں خوش تھے اپنی دنیا بسا چکے تھے۔ اگر محبت ایک بیماری تھی تو یہ

بیماری بگڑ کر اب ”عشق“ کے عارضے میں بدل چلی تھی۔ اس کی معصومیت، خوب صورتی میں بدل رہی تھی۔ اس کی چال، ناز، ادا، وہ ”کمال سے کمال“ ہو رہی تھی۔

”پریتا“ فلم کی پریس ریلیز میں مینا نے اپنے اور کمال کے رشتے کو کچھ ایسے عام کہا تھا۔ میں پریتا (شادی شدہ) ہوں؟ کس کی۔۔۔ ”کمال کی۔۔۔“

صحافی دنگ رہ گئے۔ اخبارات نے وہ شور مچایا کہ ہفتوں ہندوستانیوں کو مینا کماری کے کمال کی ”پریتا“ ہونے پر یقین نہ آیا۔ کہیں حیرت، کہیں دکھ، کہیں بے قراری۔

”مینا جیسی معصوم، ادب، نواز، شاعرانہ مزاج کی مالک لڑکی کو کمال نے اپنے ہال میں بنایا۔“ اخباروں نے اس طرز کی سرنایاں گائی۔ ”مینا جی“ تجزیوں، تنقید، طاقتورانی سالہ شروع ہوا، اداکارہ ان اعتراضات کا جواب دیتا رہا۔

”لوگ سمجھتے ہیں کہ ہیروئن کی شادی بس ہیرو سے ہی ہونی چاہیے جیسا کہ فلموں میں ہوتا ہے۔ ضروری نہیں ایسا ہی ہو۔ شادی کے لیے محبت کا ہونا ضروری ہے، شوہر کا ہیرو ہونا نہیں۔ اگر دنیا میں اس وقت کوئی عورت پورے دل سے کبھی ہے تو وہ میں ہوں۔ اگر اس زمین پر کسی کا دل دکھ سے خالی ہے تو وہ میرا دل ہے۔“

وہ گھر آتی اور منجھو بن کر تیار ہوتی۔ کمال کے کرتے اس کا پہناوا ہوتے ورنہ وہ شرارے، فرائیں، ساڑھیاں پہنتی۔ گلابی، سبز، سفید، جھلملاتے، آچھل اوڑھتی۔ ہاتھوں میں کئی طرح کے زیور سجاتی۔ لمبے سیاہ بالوں کو نت نئے انداز سے گوندھتی۔ اس کے گھر میں ڈھیروں ڈھیروں پھول مڑا کرتے۔ اس کے دل کی طاق پر انتظار کے دپ جلتے۔ محبت کی زمین پر کمال اس کا آسمان تھا۔

فارغ وقت میں وہ، سنیما جاتے، تھیر دیکھتے، تاش

کھیلنے کے کارلے کی سرورسیاحت کے لیے اہل جانتے چاندنی راتوں میں ساحل پر چل قدمی کرتے۔ گوفلیں ہوتیں، یاروں کا جوم ہوتا اور وہ اپنے رنگیں اہل اوڑھے چوڑیاں جھنکاتے، کمال کی نظروں کے تعاقب میں جھلم ہوتی۔ وہ کمال کے ہاتھ کو اپنے میں ہاتھ لپی تواسے لگتا کہ اس نے ستاروں کے جھرمٹ کی گمان کو ہاتھ میں لے لیا ہے اور اب انہیں کائنات کے سب ہی کنارے چھو لینے سے کوئی نہیں روک سکے گا۔

اس نے اپنے گھر کو اپنی مرضی کے رنگ سے سچایا۔ ”سفید“ رنگ سے۔ سفید رنگ اسے اتنا بھانا تھا کہ وہ ساری دنیا کو ہی سفید کر دیتا جانتی تھی۔ کمال سے ملاقات سے بھی پہلے اس نے کمال کی تصویر اخبار سے کاٹ کر اپنے پاس محفوظ کر لی تھی۔ اب وہ تصویر اس کی ڈائری میں محفوظ رہتی تھی۔ اس تصویر سے اس کا رشتہ کمال سے اس کے حقیقی رشتے سے کہیں زیادہ گہرا تھا۔

اس کے ساتھی اداکار اسے سیٹ پر دیکھتے تو چونک جاتے، مسکرا دیتے۔ اس کی خوب صورتی خیرہ کن ہوتی جاری تھی۔

”کیا یہ محبت کا اثر ہے مینا؟“  
”نہیں۔ کمال کا۔“

اسے کمال کی باتیں کمال کے لب و لہجے میں کرنا اچھا لگتا تھا۔ ہر بات میں اس کا خوالہ دینا کیسے بھی کر کے اس کے ذکر کو گھسیٹ لانا۔ اس ذکر کو طول دیتے جانا۔ وہ کمال کو بیان کرتے اس کی تشریح کرتے تھکتی نہیں تھی۔

اس کی فلموں اور ہر طرح کے معاملہوں کا چارج کمال اور کمال کے خاص آدمی باقر علی نے سنبھال لیا تھا۔ وہ ہمیشہ ان معاملات سے دور بھی رہی تھی اور ان میں کوری بھی۔ ویسے بھی اسے دلغ کو زحمت دینا پسند نہیں تھا۔ پہلے کام باجوئی کرتے تھے۔

”آہ باجوئی!“ کئی ہی بار وہ جا کر ان کے شانے پر سر رکھ کر آنسو بہا چکی تھی۔ ان کا ہاتھ چوم کر آنکھوں سے لگا چکی تھی لیکن ان کی خاموشی چپ کسی کو نے

میں پڑی تھی۔ اب وہ اس کے ذاتی یا فلمی معاملات میں نہیں بولتے تھے۔ باپ کی ناراضی کا یہ انداز اس کے اندر ناسور بن کر بیٹنے لگا۔ باجوئی کی آنکھوں میں سر شام ہی رات کا سناٹا اس کے دل کے ٹکڑے کر دیتا۔

اس کی نظروں میں وہ علی بخش محوم جاتا جو بچنے پرانے کمپنوں کے ہوتے جو قونوں میں بیٹھی کے اسٹوڈیو میں کام کی تلاش میں صرف اس لیے بھٹک رہا ہوتا کہ بنارہی ہو کو وہ اور بھوکے بچوں کو پیٹ بھر خوراک مل جائے۔ اپنی ساری ہستی مٹا کر اسے ”میتا کماری“ بنا کر وہ باپ اب خاموش ہو گیا تھا۔ وہ جب جب سیٹ پر کسی فلمی باپ کے سامنے مکالمے بولتی، اس کی آنکھیں بھٹک جاتیں۔ دل تڑپ اٹھتا۔

اقبال بنگلہ میں وہ دن دوبارہ نظروں نہ ہوا جس دن باجوئی اس کے کمرے کے کمرے کے کمرے ہو کر آواز دیتے۔ ”منا! اٹھ جاؤ۔ تم رات بھر کتابیں پڑھتی ہو اور پھر یوں دیر سویر کرتی ہو!“

وقت ٹوٹ کر نہیں آئے گا لیکن شاید وقت بھیس بدل کر بھی نہیں آئے گا کہ جب وہ باجوئی کا ہاتھ کھینچتے ہوئے انہیں پہلے میں چلنے کے لیے کہے گی۔ یا انہیں اپنی کار میں بیٹھا کر بیٹھی کی سڑکوں پر ایسے حملائے گی کہ وہ چلائے لگیں گے۔

”منا! تم تو پاگل ہو چکی ہو لیکن مجھے تو سلامت رہنے دے۔ موٹر کو کہیں بھی دے مارو لیکن پہلے مجھے اتر جانے دے۔“

ماں باپ کے ساتھ گزرا وقت اذیت ناک ہوا خواب ناک، وہ روح کی طرح دل سے کبھی جدا نہیں ہوتا۔ موت کی پہلی سانس سے ذرا پہلے تک بھی اس وقت کا احساس جان نہیں چھوڑتا۔ یوں وہ بیک وقت دو زندگیاں گزار رہی تھی۔ ”مہ جیوں بانو“ اور ”میتا کماری ناز“ بن کر۔

”مجھے میرا ماضی ہمیشہ پکارتا ہے۔ آوازیں دیتا ہے۔“ (ڈائری)

مہ جیوں اپنے ماں باجوئی کے ساتھ کھولی میں رہتی۔ رات کو بھوکی سوتی۔ صبح باجوئی کے ریاض کے

ساتھ اٹھتی۔ اس نے ماضی کو کبھی ہاتھ سے پھسل جانے ہی نہیں دیا۔ وہ بیٹھے بیٹھے رو پڑتی۔ کچھ اور نہ بن پڑتا تو بننے لگتی۔

اسے لگ جانے والے روگوں میں سے ایک یہ بھی ٹھہرا۔ جس کی دوا ملی نہ کوئی چارہ ہو سکا۔ موت کا ایک رنگ یہ بھی رہا۔



دل سا ساتھی جب پایا۔  
بے چینی بھی ساتھ لی۔  
”تمہارے میک اپ روم میں کسی کو آنے کی اجازت نہیں ہوگی منجھو۔“

ایک رات اس کے گھر واپس آنے پر کمال نے سنجیدگی سے کمال اس نے حیرت سے کمال کو دیکھا۔ شوٹنگ کے وقفوں میں ہمیشہ سے اس نے آرام کرنے کی بجائے دریافت کو ترجیح دی۔ وہ کتابیں پڑھتی، شاعری لکھتی۔ اس کا ادبی ذوق ہمیشہ تفتہ ہی رہا۔ وہ شاعروں، گانوں، ادیبوں سے ملتی۔ گیتاوت، ”تا جی“، رعب، ہشور، اسٹوڈیو میں بیٹھ کر وہ ان سب کے ریکارڈ ہونے والے گانوں کی ریکارڈنگ سنا کرتی۔ اس کے شوق کی حد تھی کہ ختم ہونے میں نہیں آتی تھی۔ ”کیوں؟“

”کیوں کا جواب تم اچھی طرح سے جانتی ہو۔ باقر علی تمہارے ساتھ ہوں گے۔ مجھے اس پر بحث نہیں کرنی۔“

اس کی چندون آنکھیں جھللا گئیں۔ ”میں کوئی بازاری عورت نہیں ہوں جس پر تمہیں اعتبار نہیں۔“

”یہ فلم نگر ہے۔ اسے بازاری سمجھو۔“  
”اسی بازار سے تم کمال امروہی بنے۔“

کمال نے اپنی آنکھوں کی ساری محبت چھپا کر مٹا کر اس کو دیکھا۔ ”دنیا کا کوئی بازار مرد پر آج بھی آنے

نہیں دیتا۔ بدنام تو عورت ہو جاتی ہے۔ اب تم میری عزت ہو۔ میں لوگوں کی چہ گوئیاں نہیں سن سکتا۔“  
”انتا تو جانتے ہو نا کہ ہماری باتوں کے افسانے بن جایا کرتے ہیں۔“

کمال نے سفید کرتے پر پرفوم اسپرے کیا اور جواب دینے کی زحمت کیے بغیر چلا گیا۔ اس نے دل گرفتگی سے کمال کو یوں جاتے دیکھا کہ اس کے شانے پر سر رکھتی اور کہہ دیتی کہ ”چلو ٹھیک ہے“ وہ اس سے نیلے ہی چلا گیا۔ اس دن باقر علی اس کے میک اپ روم کے باہر سرے دار بنا بیٹھا رہا۔

پات شعلہ ہوئی۔ دھواں بن کر پھیلی۔  
”کمال امروہی نے مینا پر ہرا بھٹایا ہے۔ ان کے سیکرٹری باقر علی سلسے کی طرح مینا کماری کے ساتھ رہتے ہیں۔“

وہ فون پر سب کا جواب دیتے دیتے تھک گئی۔ ہمیں الگ پریشان۔ خورشید کپارو نے ہی تو لگیں۔  
”منا! تم سے غلطی تو نہیں ہو گئی۔ تم نے یہ کس شخص سے شادی کر لی؟“

وہ ہنس دی۔ ”کیا جھوٹی باتوں کو چھوٹا ہی رہنے دےں۔ کمال میرے شو ہر ہیں۔ میرے اچھے کے لیے کہتے ہیں۔“

باجوئی نے بس ایک نظر اسے دیکھا اور وہ شرمندگی سے زمین میں گڑ گڑا گئی۔ رات بھر وہ بستر پر کروٹیں بدلتی رہی۔ باجوئی کی نظر میں کیا تھا، یہی کہ ”جس انسان کے لیے باپ کو اندھے میں رکھا، وہ دن کی روشنی میں بھی تم پر اعتبار نہیں رکھتا۔“

وہ بھر بھری مٹی۔ رات ہی رات کچھڑ ہو گئی۔ ایک اعتراض اپنے ساتھ کئی اور اعتراضات لایا۔ وہ اتنے اعتراضات کا جواب دیتے دیتے تھک گئی۔ ایک دن عاجز آکر کہہ دیا۔

”تو پھر تم مجھے چھوڑ دو۔“  
”تم نے کتنی آسانی سے الگ ہونے کی بات کہہ دی منجھو! اب کمال کے دل کو تکلیف ہوئی۔“

”نہ جانے کس کی قسمت مجھے مل گئی ہے۔“

خوشیاں گھڑی بھری ملتی ہیں اور روگ صدیوں پر محیط۔

”میری پاکیزہ ہوگی؟“  
”تمہاری ہی تو ہو۔“

”میں نے زندگی میں دو ہی خواب دیکھے ہیں منجھو۔ ایک یہ کہ میرا شہر امروہ میرے نام سے پہچانا جائے۔“  
”میں انہی دی۔“ اور امروہ تمہارے نام سے جانا جاتا ہے۔ تمہارا یہ خواب پورا ہوا۔ کیا وہ سراسر خواب مجھ سے شادی تھا۔“

اسے اپنے ساتھ ایک بڑے پتھر پر بیٹھا کر وہ پانی میں کنکر پھینکنے لگا۔ ”دوسرا خواب پاکیزہ ہے۔“  
”یعنی کہ میں؟“ اس کے شانے پر اپنا سر رکھ کر وہ شرارت سے مسکرانے لگی۔

”ہاں! تم ہی ہو۔ کمال امروہی کی پاکیزہ۔ پاکیزہ میرے خوابوں میں آتی رہی ہے۔ جن دنوں میں لاہور بڑھتا تھا ان دنوں چپکے سے یہ میرے دل پر آشکار ہو گئی۔ اس کے کروار، منظر نامے، حتیٰ کہ بہت سے مکالے بھی۔ ریل کی چھک چھک نے میرے دل کو پاکیزہ کے قدموں میں لے جا چکا۔ پائل کی چھن چھن نے بیشہ مجھے ”صاحب جان“ کے ساتھ ساتھ رکھا۔ پاکیزہ کے کرواروں کو میں نے چلتے پھرتے دیکھا ہے منجھو! پاکیزہ مجھے سونے نہیں دیتی۔ صاحب جان کے عشق کی حدت مجھے بے قرار رکھتی ہے۔ میں بے تاب ہوں کہ اسے بنا لوں۔“

”تو بناو چندن۔ ہمارے پاس محل اسٹوڈیو ہے۔ ہم فلم بنا سکتے ہیں۔ لاہور کے بازار، بمبئی کے سینوں پر لائے جاسکتے ہیں۔“

”جب میں نے تمہیں پہلی بار دیکھا تو میں حیران رہ گیا تھا۔ صاحب جان میری نظروں کے سامنے آکر کھڑی ہو گئی تھی۔ میرے خواب سے نکل کر، میرے وجدان کی مکمل تصویر بن کر۔ جب تم آچل کو جھٹک کر چلتی ہو، سارا پیار آنکھوں میں سمو کر، بالکونی میں کھڑی ہو کر میرا انتظار کرتی ہو، تو ریل کی کوک تمہارے انتظار سے نکلتی ہوئی لگتی ہے۔“  
وہ حیرت سے کمال کو دیکھنے لگی۔ ”تو میں پہلے سے

”تمہارے منہ سے نکلے یہ الفاظ نجانے کب میری یادداشت سے نکلیں گے۔“

”میرے دل پر تمہارے رویے نے کچھ ایسے گھاؤ لگائے ہیں کہ میری محبت سسک رہی ہے۔ یہ گھاؤ جانے مندل ہوں گے بھی یا نہیں۔“

کتنے ہی دن کمال اپنی یادداشت مٹانے کی کوشش کرتا رہا اور وہ اپنے زخم بھرنے کی کوشش کرتی رہی۔ جتنی جلدی انہوں نے تعلق بنانے میں کی تھی، اتنی جلدی میں وہ اسے توڑنا نہیں چاہتے تھے۔ آخر کمال نے اس کے سامنے چند شرطیں رکھ دیں۔

”تم شام چھ بجے تک گھر آجایا کرو گی۔ تمہارے میک اپ روم میں کسی کو آنے کی اجازت نہیں ہوگی۔ صرف اپنی کار میں بیٹھ کر ہی جاؤ گی۔ کسی بھی انسان سے اکیلے میں نہیں ملوں گی۔“

اس نے ان شرطوں کو مان لیا لیکن اس احساس نے اسے تکلیف دی کہ اب ان کا رشتہ شرطوں پر چلے گا۔ ”خدا یا چاند کے گرہن کی طرح میری مشکل آسان کر اور مجھے فکر مت ایسا ہی ضبط و صبر بخش جیسا کہ اسے بخشا ہے۔“ (ڈائری)

☆ ☆ ☆

”آپ ہی آپ کبھی آپ مجھے مل جاتے ہیں۔ کبھی پچھڑ جاتے ہیں۔ نہ جانے یہ میرا خواب ہے یا میں جاگل ہو گئی ہوں۔“

فلم کی شوٹنگ کے لیے وہ لوگ بدر اس آئے تھے۔ شوٹنگ سے فارغ ہو کر وہ اور کمال کتنی ہی دیر تک شام کے سائوں میں رات کا انتظار کرتے رہے۔ دور بہت دور ایک ٹرین سیٹی بجانی گزری۔

پتھروں پر سنبھل سنبھل کر کمال سے دو قدم آگے چلتی بیٹانے اچانک اپنی کمر براس کے ہاتھوں کی گرفت محسوس کی اور وہ مسکرا کر پلٹی۔  
”کیا ہوا؟“

”یہ کیا کیزہ تھی؟“

”پہلے دن سے۔۔۔ پہلی نظر سے، پھرتے ہیں ہم اکیلے۔۔۔ ہاتھوں میں کوئی لے لے۔“  
”اور میرے عشق کی حدت؟“ کتنا پیار آ رہا تھا اسے چندن پر کہ پائش ممکن نہیں تھی۔  
”وہ مجھ تک آ پہنچی تھی۔ جب تم نے اخبار سے میری تصویر کاٹ کر اپنے پاس محفوظ کی تھی۔ رموز محبت کا یہ سب سے گہرا رمز ہے۔“

”تو پھر سناؤ مجھے اپنی پاکیزہ کی کہانی۔۔۔“  
”پہلے تم میرا لکھنا یہ گیت سنو۔۔۔  
یہ رات یہ خاموشی۔ یہ خواب سے نظارے۔۔۔  
جنوبہ زمین پر اترے ہوئے ہیں تارے  
بے خواب میری آنکھیں۔۔۔ مدھوش ہے زمانہ  
اسے دل کیسے سے ”ان“ کو ایسے میں ڈھونڈ لانا۔  
اس کے دائیں شانے سے سر نکالے، آنکھیں بند  
کیے اس نے ساری کائنات کو یہی گیت گاتے سنا۔  
”کیسا لگا؟“ جواب وہ جانتا تھا، بس اسے الفاظ میں اظہار چاہیے تھا۔

”گیت میں ان کے تاثر نے مجھے بہت مسحور کیا ہے کمال۔۔۔ تم نے مجھے متبر کر دیا۔“  
وہ حیرت سے اسے دیکھنے لگا۔ ”کیسے؟“  
”ایسے میں ”ان“ کو ڈھونڈ لانا۔ تم نے ”اس“ کو ”ان“ کر کے اسے محرم بنا دیا۔ لڑکی کسی بھی شخص کو نہیں صرف اپنے ”محرم“ کو ڈھونڈ لانے کو کہہ رہی ہے۔ اپنے مجازی خدا کو۔“

کمال اسے داد دے بنا نہیں رہ سکا۔ ”تمہارا علمی ذوق بہت کمال کا ہے منجھو۔ تم نے میرے گیت کی حقیقی روح کو پایا۔“  
اس نے تہقیر لگایا۔  
بمبئی واپس آتے ہی جولائی 1956ء میں پاکیزہ بنانے کا اعلان کر دیا گیا۔ کمال نے کہانی پر کام شروع کر دیا تھا۔ ہندوستان نے اس فلم کی راہ میں آنکھیں بچھا دیں جس کی تیاری میں سولہ سال لگنے والے تھے۔ چار سال میں اسکرپٹ مکمل ہوا اور کمال نے ایک

گہنا مٹگیت کار کے ہاتھ میں کہانی دی تو اس نے اپنی روح کہیوں میں کھینچ لانے کا وعدہ کیا۔ اور ایسے۔۔۔ رات کے پچھلے پہر۔۔۔ رات کے پہلے پہر سے دیوار سے سر نکالے بیٹھے غلام محمد نے اپنی آنکھیں کھولیں اور اپنی انگلیوں میں دبے مضرب کو ستار کے ناول پر رکھا۔  
اور یوں ”چلتے چلتے“ کی دھن ٹھہری سے نکلی، وقت کے سپرد ہوئی۔

☆ ☆ ☆

بازار حسن، پالکیاں، بالکونیاں گھوڑا گاڑیاں، وضع داریاں۔۔۔ پس منظر صاحب جان کی پشت سے جھانک رہا ہے۔  
”جس نے اشرافی گزرتا وہ پٹہ میرا۔۔۔ ہو جی ہو پٹہ میرا۔۔۔“

بازار حسن کے سامنے، چلتے فانوس کے نیچے، صاحب جان محور قصب ہے۔  
پھول والے کی آنکھوں میں شوق دید کی انتہا ہے۔ وہ صاحب جان کو دیکھ دیکھ تھک نہیں رہا۔ شوٹنگ سے پہلے بھی یہی پھول والا بیٹا کو میک اپ روم سے نکلتے دیکھ کر عرش کھار کر گر گیا تھا۔ یہ بات سیٹ میں مھوم گئی کہ پھول والا پچھو مینا کے حسن کی تاب نہیں لاسکا۔ مینا مسکرا دی۔ پھول والے کے گال پر چٹکی لی۔  
”کیوں اتنی پیاری لگ رہی ہوں میں؟“  
”اپر اسے۔۔۔ پھلکا کر وہ اتنا ہی کہہ پایا۔“

سب ہنس دیے۔  
بلک اینڈ وائٹ، کلر سینما اسکوپ کے چکر میں نہ جانے کتنی بار فلم کی شوٹنگ ہو چکی تھی۔ کتنے سال گزر چکے تھے۔ آج پھر اس گانے کی شوٹنگ تھی جو پہلے بھی دوبار شوٹ ہو چکا تھا۔ فلم کے رنگین اور وہ بھی سینما اسکوپ بنانے کے فیصلے کے بعد مینا نے خود لمبوسات ڈیزائن کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ وہ بہت خوش تھی۔ کمال کا خواب اس کا خواب تھا۔ فلم کے سیٹ کی تعریف چار عالم میں تھی۔ گلابی محل اور بازار حسن

کے سیٹ کو جو دکھاتا اور پر بغیر نہ رہا۔

مینا کے گلابی فراک، سفید چوڑی دار، سرخیلے گھنگھروں سے سجے پیروں کی تصویر کسی فوٹو گرافر کے ہاتھ آ گئی تھی۔ اس تصویر کی اخبارات میں دھوم مچی۔ ایک تصویر نے ہی اپنی پہلی بچادی کہ فلم کا انتظار مشکل ہو گیا۔ لوگوں نے کہا کہ مینا کماری آج تک کسی اتنی حسین نہیں لگی جتنی وہ بس اس ایک تصویر میں لگ رہی ہے۔ اگر ایک تصویر کا یہ عالم ہے تو پوری فلم کا کیا عالم ہو گا۔

جس دن گلابی محل میں ”تھارے ریو“ گانے کی شوٹنگ شروع ہوئی اس دن سیٹ پر سے کوئی بھی اس پر سے نگاہ ہٹانے کے لیے تیار نہیں تھا۔ کھلتے ہرے رنگ کے پہناوے، سفید و سنہری راجستھانی زور، جھومر بنی، پیروں میں چھن چھن گھنگھرو۔ اس کی چھاپ نے، اس کی آنکھ نے قیامت کا سماں برپا کر دیا تھا۔

وہ خود کو ابھی آئینے میں دیکھ کر آئی تھی۔ آخر ایسا بھی کیا ہو گیا تھا کہ یوں سب اسے دیکھتے ہی دم بخود ہو جاتے تھے۔ وہ کہہ کر لیتی کہ بس ہنس سادیتی۔ وہ خود نہیں جانتی تھی کہ آخر کیا چیز اسے اتنا خوب صورت بنا رہی ہے۔ سامی اداکار اس کے سامنے آکر مکالمے بھول جاتے۔ وہ ہونٹ کو دانت میں دبا کر چھوڑ دیتی۔ پہلے آنکھوں سے پھر ہونٹوں سے مسکرا دیتی۔

کمال اپنے خواب کی تکمیل کے لیے اس سے زیادہ پُر جوش تھا۔ وہ ایک ایک چیز کو سوسوار ہو دکھاتا۔ اس کے بار سنگھار، زور، گیزا، ایک ایک چیز اس کی نظر سے سند قبولیت حاصل کرتی۔ کتنے ہی سین اس نے بار بار شوٹ کیے۔ وہ مطمئن ہی نہیں ہوتا تھا۔ ویسے ہی اس کی شہرت ”کاملیت پسند“ کی تھی لیکن اس فلم کے لیے تو خاص اس پر کاملیت کا خبط سوار ہو گیا تھا۔

مینا موسیقار باپ کی بیٹی تھی۔ خود شاعرہ تھی۔ گانے کے سرنال کو کھال بال سمیت پہچانتی تھی۔ جب غلام محمد لاجپ کو بٹھائے ریاض کراتے تو وہ ان کے پاس موجود رہتی۔ جب گانا ریکارڈ کیا جاتا تب بھی۔ اسے

گانے فلم کی اسکرین پر جانے سے پہلے سننا پسند تھے۔ لفظ عام ہونے سے پہلے، وہ ان کے خاص تاثر کو محسوس کرنا چاہتی تھی۔

گلابی محل میں ”چلتے چلتے“ کی شوٹنگ تھی۔ ایک کاروباری شخصیت مسٹر ایڈوانی سیٹ پر بیٹھے مینا کو دیکھ رہے تھے۔ سونے کے ناموں سے جھلمل قالین پر بیٹھی صاحب جان نے ہنس کر چہرے کو ذرا سا خم دے کر طاؤس کو دیکھا اور اپنے حسن میں اسے محبوب کولا کر اپنے چہرے کی پائل کو اپنے ہاتھ سے بجا کر گانا شروع کیا تو وہ اپنی آنکھیں جھپکنا بھول گئے۔ سانس لینا ان کے لیے دشوار ہو گیا۔

”آپ یہ فلم کھڑ میں بنا رہے ہیں۔ آپ کے ارادے کچھ نیک نہیں لگتے۔ یعنی کہ آپ چاہتے ہیں کہ لوگ سینما اسکرین توڑ کر مینا کی کو اپنی بانسوں میں بھر لیں۔“

”دھیان رہے مسٹر ایڈوانی، مینا میری بیگم ہیں۔“  
”آپ کی بیگم وہ گھر میں ہوتی ہوں گی۔ سینما اسکرین پر وہ ہندوستانیوں کی بیوی ہوتی ہیں۔“  
کمال نے ایک نظر مسٹر ایڈوانی کو دیکھا اور ایک نظر گلابی محل میں رقص کی مشق کرتی مینا کو۔ کرسی پر بیٹھے بیٹھے وہ چلا کر بولا۔  
”نیک اپ۔“

☆☆☆

”کسی کی حد مقرر ہے، کسی کا مقدر، کسی کا پیار، کسی کا ملاپ، سب ناپ تول کر ہے۔“  
وہ سمجھتی تھی کہ محبت ایک ایسی واحد چیز ہے جو بڑھتی ہی ہے محقق نہیں اسے لگتا تھا کہ جب انسان محبت کو پالے گا تو بس سب کچھ پالے گا۔ لیکن دونوں ہی باتیں غلط نکلیں۔ کمال بھی اس سے بات نہ کرنے کا عہد سا کر لیتا۔ وہ خود کو کمال کے گھر کی ایک چیز سمجھتی۔

دل کا ساتھی دل میں بھی تھا، زندگی میں بھی اور ان دونوں ہی جگہوں پر بے چینی بھی۔ اواسی شاید اسے

گھسی میں ملی تھی۔ پیاری، ذمیک کی طرح جان کو لگی تھی۔

”مجھے تو لگتا ہے مجھے گھن لگ گیا ہے۔“ (ڈائری)  
اس کی فلمیں ہٹ ہو رہی تھیں۔ دلپ کمار کے بعد وہ پہلی ہیروئن تھی جسے منہ مانگا معاوضہ دیا جا رہا تھا۔ وہ دن رات کام کر رہی تھی۔ ہر بڑے اداکار، ہر بڑی فلم کمپنی کے ساتھ۔ لیکن پھر بھی اسے لگتا تھا کہ وہ خالی ہاتھ ہے۔ وہ ٹھیک ٹھیک یہ اندازہ کبھی لگا ہی نہیں سکی کہ ایسا کیوں ہے۔ کمال ہر روز اس سے اظہار عشق نہیں کر سکتا تھا۔ لیکن کیا یہی بات تھی جو اسے اداس کرتی تھی۔

ایک دن اس نے اپنے شاعر دوست گریز سے پوچھا اور وہ بس مسکرا دیا۔ ”یہ محبت کی بے اطمینانی ہے۔“

”محبت آپ کے لیے بہت بامعنی ہے۔ جیسے آپ نے اس کے سارے مطلب کھوج لیے ہیں۔ جیسے آپ نے سارا پریم پیالہ پی لیا ہے لیکن جس سے آپ محبت کرتی ہیں وہ نہ اس پیالے کے پاس پہنچا ہے نہ وہ کسی مطلب کو پاس کا ہے۔ یہ یک حرفی ”محبت“ کی سمجھ کا معاملہ نہیں ہے۔ یہ۔ م۔ ح۔ ب۔ ت۔ ت۔ چار لفظوں کے ہر احساس کا معاملہ ہے۔ یہ دنیا تو جاہلوں کی ہے مینا جی۔ یوں سمجھ لیں آپ کی سمجھ کے مقابلے میں سب جاہل ہیں۔ آپ جیسے لوگ تو بس گئے فٹھے ہوتے ہیں۔ جیسے سمندر۔ کی سیبیوں میں موٹی۔ کوئی بھی آپ سے محبت تو کر سکتا ہے لیکن وہ آپ کو پائیں سکتا ہو تو کہ اسے پہلے ”محبت“ کے سب معنی پائے ہوں گے۔“

مینا اپنا دل تھام کر رہ گئی۔ وہ ٹھیک کہہ رہے تھے۔ کمال کی محبت اب صرف ایک شوہر کی محبت رہ گئی تھی۔ وہ افراد کی محبت جو ایک چھت، ایک تعلق میں بندھے رہتے ہیں۔

وہ کمال سے اکثر خفا رہتی تھی کہ وہ اسے امر وہ کیوں نہیں لے کر جاتا۔ خاندانی اختلافات کی صورت

حال کچھ ایسی تھی کہ وہ امر وہ نہیں جاسکتی تھی۔ اور ان ہی دنوں جب وہ ”پہلا محبت“ کے احساس میں ابھی تھی کمال اسے ناموں بھری رات میں امر وہ لے آئے گاڑی میں بٹھائے بٹھائے اسے شہر کا چہ پہنچا دکھایا۔ ساری رات وہ دونوں گھومتے رہے۔ سارا امر وہ چاندنی میں نمایا ہوا تھا اور وہ بولی ہو رہی تھی۔ اسی دوران اس نے جان لیا کہ اس کے وہم کس قدر بے سرو پا تھے کہ کمال اس محبت سے کوسوں دور ہے جو دراصل وہ اپنے دل میں اس کے لیے محسوس کرتی ہے۔

پھر ایک دن وہ دہلی آئے۔ دونوں لال قلعہ دیکھ رہے تھے۔ کمال کی تاریخ کے بارے میں معلومات حیران کن تھی۔ وہ اس سے بہت متاثر ہوئی تھی۔ ایک مغل شہزادے جہاندار مرزا سے منسوب تاریخی حقائق کمال کے منہ سے سنتے ہی اس کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ اس کی ساری مسرت کا نور ہو گئی۔ آنکھوں میں آنسو آگئے۔ وہ کمال کی طرف سکتے کے عالم میں دیکھتی رہ گئی۔ سارا قلعہ اپنی سرخ اینٹوں سمیت اس پر اُگرا۔

”اب میں جان گئی کہ آپ نے یہ کیوں کہا تھا کہ اگر میرے یہاں کوئی بیٹا پیدا ہوا تو آپ اس کا نام جہاندار رکھیں گے۔ کیونکہ جہاندار مرزا ایک طوائف کے بطن سے پیدا ہوا تھا۔“

چلا کر گئے، وہ قلعے کو اپنے پیچھے وحشت زدہ چھوڑتی چلی گئی۔ بھاگتے ہوئے اس کا سفید پہناؤ اور لمبا دوپٹہ قلعے کے فرش پر نہ جانے کہاں کہاں رک کر دیا، تریا۔ اس کے آنسو کتنی ہی اینٹوں میں جذب ہوئے، کتنے ہی پیروں تلے آئے۔

”لوگ کہتے ہیں کہ کمال اپنے خون کے معاملے میں بہت متعصب ہے۔ اس کی خاندانی بیوی سے اس کی اولاد ہے اسے تم سے اولاد نہیں چاہیے۔ ایک ایسی لڑکی کے بطن سے وہ اولاد لے کر کیا کرے گا جس کا خاندانی پس منظر اس کی ناک کے نیچے ہے۔“

”تمہیں ایسی بے سرو پا باتیں گرتے کچھ لحاظ کرنا



چاہے منعجو۔۔۔

”تو پھر میں اب تک ماں کیوں نہیں بنی۔ اتنے سال ہو چکے ہیں ہماری شادی کو۔“ وہ چلانے لگی۔  
”تم خود سے پوچھو۔ تم جو خود کو دیوی سمجھتی ہو۔ تمہیں لگتا ہے تم ماں بن سکتی ہو؟ تمہارے ہاتھ سے سارے فلمیں نکل جائیں گی۔“

میں اپنے ہونٹ کاٹنے لگی۔ ”کامیابی کا نثر اتنا بھی میرے سر نہیں چڑھا کہ میں ماں نہ بننے کا فیصلہ کر لوں۔ افسوس تو مجھے یہ ہے کہ تمہیں اپنے خاندانی خون پر بہت ناز ہے۔ تمہاری بیوی کو میں نے اپنی بڑی بہن کی طرح سمجھا، تمہارے بچوں کو اپنے بچے، تمہارے خاندان کو اپنا خاندان۔ تمہارے لیے اپنے باپ کو چھوڑ دیا اور تم مجھے ایک طوائف سمجھتے ہو؟ اگر میں طوائف ہوں تو تمہارے خاندان کی ہر عورت۔۔۔

”بکواس بند کرو اپنی! ہاں ہے۔ بہت ناز ہے۔ تم ہو کیا۔۔۔ تمہاری بانی؟ ایک ہندو عورت تھی جس نے ایک پارسی سے گھر سے بھاگ کر شادی کی تھی۔ تمہاری ماں پھر بھاگ دی، جو کامیابی دی بنی پھر وہ اقبال بانوں بن گئی۔ تمہیں کیا لگتا ہے کہ تمہارے بابو جی سے محبت میں وہ واقعی مسلمان ہو گئی ہوں گی۔ یہ ہے تمہارا خاندان۔ اور تم میرے خاندان پر انگلی اٹھا رہی ہو۔“

سارا ہندوستان بھی مل کر مینا کو پکڑ کر آگ میں جھونک دیتا تو اسے ذرا سی تکلیف نہ ہوتی جواب ہوتی ہاں اب ہوئی۔ اس محبت کی آزمائش جو وہ کمال سے کرتی تھی۔

”اور میرے بابو جی۔۔۔؟ تم انہیں کچھ کہنا بھول گئے کیا کہو گے انہیں۔“ چلا کر اس نے کہا۔ لبالب گلاس الٹ گیا ہو جیسے خون اس کے منہ سے ایسے نکلا اور وہ ہوش سے ریگانہ ہو کر چکر اکر گر گئی۔

”تمام وقت میں اس وسیع سفید بستر پر ایک ایسے جنازے کی طرح پڑی رہتی ہوں، جسے لوگ دفنانا بھول گئے ہوں۔“ (ڈائری)

بے خواب راتیں اور بے خواب ہو گئیں۔ کچھ دکھ کچھ جوگ، کچھ بیماری۔ اس کی زندگی کی کمائی وقت سے بہت پہلے ہی انٹرویو سے آگے نکل گئی۔

☆☆☆

”اور اب سینے میں دل کی جگہ لگتا ہے کہ چاند ہے ہماری۔۔۔ سرسید اور سفید! (ڈائری)  
یہ شاید وہ خود بھی ٹھیک سے نہیں جان سکی کہ کمال سے محبت ہو جانے کے بعد کب کہاں اور کیسے اس محبت میں بال آنے لگا تھا۔ ذاتی زندگی کے جھگڑے، اخباروں کی خبریں یا پھر لوگوں کی باتیں۔ کس چیز نے ان دونوں کو دور کرنا شروع کیا تھا۔ لوگ اسے کہتے کہ کمال تمہاری کمائی کھا رہا ہے۔ تمہیں ماں نہیں بننے دے رہا۔ جن دنوں تم علاج کے لیے ہسپتال میں داخل تھیں ان ہی دنوں ڈاکٹر کے ساتھ مل کر اس نے تمہیں بانجھ کر دیا تھا۔ اگر اسے اپنے حسب نسب کا خیال نہیں ہے تو وہ تمہیں امروہی اپنے آبائی گھر میں کیوں نہیں رکھتا۔ ساری دنیا جانتی ہے کہ تم اس کی بیوی ہو۔ پھر خاندانی بیوی کھلائے جانے میں عذر کیا؟

ایروز سینما میں فلم کے بے میسر کے موقع پر سراب مودی نے ہمارا شٹر کے کورنر سے کمال کا تعارف کچھ یوں کر دیا۔

”یہ ہیں مشہور اداکارہ مینا کماری۔۔۔ اور یہ ان کے شو ہر کمال امروہی۔“

”سراب صاحب! آپ غلط کہہ رہے ہیں۔ میں ہوں کمال امروہی اور یہ ہیں میری بیوی مینا کماری۔“ کمال نے سراب مودی کو فوراً ٹوک دیا۔ مینا کا ہاتھ چھوڑا اور ان سب کو حیران چھوڑ کر فوراً آؤٹ ریم سے باہر نکل گیا۔ وہ اس کے پیچھے بھاگی۔

”تمہارا ایسے جانا ٹھیک نہیں چندن۔۔۔ ہم کچھ دیر میں چلے جائیں گے۔“

”سراب صاحب کا ایسے کہنا بھی ٹھیک نہیں تھا۔۔۔ آؤ تم بھی میرے ساتھ چلو۔“

”ہمیں ایسے نہیں جانا چاہیے۔ سراب صاحب

کے احسانات کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ انہوں نے تمہیں پہلی فلم دی تھی۔“  
”وہ فلم مجھے میری قابلیت پر ملی تھی۔ احسان نہیں کیا تھا انہوں نے۔“  
”میرے بابو جی سرسارگ تھے چندن، لیکن انہیں کبھی کام نہیں ملا۔ ہاتھ پکڑ کر آگے لے جانے والے کا بہت بڑا احسان ہوتا ہے۔“

”تم میرے ساتھ آ رہی ہو یا نہیں۔۔۔؟“  
”تم اس بات پر خفا ہو کہ میرے نام سے تمہارا تعارف کروا گیا؟“

”جب تم ”مینا کماری“ نہیں بنی تھیں اس سے کہیں پہلے میں ”کمال امروہی“ بن چکا تھا۔ ایک کامیاب کمائی نویس، ہدایت کار۔“ لوگوں کے ہجوم میں مینا نے بات کو بدھانا مناسب نہیں سمجھا۔ کمال چلا گیا اور اس نے اسیلے بیٹھ کر فلم دیکھی۔ اگلے دن کے اخبارات میں شہ سرخیاں کچھ ایسے تھیں۔

”کمال امروہی کو اپنی بیوی مینا کماری کے نام سے متعارف ہونا پسند نہیں۔“  
پانی پل کے اس گھر میں دو ایسے افراد رہتے تھے جو اپنے اپنے شعبے میں بے مثال تھے۔ ایک کا قلم بے جوڑ تھا اور ایک کا فن۔ ایک اسکرین پر آئی اور چھ جانی، ایک اسکرین کے پیچھے رہتا اور تاریخ لکھ دیتا۔ لیکن بس مینا ہر آنکھ، ہر کان، ہر زبان سے جالی جاتی تھی۔ اخبارات اس کی تعریف میں رطب اللسان ہوتے تھے۔ اور وہ جو کیمرے کے پیچھے ہوتا تھا اسے چند ہزار لوگوں سے زیادہ کن پچانتا تھا۔ اور پھر لوگ فلم شروع ہونے اور ختم ہونے کے بعد یہ پڑھنا گوارا ہی کہاں کرتے ہیں کہ فلم کس نے لکھی ہے، کس نے بنائی ہے۔ وہ تو ایک ہی بات جانتے ہیں۔ ”ہیرو۔۔۔ ہیروئن۔“ ان دو کے علاوہ انہیں کسی میرے سے کیا سروکار ہے۔

اسی دوران اسے ایک اور رنگائی ناول پر بننے والی کمائی کی پیش کش ہوئی۔ پیش کش کیا ہوئی مگر روروت نے اصرار کیا کہ یہ کروار صرف وہی کر سکتی ہے۔

ہدایت کار ابرار بھی پر زور دلا کر دینے لگا۔  
”تم یہ فلم نہیں کرو گی منعجو۔۔۔“ کمال نے گروڈت کو انکار کر دیا تھا۔  
”میں کمائی سن چکی ہوں، ناول بھی پڑھ چکی ہوں۔ میں چھوٹی بہو کا کروار بہت اچھے طریقے سے کر لوں گی۔“

”تم چاہتی ہو لوگ باتیں کریں۔ گروڈت نے تمہیں چھوٹی بہو کا کروار دے کر میرے منہ پر طمانچہ مارا ہے۔ ساری دنیا جان گئی ہے کہ تم شراب پینے لگی ہو۔ مریضہ ہو تم اب تم چاہتی ہو سلدا ہندوستان جان لے۔ امروہہ جان لے۔“

”میں یہ فلم کر لوں گی چندن!“ اس نے غصے سے کہا۔

”تم ایک دکھی ’لاچار‘ بے بس عورت ہو۔ جو اپنے شوہر کے ساتھ خوش نہیں۔ جو لٹے کی لٹ میں مبتلا ہو چکی ہے۔ سب ثابت کرنا چاہتی ہو؟“

”اگر مجھے یہ سب دینا کو بتاتا ہے سارا، تو اس کے لیے ریس میں میرا ایک بیان ہی کافی ہے۔“  
”تم لوگوں کو اپنے نقش کی وجہ کیا دو گی۔ تا سکو کی انہیں اپنے گھٹیا کروار اور بد چلتی کے بارے میں؟“

”تنتی کے پردوں کو اپنے ہاتھوں میں مسل کر تم کہتے ہو کہ میں بد چلتی ہوں۔ تمہاری محبت نہ رہن کر میری روح میں دوڑ رہی ہے اور تم کہتے ہو میں گھٹیا ہوں۔“ وہ چلا کر بولی۔

”اور تم دوسرے مردوں میں اس زہر کا تریاق ڈھونڈتی ہو۔“ کمال بھی اسی کی طرح چلایا۔

مینا نے اپنے لیے اپنے ہی دل میں ڈھیروں نفرت محسوس کی۔ ہاتھ بدھا کر اس نے فون اٹھایا۔

”میں آپ کی فلم صاحب بی بی اور غلام ضرور کر لوں گی۔ چھوٹی بہو صرف میں ہی بنوں گی۔“

☆☆☆

”جس عورت کے بھاگ پھوٹے ہوں، وہی سمجھ سکے شاید۔ عورت ذات کے لیے اتنا بڑا اعلان۔۔۔ اتنی

بڑی لیا۔“ (مکالمہ)

ساتھ جمع دو کائن تھا۔ صاحب بی بی اور غلام نے ریلیز ہو کر سب ہی کرداروں کو لے جا کر پام عروج پر ٹھہرا دیا تھا۔ لیکن ایک کردار ایسا تھا جو ان سب سے بہت آگے نکل گیا تھا۔ سب مثالوں میں اپنی مثال آپ ہو گیا تھا۔ وہ کردار تھا ”چھوٹی ہو“۔

گھنوں اور تباری ساڑھی میں جی، ہندی، پازیب، انگوٹھی، ہندیانچے ساگ، ہندی، ٹھوڑی نلے ہاتھ، ہونٹ بائتی مسکان، کرسی پر بیٹھی چھوٹی ہو۔ جب بھوت ناتھ اسے دیکھتا ہے تو اس کے حسن سے چکر اکر رہ جاتا ہے۔

”چکر اکیوں گئے۔ میں تو تمہیں بھوت ناتھ ہی کہوں گی۔ اور تم مجھے چھوٹی ہو کہہ سکتے ہو۔“

”بریں کیا کہہ رہا ہے جانی ہو؟ یہ دیکھو۔ یہ بھی۔۔۔ یہ جی۔“ کمال نے اس کے سامنے اخباروں، رسالوں، خطوں کے پلٹے پھینکے۔

قائیں پر آڑی ترچھی لکٹی کتاب پڑھتی بیٹانے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ ”مجھے ان سب سے کوئی مطلب نہیں ہے۔“

”مطلب ہوتا چاہیے بیٹا جی۔ انہیں کھولیں، پڑھیں۔ ایک ہی سوال ہزار انداز سے پوچھا گیا ہے۔“

”چھوٹی ہو کیا کمال کی چھوٹی بیوی ہیں؟ کیا کمال کی بے وفائی نے مینا کو شراب کاغذی بنا دیا؟ یا کمال کی بے رخی مینا کو لے ڈلی۔ ایسی شاندار حقیقی اداکاری،

در اصل مینا جی کی حقیقی زندگی کی اصل تصویر ہے۔“ وہ اخباروں کی شہ سرخیاں بڑھ رہا تھا۔

”تم سے کہا تھا تم یہ کردار نہیں کرو گی۔ میں کسی کو ٹھکے پر نہیں چڑھا تھا، جس سے اتارنے کے لیے تمہیں یہ سب کرنا پڑا ہو۔“ کمال کی آنکھوں میں خون اُتر آیا تھا۔

”صرف ایک طوائف ہی تو عورت کی زندگی کا روگ نہیں ہوتا۔“

”کیا ہے تمہارا روگ۔ جواب دو۔“

”تم نے کسی بازی کی طرح مجھے جیتا۔ دعوے کی

طرح بھلا دیا۔“

”تم میں ایسا تھا کیا جو میں تمہیں جیتنے کے لیے سر دھڑکی بازی لگانا نہ یہ تم تھیں جس نے میری تصویر دیکھ کر کہا تھا۔“ یہ ہے میرے خوابوں کا شہزادہ۔“ یہ تم تھیں جسے ”کمال امروہی“ چاہیے تھا۔

مینا رو دینے کو بس سی دی۔ ”ہاں! میں نے ایسا ہی کیا تھا۔ پورے دل سے میں نے تم سے محبت ہی تو کی تھی۔ چھوڑ کھولی میں مجھے دیکھ کر تم نے اپنے دوست سے کیا کہا تھا کہ میں آنے والے وقت کی بہت بڑی بیویوں بننے والی ہوں۔ تمہیں یقین تھا کہ میں ضرور بڑی بیویوں بنوں گی۔ تم نے ایک بیویوں سے محبت کی شادی کی۔ کسی سلطنت کی طرح تم نے مجھے فتح کیا

اب تمہارے آدمی میری عمر لگاتی کرتے ہیں۔ اب تمہیں میرے نام سے متعارف ہونا پسند نہیں ہے۔ گھر گھر چھوٹی ہو کا ذکر پسند نہیں۔ مجھے تمہاری شہرت نے، نام نے بھی تکلیف نہیں دی۔ تمہارا آخر میرا آخر

رہا۔ میرا نام تمہارا نام کیوں نہیں رہا؟ میری پہچان تمہیں منظور کیوں نہیں؟

جو شخص بڑے بھائی کی معمولی سی سرزنش پر اپنا گھر، خاندان، شہر چھوڑ سکتا ہے وہ کیا کچھ نہیں کر سکتا ہے۔ تمہیں غور ہے کہ تم ”کمال“ ہو۔ باہو جی کہتے تھے ”ہمارے خاندان میں شاید ایک ہی انسان کامیاب ہو سکتا ہے۔“ وہ ایک میں تھی۔ تم بھی شاید یہی

چاہتے تھے کہ ہمارے اس گھر میں ایک ہی شخص کامیاب رہے اور وہ تم ہو۔“

”مینا جی۔۔۔ یہ آپ کی کسی فلم کا سیٹ نہیں ہے جہاں آپ مکالمے بول کر دیکھنے والوں سے داد وصول کر لیں گی۔“

وہ کچھ اس طرح ہنسا کہ محبت جو دل کے پنجرے کا پنچھی تھی، پھر سے پنچو تو ڈر نکلی۔ آہ کی طرح اس نے کہا۔

”میری محبت کی سفید دھرتی پر تم گندے پاؤں چلنے لگے ہو۔“

”تمہارے جن لوگوں سے چکر ہیں، انہیں تم کس

دھرتی پر چلاتی ہو؟“

”مجھے بھئی کی آگ بنا کر تم کہتے ہو پانی کے لیے کسی ساگر میں نہ کروں۔ مجھے جام بنا ڈالا ہے، پوچھتے ہو چھلکی کیوں ہو؟“

کمال نے جواب میں اس کے منہ پر ایک زوردار چاٹنا مارا۔

\*\*\*

”اسکرین پر غم کی جو تصویر مینا کماری بنی ہیں، وہ ہندوستان میں کوئی اور بیویوں نہیں بن سکتی۔“ (اخبار)

اس نے ثابت کر دیا اور وہ تاریخ کی پہلی بیویوں بن گئی جو ایک ہی سال تین فلموں کے لیے بہترین اداکارہ کے ایوارڈ کے لیے خفیہ کی گئی۔ اس سال کسی اور اداکارہ کو ایوارڈ مل جانے کا سوال سرے سے ہی ناپید ہو گیا۔

”جو کچھ ان کے پاس ہے وہ میرے پاس؟ وہ سب کیا دے سکے تم مجھے۔ مجھے۔ مجھے۔ ماں کہہ کر پکارنے والا۔“

ایوارڈ چھوٹی ہو کا ہوا۔ وہ پہلی بیویوں بن گئی جس کے پاس تین ایوارڈ آچکے تھے۔ یہی فلم جب برلن فینسٹیل کے لیے منتخب کی گئی اور کمال اور مینا کو برلن بھیجا جانے لگا تو کمال نے صاف انکار کر دیا۔ اسے مینا کے ساتھ شوہر کا ٹھہرنا نہیں تھا۔ وہ خود بھی برلن نہیں گئی۔

زندگی کچھ ایسی ہی ہو گئی تھی۔ دکھ کا کوئی ایک سرا نہیں تھا جسے وہ کات کر الگ کر دیتی تو سکھی ہو جاتی۔ جب محبت کا پہلا پیر غلط پڑتا ہے تو چالی سیدھی ہونے میں نہیں آتی۔ آگے موت رہ جاتی ہے۔ پیچھے خاموشی۔

”موت اس میں رینگ آئی۔ خاموشی اس پر حاوی ہونے لگی۔“

”آج ماں کی چودھویں پڑی ہے اور پچھلی رات وہ مجھے دیکھتے آئی تھیں۔ مجھے یقین ہے۔“ (ڈائری۔)

وہ ایک مشہور اداکارہ تھی۔ گھر گھر اس کی پوجا ہوتی تھی۔ وہ کسی سے بھی کچھ کہہ دیتی تو اگلے دن اخبار میں کہانی چھپ جاتی۔ وہ جن پر اعتماد کرتی وہ اسے دھوکا دے جاتے۔ جن کی مدد کرتی وہ پلٹ کر خبر نہ لیتے۔ میک اپ مین سے چائے والے تنک، کسی انسان کو اس سے کوئی شکایت نہ تھی۔ کسی ایک بھی شخص نے بھی اس کی طرف انگلی اٹھا کر یہ نہیں کہا کہ ”اس نے مجھے تکلیف دی ہے“ اسنے علاوہ وہ ہر انسان کے لیے بے ضرر تھی۔ فلم سازوں کی فائیں ڈوب رہی ہوتیں اور وہ بنا پیسوں کے کام کرتی۔ پروڈیوسر کو چیک لکھ لکھ کر دیتی۔ اس کے گھر مدد کی درخواست کرنے والوں کا تانتا بندھا رہتا۔ اس کے بارے میں مشہور تھا، وہ دروازے سے خالی ہاتھ نہیں لوٹاتی۔ وہ جتنی مشہور تھی اتنی ہی تنک دل۔ اس کی روح میں کھولی کی وہ بچی آہل تھی، جو پیچھے خانے کی بیڑھیوں پر بڑی رو رہی ہے۔ برقع پہن کر بازاروں میں کم نام ہو کر خریداری کرتے، اس نے کبھی خود کو خاص عورت نہ سمجھا۔

شوٹنگ سے گھر آکر وہ ایک عام عورت بن جاتی۔ وہ مینا کماری کو گھر کی دلہن سے باہر چھوڑ دیتی۔ اندر صرف وہ جہیں بانو آتی، کمال کی منجھو۔ وہ کھانے بیٹائی، بہنوں کی دوستوں، رشتے داروں کی دعوتیں کرتی۔ بچوں سے کھیلتی۔ امروہہ سے کمال کے بچے آتے تو ان کے بازو خیرے اٹھاتی۔ حتیٰ کہ کمال کی پہلی بیوی اس کے گھر آئی تو اس نے انہیں دیکھتے ہی گھر کی چابیوں ان کے ہاتھ میں تھامیں اور کہا۔

”آپ اس گھر کی بڑی ہیں، آپ کے ہوتے مجھے بڑا بننے شرم آتی ہے۔“

محمودی بیگم کا دل اس کی خدمت، محبت پر ایسے صاف ہو گیا کہ انہیں یہ دکھ جانا نہ تھا کہ اس نے ان کا شوہر ان سے چھین لیا تھا۔ اس کی خوش اخلاقی کے قہقہے امروہہ تک گئے۔ ہر شخص جو اس سے ملا وہ اس کا دیوانہ ہی ہوا۔

پھر بھی۔ پھر بھی۔ اتنا اچھا ہونے پر بھی اسے چھپ چھپ کر رونا پڑتا۔ اس کا دل اندھیروں میں بھٹکتا

پھرتا۔ ایک انسان جس کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چلنا چاہو یا دو قدم آگے ملایا دو قدم پیچھے۔ علاج کے لیے اکثر نرسنگ ہوم رہتے، خالی کمرے کے سفید بندر لاش کی طرح لیٹے وہ ایسی میت بن جاتی جو اپنی قبر کا انتظار کر رہی ہو۔

دل کی تثنائی بانٹنے کو اسے ایک شفاف دل، نیک صورت انسان ملا۔ وہ اسے اپنی شاعری سناتی۔ اس کی شاعری سنی۔ دونوں مل کر کچھ اشعار کہتے۔ کچھ وہ کہتا، کچھ وہ کہتی اور غزل، نظم بن جاتی۔ کبھی کبھی ایسے ہی اشعار تخلیق کرتے، وہ ان محسوسات کو سننے، جنہیں بیان کرنے کے لیے الفاظ دنیا میں نہیں۔ ایسی محبت کو سمجھنے کے لیے مگر دوبارہ زندہ ہونا پڑتا ہے۔ ایک شاعر۔ ایک شاعر۔ مگر مر کر زندہ ہوتے ہیں تو ہی سمجھ پاتے ہیں۔

”محبت آخر ہے کیا۔“

بے وفا کی کاچلن۔ وفا کا ساتھ عام ہوا۔ جب وفات پائی ہوئی تھی۔ بے وفا کی عام ہوتی تھی۔ انسان کسی بھی شاہراہ پر زیادہ دیر تک اکیلا نہیں چل سکتا۔ ایک ٹولی پھولی عورت تو ہرگز نہیں۔ ساحل کنارے کی ریت کی طرح ایک اسی کی دوستی اسے وفا کے سمندر کے پانی سے گیلی ہوئی لگتی۔ دونوں کا تعلق وہ تو نہیں تھا جو لوگ سمجھ رہے تھے ایک مرد اور عورت کا تعلق؟

وہ اس کی خوب صورتی پر نڈا تھا، لیکن اس خوب صورتی پر نہیں جو سامنے چہرے پر نظر آتی ہے۔ اس خوب صورتی پر جس تک صرف محبت کی دھوپ ہی چھن کر جاتی ہے۔ اس دھوپ میں اس کا چہرہ جب ٹکھڑا تو وہ مہسوت سے اسے دیکھتا اور کہہ دیتا۔

تمہارا نور بڑا ہے چہرے پر  
وگر نہ کون مجھے دیکھتا اندھیرے میں

\*\*\*

ایک نئی فلم کے افتتاح کا دن تھا۔ اسٹوڈیو فوڈوگرانز، صحافیوں سے بھرا ہوا تھا۔ پہلے شارٹ کی

تیاریاں کی جارہی تھیں۔ وہ میک اپ روم میں تیار ہو رہی تھی۔ کمال کے آدمی اس کی عمر لپٹی پر تھے باقر علی نے ہیر ڈریسر سے کہا کہ میک اپ روم میں کوئی نہ آئے اور اس نے سن لیا۔

”کیوں باقر بھائی؟ مجھے کیا سمجھ رکھا ہے آخر۔ کون ہوں میں جس پر کسی کو یقین نہیں؟“

”عرصہ پہلے بھی یہی طے پایا تھا۔“ وہ ذرا غصے سے بولا۔

”عرصہ پہلے تو اور بھی بہت کچھ طے پایا تھا کیا اس کی پاسداری کی گئی ہے؟“

”وہ میں نہیں جانتا۔ کمال صاحب نے کہا ہے کہ میں آپ کے میک اپ روم میں کسی کو بھی گھسنے نہ دوں۔“

”میری زندگی کمال صاحب کے اشاروں پر نہیں چلے گی باقر بھائی۔“

”تو اس کا مطلب ہے تمہارے میک اپ روم میں وہ شاعر بیٹھا ہے۔“ باقر علی دروازے کو دھکے سے کھول کر آگے بڑھتا چاہتا تھا کہ وہ دروازے کے سامنے تن کر کھڑی ہو گئی۔

”اب یہ میری عزت نفس کا سوال ہے۔ یہاں سے جاؤ باقر علی۔ ورنہ بہت کچھ بگڑ جائے گا۔“

باقر علی نے بدستور اسے دھکا دے کر اندر جانا چاہا۔ مینا جی سے کھڑی رہی تو اس نے ایک تھپڑ کھینچ کر اس کے منہ پر مارا۔

اس تھپڑ کی گونج بہت دور تک گئی۔ سارے ہندوستان نے سنی۔ ہر اخبار نے لکھی۔ ہر آواز نے نشری۔

اس نے کمال کو فون کیا۔ ساری روڈ او سنائی۔ اسے یقین تھا کمال دوڑا چلا آئے گا، لیکن اس نے کہا۔

”تم گھر آ جاؤ۔ میں یہاں فیصلہ کروں گا۔“

”جہاں تھپڑ پڑا ہے فیصلہ بھی وہیں ہو گا۔“

”یقیناً تم نے کچھ ایسا کیا ہو گا جو اس کا ہاتھ اٹھا۔“

کمال نے کہا اور مینا نے ایک دوسرا چائنا گلے پر پڑا محسوس کیا۔ فون کو پھینک کر وہ روئی، سستی ہوئی

کار میں بیٹھ کر دھوکے گھر چلی گئی۔ جاتے ہوئے اس کے یہ الفاظ وہاں موجود ہر شخص نے سنے۔

”کمال صاحب سے کہہ دیتا۔ میں اب گھر واپس نہیں آؤں گی۔“

اور پھر وہ دوبارہ کبھی گھر واپس نہیں گئی۔

”وہ اپنا گھر خود چھوڑ کر گئی ہے۔ اسے خود ہی واپس آنا ہو گا۔ میں اسے کبھی لینے نہیں جاؤں گا۔“

وہ بھی دوبارہ اسے کبھی لینے نہ گیا۔

ایک کامیاب کہانی نویس، فلم ساز، ہدایت کار نے جو قسم کھائی، وہی قسم ایک بڑی ہیروئن نے کھائی اور مرتے دم تک نبھائی۔ تعلق ایک دم سے نہیں ٹوٹے۔ ان کے پیچھے زمانے نزلتے ہیں۔ نفرتیں تشکیل پاتی ہیں، محبتیں ناپید رہتی ہیں۔ پھر ہی تو۔۔۔

چاند تھامے آسمان تھا

دل ملا کمال کہاں تھا

جس خوب صورتی سے کمال اس کی زندگی میں آیا تھا، اس سے کہیں زیادہ صورتی سے وہ اس کی زندگی سے نکل گیا۔ دونوں کی علیحدگی کی خبر۔ ان کی شادی کی خبر کی طرح جنگل میں آگ کی طرح پھیلی۔

وہ لوگوں کو کبھی ٹھیک سے سمجھانہ سکتی کہ وہ کیوں کمال سے الگ ہو گئی ہے۔ کچھ باتیں بتائی جائیں تو بہت بار شرمسار ہونا پڑتا ہے۔ پھر ایسی باتوں کے لیے الفاظ بھی تو نہیں ہوتے کہ انہیں بیان کر دیا جائے۔ انہیں تو بس آنسوؤں میں ہی بہایا جاتا ہے۔

کمال امرہوہی سے شادی کرنے والی انش بیس سال کی لڑکی، بیس سال کی ہو چکی تھی۔ گیارہ بارہ سال کے اس سفر نے کھولی کی کھلی منی۔ جہیں ناز کو مار دیا تھا۔ وہ منجوبنی تھی اور اب ”مینا کماری“ بھی نہیں رہی تھی۔ نیند کی گولیوں کی مقدار نے جب اس کی صحت برباد کرنی شروع کر دی تھی تو ڈاکٹر نے وہ مشروب دوا میں لکھ دیا تھا جو کلبہ پھونکتا تھا۔ وہ یہ بتی تھی تو نیند سے پہلے غم سے غافل ہو جاتی تھی۔ اسے یہ دوا دنیا کی ہر دوا سے زیادہ اچھی لگی۔ یہ دوا جو اسے کھولی میں بھٹکنے نہیں دیتی تھی۔ جو اس کی آنکھوں کو

تقہوں میں بدل دیتی تھی۔ ایسی دوا وہ شوق سے پینے لگی۔

کمال سے علیحدگی کے دو سال پہلے بابو جی مر گئے تھے۔ اس کی بھی تو زندہ نہیں تھیں۔

وہ بھٹکنے لگی۔ اتنا بھٹک گئی کہ نشے میں غرق ہو کر رہ گئی۔ کس کس کے ساتھ اس کا نام نہیں جو ڈا گیا۔ گناہوں کی فصل کے بیج تو دوسروں کے ہاتھوں میں تھے، وہ تو بس زمین تھی۔ لوگ آتے گئے، فصل بوٹے گئے۔ لوگ اس سے طرح طرح کے سوال کرتے اور اس کا دل چاہتا وہ ساری دنیا کو پیچھے چھوڑ کر لیں آگے نکل جائے۔

”دنیا چھوڑ کر تو صرف موت کی سواری میں ہی آگے نکلا جاسکتا ہے۔“

گروڈت نے خود کشی کر لی۔ اس جیسے ذہن و فطین انسان کو زندگی نے آخر اتنا بے بس کر ہی دیا کہ اس نے موت کے سامنے، تھیار ڈال دیے۔ اخبارات گروڈت کے لیے چلانے لگے اور مینا چپ چاپ سب دیکھتی رہی۔ اس نے یہ جان لیا کہ جو شخص جتنا وصول پایا ہے وہ محصول بھی اتنا ہی ادا کرتا ہے۔

ہر گز رے دن کے ساتھ وہ اپنا معاوضہ بڑھانے لگی کہ کبھی تو اسے انکار کیا جائے گا۔ شاید کبھی تو وہ فلموں سے دور ہوگی۔ یہ ایک لاشعوری کوشش تھی، ورنہ شعوری کوشش تو یہ ہوتی کہ وہ ایک پریس کانفرنس بلاتی اور اعلان کر دیتی۔

”میرا سفر تمام ہوا۔ اب میں مزید فلموں میں کام نہیں کروں گی۔“

دل ایک کھائی بن گیا، اس کی طلب بڑھتی گئی۔ جس چشمے کا پانی شفاف بیٹھا تھا، وہ کندی ندیوں میں مل کر غلط ہو گیا۔

اس نے کبھی کسی کو رو کر نہیں دکھایا تھا، پھر بھی ساری دنیا جان گئی وہ دھچی ہے۔ اس نے کبھی کسی کو اپنے دل کا حال نہیں سنایا تھا، پھر بھی سب جان گئے اس کا دل خالی ہے۔ اور دل خالی ہی تو نہیں ہو رہا تھا۔ گریز اس کے پاس تھا۔ وہ اس کے آنسو پوچھتا۔

وقت پر اس کو دھارتا۔ جب وہ خون کی الٹیاں کرتی تو وہ اپنی ساکس بچھ کر اس کی ہتھیلی پر رکھ دیتا اور یوں کچھ لمحوں کے لیے وقت اپنا ذہب بدل دیتا۔  
”واوا۔۔۔ دوا پانی پلاؤ گے؟“

وہ بے چارہ باہر گیا۔ بڑے غلوں سے اندر لے گیا۔ چھوٹی سی بیچ کو ہاتھوں سے صاف کیا اور کہنے لگا۔ ”بہا بہا، بیٹھو بیٹھو۔“  
پھر اندھیرا جیسے ہتھکڑ بجانے لگا۔ میلی میلی چھوٹی سی لڑکی، لویا کٹوری لے آئی۔ بہت سے بچے بھی آ کھڑے ہوئے پھر گھر کی عورت بھی۔ دیوالی ہے نا پائل پنپے ہوئے تھے وہ بچی۔ سچ اس لمحے جیسے سب دیوالی میں تھے۔ (ڈائری)

\*\*\*

”جس شخص کو سکون و اطمینان میسر نہیں اس کے پاس کچھ بھی نہیں۔“ (ڈائری)

وہ لینڈ مارک بلڈنگ میں اپنے الگ فلیٹ میں رہتی تھی۔ مدھو اور خورشید آپا اپنے اپنے بچوں کے ساتھ وہیں آ جاتیں۔ اس کی فلموں میں مانگ نہ بد دن بڑھتی جا رہی تھی۔ کوئی ایک وجہ بھی ایسی نہیں تھی جو لوگوں کو اسے دیکھنے کے لیے سینا لانے سے روک سکتی۔ اس کی تصویریں شائع ہوتیں تو لڑکیاں اسے دیکھ دیکھ کر فیشن کرتیں۔ وہ جس انداز میں بات کرتی وہ اسی انداز کو اپناتیں۔ جس فلم میں وہ جن اطوار کا مظاہرہ کرتی، وہی اطوار عام ہو جاتے۔ اس کی شہرت آتش نیکل تھی، اویسہ، اوپر اور بس اویسہ۔ وہ اپنا چو تھا اور اویسہ بھی حاصل کر چکی تھی اور صد ارتی اور اویسہ بھی۔ یوں وہ ہندی سینما کی پہلی ہیروئن بن گئی، جس کے ریکارڈ پر چار فلم فیسو اور اویسہ تھے۔

ہزاروں کی تعداد میں اسے خط ملتے اور لوگ دیوانہ وار اس سے اپنی محبت کا اظہار کرتے۔ اخباروں میں چھپتی اس کے معاشقے کی خبریں لوگوں کو بے چین کر دیتیں۔ تفصیل جاننے کے لیے ایسے اخبار۔۔۔ دھڑا دھڑا خریدے جاتے۔

”میںا کماری فلاں ہیرو سے عشق لڑا رہی ہیں۔“ (ڈائری)

لوگ یہ پڑھتے ہی دیوانے ہو جاتے۔ میںا اس بار بھی کمال کی طرح دھوکا نہ کھالے۔ میںا اور دھمی نہ ہو جائے۔ اس کے دل کی دیوانہ اجڑ جائے۔

”ملکہ جذبات میںا کماری ہر وقت شراب پیتی رہتی ہے۔ شراب ہی اس کا کھانا پینا ہے۔“ (ڈائری)

ہر روز اخبار اس کی ایک نئی کہانی سناتے۔ وہ ایسی خبریں پڑھتی تو کبھی ہنس دیتی۔ کبھی رو دیتی۔ سب جھوٹ نہیں تھا۔ سب سچ بھی نہیں تھا۔ ویسے بھی سچ ہانے کے لیے مرنا پڑتا ہے۔ کیونکہ اپنی پوری مقدار کے ساتھ ”سچ“ صرف اللہ کے پاس محفوظ ہوتا ہے۔

”میں جلد سے جلد سکون و اطمینان حاصل کرنے کے لیے زیادہ سے زیادہ فلموں میں کنٹریکٹ کرتی ہوں، تاکہ جو کچھ عوام کو دکھانا چاہتی ہوں، وہ جلد از جلد منظر عام پر آجائے اور پھر میں ہوں اور میری تمنا۔“ (ڈائری)

”آفس پائیز۔۔۔“

چار سال پائیز کی وقفہ وقفے سے ہونے والی فلم بندی اب مکمل طور پر بند تھی۔ کمال کا کھڑے چھوڑ دینے کے چار سال بعد اسے کمال کی طرف سے ایک خط ملا اور ”پائیز“ کو مکمل کرنے کی درخواست کی گئی۔ ساتھ جمع آٹھ سٹ۔ اس نے وہ خط پڑھا اور دیر تک، سٹریانی ہستی رہی۔

”کاش مجھے گھر واپس بلا لینے کے لیے بھی تم نے ایسا ہی ایک خط لکھا دی ہوتا۔ کاش تم اتنا لکھ دیتے۔“

”میںا لوٹ آؤ۔“

”میںا لوٹ آؤ۔“ کمال نے ایک پریس کانفرنس میں کہا تھا۔ یہ بلاوا اسے نمائش سے زیادہ کچھ نہ لگا۔

جتنی خوب صورت وہ فلم بن رہی تھی، اتنا ہی بد صورت اس کا انجام ہوتا جا رہا تھا۔ پھر ایک دن اسے موسیقار غلام محمد کی موت کی خبر ملی۔ غلام محمد اسے اس کے بلوچی کی یاد دلواتے تھے۔ بلوچی کی طرح وہ بھی سر سا کرتے تھے۔ غلام محمد کے پاس واحد بڑی فلم ”پائیز“ ہی

تھی۔ انہوں نے بڑی جانفشانی سے لفظوں کو مدح کیا تھا۔ اتنی مدت پر بھی فلم مکمل ہوتی نظر نہیں آتی تو وہ ”پائیز“ کے گانوں کے ریکارڈ فلم سازوں کو جا کر کرنا نے لگی۔ لیکن سب نے ان کے کام کو رد کر دیا۔ ”پائیز“ کی موسیقی سے کوئی بھی متاثر نہیں ہوا تھا۔

ان کی موت نے اس پر بہت گہرا اثر کیا۔ ایک انسان اپنا سارا فن ”پائیز“ کو دے گیا اور خود مر گیا۔ میںا کو بہت رونا آیا۔ کہتے ہی لوگ تھے جن کی زندگیاں ”پائیز“ سے جڑی تھیں۔ کچھ واقعات و حادثات اور کچھ نرگس، سنبیل کا سمجھنا، اس نے فلم مکمل کرنے کا عندیہ دے دیا۔ سارے کے مہینے میں ہی وہ کمال سے الگ ہوئی تھی اور مارچ میں ہی وہ کمال کی ”پائیز“ کی تکمیل کے لیے پھر اس کے ساتھ تھی۔

ایک بار وہ علاج کے لیے ماسکو جا چکی تھی۔ ایک بار لندن۔ نرسنگ ہوم بھی اسے اکثر رہا کرتا۔ ڈاکٹر کہتے اسے جگر کی بیماری ہے، وہ کہتی اسے دل کا عارضہ لاحق ہے۔ لندن سے واپسی پر وہ کافی بہتر تھی۔ واپسی پر ڈاکٹر نے بس اتنا کہا تھا۔

”جس دن مرنا ہو اس دن شراب پی لیجئے گا۔“

اس نے مسکرا کر ڈاکٹر کو دیکھا اور اردو میں کہا۔ ”زندگی کا زہری چکی۔ اب موت کا تریاق پیوں گی۔“ جب وہ واپس آئی تو اسے جس نے دیکھا ہی نہ لگا۔ وہ بہت خوب صورت ہو کر آئی ہے۔ آبا اور مدھو اس پر واری صدقے جاتی تھیں۔ اس کے کھانے پینے کا خیال رکھتی تھیں۔ ان کے بچے اپنی ماسکو ”مال سی“ ہی سمجھتے۔

اپنی صحت کو کچھ بحال کر کے وہ سیٹ پر آ گئی۔ اس کی نظر کمال پر رہی تو سسکیاں اس کی نگاہ میں سٹ آئیں۔ ٹرین کی چمک چمک میں جب اس کے پاؤں میں رقعہ رکھا گیا تو وہ پلو سے ڈھانپنے اپنے چہرے کو تاریک ہونے سے نہ روک سکی۔ بے رنگ شلوار قمیض میں ملبوس جب اس نے ”چلو دلدار چلو“ چاند کے بار چلو“ قلمبند کر دیا تو، ایک اب روم میں پھوٹ پھوٹ گر روئی رہی۔

کمال کے بعد ایک شخص آیا تھا اس کی زندگی میں۔ جس سے اسے ان سالوں میں محبت ہو گئی تھی۔ اتنی شدید کہ پھر کسی اور سے نہ ہو سکی۔ جسے دنیا بس اس کے ایک معاشقے کی حیثیت سے جانتی تھی۔ جسے اخباروں نے بڑی غلاطت سے اجمالاً تھا۔ دونوں پر بڑی ہمتیں لگی تھیں کہ ”محبت کی پائیز کی“ قائم نہ رہ سکی۔ کچھ روایات کی پابندیاں تھیں، کچھ دونوں ہی بد نصیب تھے کہ وہ ہونہ ہو سکا جو اس نے چاہا۔ زندگی کہاں سے کہاں آنکلی۔ ایک اس دنیا میں اس کے ہی دل کے لیے کوئی آسرا نہ تھا۔ اس شور، ہنگامے سے بھری پری زندگی میں ایک اسی کی تمنا کی کو کاٹ ڈالنے والا کوئی نہ تھا۔

اس کے دل کو مدح کو جو تیریاں لگیں انہوں نے اسے کہیں کانہ چھوڑا۔

”اس نے دکھوں پر مہر کیوں نہ کیا۔ اپنا راستہ کیوں نہ بدل دیا۔ اس نے خود کو ختم کر لینے کا انتخاب ہی کیوں نہ کیا۔“ یہ سوال، ہمیشہ سوال ہی رہا۔ اس نے ان کے جواب وقت پر چھوڑ دیے۔

\*\*\*

”صبح سے بلوچی یاد آ رہے ہیں۔ ورشا کو ثانی سے اپنے تک کاسلسلہ سناتی رہی۔“ (ڈائری)

وہ اپنی اب تک کی زندگی میں اتنا نہیں تھکی تھی جتنا ”پائیز“ کی شوٹنگ کراتے ہوئے تھکنے لگی تھی۔ سیٹ پر دو تین ڈاکٹر ہمہ وقت موجود رہتے تھے۔ اکثر اسے سہارا دے کر کھڑا کرتا پڑتا۔ اس کے لیے اسکرین میں تبدیلیاں کی گئی۔ گیمبرے کے زاویے بدلے گئے۔ اس کا چہرہ آچکل سے ڈھانپ کر چھپایا گیا۔ کہیں دوسرے شارٹ لیا گیا، کہیں سائڈ پوز۔

اس کا حسن، عمر سے پہلے ڈھل گیا۔ اندر کی وحشت چہرے سے جھلنے لگی۔

اس کی حالت کی وجہ سے شوٹنگ کئی کئی دن تک رک رہی۔ وہ کچھ ٹھیک ہوتی تو پھر سے شوٹنگ شروع ہو جاتی۔ ثقاہت، بیماری، تکلیف کے باوجود وہ پوری



جانفشانی سے کام کرتی۔ تیس، بیس سالوں میں اس نے نوے کے قریب فلمیں کی تھیں۔ ہر فلم کو اس نے آخری فلم سمجھ کر کیا تھا۔ اپنے کام کو وہ عبادت کا درجہ دیتی تھی۔ کام سے خیانت اس کے لیے سب سے بڑا گناہ تھی۔

”کچھ“ جو ہو جانے والا ہے نہ جانے ”ہو“ کیوں نہیں جاتا کہ یہ اذیت ناک انتظار ختم ہو۔ (ڈائری)  
”مدھوبالا بھی مر گئی۔“ مرنے والے سارے اسے ”خوش قسمت“ لگتے۔ خود کو زندہ دیکھ کر وہ آپس بھرتی ہے۔ یہ ستر ہے۔ آہستہ آہستہ وہ اپنی زندگی کے بارے کام سمیٹ رہی تھی۔ سارے تعلق اس نے سمیٹ دیے تھے۔ اب بس خون کے ہی تعلق بچے تھے۔ زندگی میں اس کی ساری دلچسپیاں ختم ہو چکی تھیں۔ لوگوں کے سوال تو ابھی بھی وہیں تھے کہ البتہ اس نے اپنے جواب ”میت“ کے لیے تھے۔

”جتنی شہرت اور جتنا نام آپ کو ملا ہے اس کے بعد آپ کیا سوچتی ہیں؟“  
”سوچتی ہوں، جہاں میں پہنچ چکی ہوں، وہاں سے ایسے ہی چلی جاؤں۔“  
”ذرا وضاحت کیجئے؟“

”یہی کہ جتنی شہرت اور جتنا نام مجھے ملا ہے اس کے بعد مجھے مرجانا چاہیے۔“  
”آپ امر ہونا چاہتی ہیں، جیسے مارلن منرو ایک رات سوئی اور صبح امر ہو گئی؟“

”کاش میں مرجاتی۔ ابھی بتا نہیں اور کتنا درد سہنا ہے۔ شاید میرے اندر کی مینا جینا چاہتی ہے، لیکن وہ اس تن کو آرام پہنچا سکتی ہیں مہن کو نہیں۔“  
”محبت کے بارے میں آپ کا نظریہ؟“

”محبت ہی دنیا میں سب کچھ ہے۔ اس کے بغیر دنیا میں کوئی زندہ نہیں رہ سکتا۔“ (انٹرویو)

محبت کے بغیر دنیا میں کوئی زندہ نہیں رہ سکتا۔ تو پھر وہ کیسے زندہ رہتی۔ مرنے کے لیے اس نے اپنی سانسیں گننا شروع کر دیں۔ جیسے ٹوٹنے سے پہلے ستارہ پوری شان سے چمکتا ہے۔

اس کی زندگی کا محور اب ”پاکیزہ“ ہی تھی۔ اس کی بیماری کی خبر وہاں کی طرح پھیلی ہوئی تھی۔ اکثر جب وہ سیٹ پر کام کرتی تو اسے لگتا کہ بس ہمیں کمرے کے سامنے وہ اپنی آخری سانسیں لے دے گی۔ پھر وہ سوچتی اچھا ہی ہو گا۔ جو زندگی کمرے کے سامنے شروع ہوئی ہے اسے ختم بھی وہیں ہو جانا چاہیے۔

”شام ہوئی اور آج پھر ڈر لگنے لگا ہے رات سے۔“  
شام سے۔ یہ ڈر کیوں ہے؟ (ڈائری)

رات کے سناٹے میں جب وہ اپنے کمرے کی کھڑکی میں کھڑی ہو کر بمبئی کی سڑکوں کو دیکھتی اور غروب ہو چکے سورج کے نشانوں کو تو یہ سوچے بنانہ رہ سکتی کہ اسے اپنا تصور کہاں سے نکالنا شروع کرنا چاہیے۔ زندگی کی بنت میں کون سا گھلے میٹھا تھا کہ ساری زندگی ہی ادھر کی چلی گئی۔ اس نے تو ہمیشہ باکروار رہنا چاہا، اس نے تو ہمیشہ سفید رنگ کو پسند کیا، پھر یہ غلیظ رنگ، یہ گندا، دھبے جیسا رنگ کیسے اس کے سفیدے پر نمودار چلا گیا۔ اسے تو گھر، شوہر اور بچے چاہیے تھے۔ پھر موٹر روگ، روگ کر بمبئی کی سڑکوں پر خون تھوکتا کس وقت اس کے نصیب میں لکھا گیا۔

یہ سن ستر ہے جو ڈھلنے کو ہے۔  
کچھ سال پہلے وہ درشا کے ساتھ ماہلہ شور گئی تھی۔ پندرہ سال پہلے وہ یہاں باجی کے ساتھ آئی تھی۔  
”میں پونا کے حادثے کے بعد امریکوں نہ گئی۔“ (ڈائری)

اس نے وہ ساری جگہیں دیکھیں جہاں وہ باجی کے ساتھ آئی تھی۔ سب کچھ دیا ہی تھا اور پھر بھی سب کچھ کتنا بدل گیا تھا۔ کتنی ہی جگہوں پر رک رک کر وہ آنسو بہاتی رہی۔

”شاید لوگ میرے چہرے سے جان لیتے ہیں کہ اس بے چاری کو بھی پھول چاہئیں۔ ڈھیر سارے پھول دیے اس بوڑھے۔ نے باہر کھڑی اسے دیکھ رہی تھی تو مجھے دیکھ کر خود ہی ہونچے لگا۔“ پھول مانگا؟“ کچھ نہیں بولی تو بھی ہاتھ میں تھما دیے۔“

(ڈائری)

چند سال پہلے وہ اپنی کھولی بھی گئی تھی۔ وہاں بھی بیٹھ کر سستی رہی تھی۔ اس نے بمبئی کی ان سب سڑکوں پر نظریں دوڑائی تھیں، جن پر وہ ہمہ جہیں یا فون کر گھر، ماگرتی تھی۔ جب دور دور تک ”مینا کمار“ دکھائی نہیں دیتی تھی۔

”کس نے سوچا تھا کہ روپ تارا اسٹوڈیو میں کھیلنے والی بچی اتنی بڑی اداکار بن جائے گی۔“ وجے بھٹ نے ایک دن ایسے ہی کہا۔

”ہمہ یون نہ کہیں۔ ٹریڈی کو مین کہیں۔“ وہ تلخی سے، ہنسی تو وہ خاموش ہو گئے۔

ایک دن نرگس نے بھی کہا تھا۔ ”منجوا! تم آزاد ہو، مگر ایسی بھی آزادی کس کام کی کہ خود کو ہی مار ڈالو۔“ سب ہی کچھ نہ کچھ کہتے تھے، لیکن وہ کسی سے کہہ نہ سکی کہ جو محبت اس کی مٹھی میں سیپ کے موتی کی طرح چڑی رہی تھی، اب یوں پتھر ہو گئی ہے تو اس سے جیا نہیں جاتا۔ روگ صرف محبت ہی نہیں تھا، لیکن ابتدا اسی سے ہوئی۔ بچپن سے محبت کا روگ، سیلیوں سنگ کھیل نہ سکنے کا روگ، ماں کے چلے جانے کا، باجی کے کمرے سے نکل دینے کا، گڑیا کے چھن جانے کا، گھر کا، بچوں کا اور سب سے بڑھ کر۔ ندی سے نالہ بن جانے کا۔  
”سن اکثر تو دب چکا ہے۔“

\*\*\*

”اگر کوئی مجھ سے یہ پوچھے کہ مجھے کیا پسند ہے تو میں کہوں گی۔“ مجھے موت پسند“ ہے۔ (ڈائری)  
وہ آنکھیں موندے بیڈ پر لیٹی تھی۔ اس پاس دھواں سا پھیلا تھا۔

وہ پاکیزہ کی شوٹنگ مکمل کر چکی تھی۔ اسے یہ چاہ نہیں تھی کہ وہ خود کو آسمان پر بلند کر دیکھے۔ جو چیزیں لوگ انگلیوں پر گنتے، وہ انہیں غفلت میں بھی نہیں گنتی تھی۔ وہ لینڈ مارک فلیٹ میں رہتی تھی۔ آبا اور مدھواس کے ساتھ تھیں۔ وہ روز تاش کی بازیاں لگاتے

اور شور مچا کرتے۔ پھر بھی زندگی کا سناٹا موت کی چاپ کو نہ روک پایا۔ کبھی اس نے اپنی غلطیوں کا لائف ریکارڈ اپنی ہی آواز میں ریکارڈ کروایا تھا۔ اکثر وہ اسے سنتی۔ وہ روز سچ اٹھتی اور سورج کو دیکھتی۔ زندگی کے اس مقام پر اگر جوانی کو یوں اندھیروں میں گر کر اس نے جانا کہ سورج کی پہلی کرن کی تازگی کیسی ہوتی ہے۔ نئے سال کا سورج بھی ظلوں ہو چکا تھا۔ اپنے کمرے کی کھڑکی میں بالکنی سے اگتے سورج کو دیکھ کر وہ ہنسنوں کو دیکھ کر بے اختیار کہتی۔

”آہ! میں زندہ رہنا چاہتی ہوں۔ میں مرنا نہیں چاہتی مدھواس مجھے بچالیں۔“

”کس نے کہا تم مر رہی ہو۔ دیکھو تمہاری زندگی کے لیے کیسے رو رو کر دعا میں کرتی ہوں۔“ آپا تریپ جاتیں۔

”میں نے کبھی رو رو کر اپنی موت کی دعائیں ہی ہیں

انکارہ عمران ڈائجسٹ کی طرف سے  
ہر مہینوں کے لیے خصوصی سورت ناول

لیکھی شعل

مکمل ناول کتابی شکل میں شائع ہو گیا ہے

مکتبہ عمران ڈائجسٹ

قیمت - 500/- روپے

فون نمبر: 32735021

37، بازار کلاں



عفت سحر طاهر

## سحر طاهر

وہ اس کی سماعت میں زہر انداز کر کرے سے ملحق بالکنی میں نکل گیا تھا۔ تین گنگ سی بیٹھی رہ گئی۔ لمحہ بھر کو دروازہ کھل کر بند ہوا تو سر ہوا کا جھونکا اس کے وجود سے ٹکرایا۔ وہ جھرجھری لے کر حواس میں آئی۔ تب اسے احساس ہوا کہ یہ سب کیا ہو رہا تھا۔ وہ بے یقین ہوئی۔

”یعنی جو اس کا تھا وہ ابھی بھی اسی کا تھا تو میں۔۔۔ میرا کیا بدل ہے اس کھیل میں۔“ اسے شدید غصے نے اپنی لپیٹ میں لیا۔ وہ ایک جھٹکے سے اٹھی۔ اور اپنی سینٹل کو نظر انداز کرتی وہ نکلے پاؤں ہی بالکنی میں نکل آئی تو ٹھنڈے فرش نے اس کے پیروں میں کرنت سا دوڑا دیا۔ باہر وہ دونوں ہاتھ رینگ پر جمائے دوڑ سڑک پر نظر جمائے موسم کی انتہا سے بے خبر کھڑا تھا۔ تین کا سر گھوما۔ سر ہوا نے اس کے وجود میں پھریری سی دوڑادی۔ ٹھنڈے پاؤں میں گھسنے لگی تھی۔

”طلال۔۔۔!“ اس نے بے اختیار پکارا تو انداز میں ایک شکوے اور احتجاج کی سی کیفیت تھی۔ وہ چونک کر پلٹا۔ غیر متوقع طور پر تین کو دہاں دیکھ کر اس کی آنکھوں میں ناگواری سی اتر آئی۔

”تم یہاں کیوں آئی ہو؟“

باسوین قنبر



”میں بھی تم سے یہی سوال پوچھنے آئی ہوں طلال۔“ اس نے دونوں بازو سینے پر لپیٹ کر سر دی سے کپکپاتے جسم کو گرم رکھنے کی کوشش کی۔

”اس وقت میرا داغ خراب ہو رہا ہے تڑپ میں نہیں چاہتا کہ میرے منہ سے کچھ غلط بات نکلے۔ تم جاؤ اندر۔“ وہ بہت ضبط سے بولا۔ مگر تڑپیں کا کم از کم اس وقت تو ہتھیرا ڈالنے کا کوئی ارادہ نہ تھا۔

”تو پہلے کون سا اچھا سلوک کر رہے ہو۔ میں اندر تب ہی جاؤں گی طلال جب تم اپنے اس رویے کی وضاحت کرو گے۔“ طلال کی آنکھوں میں ضبط کی لالی اترنے لگی۔ اس نے آگے بڑھ کر تڑپیں کا بازو تھاما تو گرفت بے رحمان تھی۔

”مجھ سے اس قدر حق سے بات مت کرنا کبھی۔ سمجھیں۔“ یہ کہتے ہوئے اس کے بازو کو جھٹکا دیا تو دور کی شدت سے وہ کراہ اٹھی۔ ایک جھٹکے سے طلال کا ہاتھ اپنے بازو پر سے ہٹا یا۔

”نی ہیو بلو طلال۔ میں ایسے رویے کی عادی نہیں ہوں۔“ تڑپیں کون سا غصے میں اس سے کم تھی۔ چیخ کر بولی۔ وہ پلٹ کر پھر سے رینگ کی طرف چلا گیا۔

”تو اب ہو جاؤ عادی۔ کیونکہ میں ایسا ہی ہوں۔“ اس کا لہجہ سرد تھا۔

تڑپیں نے خالی نظروں سے اس کی پشت کو دیکھا اور تاسف سے بولی۔ ”اس دوستی کا خیال کرو جو ہمارے بیچ تھی طلال۔ اور اپنا رویہ دیکھو۔ مجھ سے شادی کرنا تمہارا فیصلہ تھا۔ میرا نہیں۔“

”مروتہ تم بھی رہی تھیں اس شادی کے لیے۔“ طلال کا دار کاری تھا۔ تڑپیں ہلکا اٹھی۔

”پرو پونل تم نے بھیجا تھا طلال۔ ان فیکٹ، ریکورڈ کی تھی تم نے مگر تمہیں یاد ہو تو۔“

”اندرو چلی جاؤ تڑپیں۔“ وہ سرد مہری کی آخری حد پر تھا۔

”چلی جاؤں۔“ اور تم اس گھٹیا لڑکی یا دونوں میں سلگ سلگ کر رات بچاؤ۔ وہ لڑکی جس نے نہ اپنے گھروالوں کی عزت کا خیال کیا اور نہ تمہاری۔“ وہ پھٹ پڑی۔

طلال کرٹ کھا کر پٹا۔ وہ نی ٹولی دلہن ہونے کے احساس سے ماورا ہنس اور زلت کے حصار میں گھری اس کے مقابل تھی۔

”مجھے بے زبان جانور سمجھ کر ٹرٹ مت کرنا طلال۔“ وہ انگشت شہادت اٹھا کر بولی تو اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ مگر لہجہ قطع تھا پھر وہ پلٹی اور جھٹکے سے دروازہ کھول کر اندر چلی گئی۔ طلال بے بسی کے احساس میں گھرا وہیں کھڑا گیا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے سے مہوا اور مہوا کا ہاتھ تھا۔ ہونے موجد کے چرے جھٹتے تو اسے پور پور اپنے لیے جی تڑپیں دکھائی دیتی تھیں۔ آج کی رات کئی دلوں کے لیے بوجھل اور قاتل تھی۔ لہجہ بہ لہجہ جان نکالنے والی۔

☆ ☆ ☆

مہوا نے تڑپیں کی رخصتی سے پہلے ہی خود کو کمرے میں بند کر لیا۔ جان تھی جو آہستہ آہستہ بدن سے نکلی تھی آج۔ طلال پر اپنی طمانیت جتانے کے لیے وہ اپنی ہمت سے بڑھ کر ہمت دکھا آئی تھی۔ اس کی ہر خوش فہمی کو ختم کرنے کے لیے اپنے دل پر آج پیر رکھ دیا تھا مہوا نے۔

اور دل پر پاؤں رکھنے کی تکلیف وہی جانتے ہیں جو اس قیامت خیز کرب سے گزرتے ہیں۔ اپنی خواہش کے آگے خود پورا بننا ہر کسی کو نہیں آتا۔ مہوا یہی کرب سے گزری۔ اپنے دل کی خواہش کے آگے دیوار بنی تو تھی مگر اب منہ حال ہو گئی تھی۔ وہ رونا نہیں چاہتی تھی۔ مگر آنسو رکتے ہی نہ تھے۔ پچھلے تین دنوں سے وہ بس ”آخری“

آنسو بہا رہی تھی۔ مگر ان کمنوس کی آخر تھی نہ انت۔

بھلا محبت کی راہ سے پلٹنے والے کی آنکھ بھی سوکتی ہے اور اگر زبردستی اس راہ سے پلٹا گیا ہو تو پھر یہ آنکھیں ساون رو یا کرتی ہیں۔ مہوا بھی اسی کیفیت میں تھی۔ اسے طلال کی آخری نگاہ یاد تھی۔ اسے موجد کے ہمراہ دیکھ کر بے یقینی کے کرب و بلا بھری نگاہ۔

آہ۔ وہ نگاہ جو مہوا کی طرف اٹھتی تو اس میں محبتوں کے گلاب کھلتے دیکھائی دیتے تھے۔ آج وہ نظر پر آئی ہوئی۔ مہوا کیسے خود کو گھسیٹ کر تائی جان کی نشست تک گئی یہ اس کا دل ہی جانتا تھا۔

وہ رونا نہیں چاہتی تھی۔ وہ جانتی تھی۔ برے حالات ہی میں سہی مگر اس نے خود کو کسی کے نکاح میں سو نہ دیا تھا۔ کسی بد دیانتی سے بچنے کے لیے اللہ کو گواہ بنا کر اس نے دل سے نیر آندہ کے لیے ہابی بھری تھی۔ تو اب طلال کی یاد میں رونا کیا نغمہ دیا کرتی۔ آنسوؤں کو پوچھتی تو یاد آتا کہ طلال تو اب ہر وقت نظر آیا کرے گا۔ تڑپیں کے شوہر کے روپ میں۔ اور یہ بات مکر مار ڈالتی تھی۔ وہ چار شادیاں کر لیتا مگر مہوا کی نظروں سے دور رہتا تو وہ حالات سے سمجھو نا کرتی۔ مگر طلال نے تو فیصلہ ہی عجیب کیا تھا۔ اور مہوا سمجھ سکتی تھی کہ طلال کا یہ غلط فیصلہ آندہ ہی ہاؤس میں کیسے طوفان اٹھانے والا تھا۔ دھتے سر کو دونوں ہاتھوں میں تھا۔ وہ منہ حال سی تکیے پر او نہی گر کر سکنے لگی۔

☆ ☆ ☆

سومیہ کی بے یقینی کی کوئی حد نہ تھی۔ وہ اس کے لبوں سے اس کا اعتراف جرم سن کر بھی بے یقینی نظروں سے سامنے بیٹھے میسر کو دیکھ رہی تھی۔ کافی کے کپ کو اس کے سامنے کھکا تا وہ جیسے روز مہ کے مطمئن انداز میں تھا۔

”آج بہت سردی ہے۔ کافی بیو ٹھنڈی ہو رہی ہے۔“

سومیہ نے آہستہ سے پلکیں جھپکائیں۔ گویا اس خواب کو توڑنے کی سعی کی۔ مگر یہ خواب نہیں تھا اور ویسے بھی خواب ہمیشہ وہی ٹوٹا کرتے ہیں جن کو انسان سینٹ سینٹ کر رکھتا ہے۔ جنہیں وہ پورا کرنا چاہتا ہے۔

”یہ تم نے کیا کیا میری؟ اس کی تو شادی ہونے والی تھی۔“

”ہاں۔ تو؟ ہو گئی نا نکاح بھی تو شادی ہی ہوتا ہے۔“ وہ مطمئن تھا۔ سومیہ کا دل کسی نے مٹھی میں کر لیا۔ اس کی آنکھیں ضبط کی کوشش میں لگائی ہوئے لگیں۔

”بہت ظالم انسان ہو نیو۔ آندہ زنی نکلے تم بھی۔“

”آندہ ز سے آندہ بن کر ہی ملنا پڑا اور کوئی آپشن نہیں تھا۔ میرے پاس“ وہ پُر سکون انداز میں بولا۔ تو سومیہ تسک کر بولی۔

”اور وہ۔ ایک کمزور اور بے بس لڑکی کے خواب توڑنا۔ اس کے بارے میں کیا خیال ہے تمہارا؟“

”اور اس کمزور شخص کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے جو سچائی کا پتا لگانے کے لیے چند دن اسٹینڈ نہیں لے سکا مہوا کے لیے۔ اسی طے شدہ تاریخ پر اسی کی کزن کے لیے دو لہا بن کے گیا لو کا۔“ ططر سے کہتا آخر میں وہ بدردیا۔ پھر اسے گھور کر دیکھا۔ ”ایک میں ہی نہیں یہاں اور بھی بہت ہیں، دوسروں کا دل اور خواب توڑنے والے۔ تمہیں صرف میں ہی نظر آتا ہوں۔“

”ہاں۔“ سومیہ نے متاسفانہ کھری سانس لی۔ ”مجھے تو ہمیشہ تم ہی نظر آئے۔ مگر تمہیں کبھی میں نظر نہیں آئی۔“



”تم میری سب سے اچھی دوست ہو۔ سو“ وہ سنجیدہ ہو گیا۔  
 سومیر نے لب کھلے ”بس کرو میرے۔ مت دو جھوٹی دوستی کا قریب مجھے۔“  
 ”ایک تو تم لوں کیاں جذباتی بہت ہوتی ہو۔“

”تم نے انتقام لینے کے لیے ایک لڑکی کا سارا لیا میر۔“ وہ اسے شرم دلانے والے انداز میں بولی۔  
 ”تو کون سا جرم کر دیا میں نے۔ آرام سے نکاح پر دھوا کر بخیر و عافیت گھر چھوڑا ہے۔ آئندہ مہواہ کو۔“ وہ تنک کر بولا۔

سومیر نے مشکل ضبط کر کے اسے دیکھا۔ ”تمہیں ذرا بھی احساس نہیں کہ تم کسی بے گناہ لڑکی کے ساتھ کیا کر چکے ہو؟“

”بے گناہ بے گناہ۔ کیا رٹ لگا رکھی ہے تم نے؟ میں میری ماں، میرا باپ۔ ہم میں سے کون قصور وار تھا؟ مگر سزا ہم سب نے بھگتی۔ اب ان کی باری ہے۔ جیسا مجھے صحیح لگے گا۔ میں ویسا ہی کروں گا۔“ وہ خشک و متدلب و بچے میں بولا تو سومیر لب پکچلتی چہرہ موڑ کر رستوران میں دیکھنے لگی۔ اس کا رونے کو دل چاہ رہا تھا۔ کتنی آسانی سے میرے لئے ہے اپنی زندگی سے الگ کر دیا تھا۔ اس کی اچانک خاموشی نے شاید میر کو احساس دلایا تو معذرت خواہانہ انداز میں بولا۔

”آئی ایم سوری سومیر۔ اگر تمہارا دل دکھا ہے تو۔۔۔ مگر میں کیا کروں۔۔۔ مجھے اپنی پہچان چاہیے۔ اور وہ میں کسی بھی صورت حاصل کر کے رہوں گا۔ میں موجد آئنڈی جیسا خوش قسمت نہیں ہوں۔ چودہ سال بعد اس گھر میں واپسی پر جس کا والدانا استقبال کیا گیا ہے۔

مجھے تو قار آئنڈی کا بیٹا بھی نہیں سمجھا جاتا۔ میری پہچان صرف زر نگار ہے۔ اور تمہیں پتا ہے۔۔۔ مہواہ آئنڈی نے بھی مجھے میری ماں کے نام کا طعنہ دیا۔ یعنی ان سب کے دل ایک ہی ہیں۔“ اس کی آنکھیں لال ہونے لگیں۔ وہ ضبط کی انتہا پر تھا۔

”مگر یہ نکاح تمہارے مسئلے کا حل تو نہیں ہے میرا۔“ سومیر نے اسے ٹوکا۔  
 ”نہ ہو۔۔۔ مگر مجھے ان کی تڑپ دیکھ کر خوش ہو لینے دو سومیر۔ ان لوگوں کو بھی پتا چلے کہ دل کیسے چھلتی ہوتا ہے۔“

”تمہیں سمجھانا بے سود ہے۔“ سومیر نے سر جھٹکا۔ درحقیقت وہ اندر سے لمول و پڑھ رہا تھا۔  
 ”تمہیں سمجھانا بے سود ہے۔“ سومیر نے سر جھٹکا۔ درحقیقت وہ اندر سے لمول و پڑھ رہا تھا۔  
 کے ساتھ ساتھ میر آئنڈی نے جانتے بوجھے سومیر کا دل بھی توڑ دیا تھا۔

\*\*\*

تر زمین نے رات جیسے تیسے کر کے آدھی سوئی آدھی جاگی کیفیت میں گزار دی تھی۔ رات طلال کمرے میں آیا بھی تو اس کی طرف دیکھے بغیر بستر کے کونے پر پڑ کر کھیل لپٹے سو گیا۔ تر زمین کا جی چاہا اس تنگ دل شخص کو پکڑ کر چھوڑ ڈالے۔ جو مہواہ کے کیے کا بدلہ اس سے لے رہا تھا۔ دروازہ کھٹکھٹانے کی تیز آواز دہرائی تو آنکھیں کھل جانے پر بھی نئے ماحول سے واقف ہونے میں اسے چند لمحے لگے۔ پھر وہ ایک جھٹکے سے اٹھی۔ طلال شاید ہاتھ روم میں تھا۔ اس نے دیکھے سر کو ہاتھ سے دبایا۔ رات کی فلم پھر سے آنکھوں کے سامنے چلنے لگی تو اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔

وہ کیا بد عاقبتی طلال اور مہواہ کو۔۔۔ بد دعا تو اسے لگ گئی تھی کسی کی۔ من کی مراد یا کبھی جو نامراد رہی تھی۔ کوئی دروازہ کھٹکھٹا کر مایوس ہو کر لوٹ گیا تھا یا شاید انہیں جگانا ہی مقصود تھا۔ ہاتھ روم کا دروازہ کھلا اور ہاتھ گاؤں میں

ملبوس طلال باہر نکلا۔ تو لیے سے رگڑ کر بال خشک کرتا وہ جیسے کمرے میں بالکل اکیلا تھا۔ تر زمین کا دل غصے سے بھرنے لگا۔

”تمہیں احساس ہے طلال کہ تم کیا کر رہے ہو؟“ بستر سے اتر کر چیلوں میں مہندی کے نقش و نگار سے سجے پاؤں ڈالتی وہ تلخی سے مخاطب ہوئی۔ کمرے کی پشت پر تو لیا ڈالتا وہ ایک نظر اس پر ڈال کر وارڈ روب کی طرف بڑھا اور اپنے کپڑے نکالنے لگا۔ خفت کے مارے تر زمین کی پیشانی تپ اٹھی۔

”بڑے افسوس کی بات ہے طلال! تم اپنی زندگی کے خوب صورت پل اس لڑکی کے لیے برباد کر رہے ہو جسے تمہاری بربادی سے کوئی فرق ہی نہیں پڑتا۔“

تر زمین کی بات سن کر طلال کے ہاتھ لمحہ بھر کو ٹھٹھکے پھر وہ تیز لہجے میں بولا۔ ”تیار ہو کر باہر جاؤ۔ دوبار ناشتے کے لیے ملاوا آچکا ہے۔“ مگر تر زمین اس موقع کو ہاتھ سے جانے نہیں دینا چاہتی تھی۔ آج دلہے کی تقریب تھی۔ رات تک وہ دوبارہ ہاتھ آنے والا نہیں تھا۔

”تم نے مجھے خود پر پوز کیا تھا طلال۔۔۔“ وہ اس کے سامنے آکر احتجاجاً بولنا شروع ہوئی۔ ”میں یا میرے گھر والے نہیں تو نہیں کر رہے تھے تمہاری اس شادی کے لیے۔ پھر تم یہ سلوک کیوں کر رہے ہو میرے ساتھ؟“

”ایسے تو نہیں چھوڑوں گا میں بھی اسے۔ میری بیویا تباہ و برباد کر کے وہ خود رنگ رلیاں مناتی پھرے۔ ہنس۔ ابھی اس نے جانا ہی نہیں مجھے۔“ وہ خنجر سے بولتا تو بے یقینی سے تر زمین کی آنکھیں پھیلیں۔

”تم نے مہواہ سے بدلہ لینے کے لیے مجھ سے شادی کی ہے یا مجھ سے بدلہ لینے کے لیے۔“ وہ جھجھکی بولی۔  
 ”میں ایک باب۔ بس ایک بار اس کے منہ سے ساری حقیقت سنا چاہتا ہوں۔“ طلال کے دل میں تو بھانپ

جل رہے تھے۔ جو کہی پل چین نہ آنے دیتے تھے۔ مگر تر زمین کو شدید جھکا لگا۔ وہ تو سمجھی تھی کہ طلال کی مہواہ کے ساتھ شادی نہیں ہوئی۔ بات تمہ۔ مگر یہاں تو وہ گڑے مرنے لگا تھا۔

”اس نے تمہیں چھوڑ دیا ہے طلال۔ اور کیا حقیقت جانتا باقی رہ گئی ہے؟“ وہ بے بسی سے دہی آواز میں چلا کر بولی۔

”تم اس بحث میں مت پڑو۔ تمہیں مجھ سے شادی کرنے کا شوق تھا نا۔ تو کر لی نا۔ اب جان چھوڑو۔“ حد درجہ اکٹا کر کے الفاظ نے تر زمین کو ساکت کر دیا۔

\*\*\*

”آئی۔۔۔ اللہ کا واسطہ ہے اب بس کروں۔ کیوں اپنی برواشت آزماری ہیں۔“ بخار میں پھٹکتی مہواہ کو بیڑھال سا اٹھ کر لیمہ کے فنکشن کے کپڑے اٹھاتے دیکھ کر ملاحہ کو رونا آگیا تھا اور وہ بھی پڑی۔ مہواہ نے اسے دیکھ کر حوصلے سے کہا۔

”اگر اب دنیا کا سامنا کرنے کی ہمت نہ کی تو آئندہ بھی نہیں کر پاؤں گی ملاحہ۔ طلال نے کیا کیا میرے ساتھ؟ اس نے بھی اتنا ہی دکھ دیا جتنا میر آئنڈی نے۔ جلی تو میں نا، راکھ تو میں ہوئی نا۔“ وہ آنسو ضبط کر رہی تھی۔ مگر آواز بھڑکی۔

”میں کہہ دوں گی، آپ کی طبیعت خراب ہے۔“ ملاحہ سے بہن کا دکھ برواشت کرنا مشکل ہو رہا تھا۔ مہواہ نے گہری سانس بھرے ہوئے اپنے شکستہ اعصاب کو سمیٹا اور نرمی سے بولی۔

”مشکل وقت تو۔۔۔ کل گزر گیا ملاحہ۔ اب مجھے ٹوٹے، ٹکڑے اور خود کو سمیٹنے کی عادت ہونے دو پلینز مجھے حوصلہ دو۔ میری ہمت توڑو۔“ اس کی آنکھیں شدت ضبط سے گلابی ہو رہی تھیں۔ ملاحہ کا جی چاہا، بہن کے

گلے لگ کر دھاڑیں مار کر روئے۔ اپنا دلہہ تو انساں برداشت کر لیتا ہے مگر اپنے پیاروں کا دکھ لمحہ بہ لمحہ مارتا ہے۔ وہ کپڑے تبدیل کرنے چلی گئی۔ تائی جان تو کل سے لوگوں کے سوالات کے جواب دیتی ادھ موٹی ہو رہی تھیں۔ ساتھ چچی اندر ہی اندر اس صورت حال پر تلملارہی تھیں۔ مگر وہی سب کو فرضی ایکسی ڈنٹ اور دماغی انتشار کا بہانہ۔

”بھالی...؟“ تیار ہو کر اپنے کمرے سے نکلتی مہو کو دیکھ کر ساتھ چچی صدیقہ بیگم کی طرف لپکیں ”حد ہے بھالی! اب یہ مہو ویسہ میں بھی جائے گی؟“

تائی جان کا سر گھوما۔ ناگواری سے ساتھ چچی کو دیکھا۔ ”کیا مطلب ہے تمہارا؟“

ان کا انداز دیکھ کر چچی جان فوراً ”نبھیلیں۔“ ”میرا مطلب تھا بھالی۔۔۔ کل سے بے سدھ پڑی بخار میں پھنک رہی تھی بچی۔ اور اب اٹھ کر چل دی۔ اسی کے بھلے کو کہہ رہی ہوں۔ یہاں کون سا کسی نے اعتراض کرنا ہے اس کے نہ جانے پر۔“

انہوں نے لب و لہجے کو شیرے میں ڈوبایا۔ مگر تائی جان بے وقوف نہیں تھیں، اچھی طرح ان کا مطلب سمجھیں۔ اور انہوں نے بہتر سمجھا کہ آج ہی ساتھ چچی کے کان کھول دیں۔

”طبیعت ٹھیک ہے تو ہی جارہی ہے نا۔ اور ایک بات یاد رکھ لو ساتھ! تم لوگوں نے طلال اور تزئین کا رشتہ کر کے مہو کے لیے اس گھر میں مستقل آنا نشت کھڑی کر دی ہے۔ اب مہو جس طرح اپنی زندگی کو لے کر چلنا چاہتی ہے اسے چلے دو۔ تم سب اپنے حالات پر دھیان دو۔ اگر اس نے دنیا کا سامنا کرنے کی ہمت کر لی ہے تو اسے کوئی ٹوٹکے۔ طلال سے رشتہ مہو نے اپنی مرضی سے ختم کیا تھا یہ بات سب یاد رکھیں۔“

اس قدر صاف جواب پر چچی جان اپنا سامنا نہ کر رہ گئیں۔ مگر یہ ضرور ہوا کہ اس گھر میں اب مہو کے لیے اپنی مرضی سے زندگی گزارنے کا ایک اصول وضع ہو گیا تھا۔ اس پر اعتراض کا حق کسی کو نہیں تھا۔



”مہو نہ آئے ہمارے ویسہ میں امی۔ کل بھی بے شرموں کی طرح جارات اٹینڈ کرنے چلی آئی تھی۔“ ساتھ چچی نے تو ناشتا سمجھتے وقت یونہی تزئین کا حال پوچھ لیا تھا فون پر۔ مگر ادھر سے تو بہت کڑے انداز میں فیصلہ صادر کر دیا گیا۔ تزئین کو امید تھی کہ آج مہو کی شکل نظر نہیں آئے گی۔ اپنی بے قدری کا دکھ اپنی جگہ مگر طلال کو مہو دکھائی نہ دے۔ کہیں وہ طلال کو اپنی مظلومیت کی کہانی سنانی نہ بیٹھ جائے۔ اسی لیے اس نے مہو کو ساتھ لانے سے منع کر دیا تھا۔

گلابی رنگ کی بھاری نفیس کا دانی پشوا ز اور میچنگ سونے کے زیورات میں آج بھی تزئین کا روپ کمال کا تھا۔ مگر

دیکھنے والی آنکھ طلال کی ہوتی تو بات تھی۔۔۔ تزئین کا دل طلال کی ایک بے اختیار نظر کے لیے ہکتا رہا۔ مگر شادی بال تک گاڑی ڈرائیو کرتا وہ سپاٹ تاثرات لیے دینا اسکرین کے پار دیکھتا رہا۔ حالانکہ گاڑی میں صرف وہی دونوں تھے مگر طلال کے دل پر تو مہو نامی چیزیں کا سایہ پڑ چکا تھا۔ تزئین کی زبان تک کئی الفاظ کئی شکوے آئے مگر عزت نفس نے زبان پر تالا لگا دیا۔ شادی ہال کے قریب پہنچتے ہی طلال کا موبائل بج اٹھا۔ اس نے پارکنگ میں گاڑی روک کر فون سنا۔ دوسری طرف اس کی ماما لکی بوالوں کے پہنچ جانے کی اطلاع دے رہی تھیں۔

”پہنچ گئے ہیں ماما۔ پارکنگ میں ہیں۔ آکر لے جائیں اسے۔“ وہ بڑے آکتائے ہوئے انداز میں بولا تو تزئین اپنی جگہ تلملارہ گئی۔ صاف ظاہر ہے کہ اسی کی بات ہو رہی تھی۔ پھر شاید اس کی ماما نے سمجھایا بھجایا تب وہ موبائل بند کر کے جیب میں ڈالتا اچھٹی نگاہ تزئین پر ڈال کر بولا۔

”تزوینچے۔ فوج تو نہیں آئے گی اب نہیں لیتے۔“  
 ”میرے ساتھ ایسا سلوک کرو گے تو ایسا ہی لو کہ کائنات میں اٹھنا کرو گے طلال۔ برے رویے محبت میں برداشت ہوتے ہیں نفرت میں نہیں۔“ تزوین کی برداشت خواب دے گئی تو وہ غصے سے بولی۔  
 طلال منٹوں میں ٹھنڈا پڑا۔ اندر اس کی بھی ٹھنڈی عزت کا سوال پڑا تھا وہ کیسے بھول گیا وہ اس کے ساتھ خاموشی سے بیٹھیاں چڑھنے لگا۔ تو سامنے سے اس کی کرنز اور ماما آگئیں۔ لڑکیاں شوق سے تزوین کی تعریفیں کرتی اسے لے کر اندر کی طرف بڑھیں اور پیچھے طلال کو سرزنش کرتی ماما۔  
 ”ایک تو تزوین کو اتنی لپٹ پار لے چھوڑا۔ سارے مہمان آگئے اور دو لہا دہن اب پہنچ رہے ہیں۔ اوپر سے تم نے منہ بھی بنایا ہوا ہے۔ بس کرو اب یہ جذباتیت۔ تزوین بے قصور ہے طلال۔ جس کا قصور ہے وہ تو مزے سے پورا فنکشن اٹینڈ کر رہی ہے نہ جانے کیا بات تھی۔ نہیں تو یہی کہ لڑکی مینٹلی ڈسٹربڈ (ذہنی طور پر پریشان) ہے۔“

انہوں نے تو اپنی طرف سے اس کا دل تزوین کے لیے صاف کرنے کی کوشش کی۔ مگر اس کا ذہن ایک ہی نقطے پر اٹک گیا۔ (موت بھی آئی ہے) ایک میل میں وہ ساری باتیں بھولا تھا۔ چند قدم آگے بڑھ کر وہ تزوین کا ہم قدم ہوا۔ دنیا داری بھی کوئی چیز تھی۔ مودی میگزین ڈھنڈیاں اور پرائیویٹ جہاز۔ بارات کے ساتھ کسی کو نہیں لے جایا گیا تھا اسی لیے دلہن دیکھنے کا سب کا شوق اور تجسس فطری تھا۔ طلال نے اپنی نگاہ اس جہاز پر ڈال کر گویا کسی کو ڈھونڈنے کی سعی کی۔ (مگر مرنی سے چھڑ جانے۔ جان بوجھ کر چھپ جانے والے پونی ٹھوڑی مل جایا کرتے ہیں۔) اس کی نظر بھی ناکام لوٹی تھی۔

اور وہاں سے بہت دور ایک کونے میں تائی جان اور ملاح کے ساتھ جڑ بڑی بیٹی مہوا نے دلہن آگئی کا جملہ سنتے ہی دل رکتا محسوس کیا۔ اس نے زبردستی چہرے کے ساتھ ملاح کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں دبوچ لیا۔ ان کی فیملی جس دل کے ساتھ اس فنکشن میں شریک تھی ان کا دل ہی جانتا تھا۔ ملاح نے تم آنکھوں سے بہن کو دیکھتے ہوئے دوسرے ہاتھ سے اس کا ہاتھ تھپتھا کر گویا اسے حوصلہ دیا۔ وہ پونی چہرہ موڑے بیٹھی رہی۔ یہاں تک کہ نیا شادی شدہ جوڑا جا کر اسٹیج پر بیٹھ گیا۔ تو نوٹیشن شروع ہو گیا تھا۔ تائی جان اور ملاح میں سے کوئی بھی اسٹیج پر جانے کے لیے نہیں اٹھا۔ اور نہ ہی کسی نے انہیں بلانے کی زحمت کی۔ ماحول پر ایک عجیب سی مرنی چھائی ہوئی تھی۔ اور جاننے والے جانتے تھے کہ طلال کی ہال میں پھرتی متلاشی آنکھیں کس کو ڈھونڈ رہی ہیں۔ طلال کی زرتاشہ بھالی کو بھی ایسے ہی موقع کی تلاش تھی۔ انہوں نے عقابلی نگاہوں سے ایک طرف میز پر بیٹھی مہوا کو ڈھونڈ ہی لیا۔ اور تیزی سے اس کی طرف آئیں۔

”ارے واہ۔ واہ۔ واہ اے سر پرانے۔ نائس ٹو سی یو مہوا۔“ وہ یوں زبردستی مہوا سے گلے۔ ملیں جیسے پتا

نہیں اس سے کتنے اچھے تعلقات رہے ہوں۔ حالانکہ انہوں نے طلال اور مہوا کی ملٹنی کے دوران کبھی اس سے ہنس کر بات بھی نہیں کی تھی۔ مہوا زبردستی مسکرائی۔ تائی جان کا رنگ بھی بدلا۔ یہ ان کا سہرہ تھا جو سارہ چچی کی قسمت میں چلا گیا تھا۔ زرتاشہ بھی وہیں ایک کرسی پر براجمان ہو گئیں۔  
 ”کیسی ہواب؟“ ان کی پوری توجہ مہوا کی طرف تھی۔ صاف لگ رہا تھا کہ وہ اس پوٹلی میں سے کچھ نہ کچھ نکال کر ہی رہیں گی۔ مہوا نے ہلکا سا کھنکھار کر گلا صاف کیا اور بہت ہمت سے ان کی طرف دیکھ کر ہلکا سا مسکرائی۔  
 ”اب ٹھیک ہوں۔“

”تو پھر اتنا غلط فیصلہ کیوں کیا مہو۔ طلال کا بھی نہیں سوچا تم نے۔ ہم تو اس گھر میں تمہارے منتظر تھے۔“ وہ یقیناً ”بڑی اداکارہ“ تھیں۔ مہوا نے بڑی سرعت سے محسوس کیا۔ اور اس سے پہلے کہ اتنی ہمدردی پا کر تائی جان

ان کے سامنے جذباتی ہو کر طلال کے کیے کو غلط قرار دیتیں مہوا نے ہلکے ہلکے انداز میں جواب دیا۔  
 ”ساری قسمت کی بات ہے بھالی۔ اس گھر میں تزوین کا آنا لکھا تھا۔“  
 ”پھر بھی۔۔۔ چلو تمہاری تو ماما کہ ذہنی کیفیت کچھ ٹھیک نہیں تھی مگر طلال کو کیا ہوا۔ اسی گھر کی لڑکی کو شادی کے لیے چن لیا۔ کچھ تو خیال کرتا۔“ وہ بدستور کچھ کھوجنے کی کوشش میں تھیں۔  
 ”ارررر۔۔۔ تم یہاں ہو اور وہاں اسٹیج پر دولہے کی بھابی کی ڈھنڈیاں بجی ہوئی ہے۔“ سارہ چچی نے اپنی دانست میں تو چھپایا ہی مارا اور مصنوعی حیرت سے زرتاشہ کو دیکھا۔ وہ منہ بنا کر وہاں سے اٹھیں۔ سارہ چچی ان ماں بچی پر بڑی جتانی ہوئی نظر ڈال کر گئیں۔ ان کے جاتے ہی مہوا کے جیسے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ وہ اپنا پرس سنبھالتی اٹھ کھڑی ہوئی۔

”مجھے گھر جانا ہے امی۔۔۔“ اس کا انداز سراسیمہ سا تھا۔ تائی جان نے دکھ سے اسے دیکھا۔ وہ اس کی حالت سمجھ رہی تھیں۔ ایک تو بدترین ذہنی کیفیت کو پر سے بخار کی حالت۔ وہ محض لوگوں کا سامنا کرنے کی خاطر آگئی تھی۔ مگر سوال کرنے والے کہاں رکھتے ہیں۔

”اے اب سے بات کرو۔ ابھی تو فنکشن شروع ہوا ہے وہ کہاں مانیں گے۔“  
 ”آپ لوگ فنکشن اٹینڈ کریں امی۔ میں نہیں چاہتی کہ چچی جان کو مزید باتیں بنانے کا موقع ملے۔ میں کبیر کے ساتھ چلی جاؤں گی۔ ویسے بھی گھر نوکروں سے بھرا پڑا ہے۔“ وہ بین صاحب کو کال ملائے ہوئے شکل سے بولی۔

”اچھا۔۔۔ میں بھیجتا ہوں کبیر کو۔“ اس کی طبیعت کی خرابی کا سن کر فوراً انہوں نے کہا تھا۔ مہوا مطمئن ہو گئی۔ کھانا شروع ہو گیا تب طلال کی نظر سرو قد اپنی نشست پر کھڑی مہوا پر پڑی تو وہ گویا اڑتا ہوا اسٹیج پر سے اتر اور لوگوں سے ٹکراتا ان کو ہٹاتا اس کی طرف بڑھا۔ تزوین کی بے یقین نگاہ نے دور تک اس کا پیچھا کیا۔ دو لہا دہن کے سامنے کھانے کی میز پر چکی تھی۔ مگر وہ اس میں ہی ٹپکتا تھا۔

وہ چند قدموں کے فاصلے پر تھا۔۔۔ بھی موجد کو اس نے مہوا کے پاس آ کر رکھتے دیکھا تو طلال کے قدم زمین میں ہی گر گئے۔ وہ مہوا سے کچھ کہہ رہا تھا۔ تائی جان اس سے کچھ پوچھ رہی تھیں پھر طلال نے اسے موجد کے ساتھ آگے بڑھتے دیکھا۔ دور بہت دور۔۔۔ وہ ہال سے باہر نکل گئے تھے۔ طلال ضبط سے لالہ ہوتی آنکھیں لیے مٹھیاں جھنجھٹے وہیں کھڑا رہ گیا۔ پھر اس کے نام کی پکار پڑی تو وہ جھجھکے دل سے اسٹیج کی طرف بڑھا۔ جہاں اس کے لیے قسمت نے نیا ٹھیل شروع کر رکھا تھا۔



وہ سیٹ سے سر نکالے نڈھال سی تھی۔ گاڑی سڑک پر ڈالتے ہوئے موجد نے فکر مندی سے اسے دیکھا۔

”آریو اوکے۔۔۔؟“

”ہمم۔۔۔“ مہوا نے اثبات میں سر ہلایا۔  
 ”کبیر نہیں تھا۔ اس لیے آغا جان نے مجھے بھیجا۔“ اس نے خواہ مخواہ وضاحت کی۔  
 ”مجھے تو گھر جانا تھا۔ کوئی بھی لے چلے۔“ مہوا نے بات ختم کی۔ درحقیقت وہ گھر جا کر تنہائی میں خوب رونا چاہتی تھی۔ آنکھوں کے سامنے دنیا لٹنا گئے کہتے ہیں یہ مہوا نے صبح معنوں میں آج محسوس کیا تھا۔  
 ”تمہیں کس نے کہا تھا یہاں آنے کو۔ طبیعت خراب تھی تو گھر میں ہی رہیں۔“ وہ شادی ہال میں مہوا سے چند قدم پیچھے کھڑے طلال کو دیکھ چکا تھا۔ تب ہی خفگی سے بولا۔ مہوا نے تپ کر سر اٹھایا۔

”میں کون سا اپنی خوشی سے آتی ہوں یہاں۔۔۔ لیکن چھپ کر بیٹھ جانا بھی تو حل نہیں ہے۔“  
 ”اتنی ہمت کر لی کی تھی تو پورا فنکشن اینڈ کرکٹیں۔“ وہ ٹرسکون انداز میں بولا۔ اور ایک نظر بخار سے  
 تہمتاے مہواہ کے چہرے کو دیکھا۔ مہواہ نے اسے غصے سے دیکھا۔ مگر غصے سے بولتے ہوئے بھی اس کی آواز بھرا  
 گئی۔  
 ”کچے دشمن ہو تم تو میرے۔۔۔ جب تک ہمت تھی، سامنا کیا نا حقیقت کا۔۔۔ طبیعت خراب ہو رہی ہے میری۔“

”اچھا۔۔۔“ وہ بے یقینی سے بولا۔  
 ”میں بھی کموں۔۔۔ طلال سے بھاگنے والی تو نہیں لگتیں تم۔“ اس کی غیر متوقع بات پر مہواہ ساکت سی ہوئی۔ پھر  
 تیزی سے خود کو سنبھال کر بولی۔  
 ”طلال سے مجھے کیا مطلب۔۔۔ میں اپنے فیصلوں کی خود مالک ہوں۔“  
 ”ہوں۔۔۔ ویسے میں بنا معذرت کے کموں کا گھر طلال نے تمہارے انکار کے باوجود اسی گھر میں شادی کرنے کا  
 گھنٹا ترین فیصلہ کیا۔ اب اس کے پیچھے کیا پلاننگ کا فرما ہے؟ وہ نہیں پتا۔“ وہ بڑے آرام سے اپنا خیال اسے بتا  
 رہا تھا۔ مہواہ کا دل کسی نے گویا ٹھٹھی میں کر لیا۔ قسمت کیا ہے کیا کھیل کھیل گئی تھی اور وہ اپنی زندگی کے لیے کچھ  
 بھی نہ کر سکتی۔  
 ”چلو یہ بھی بہتر ہی ہوا۔ اکیلی تم تو سزاوار نہیں غلط فیصلہ کرنے کی۔“ وہ پھر سے اسی دوستانہ انداز میں بولا۔ تو  
 مہواہ نے بیزاری سے اسے دیکھا۔  
 ”تم خاموشی سے گاڑی نہیں چلا سکتے؟“  
 ”بڑی بد تمیز ہو ویسے میں تو تمہاری ہمدردی میں کہہ رہا تھا۔“

موجود جیسے اس کی خوبی سے بڑا متاثر ہوا تھا۔ مہواہ نے سر سیٹ سے نکا کر آنکھیں موند لیں۔ یہ اشارہ تھا کہ  
 اسے اس فضول بک بک میں کوئی دلچسپی نہیں۔ موجود نے ایک سرسری نگاہ آنکھیں موندے بیٹھی مہواہ پر ڈالی تو  
 اس کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ چھیل گئی۔ مہواہ گھر میں داخل ہوتے ہی سیدھی اپنے کمرے کی طرف چلی  
 گئی۔ موجود کو ابھی واپس جانا تھا۔ کو ریڈور کے سرے سے مڑتے ہوئے اس نے آغا جان کے اسٹڈی روم سے کسی  
 چیز کے واضح طور پر گزرنے کی آواز سنی تو بڑی طرح ٹھٹھک گیا۔ آغا جان کی غیر موجودگی میں ان کی اسٹڈی میں کسی نوکر  
 کو جانے کی اجازت نہیں تھی۔ وہ دے پاؤں چلتا اسٹڈی کے دروازے تک آیا اور تاب رہا تھا جہاں گھمایا۔  
 خفیف سی کلک کی آواز گنڈر سیاہ رڈ اور شرٹ اور نقاب میں چروچھپائے موجود شخص کے کان کھڑے کر گئی۔ ادھر  
 دروازہ کھول کر موجود اسٹڈی میں داخل ہوا۔ نیم تاریک کمرے میں اس نے تارچ کی روشنی کو بند ہوتے اور ایک  
 سیاہ پوش کو بے سرعت بھاگ کر کھڑکی سے لان میں کودتے دیکھا۔ تو بے اختیار اس کے پیچھے بھاگا۔

”کون ہے۔۔۔ کون ہے یہاں؟“ وہ اونچی آواز میں پوچھ رہا تھا۔  
 کھڑکی کے پار لان میں کوئی ذی نفس موجود نہیں تھا۔ موجود نے پلٹ کر جلدی سے جی چلائی۔ اور کمرے پر  
 طائرانہ نگاہ ڈالی۔ آغا جان کی الماری چویٹ کھلی تھی۔ اور اندر موجود لا کر بھی۔ ایک کھلی فائل کے بے ترتیب  
 صفحات زمین پر بکھرے ہوئے تھے۔ لب پیچھے ہوئے وہ ہار لیکا اور اونچی آواز میں ملازموں کو پکارنے لگا۔ نہ جانے  
 گھر سے کیا کچھ لٹ چکا تھا۔ سب ملازم منٹوں میں جمع ہوئے۔ اور آغا جان کی اسٹڈی میں چور کا سن کر سب کے  
 رنگ بیلے ہوئے۔ ملازمہ سارے دروازے چیک کر آئی ماسوائے اسٹڈی کے سب کے تالے محفوظ تھے۔ تو گویا  
 چور کو تھن آغا جان کے لا کر سے دلچسپی تھی۔ مگر صرف فائلز سے؟ موجود کا ذہن الجھ گیا۔ وہ ملازمین کو سختی سے

چوکیداری کی تلقین کرنے کے بعد آغا جان کو کال ملائے لگا۔

\*\*\*

اللہ کا شکر تھا کہ گھر کی کوئی بھی چیز ادھر سے ادھر نہیں ہوئی تھی۔ البتہ آغا جان نے ملازمین کو خوب بھاڑا۔ مگر  
 چونکہ کوئی نقصان نہیں ہوا تھا اس لیے بات رفع دفع کر دی گئی۔ مگر رات کو آغندی ہاؤس کی سیکورٹی ضرور سخت کر  
 دی گئی تھی۔

آج ترمین اور طلال مکلاوے کے لیے آرہے تھے۔ تو کچن کھانوں کی خوشبوؤں سے ممک رہا تھا۔ مہواہ اپنے  
 کمرے میں مقید ہو گئی۔ اب اور کتنی ہمت کا مظاہرہ کرتی۔  
 ”دادا ہو گا تو سارہ اور سہیل کا۔۔۔ وہی جو ٹھٹھے اٹھائیں اس کے مجھے کوئی نہ کہے۔“ تائی جان نے میاں سے  
 صاف کہہ دیا۔ شادی میں شرکت تو دنیا کا منہ بند کرنے کے لیے کرنا پڑی مگر اب اپنے گھر میں تو وہ طلال پر اس کی  
 حیثیت واضح کر سکتی تھیں۔ ترمین سے رشتہ جوڑ کر اس نے صحیح معنوں میں کمینگی کا مظاہرہ کیا تھا اور ابھی وہ  
 ٹھٹھک سے کمر نکال کر بیٹھی بھی نہیں تھیں کہ ملاح چلی آئی۔

”امی فون ہے آپ کا۔۔۔“ اس نے موبائل ان کی طرف بڑھایا۔ انہوں نے اشارے سے پوچھا۔  
 ”کوئی آدمی ہے۔ اپنا نام نہیں بتایا اس نے۔ آپ سے بات کرانے کا کہا ہے۔“ وہ دبی آواز میں بولی تو انہوں نے  
 موبائل کان سے لگا لیا۔  
 ”ہیلو۔۔۔؟“ ان کی تیوری چڑھی ہوئی اور انداز میں ناگواری تھی۔ مگر ان کے برعکس دوسری طرف سے بہت  
 شگفتہ لہجہ ابھرا۔

”السلام علیکم ساس صاحبہ۔ کیسی ہیں آپ؟ آپ کا داماد عرض کر رہا ہوں۔ نمبر وقار آغندی۔“  
 تائی جان کے اوپر گویا کسی نے سردر فیلا پانی اندر مل دیا ہو۔ ان کی رنگت زرد پڑ گئی تھی۔ ملاح ان کی حالت دیکھ  
 گھبرا کر ان کی طرف بڑھی۔ ان کے ہاتھ سے موبائل پھسل کر ستر گر گیا تھا۔

ملاح نے آگے بڑھ کر موبائل اٹھایا۔ اس کے چہرے پر اڑتی ہوائیاں کسی خطرناک بات کی طرف اشارہ تھیں۔  
 انہوں نے معاً ”حواس میں آتے ہوئے ملاح کے ہاتھ سے موبائل چھٹ لیا۔  
 ”سے۔۔۔ ہیلو۔۔۔ ہیلو۔۔۔ کون ہو تم؟ کہاں سے بات کر رہے ہو؟“ وہ متوحش سی اس کے اس قدر ختم والے  
 انداز میں کرائے گئے تعارف کے بعد بھی پوچھ رہی تھیں۔ دوسری طرف وہ دم سا بے ساختہ ہوا۔  
 ”ارے واسے۔۔۔ مجھے نہیں پتا تھا کہ آپ کو اتنا اشتیاق ہے مجھ سے ملنے کا۔ ورنہ آپ کی بیٹی کے ساتھ ہی حاضر  
 ہو جاتا۔“ وہ محظوظ ہونے والے انداز میں بولا۔ موبائل پر ان کی گرفت سخت ہوئی اور چہرے کے تاثرات ناقابل  
 فہم وہ پھٹ پڑیں۔

”غصیٹ۔۔۔ کیمنے۔۔۔ ظالم ہو تم۔ کیوں میری بیٹی کی زندگی برباد کی تم نے؟“ ان کا بس نہیں چلتا تھا کہ فون سے  
 نکال کر نمبر کی گردن موڑ دیں۔  
 ”بریا۔۔۔ د۔۔۔؟“ اس نے لفظ کو کھینچ کر ادا کیا۔ پھر مسکراتے لہجے میں انہیں یاد دلایا۔ ”یہ تو آغندی کی روایت ہے  
 نا۔۔۔ لوگوں کی زندگیاں برباد کرنا۔ اب اگر میں یہ سب نہ کروں تو آغندی کیسے کہلاؤں؟“ اس کا ایک ایک لفظ سنا  
 دینے والا تھا۔ ملاح بھاگ کر مہواہ کو بلائے گئی۔

”نمبر آغندی کی کال ہے امی سے بات کر رہا ہے۔“ وہ جوتا پہنے پنا بھاگی آئی۔ دوپٹا شانے پر دھر رہا تھا جواب  
 پیروں کے ساتھ ہٹھکتا تھا۔ شو کے کانوں میں بھی ملاح کی آواز پڑی تھی۔ وہ بے اختیار ان کے پیچھے کمرے تک



”اور ایک وہ ہے۔ سہیل کی گھر والی۔ بے شرم عورت۔ میری بچی کے دل پر ہاتھ ڈالتے دل نہ کاٹنا اس کا۔“ وہ ہاتھ ملتے گویا بین ڈال رہی تھیں۔ مہراہ کا دل بو بھل ہونے لگا۔ وہ تیزی سے ان کے کمرے سے نکل آئی۔ حلق خشک تھا۔ پانی پینے کے لیے بچن کا رخ کیا تو لاؤنج میں داخل ہوتے ہی قدم جم سے گئے۔ بالکل سامنے صوفے پر بڑے طمطراق سے طلال بیٹھا تھا۔ اور بچیا جان کی فیملی کے علاوہ موحدا اور آغا جان بھی۔ اس سے پہلے کہ کسی کی نظر اس پر پڑتی وہ تیزی سے بچن میں گھس گئی۔ آنکھوں سے آنسو ابل پڑے۔

”یا اللہ! یہ کیا امتحان ہے۔۔۔“ اس نے لرزتے ہاتھوں سے کاؤنٹر پر رکھی پانی کی بوتل اٹھائی اور اسٹول پر آ بیٹھی۔ گلاس میں پانی انڈیلنے کی بجائے یوں ہی بوتل منہ لگا کر غٹا غٹا پانی پینے لگی۔



اب سمجھ میں آتا ہے  
بار کی کمائی میں  
غس جگہ بھرنا تھا  
کس سے بات کرنا تھی  
کس کے ساتھ چلنا تھا  
کون سے وہ وعدے تھے  
جن پر جان دینا تھی  
کس جگہ بکھرنا تھا  
کس جگہ مکرنا تھا  
کس نے اس کمائی میں  
کتنی دور چلنا تھا  
کس نے چڑھتے سورج کے  
ساتھ ساتھ ڈھلنا تھا  
اب سمجھ میں آتا ہے  
اس نے جو کہا تھا سب  
ہم نے جو سنا تھا سب  
کس طرح بلے تھے اب  
کس طرح ٹپ تھی شب  
ہم نے ان سنی کر دی  
بات جو ضروری تھی  
کس قدر مکمل اور  
کس قدر ادھوری تھی  
وہ جو اک اشارہ تھا  
ذکر جو ہمارا تھا  
وہ جو اک کنایہ تھا

آئیں۔۔۔ چلو ہم تو عالم ہیں مان لیا۔۔۔ تم ہی ثابت کر دیجے کہ تمہاری رگوں میں وقار کا خون ہے۔ کوئی ایک ہی ثبوت مل جاتا۔ تمہارے حلال ہونے کا۔“ تائی جان، بہت نفرت سے اسے گندے خون کی گالی دے رہی تھیں۔ نمون رہ گئیں۔ مہراہ نے آگے بڑھ کر ان کے ہاتھ سے موٹا نکل چھینا اور کان سے لگایا۔

”اسی لیے آپ کی بیٹی سے نکاح کیا ہے۔ کچھ تو حلال کا اثر پیدا ہو۔“ دوسری طرف وہ بہت پرسکون لہجے میں کہہ رہا تھا۔ مہراہ کے دل میں نفرت کی لہر اٹھی۔ یہ شخص اس کے ارمانوں کو ناگ بن کر ڈس گیا تھا۔

”نیر۔۔۔ میری بات سنو۔۔۔“ وہ بہ غلٹ بولی تو لہجہ جذباتی تھا۔ ”تم یہاں آؤ۔ آغا جان تم سے ملنا اور بات کرنا چاہتے ہیں۔“

”مہراہ۔۔۔“ اس نے خود کلامی کے سے انداز میں دہرایا تو وہ ٹھٹک گئی۔

”کیا بات کرنا چاہتے ہیں وہ مجھ سے؟“ وہ پوچھ رہا تھا۔

”وہ۔۔۔ تم سے تمہارے پر اپنی کے حصے کی بات کرنا چاہتے ہیں۔ جو تم چاہتے ہو وہ ملے گا تمہیں۔ بولو۔ کیا چاہتے ہو؟“ مہراہ کو لگا وہ اس کے چھائے جال میں پھنس جانے والا ہے۔ تیزی سے بولی۔

”مہراہ آندی۔“ اور ہرے ایک لفظی جواب آیا تھا۔ مہراہ کا دل غم بھرا تھا۔ دل تو چاہا جتنی گالیاں یاد تھیں وہ آج ساری نیر کو دے ڈالے مگر رابطہ منقطع ہو گیا تھا۔

”دیکھینا۔۔۔ الو کا چھٹا۔“ مہراہ موٹا نکل بستر پر اچھالتے ہوئے بولی۔ غصے سے اس کی آنکھیں جلنے لگیں۔ کس قدر مطمئن تھا وہ۔ جیسے کبھی لڑکی کی زندگی برباد کی ہی نہ ہو۔

”کہا کہہ رہا تھا وہ بے غیرت شخص؟“ تائی جان نے مہراہ سے پوچھا۔ اس سے پہلے کہ وہ کوئی جواب دیتی شمو آگے آئیں۔ ان کے چہرے پر ناگواری تھی۔

”یہی رویہ ہے آپ لوگوں کا جس نے آج نیر کو اس اسٹیج پر لا کر اُٹا کیا ہے۔ آپ سے کس نے کہا کہ وہ وقار کا بیٹا نہیں؟ آپ کو کوئی حق نہیں پہنچتا کسی انسان کے قدموں تلے سے زمین کھینچے گا۔“

”وقار کا خون اس کی رگوں میں ہوتا تو وہ اتنا گھٹیا کام نہ کرتا۔“ تائی جان ان کی نیر کی طرف داری کرنے پر تپیں۔

”آپ نے کبھی یہ سوچا ہے بھائی۔ کہ وقار کی رگوں میں تو آغا جان کا خون تھا۔ پھر وہ کیوں ایک بازار والی پر مر مٹا؟“ وہ تلخی سے پوچھنے لگیں۔ ”کیونکہ فیصلوں کا تعین خون سے نہیں بلکہ ارادوں سے ہوتا ہے۔ دل سے اٹھنے والی چاہت سے ہوتا ہے۔“

”میری زندگی تو برباد کر دی تاس نے۔۔۔ اپنی جنگ کے بیچ۔“ مہراہ کی آواز بھرا گئی۔

”گیہوں کے ساتھ گھن گھن بھی پستائے مہر۔ نیر بھی گھن کی طرح چپا ہو گا حالات کی چکی میں۔ اللہ معاف کرے، کیسے اس رات اس چھوٹے سے بچے کے سامنے اس کی ماں کو بار بار طوائف کہا گیا۔ کیا وہ لفظ اس کے ذہن پر تمام عمر کے لیے نقش نہیں ہو گیا ہو گا؟ ایک بیوہ اور اس کے یتیم بچے کو طوفانی رات میں گھر سے باہر نکال دینا۔ یہی بنیاد بنا ہو گا اس کے انتقام کی۔“ وہ غیر جانبدارانہ مگر دکھ بھرے لہجے میں کہہ رہی تھیں۔

”مگر میں نے تو اسے کچھ نہیں کہا تھا۔“ مہراہ رو دی۔

”اس نے بھی کسی کو کچھ نہیں کہا تھا۔“ شمو کہہ کر وہاں سے چلی گئیں۔

”یہ دیکھو۔۔۔ مار آئیں۔ اس حراختور کی ہمدردی آرہی اسے۔“ تائی جان نے نفرت سے شمو کا ذکر کیا۔

جو سمجھ نہ آیا تھا  
اب سمجھ میں آتا ہے  
جان ہی کے دشمن تھے  
جان سے جو پیارے تھے  
ہم جہاں پہ جیتے تھے  
اصل میں تو پیارے تھے  
راہ جس کو مجھے ہم  
راستہ نہیں تھا وہ  
واسطہ دیا جس کو  
واسطہ نہیں تھا وہ  
کس نے رو کیا ہم کو؟  
کس نے کیوں بلایا تھا؟  
جس کو اتنا سمجھے ہم  
کیوں سمجھ نہ آیا تھا؟  
اب سمجھ میں آتا ہے  
اب سمجھ میں آیا جب  
زندگی کا رت ہے  
ایسی اک بھارت ہے  
جو در سے سمجھ آئی  
زندگی کے بھیدوں کو  
ہم نے اب سمجھا تھا  
تب سمجھ بھی آتی تو  
ہم نے کب سمجھا تھا  
آنکھ جب پھل جائے  
اور بے شام ڈھل جائے  
زندگی کی مٹی سے  
ریت جب نکل جائے  
بھید اپنے چہرہ کا  
تب سمجھ میں آتا ہے  
مہم سمجھ میں آتا ہے

وہ جب ہر داشت کھو بیٹھی تو میز پر سر نکا کر بے آواز رو دی۔

تب ایک ہاتھ بہت نرمی سے اس کے سر پر آن ٹھہرا تو وہ ساکت رہ گئی۔ شکست و ریخت کی اس حالت میں کسی کا سامنا کرنا۔ الفف۔ مہراہ نے آہستہ سے سر اٹھا کر مقابل کو دیکھا تو لفظ بھر کو بے یقین رہ گئی۔ وہ نمونہ تھیں۔

مہراہ نے جلدی سے ہاتھ پھیر کر چہرہ صاف کیا اور جھل سی کھنکھاری۔

”وہ۔۔۔ میں۔۔۔ چائے بنانے آئی تھی۔“ اسے ہمانہ سوجھ ہی گیا۔

وہ اس کے ساتھ رکھے اسٹول پر ٹک گئیں۔ مہراہ نے بے بسی سے ہونٹ کاٹنے ان کو دیکھا۔ پتا نہیں کیا بات تھی ان سے مہراہ کا دل اور طبیعت تل نہیں پائی تھی۔ اور نہ ہی مہراہ سے صدیقہ بھابی کی بیٹی کے علاوہ کچھ سمجھنے کو تیار تھیں۔ مگر اب شاید دیکھنے کا انداز بدلا تھا۔ مہراہ کا اور مہراہ کا بھی۔

”میں جانتی ہوں۔“ انہوں نے میز پر رکھے مہراہ کے ہاتھ کو نرمی سے دیا۔ تو اس نے سر جھکا لیا۔

”بہت غلط ہوا تمہارے ساتھ مہم۔ مگر کیا کیا جائے۔ بیٹوں کا بھنگنا عموماً بچوں کو ہی بھنگنا پڑتا ہے۔“ مہراہ نے انہیں آج پہلی بار نرم لہجے میں بولتے سنا تھا۔

”مجھے کوئی خوشی نہیں تمہارے اس حال سے بیٹا۔ مگر اب وقت اور حالات کے ساتھ انداز بھی بدلے چاہئیں۔“ مہراہ نے ان کی طرف دیکھا۔ تو وہ اسی کی طرف متوجہ تھیں۔ ”میں یہ نہیں کہتی کہ نمیر نے جو تمہارے ساتھ کیا وہ صحیح ہے بیٹا۔ مگر اب جبکہ یہ سب کچھ ہو چکا تو کیا اسے حوصلے اور عقل سے حل نہیں کرنا چاہیے؟“

”اور حوصلہ کیا ہوتا ہے چچی جان۔ اپنی زندگی اپنے سامنے برباد ہوتے دیکھی ہے میں نے۔“ وہ شکوہ کنال ہوئی۔ مہراہ نے چند لمحے کچھ سوچا اور بولیں۔

”وہ سب تو ہو گیا مہم۔ اب واپس نہیں ہو سکتا۔ مگر بہتر ضرور ہو سکتا ہے۔“

”اب کیا بہتر ہو گا۔۔۔ سب کچھ تو برباد ہو گیا۔“ مہراہ ابھی سے ہار گئی تھی۔

”مگر نمیر نے غلط کیا ہے تو صدیقہ بھابی کا انداز بھی غلط تھا اس سے بات کرنے کا۔ موقع تھا ان کے پاس اس کی غلط فہمیاں دور کرنے کا۔ مہراہ اپنی روش چھوڑنے کو تیار ہی نہیں۔ حتیٰ ہمیشہ بغاوت کو جنم دیتی ہے۔ جو پہلے ہی غلط کر رہا ہو اس کو مزید غلط کرنے پر مجبور نہیں کرنا چاہیے۔“ وہ ناصحانہ انداز میں نرمی سے کہتی مہراہ بہت اچھی لگیں۔ ”تم چاہو تو بدلے کے اس ٹھیل کو ختم کر سکتی ہو مہم؟“ انہوں نے مہراہ کے رویے سے حوصلہ پا کر مزید کہا۔

”میں؟“ حیرت سے اس کی آنکھیں پھیلیں۔

مہراہ نے اثبات میں سر ہلایا۔ ”اب بات تم پر آٹھری ہے مہم۔ اس نے آغا جان کو شکست دینے کے لیے تمہیں چننا ہے۔ تو اس ٹھیل کو ختم بھی تم ہی کر سکتی ہو۔“

”میں کیسے بھلا۔؟ مجھے تو اس کے نام اور شکل کے علاوہ کسی بات کا علم نہیں۔“ وہ ابھی۔

”ٹھیل کو ٹھیل کر ہی مقابل کو شکست دی جاتی ہے مہراہ تمہاری زندگی سے ٹھیل چکا۔ اب تم اسے مات دو۔ کچھ بھی کر کے۔“ مہراہ نے تولی نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔ تو وہ بدکی۔

”میں۔۔۔؟“

”ہاں تم مہراہ! حالات جتنے خراب ہوتے تھے ہو چکے اگر صدیقہ بھابی، نمیر اور اس صورت حال کو اپنے انداز و الفاظ سے ہینڈل کر سکی تو نتیجہ برابری ہو گا۔ اس لیے تم خود رابطہ کو نمیر سے۔ اس سے بات کرو اس سے پوچھو بیٹا! وہ کیا چاہتا ہے۔ ہو سکتا ہے تمہارے سمجھانے سے اس کا دل پلٹ جائے۔“ وہ نرمی سے کہہ رہی تھیں۔

مہراہ کی پیشانی تپتی۔ اسے یاد آیا نمیر نے اس سوال کے جواب میں کیا کہا تھا۔ وہ خاموشی سے ان کی بات پر غور کرتی رہی۔ مہراہ کا ہاتھ تھپتھپاتی اٹھ کھڑی ہوئیں۔

”اب کی بار وہ رابطہ کرے تو اعتماد سے بات کرنا۔ تم آفندی ہاؤس میں بیٹھی ہو مہم! پر نہیں۔“ انہوں نے رک کر قدرے توقف سے کہا۔ ”اور یہ جو شخص ترین کا نصیب بنا ہے۔ یہ اسی کو ڈیزور کرنا تھا مہم۔ اس کو

کھوئے پر مت بچھتا نا۔ اصل مردہ ہوتا تو آخروقت تک تمہارا انتظار کرتا۔“ وہ ذہنی انداز میں کہہ کر چلی گئیں۔  
مواہن رہ گئی۔

☆☆☆

مواہ کھانے کی میز پر نہیں تھی۔ طلال ترستا ہی رہ گیا۔ اس کا دکھاوے کا اچھا مزاج خراب ہونے لگا۔ ترائین کے دل میں سکون اترا۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ مواہ طلال کے سامنے آئے۔ سب نے کھانا شروع کیا۔ تب بھی وہ ہنستا ہی رہا۔ اس نے تو سوچا تھا کہ مواہ کے سامنے خوب ہنس کر ترائین سے باتیں کرے گا۔ اس کا ویسے ہی دل جلانے کا مقصد اس نے موحد کے ساتھ طلال کے سامنے آکر جلایا اور ویسے بھی وہ ایک بار تو مواہ سے اس کی بیوفائی کا سبب ضرور پوچھنا چاہتا تھا۔ مگر اس نے تو طلال کو اپنی ایک جھلک دکھانے کے قابل بھی نہیں سمجھا تھا۔ وہ جھنجھلا سا گیا۔ ذرا سا کھانا چکھ کر ہاتھ روک دیا۔

ترائین کا بھائی تو چاہ رہا تھا کہ سب پر طلال کی حقیقت بکھول دے مگر اس سے کی جانے والی محبت ترائین کو یہ سب کرنے سے روکتی تھی۔ اس نے خود طلال کے رشتے کے لیے ہائی بھرے کا کہا تھا۔ اور ویسے بھی اسے پورا یقین تھا کہ جلد ہی طلال مواہ سے متفق ہو کر اس کی طرف لوٹ آئے گا۔ کھانے کے بعد چائے کا دور چلا۔ اس کے فوراً بعد ہی وہ معذرت کرنا اٹھ گیا۔ بلکہ ترائین کو بھی اشارہ کیا۔

”کہاں چل دیے بیٹا۔ آج رات رکتا ہے تم دونوں کو یہاں۔“ ساڑھ چچی کو داماد کے تئیں کچھ اچھے نظر نہیں آ رہے تھے۔

”سوری۔۔۔ مجھے اپنے بستر کے علاوہ کہیں نیند نہیں آتی۔“ وہ معذرت خواہانہ انداز میں بولا۔ ”اور ویسے بھی ایک ہی شرمیلے رہتے ہوئے سسرال میں اگر رات گزارنا مجھے پسند نہیں۔ ہاں اگر ترائین رکتا چاہتی ہے تو موٹو دیگم۔“ وہ قصداً مسکرایا۔ باقی سب خاموشی سے تماشا ہی بنے ہوئے تھے۔

”طلال صحیح کہہ رہے ہیں امی۔ میں بھی چلوں گی۔ اب تو آنا جانا لگا ہی رہے گا۔“ ترائین نے سب کے سامنے مسکرا کر کہتے ہوئے اپنی عزت کو سنبھالا۔ ذرا درمیں وہ طلال کے ساتھ رخصت ہو گئی۔ چچی جان کا دل مٹھی میں آگیا۔ انہیں ترائین کی مصنوعی مسکراہٹ کا ذرا بھی یقین نہیں آیا تھا۔

☆☆☆

گاڑی تیز رفتاری سے اپنی منزل کی طرف رواں دواں تھی۔ جیسے ڈرائیور پر سفر کے لمحات گراں گزر رہے ہوں اور وہ پل بھر میں یہ فاصلہ ختم کر دینا چاہتا ہو۔ ترائین نے ناراضی سے اس کی طرف دیکھا۔  
”تم ایسے تو کبھی بھی نہیں تھے طلال۔ میرے اچھے دوست تھے تم۔“ تائف سے اسے یاد دلایا۔  
”اب وہ حالات نہیں رہے۔ نہ وہ میں رہا نہ تم۔ سب کی جگہیں بدلی گئیں اس کھیل میں۔“ وہ سرد لہجے میں بولا تھا۔

”مگر ہم چاہیں تو ہم اپنی زندگی اپنے حالات کو بہتر بنا سکتے ہیں طلال۔“ ترائین نے بمشکل غصے پر قابو پا کر مصالحت آمیز لہجے میں کہا۔

”میری زندگی تب ہی بہتر ہوگی جب اس میں مواہ آئے گی۔ تم سوچ لو تب تم کیا کرو گی۔“ وہ اس قدر سفاکی سے بولا کہ ترائین سناتے میں رہ گئی۔

☆☆☆

مبین آندھی نے اس نمبر کا پتا لگوا یا جس سے نیر آندھی کی کال آئی تھی۔ توقع کے عین مطابق وہ ایک پبلک فون بوتھ کا نمبر تھا۔

دن بہت بوجھل تھے۔ موسم بدل رہا تھا۔ بہار آنے کو تھی مگر مہماہ کے دل میں تو سردی کے بعد خزاں کا موسم جم گیا تھا۔ کبھی نہ بدلنے کے لیے۔ بہت عرصے کے بعد ملاحہ کالج گئی تھی۔ تائی جان کے ساتھ کچن میں تھوڑا ہاتھ بٹا کر وہ کمرے میں آگئی۔ اس کا موبائل بج رہا تھا۔ اس نے دیکھا، جیسی نمبر تھا۔

”ہیلو۔۔۔“ اس نے کال اٹینڈ کی۔

”جیتی ہے۔ کیسی ہیں مسز نیر آندھی؟“ دوسری طرف سے ابھرتی آواز سن کر مہماہ کا دل بند ہونے لگا۔  
”تم تو یقیناً یاد کرتی ہی ہوں گی مجھے۔ سوچا آج میں بھی یاد کر لوں سمجھیں۔“ پُر یقین انداز میں کہا گیا۔ مہماہ کی آنکھیں بھر آئیں۔

”تم کیا چاہتے ہو نیر؟ صاف اور سیدھی بات کرو۔ دولت پیسہ، جائیداد؟“ اس نے ہارے ہوئے لہجے میں پوچھا تو بھڑک کر اس کے لہجے کے پھٹکے پن کو محسوس کرنے کے بعد وہ نرمی سے بولا۔

”میں تم سے ملنا چاہتا ہوں۔“

مہماہ کو کرنٹ سا لگا۔ گھرؤں میں بہت کچھ چلا تو وہ بے اختیار بولی۔ ”کہاں۔۔۔ مجھے بھی بات کرنی ہے تم سے۔“

”آہاں۔۔۔ گڈ گرل۔۔۔“ مسکراتے لہجے میں کہہ کر وہ اسے ہوٹل کا نام بتانے لگا۔

”میں تم پر چیک رکھوں گا مہماہ۔ مجھے دھوکا مت دینا۔“ وہ ذرا سار کا پھر سرد مہری سے بولا۔ ”مرد کو دھوکا دینے والی عورت اچھی نہیں لگتی۔“

مہماہ کی بریڈ کی ہڈی میں سنسناہٹ سی دوڑاٹھی۔ فون بند ہو گیا تھا۔ مہماہ کا ذہن اب تیزی سے کام کر رہا تھا۔ اگر نیر آندھی اس کی باتوں میں آجاتا تو وہ اسے اچھا خاصا پھنسا سکتی تھی۔ اس کا گھر میں کسی کو نیر کی کال کے بارے میں بتانے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ اس نے وقت دیکھا۔۔۔ نیر کے دیے وقت میں ابھی دو گھنٹے باقی تھے۔ وہ گھر سے اکیلے باہر جانے کا بہانہ سوچنے لگی۔

☆☆☆

وہ آدھے گھنٹے سے نیر کے بتائے ہوئے ہوٹل میں بیٹھی آتے جاتے ہر شخص کو شکی نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔ مگر وہ

کہیں نظر نہیں آتا تھا۔ اس کا دل پریشان ہونے لگا۔ کیرا سے لائبریری چھوڑ کر کے گیا تھا۔ اس کے جاتے ہی رکشہ لے کر وہ ہوٹل چلی آئی۔ اب اتنے سارے لوگوں کی موجودگی میں وہ اسے اغوا کرنے سے تو رہا۔ مہماہ کو اس بات کی تسلی تھی۔ ایک گھنٹے بعد کیرا اسے لینے آجاتا۔ جس میں سے آدھا گھنٹہ تو اس ذیل شخص کے انتظار میں گزر گیا تھا۔ وہ نیر کا نمبر ملا کر تھک گئی مگر وہ نیر اب کسی کے استعمال میں نہیں تھا شاید وہ اٹھنے کا سوچ ہی رہی تھی کہ کوئی اس کے پیچھے سے جیسے گنگنا یا۔

”مہماہ۔۔۔“

مہماہ کرنٹ کھا کر بیٹھی۔ اور مقابل کو دیکھ کر حق دق رہ گئی۔

(باقی آئندہ ماہ ان شالند)

# نبیلہ عزیز قصہ سحر

رات کے بارہ بجے کا وقت تھا۔  
ولید نادرا کے سامنے والے صوفے پر گم مٹم اور ساکت سا بیٹھا اور اسے سنی ہوئی داستان پر یقین کرنے اور نہ کرنے کے بیچ ڈول رہا تھا۔  
کیوں کہ جو کچھ وہ تاجپلی تھی وہ قابل فراموش تو نہیں تھا۔  
رضاحیدر، علی مرتضیٰ کے قاتل تھے۔ عافیہ بنیم اور دُرا مرتضیٰ کے مجرم تھے اور قاتل اور مقتول کی اولادیں محبت میں گرفتار تھیں۔  
معاملہ کہاں سے شروع ہوا تھا اور کہاں پہنچا تھا اور آگے کیا ہونے والا تھا سب عقل اور سمجھ سے باہر کی باتیں تھیں۔  
ولید کی پُرسوج آنکھیں پینٹھاری تھیں۔  
مٹاؤ ولید میرا ساتھ دو گے؟ مجھے بیور حیدر واپس چاہیے۔ ہر حال میں۔۔۔ "نادرا! انتہا بھی کر رہی تھی تو ایک ضد ایک ہمت دھری کے ساتھ۔"

## سینٹیوول قسطنطنیہ

"راجلہ! راجہ!" رضاحیدر زور زور سے دھاڑنے لگے۔  
"اللہ خیر کرے کیا ہو گیا ہے؟" راجہ تیزی سے اندر آئی تھیں۔  
"نہن ملاؤ ابھی، نادرا مرتضیٰ کے نمبر۔۔۔" وہ ادھر سے ادھر چکر لگا رہے تھے۔  
"خیریت سب ٹھیک ہے نا؟" وہ ڈرتے ڈرتے بولیں۔





”پوچھو اس سے کہ وہ کس کپاپ ہمارے بیٹے کے سر ڈال رہی ہے۔ کس کے بچے کو ہماری نسل کا نام دے رہی ہے؟“ رضا حیدر زہرا گل رہے تھے اور رابعہ بیگم شدید شکر رہی کھڑی تھیں۔

”یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ۔۔۔؟ ماورا کا بچہ صرف ماورا کا نہیں ہے۔۔۔ ہمارے بیٹے کا“ ہمارے تیمور کا بھی ہے۔۔۔ ہماری نسل ہمارا خون ہے۔۔۔ آپ کیوں۔۔۔؟“

”نکو اس بند کرو اپنی۔۔۔“ انہوں نے یک دم انہیں تھمڑانے کے لیے ہاتھ بلند کیا تھا مگر رابعہ بیگم کے چہرے پر ہونے کے بجائے ان کا ہاتھ کسی کے ہاتھ کی گرفت میں آ گیا تھا۔

”کہتے ہیں کہ ظلم، جبر اور سفاکی کی بھی ایک حد ہوتی ہے، لیکن آپ تو ہر حد پار کر چکے ہیں۔۔۔ بے حس نے اندھا کر دیا ہے آپ کو۔۔۔ لیکن بانی دنیا تو بے حس نہیں ہے نا۔۔۔؟ سب کے سینے میں اللہ کا خوف رکھنے والا

دل ہے۔۔۔ جو آپ کے اندر بد قسمتی سے نہیں ہے۔۔۔ آپ اس دولت کی ہوس میں اپنے خون اور اپنی ہی نسل کے دشمن ہو رہے ہیں۔۔۔؟ جس خوش خبری کو سن کر آپ کو مٹھائیاں بانٹنا چاہیے تھیں اس خوش خبری پہ آپ لوگوں کی زبانیں کھینچ رہے ہیں اور ہاتھ اٹھا رہے ہیں۔۔۔ ہونسنہ! صد افسوس بابا جان! صد افسوس۔۔۔“

عزت انتہائی مضبوطی سے ان کا ہاتھ دوپٹے سے اپنے اندر کا سارا غبار ہیر نکال رہی تھی۔ اس کے لہجے سے شعلے لپک رہے تھے دل چاہ رہا تھا کہ رضا حیدر جیسے باپ کو مار ڈالے یا خود مرجائے۔ رضا حیدر نے زندگی کے اس موڑ پہ آکر انہیں دکھ، اذیت، شرمندگی اور اپ بھینائی سے دوچار کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی اور ان کی اولاد ہونے کے ناطے وہ دونوں بہن بھائی خود کو کسی کے سامنے سر اٹھا کر بات کرنے کے قابل بھی نہیں سمجھ رہے تھے۔

”مجھے صرف اتنا بتادیں آپ یہ دولت کس کے لیے حاصل کرنا چاہتے ہیں؟ اپنے لیے یا اپنے بیٹے کے لیے؟“ اس نے خون رنگ نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”اگر اپنے لیے حاصل کرنا چاہتے ہیں تو مجھے بتائیں کہ اس عمر میں اتنی دولت کا کیا کریں گے۔۔۔ وہ ان ہی کے لہجے و انداز میں زہرا گل رہی تھی۔“ اور اگر بیٹے کے لیے حاصل کرنا چاہتے ہیں تو پھر بیٹے کے دشمن کیوں ہو رہے ہیں اگر اس نے اپنی مرضی سے اپنی پر اپنی اپنی بیوی کے نام کو دی۔ کیوں زندگی عذاب بن رہی ہے اپنی بھی اور ہماری بھی؟ پلینز کچھ تو خیال کریں۔۔۔ اب اپنی آنے والی نسل کو تو انوارِ موت کریں اسے تو تیرے تھیں اس معاملے میں۔۔۔ اسے تو خوش رہنے دیں۔“ عزت بولتے بولتے جیسے تھک گئی تھی۔۔۔

”سن رضا حیدر پھر سے بھڑک اٹھے تھے۔۔۔

”کیوں نہ عین لوں؟ کیوں نہ زندگی عذاب بناؤں۔۔۔ کیوں؟ آخر یہ دولت میری ہے۔ میں نے بڑی محنت اور بڑی کوششوں سے بنائی ہے۔“ انہوں نے غضب ناک ہوتے ہوئے۔۔۔ جواب دیا تھا۔ اور ان کے ایسے جواب پہ عزت کے چہرے پہ طنز اور تمسخر کی لہر دوڑ گئی تھی۔

”محنت اور بڑی کوششوں سے بنائی ہے، یا پھر بڑے دھوکے اور بڑے فراڈ سے ہتھیائی ہے۔“ عزت نے مزید زہرا گلا گھاتا۔

”زبان بند رکھو اپنی۔۔۔“ انہوں نے غضب ناک ہوتے ہوئے ایک ایک دم ہاتھ بلند کیا تھا چٹا خ، زوردار تھپڑ عزت کا گال لال کر گیا تھا۔ مگر وہ بھی ان ہی کی اولاد تھی۔ یہ ایک تھپڑ اسے چپ نہیں کروا سکتا تھا بلکہ اس کا دماغ اور الٹ گیا تھا۔

”زبان بند رکھنے سے آپ کی اصلیت چھپ نہیں جائے گی۔ اور ویسے بھی کتنی زبانیں بند کریں گے؟ کتنے لوگوں پہ ہاتھ اٹھا کر انہیں چپ کر دائیں گے؟“ آپ اپنے دوست علی مرتضیٰ کے قائل ہیں۔۔۔ آج میں کہہ رہی

256 مارچ 2017

ہوں کل پوری دنیا کے گی کس کس کو چپ کروائیں گے کس کس کی زبان روکیں گے۔ بتائیں مجھے۔ عزت ان کے ہاتھ اٹھائے ہر پاگل ہو رہی تھی۔ اور اتفاق سے واپس پلٹ آنے پر تینوں کے قدم ڈراٹنگ روم کے داخلی دروازے پہ ہی رگ گئے تھے اور اس کا داغ چکرا گیا تھا۔

”جیائیں مجھے۔؟“ وہ پوری قوت سے چیخی تھی۔  
”عزت۔!“ تینوں لے لے ڈگ بھرتا اس تک آیا تھا۔ ”پاگل ہو گئی ہو۔؟“ اس نے اسے کندھوں سے تھام لیا تھا۔

”بھائی چھوڑیں مجھے۔ مجھے پوچھنے دیں۔ یہ دولت آپ نے کمائی ہے یا ہتھیائی ہے۔؟ آپ نے یہ سکھ، آرام، عیش و عشرت سب کچھ دیا نہیں۔ مگر حلال نہیں۔ حرام کھلایا ہے۔ حرام کی کمائی ہمہ رہی ہے ہماری رگوں میں۔ چوری کی ہے۔ ڈاکا ڈالا ہے۔ قتل کیا ہے آپ نے۔ ہماری رگوں میں ایک قاتل، ایک گناہ گار، ایک مجرم کا خون دوڑ رہا ہے۔ آخر ہماری اوقات ہی کیا ہے۔؟ انہوں نے ہمیں کہیں کا بھی نہیں چھوڑا۔ ہم کسی کو منہ دکھانے کے قابل بھی نہیں ہیں۔ ہم گناہ گار نہ ہوتے ہوئے بھی خود کو گناہ گار اور مجرم سمجھتے ہیں۔ اور آپ کو گناہ گار ہوتے ہوئے بھی احساس نہیں ہوتا۔؟ کیا آپ کے دل میں ذرا سی بھی پشیمانی نہیں ہے۔؟“ عزت بڑی انداز میں چیخ رہی تھی رضا حیدر شدر سے کھڑے دیکھ رہے تھے اور رابعہ بیگم بھی دم بخود ہو چکی تھیں جبکہ تینوں عزت کو قابو کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ لیکن پھر بھی وہ اس کے قابو سے باہر ہو رہی تھی۔  
”عزت۔! بوش میں آؤ۔“ تینوں نے اسے جھجھوڑا۔

”مجھے پوچھنے دیں آج۔ کیا آپ کو اللہ سے خوف نہیں آتا۔؟“ پہلے اپنے بھائیوں جیسے دوست کو نکل گئے۔ اور اب بیٹے کے خون کے پیاسے ہو رہے ہیں۔ اپنی ہی نسل اپنے ہی خون کو پاپ کا نام دے رہے ہیں۔ ایک اور جرم۔ گناہ یہ گناہ غلطی پہ غلطی کیے جارہے ہیں۔ کوئی آپ کو روکنے والا ہی نہیں۔؟ کوئی سمجھانے والا ہی نہیں کہ اب بس کرو رضا حیدر۔ موت ہر حق ہے۔ مرنا آپ نے بھی ہے۔“ عزت کے منہ سے لفظ نہیں نکل رہے تھے۔ اور رابعہ بیگم کے آنسو بہہ رہے تھے۔ وہ سب کچھ جو رابعہ بیگم آج تک ان کے ذریعہ سے نہیں کہہ سکی تھیں وہ آج ان کی بچی کہہ رہی تھی۔  
”ہمارے ساتھ جو ظلم کرنا تھا آپ نے کر لیا۔ اپنے دوست کے ساتھ جو کرنا تھا وہ بھی کر لیا۔ لیکن اب اپنی آنے والی نسل کے ساتھ تو ایسا کچھ مت کریں۔ اسے تو سرائھا کر جینے دیں۔“ عزت دہانے لہجے میں کہتے کہتے رو پڑی تھی۔

”ہم اپنے ہی گھر میں ڈرڈر کے جی رہے ہیں۔ یہ کرنا ہے وہ نہیں کرنا۔ اس دولت نے اور اس دولت کی ہوس نے ہمیں کہیں کا نہیں چھوڑا، ہماری نیندیں، ہمارا سکون، ہمارا کھانا پینا سب حرام ہو چکا ہے، ہم ایک دوسرے سے دور ہو گئے ہیں، ڈاریں بڑی دلوں میں۔ رشتے بکھر گئے ہیں، صرف آپ کی وجہ سے۔ صرف اس کی دولت کی وجہ سے۔ ہمیں ہر کام آپ سے چوری اور آپ سے چھپا کے کرنا پڑتا ہے۔ کیونکہ ہم ڈرتے ہیں۔ آپ ہمیں جینے نہیں دیں گے۔ لیکن پلین۔

میں آپ کے سامنے ہاتھ جوڑتی ہوں۔ آپ کے پاؤں پکڑتی ہوں۔ ہمیں اپنی زندگی جینے دیں، ہمیں ہمارے حال پر چھوڑ دیں، رحم کریں اللہ کے واسطے رحم کریں یہ دولت سب کو نکل جائے گی اور نہ پچھتاوے رہ جائیں گے۔ پلین بابا۔ تینوں بھائی محبت کرتے ہیں، اور اعرضی سے اور انسان اپنی محبت سے دور ہو جائے تو سمجھیں زندگی سے دور ہو جاتا ہے۔ آپ اپنے بیٹے کو زندگی سے دور مت کریں۔ چھوڑ دیں ساری ضدیں۔ جینے دیں ہم

کے پلین جینے دیں۔“

وہ کسی کی بھی کچھ نہ بغیر اپنی ہی لے جا رہی تھی اور رضا حیدر کے سامنے دوڑا تو بیٹھ کر ہاتھ جوڑ دیے تھے آنسو بے تحاشہ بہہ رہے تھے اور وہ تینوں اپنے فرس پہ بیٹھی روٹی ملتی عزت کو دیکھ رہے تھے۔

\*\*\*

”اور آج آفس نہیں گئی تھی۔ بلکہ اپنی ہی سوچوں میں گم کسمندی سے بیڑہ لیٹی رہی۔ عافہ بیگم نے ایک دو بار اس کے کمرے میں بھانک کر دیکھا بھی تھا اور اسے اس طرح منہ سر پہنے دیکھ کر انہیں کافی تشویش بھی ہوئی تھی لیکن وہ کچھ بھی کہے بغیر پلٹ گئی تھیں۔ البتہ لیگل خاموشی اختیار کرنے والی نہیں تھیں۔ وہ جیسے قدموں سے چلتی اس کے کمرے میں آگئی تھیں۔

”اور اور! اور! پچہ جاگ رہی ہو؟“ وہ اس کے بیڈ کے قریب آتے ہوئے پولیس۔ اور انے کوئی جواب نہیں دیا تھا اور لیگل اس کی خاموشی سے سمجھ گئی وہ جاگ رہی ہے۔

”دیکھو میرا پچہ سو جانے سے مسئلے حل نہیں ہوتے ورنہ ساری دنیا ہی سو جاتی بلکہ سوئی ہی رہتی۔ لیکن اصل زندگی حقیقت میں ہے جلتی پھرتی دنیا میں ہے۔ لیگل اس کے قریب بیڈ پر بیٹھی کہہ رہی تھیں۔  
”دیکھو، پہلی بات تو یہ کہ اس حال میں نیشن لینا تمہاری اور تمہارے بچے کی صحت کے لیے سراسر نقصان دہ ہے۔ تمہیں ہر طرح کی فکر اور ٹینشن سے دور رہنا چاہیے۔ تمہارا نام پچہ کھانا پینا بہت ضروری ہے۔ تمہیں اپنی خوراک پہ توجہ دینا ہوگی۔ اب وہ پہلے والی لاپرواہی نہیں چلی گی۔“

لیگل اپنے دھیان اور اپنی ہی دھن میں بولے جا رہی تھیں کیونکہ انہیں یقین تھا کہ وہ سب سن رہی ہے۔  
”اور دوسری بات اگر تینوں کی طرف سے پریشانی ہے تو وہ بھی درست نہیں۔ تم سمجھ رہی ہو کہ وہ تم سے اور بچے سے غافل اور بے خبر ہے تو یہ تمہاری غلط فہمی ہے۔ اسے تمہاری اور بچے کی بھی خبر ہے، بے فکر اور لاپرواہ نہیں ہے۔“

”لیکن بے حس ضرور ہو چکا ہے۔“ اور ان کی بات مکمل ہونے سے پہلے وہ پھٹ پڑی تھی اور لیگل ذرا دیر کے لیے رک گئیں پھر مسکرا اٹھی تھیں۔

”محبت ٹھنڈا جذبہ نہیں ہے، محبت ایک نرم گرم جذبہ ہے۔ اس کی گرمی انسان کو ہمیشہ پگھلائے رکھتی ہے۔ انسان لاکھ چاہے تب بھی بے حس اور پتھر کا نہیں بن سکتا۔ تم کیسے سوچ سکتی ہو کہ وہ بے حس ہو چکا ہے۔؟“ لیگل کا فلسفہ ہمیشہ الگ ہی ہوتا تھا۔

”وہ مجھے چھوڑ کر چلا گیا۔ میرے سوچنے کے لیے کیا یہ کافی نہیں۔؟“

”اور اتنب رہی تھی۔ اسے جو چوٹ لگی۔ کیا وہ کم تھی؟  
لیگل تینوں کی طرف داری کر رہی تھیں اور ماورائے کی طرف داری۔ انہیں دیکھ کے رہ گئی۔

”تو اس کا یہ مطلب ہوا کہ جوٹ نے محبت بھلا دی۔؟“ اور اعتراض اٹھا رہی تھی۔  
”جوٹ نے محبت نہیں بھلا دی۔“ بلکہ جوٹ کے درد نے اسے بلبلایا رکھ دیا۔ جیسے جیسے درد کم ہوتا جائے گا۔ اس کی بلبلاہٹ کم ہو جاتی جائے گی۔ زخم بھرتا جائے گا۔ طبیعت سہل ہوتی جائے گی۔“

لیگل اسے سمجھا رہی تھیں اور ماورائے سمجھنے کو تیار ہی نہیں تھیں۔  
”لیکن۔!“ ابھی وہ کچھ اور کہنے ہی والی تھی کہ اس کا موبائل بج اٹھا تھا اور ماورائے کے ساتھ ساتھ لیگل نے بھی

بے ساختہ بیڈ کی سائیڈ ٹیبل پہ رکھے اس کے موبائل کی طرف دیکھا تھا جس کی اسکرین پہ تیمور حیدر کی تصویر جگمگا رہی تھی۔

اور پھر اسی بے ساختگی سے دونوں نے ایک دوسرے کی سمت دیکھا تھا اور بی گل کے چہرے پہ دھیمی سی مسکراہٹ بکھر گئی تھی۔

”جیسے جیسے درد کم ہوتا جائے گا“ اس کی بلبلاہٹ کم ہوتی جائے گی۔ زخم بھرتا جائے گا۔ طبیعت سہل ہوتی جائے گی۔“ بی گل کی بات اس کی سماعتوں میں دوبارہ سے گونجی تھی اور اس نے کال ریسیو کر لی تھی۔

”ہیلو۔۔۔! السلام علیکم۔۔۔“ ماورا نے اپنے آپ کو پرسکون ظاہر کرنے کی بھرپور کوشش کی تھی۔ اور بی گل یونہی مسکراتے ہوئے اٹھ کر باہر نکل گئیں۔

”وعلیکم السلام۔۔۔! کیسی ہو؟“ تیمور بھی بہت مطمئن انداز میں بول رہا تھا۔

”ٹھیک ہوں۔“ ماورا کی آواز دھیمی تھی۔

”تو پھر آفس کیوں نہیں گئیں۔۔۔؟“ تیمور کے سوال پہ وہ بری طرح چونکی تھی یعنی اسے یہ بھی خبر تھی کہ وہ گھر پہ

ہے۔

”بس ایسے ہی۔۔۔“ اس نے لاپرواہی سے کہا۔

”بس ایسے ہی کام نہیں چلتا۔ طبیعت نہیں ٹھیک تو ڈاکٹر کو بلا لو۔۔۔ ایسے کاموں میں لاپرواہی نہیں اچھی ہوتی۔“ اب بی گل کی جگہ ہدایت نامہ اس کی طرف سے جاری ہوا تھا۔

”تو کیا اچھا ہوتا ہے؟“ وہ بے اختیار بولی۔

”پروا۔۔۔“ تیمور نے بھی برکتہ جواب دیا تھا۔

”کس کو کرنی چاہیے۔۔۔؟“ ماورا کریدنا چاہتی تھی کہ اس نے فون کس لیے کیا ہے؟

”مجھے۔۔۔!“ وہ بھی کسی اور سی موڈ میں نظر آ رہا تھا۔

”تو۔۔۔؟“ اس کا سوالیہ لفظ حاضر تھا۔

”کر تو رہا ہوں۔“ تیمور نے بغیر لگی لپٹی رکھے جواب دیا تھا۔

”کیا۔۔۔؟“ تاہم نہیں کیوں وہ بات کو برہنہ رہی تھی۔ بے وجہ طول دے رہی تھی۔

”پروا۔۔۔“ اس نے بھی ایک لفظی جواب سے نوازا۔

”اچھا۔۔۔ پروا ایسے ہوتی ہے۔۔۔؟“ وہ جیسے اندر سے مطمئن ہو چکی تھی۔

”تو کیسے ہوتی ہے۔۔۔؟“ اب وہ پوچھ رہا تھا۔

”ماس آکر سپاس بیٹھ کر۔۔۔ فکرمیں مبتلا ہو کر۔“ وہ اسے طریقہ بتا رہی تھی۔

”فکرمیں ہی تو مبتلا ہوں۔“ تیمور کے منہ سے بے ساختہ پھسلا۔

”کیسی فکر۔۔۔؟ اور کس کی فکر۔۔۔؟“ وہ ٹھکی۔

”ان سب کی۔۔۔ جن کو میری فکر نہیں۔“ تیمور کا جواب سیدھا ماورا کے دل میں پیوست ہوا تھا۔

”آپ کی سوچ غلط بھی تو ہو سکتی ہے۔“ اس نے تیمور کی غلط فہمی دور کرنے کی غرض سے کہا۔

”میری سوچ صحیح بھی تو ہو سکتی ہے۔۔۔؟“ تیمور نے جیسے استہزائیہ لہجہ میں کہتے ہوئے سر جھٹکا۔

”ہو سکتی ہے مگر۔۔۔“ ماورا نے کچھ کہنا چاہا۔

”ماورا۔۔۔!“ تیمور نے اس کی بات کاٹ دی اور ماورا چپ ہو گئی۔

”جی۔۔۔؟“ وہ دھیسے سے بولی۔  
 ”وہ کیسا ہے۔۔۔؟“ تیمور کا گھبر لہجہ آنچ دے رہا تھا۔  
 ”کون۔۔۔؟“ ماورا نہیں سمجھی۔  
 ”جس کو صرف میری فکر ہوگی۔“ تیمور کا اشارہ کس طرف تھا، اب وہ فوراً ”سمجھ گئی۔“  
 ”آپ کا بے بی۔۔۔!“  
 ”ہاں، میرا بے بی۔ میرا بچہ۔ میرے جسم کا حصہ۔ کیسا ہے؟“ تیمور کے لہجے میں پیار کی شدت بہک رہی تھی اور پیار کی اس شدت پہ ماورا کے دل کو کچھ ہوا تھا۔  
 ”ہناؤں! کیسا ہے وہ۔۔۔؟“ تیمور بچوں کی سی ضد سے پوچھ رہا تھا۔  
 ”ٹھیک ہے۔ بالکل ٹھیک ہے۔ کیوں کہ آپ ہونا اس کی پروا۔۔۔ اس کی فکر کرنے والے۔“ ماورا نے لہجے کو زرا خوش گوار بنانے کی کوشش کی تھی۔  
 ”ہاں۔۔۔ میں ہوں ناں۔ اسی لیے تو اس کی خاطر تمہاری گود بھرائی کی رسم ارتج کر رہا ہوں۔“ تیمور نے بالآخر کہہ ہی دیا تھا۔  
 ”گود بھرائی کی رسم۔۔۔؟“ ماورا زیر لب دہرا کے رہ گئی۔  
 ”ہاں۔۔۔ گود بھرائی کی رسم۔ صرف اس لیے کہ کل کو تم سے کوئی یہ سوال نہ پوچھے کہ یہ بچہ کس کا ہے؟ کیونکہ ہمارا تو نکاح بھی دھوم دھام سے نہیں ہوا تھا۔ اس لیے اب بچہ تو دھوم دھام سے ہونا چاہیے ناں؟“  
 ”تیمور ماورا کے رشتے اور کردار کو معتبر کر رہا تھا۔ ماورا کے لیے اس سے بڑی خوشی کی بات اور کیا ہو سکتی تھی بھلا؟“  
 ”بولو۔۔۔ آؤ گی ناں۔۔۔؟“ وہ اسے مدعو کر رہا تھا۔  
 ”کہاں۔۔۔؟“  
 ”جہاں میں بلاؤں گا۔“ وہ مبہم سا بولا۔  
 ”ہاں۔۔۔ آؤں گی۔“ اس نے اثبات میں جواب دیا۔  
 ”تھنک یوس لی گل اور آئی سے بھی کہنا۔ ابھی کال بند کرتا ہوں اور لوگوں کو بھی انوائٹ کرنا ہے۔ بلکہ تم بھی کسی گولانا چاہو تو بلا سکتی ہو۔“  
 ”تیمور نے کہہ کر فون بند کر دیا تھا اور ماورا حیرت اور بے یقینی سے موبائل دیکھتی رہ گئی۔“

☆ ☆ ☆  
 ولید اپنے پروگرام کی شوٹ کے لیے جا رہا تھا جب اس کے موبائل پر بیل ہوئی تھی اس نے جلت سے چلتے چلتے موبائل نکال کر کال انیڈ کی۔ اور نمبر دیکھنے کی زحمت بھی نہیں کی تھی۔  
 ”ہیلو۔۔۔!“  
 ”کیسے ہو۔۔۔؟“ تیمور کی آواز یہ ولید کے تیزی سے بڑھتے قدم رک گئے تھے۔  
 ”تیمور۔۔۔؟“ ولید نے تصدیق کرنا چاہی۔  
 ”ہاں۔۔۔ تیموری بول رہا ہوں۔۔۔ تمہیں کوئی شک ہے کیا؟“ تیمور نے شرارت سے کہا۔  
 ”ہاں شک تو ہے۔“ ولید نے اثبات میں سر ہلایا۔  
 ”اچھا۔ تو پھر یہ شک یقین میں بدل لو۔“ تیمور مسکرا رہا تھا۔  
 ”کیوں بدل لوں؟ وجہ۔۔۔؟“ ولید اکھڑے انداز میں بولا۔  
 ”وجہ یہ کہ تم چا چاہنے والے ہو۔“ تیمور نے اسے خوش خبری سنائی۔  
 ”کیا؟ کیا کہہ رہے ہو؟ ذرا پھر سے کہنا۔“ ولید خوشی سے چکا تھا۔

☆ ☆ ☆  
 ”السلام علیکم۔۔۔!“ مونس مرزا نے اپنی دھن میں کال ریسیو کی تھی۔  
 ”لیکن دوسری طرف کا سلام اور ٹھہرا ہوا لہجہ سن کر ٹھنک گیا تھا۔“  
 ”کون۔۔۔؟“  
 ”تیمور حیدر بات کر رہا ہوں۔“ تیمور کا لہجہ بہت مضبوط تھا۔  
 ”اوہ اچھا اچھا۔ تیمور حیدر۔۔۔؟“ مونس مرزا نے جملہ خاصا لبا کھینچا تھا۔ ”جی۔۔۔ تیمور حیدر! فرمائیے۔۔۔ آج کیسے یاد کر لیا۔“  
 ”مونس مرزا کو شک ہو چکا تھا کہ یقیناً ”کوئی بڑی بات ہے“ اسی لیے اس نے فون کیا ہے۔  
 ”یاد تو آپ ہمیشہ سے ہیں۔ لیکن فی الحال آپ کو اور آپ کی فیملی کو اپنی بیوی کی گود بھرائی کی رسم میں شرکت

**مارچ 2017 مہینہ مبارک رمضان**

**ماہنامہ دین**

**سلاٹنگز**

☆ ماہنامہ دین کی سالگرہ کے موقع پر قارئین کا مکمل ناول  
 ”گواہ ہیں سرخ شامیں“  
 ☆ ”برگ امید وفا“ مصباح علی کا مکمل ناول،  
 ☆ ”نیل گز“ محبت سیما کا ناول،  
 ☆ ”بلا“ شفا حسن علی کا ناول،  
 ☆ ”تو ہے تو درخشاں ہے حیات“ قرۃ العین خرم کا ناول،  
 ☆ ”اک اک لہو زمرہ ہو“ شبنم شوکت کا ناول،  
 ☆ صدف رحمان گیلانی، حبرین ولی اور امیر فاطمہ کے افسانے اور مستقل ناول  
 ☆ اس سلسلے کے ساتھ نثر و شاعری  
**”لباس اور فیشن“**  
 ☆ کن کے ہر شمارے کے ساتھ طبع و صنعت ہے

☆ گوکارہ ”سائڈ رشا خان“ سے شاپن رشیدی ملاقات،  
 ☆ ”خواتین کے عالمی دن“ پر مشہور شخصیات سے  
 ☆ شاپن رشید کا سروے،  
 ☆ ”شادی مبارک ہو“ عدا حسین کی شادی کا احوال،  
 ☆ ماہنامہ دین کی سالگرہ کے موقع پر قارئین سے سروے،  
 ☆ ”مون مگر کھ کی بات نہ مانو“ آسیہ مرزا کا  
 ☆ سلسلے دار ناول،  
 ☆ ”رائیڈز“ حنیفہ ریاض کا سلسلے دار ناول،  
 ☆ ”گل گھسار“ فرح بخاری کے مکمل ناول کی  
 ☆ آخری قسط،





## شکست کی آواز،

زندگی کا حسین روپ بھی دیکھو پل بھر

آفتِ زمین کے اس بارِ جہاں

نیلگوں جرج کی پہنائی میں

ہاندے کے پاس تارِ ہے

جو چپکے چپکے

پانڈی نقرئی باہنوں میں سمٹ آیا ہے

سارِ گل کے کسی خاموش جھروکے سے کبھی

جہانک کے دیکھا تم نے

کسی بھی ہوئی خوشبو کا کوئی رقصِ لطیف

اور شبنم کے روپ پہ گنگنمرو

جب بج اٹھتے ہیں تو مورج کی سنہری کرنیں

کس لیے سجدے میں جھک جاتی ہیں۔ کیا

پاتی ہیں؟

صبح دمِ موعِ صبا کرتی ہے کس کے لب و دامن

نامعِ عزیز اب ہمیں سمجھانے آئے ہیں

کا طوائف؟

اس کی اٹھلاتی ہوئی پال میں کیوں ہوتی ہے

کعبے میں خیریت تو ہے سب حضرتِ خمار

یہ دیر ہے جناب یہاں کیسے آئے ہیں

خمار بارہ ہنگوی

اک در اس جو کہ فطرت کا تقاضا کیا ہے

عشق کیا چیر نہ ہے اور حسن کا منشا کیا ہے

(حمایت علی شاہ کی ایک تمثیلی نظم سے اقتباس)

”تم چاچا اور ماما بننے والے ہو؟ تیمور کے انداز میں شرارت تھی۔  
”واؤ۔۔۔ امیرِ رنگ یا۔۔۔ ایم رنکی اچھی۔۔۔ اینڈ رنکی سربراہ۔۔۔“ ولید کی خوشی دیدنی تھی۔  
”کب خبر ملی؟ اور بھابھی کہاں ہیں؟ بالی سب کو پتا چلا؟“ ولید نے ایک ہی سانس میں کئی سوال کر ڈالے تھے۔  
”خبر دو دن پہلے ملی ہے۔۔۔ تھوڑی منشن میں تھا اس لیے تمہیں پتا نہیں سکا۔ اور ماورا اپنے گھر میں ہے۔  
البتہ اپنی فیملی کے علاوہ ابھی کسی کو بھی نہیں پتا۔ اس لیے گود بھرائی کی رسم رائج کروا رہا ہوں۔ تم اپنی فیملی کے  
ساتھ آجانا اور پوری تیاری کے ساتھ آنا۔ گود بھرائی کی رسم کے ساتھ ساتھ میں عزت کی رخصتی کی رسم بھی ادا  
کر رہا ہوں۔“

تیمور نے انتہائی تحمل اور سکون سے کہتے ہوئے ولید کے سر پہ ہم چھوڑ دیا تھا۔

”کیا رخصتی؟ وہ بھی دو دن بعد۔۔۔؟“

”ہاں۔۔۔ رخصتی! دو دن بعد نہ ہوئی تو پھر کبھی نہیں ہوگی۔ تم دونوں کا نکاح میں نے کروایا تھا۔ رخصتی بھی میں

ہی کرواؤں گا۔“ تیمور اپنے فیصلے پہ اٹل تھا۔

”تیمور! تم پیگل تو نہیں ہو گئے؟“ ہمیشہ ہر کام میں عجلت کیوں کرتے ہو؟ جب اتنا انتظار کر لیا ہے تو تھوڑا اور

سہی۔۔۔“ ولید اسے سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا۔

”اب انتظار کی گنجائش نہیں رہی۔ تم پریشان نہ ہو۔۔۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ میں تمہارے ساتھ ہوں۔

تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔“ تیمور نے اسے تسلی دی۔

”یار! بات نفع اور نقصان کی نہیں ہے بات تو۔“

”ولید! دو دن بعد رخصتی ہے۔“ تیمور نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا تھا اور ولید چپ کا چپ رہ گیا تھا۔

جبکہ اس کے بیڈ روم میں داخل ہوتی عزت کے قدم دروازے کی چوکھٹ میں ہی رک گئے تھے۔ وہ اس کی

آخری بات سن چکی تھی۔

”عزت کو میں خود اپنے ہاتھوں سے رخصت کرنا چاہتا ہوں۔ یہ نہ ہو کہ بابا جان کی وجہ سے یہ کام ادھورا رہ

جائے۔ اس لیے پلیز مجھے یہ ادھورا کام پورا کرنے دو۔“

تیمور کی بات ولید اور کیا کہہ سکتا تھا سو اے ہابی بھرنے کے۔

لیکن عزت وہیں کی وہیں پھرائی ہوئی کھڑی تھی۔

اور ڈیڈ بالی۔۔۔ نظروں سے تیمور کو دیکھ رہی تھی جو فون بند کرنے کے بعد مضبوط قدموں سے چلتا ہوا اس کے

سامنے اکھڑا ہوا تھا اور عزت کو دونوں کندھوں سے تھام لیا تھا۔ چہرے پر۔۔۔ شفیق سی مسکان تھی نرم اور میٹھی۔

دل کو اداس کر دینے والی!

(آخری قسط آئندہ ماہ)

ایک مشہور فلمی ہیروئن نے دوسری مشہور فلمی ہیروئن سے کہا۔  
”میں نے تمہارا مضمون ایک رسالے میں پڑھا تھا۔ وہ مجھے بہت پسند آیا۔ بانی داوے اس کو لکھا کس نے تھا؟“

دوسری ہیروئن نے فوراً جواب دیا۔ ”مجھے خوشی ہے کہ تمہیں مضمون پسند آیا۔ لیکن یہ تو بتاؤ آخر تمہیں وہ مضمون پڑھ کر سنا یا کس نے؟“

### سبق

ایک صاحب کی آفس سے چھٹی ہوئی تو ان کی ملاقات اپنے ایک جبری دوست سے ہو گئی۔ دونوں چائے پینے ایک ہوٹل میں گئے تو وہاں باتوں میں اتنے منہمک ہو گئے کہ وقت گزرنے کا احساس ہی نہیں ہوا۔ رات جب دس بجے موصوف اپنے گھر پہنچے تو بیگم کھانے پر ان کا انتظار کر رہی تھیں۔ وہ صاحب بھوک نہیں ہے، ”کہہ کر اپنے کمرے میں سوئے چلے گئے۔“

رات ساڑھے تین بجے الارم کی آواز پر ان کی آنکھ کھلی۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھے اور ٹائم دیکھ کر غصے سے بیوی کو جگایا۔

”یہ کیا حرکت ہے؟“

”ہوں!“ بیگم نے انتہائی سکون و اطمینان سے کہا۔ ”میں نے سوچا دو فتر سے واپس آنے میں آپ کو باج گھنٹے لگ سکتے ہیں تو اتنا ہی وقت جانے میں بھی لگے گا“ اس لیے میں نے ساڑھے تین بجے کا الارم لگا دیا تاکہ آپ وقت پر آفس پہنچ جائیں۔“

پہچان  
ایک سردار حجاز میں دوسرے مسافر کی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ اس کے اعتراض کرنے پر سردار بولا۔  
”میں پہلے سے بیٹھا ہوا ہوں۔ میں نہیں اٹھوں گا۔“

حجاز کے عطلے نے پوری کوشش کی لیکن سردار جی سیٹ سے نہ اٹھے۔ یہ دیکھ کر ایک دوسرا سردار اٹھا اور اس کے کان میں کچھ کہا۔ جسے سن کر وہ سردار فوراً پچھلی سیٹ پر چلا گیا۔ سب حیران رہ گئے۔ آخر ایئر ہوسٹس نے سردار سے پوچھا کہ ”آپ نے ان کے کان میں کیا کہا تھا؟“  
”میں نے کہا“ اس سیٹ کا مسافر دبی جا رہا ہے اور پچھلی سیٹ کے مسافر پنجاب جا رہے ہیں۔“

### سزا

کلاسیک موسیقی کے ایک بہت بڑے استاد کو جیل میں قیدیوں کے سامنے اپنے فن کا مظاہرہ کرنے کی دعوت دی گئی۔ استاد نے تقریباً ”چار گھنٹے تک اپنے فن کا مظاہرہ کیا بعد میں چائے کی میز پر استاد نے اس بات کی تعریف کی کہ اب جیل میں قیدیوں کو بڑی سہولتیں دی جاتی ہیں حتیٰ کہ موسیقی سنوانے کا اہتمام بھی کیا جاتا ہے۔“

جیل کے سرٹنڈنٹ نے چونک کر کہا۔  
”سہولتیں۔۔۔ ارے جناب یہ تو انتہائی خطرناک قیدی تھے۔ جن کے سامنے آپ نے مظاہرہ کیا ہے۔ ان سے کچھ رازا گھوانے تھے اسی لیے انہیں چار گھنٹے کلاسیک موسیقی سننے کی امت میں مبتلا کیا گیا تھا۔ آپ

کا بہت بہت شکریہ کہ آپ کی وجہ سے میں قیدی اپنے ساتھیوں کے نام و پتے بتانے پر راضی ہو گئے ہیں۔“  
مسرت الطاف احمد۔ کراچی

### اف

دو دوست احمد اور ندیم راز دار بھی تھے۔ احمد بلڈ سے اپنے بازو پر اپنی کرل فرینڈ کا نام لکھ رہا تھا۔ خون بہہ رہا تھا۔ ندیم اپنے دوست احمد کی تکلیف برداشت کرنے کے حوصلہ پر متاثر ہو رہا تھا۔ جب نام لکھا جا چکا تو احمد پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ ندیم نے کہا۔ ”تم نے کتنی تکلیف برداشت کی اب نام لکھا جا چکا ہے تو یوں رو رہے ہو۔“ احمد نے رونے ہوئے کہا۔  
”اسپیننگ (چچ) غلط لکھ دیے ہیں۔“

مسز درانی ملا ہو ریکٹ

### شکر پارے

☆ ایک صاحب کی اپنی کرن کے ساتھ شادی ہوئی۔ ایک ماہ بعد بیگم کا تعارف کرواتے ہوئے بولے۔ ”یہ ہیں میری“ اہلیہ پہلے ان سے میرا بلڈ کارڈ تھا اور اب بلڈ پریشر کا ہے۔

☆ محلے میں اگر عورتوں کی لڑائی ہو جائے تو وہ ”تین عورتیں ایسی بھی ہوتی ہیں جو پیچھے کھڑی بیک گراؤنڈ میوزک دے رہی ہوتی ہیں“ ”آہولی آہو“

☆ امی نے کہا بازار سے مہمان کے لیے کچھ لے کر آؤ۔ میں ٹیکس لے آیا۔

☆ بیٹے دو ہوئے چائیس اگر ایک انجینئر بن بھی جائے تو دو سرا گھر کا خرچہ چلا سکے۔

### دعوت

ماں بیٹے سے ”پنپے لیے لڑکی ڈھونڈو جو نمازی پر ہم نگر پر دے دار“ نیک سیرت ہو۔“  
بیٹا۔ ”یہ بتائیں اس سے شادی کرنی ہے یا بیانی پر دم کروانا ہے۔“

### یقین

لڑکا: ”تم دنیا کی پہلی اور آخری لڑکی ہو جس سے میں نے محبت کی۔“

لڑکی: ”تم وہ پہلے لڑکے ہو جس کے اس جھوٹ پر میں نے یقین کر لیا ہے۔“

### اشتہار

”پچھتر سال کی ایک عورت نے اشتہار دیا۔  
”ضرورت رشتہ“  
تین دن کے بعد اس کے گھر خط آیا۔  
”محترمہ آپ ”ف“ لکھنا بھول گئی ہیں۔ اس عمر میں ”رشتہ“ نہیں ”فرشتہ“ آتا ہے۔“  
(خیمہ اکرم۔ لیاری)

### حیرت

ایک مکرانی سے پٹھان نے پوچھا۔  
”تم کون ہو۔۔۔؟“  
مکرانی۔ ”میں ٹائی ٹانک کا ہیرو ہوں۔۔۔“  
پٹھان۔ ”جیڑی سے بولا۔“ ”ابے بھی ٹائی ٹانک ڈوبا تھا جلا تھوڑی تھا۔“  
(غوثی اکرم۔ لیاری)

### فائرنگ

ہنری اپنے دوستوں کو امریکہ کے واقعات سن رہا تھا۔  
”ایک روز مجھے ریڈ انڈین لوگوں نے گھیر لیا۔ میں نے آؤدیکھانہ تاؤ ان پر فائر کھول دیا۔ ایک۔۔۔ دو۔۔۔ تین۔۔۔ بار۔۔۔ چود۔۔۔“  
”ایک منٹ۔ ایک منٹ۔“ ایک دوست نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔

”تم نے اپنا روالور لوڈ کب کیا تھا؟“  
”جب کوئی شخص اتنی بری طرح گھر جائے۔“  
ہنری نے سنجیدگی سے کہا۔  
”تو اس کے پاس اتنا وقت نہیں ہوتا کہ فضول چکروں میں پڑے۔ اس کو تو صرف فائرنگ سے غرض ہوتی ہے۔“

فضہ یوسف۔ کراچی

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،  
حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ میں نے  
حضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا، فرماتے تھے۔  
”جو شخص عصبیت کی وجہ سے ناراض ہوتا ہے یا  
عصبیت کی طرف بھٹاتا ہے یا عصبیت کی وجہ سے  
کسی کی مدد کرتا ہے، پس مارا گیا تو اس کا قتل جاہلیت  
کا ہوگا۔ وہ مجھ سے نہیں ہے اور میں اس سے نہیں  
ہوں۔“ (مسلم)

#### ایسے تھے حضرت عمرؓ،

جب اسکندریہ فتح ہوا تو سلاطین لشکر وین العاق  
نے معاویہؓ بن خدیج کو قاصد بنا کر مدینہ بھیجا اور کہا۔  
”جس قدر جلدی جاسکتے ہو جاؤ اور امیر المومنین کو مرثیہ  
فتح سنناؤ۔“

حضرت معاویہؓ ٹھیک دو پہر کے وقت مدینے  
میں داخل ہوئے اور اس خیال سے کہ آرام کا وقت ہے  
امیر المومنین کے گھر نہیں گئے بلکہ مسجد نبویؐ کا رخ کیا۔  
راستے میں امیر المومنین کی لونڈی ملی، اس نے  
حضرت عمرؓ کو جا کر اطلاع دی کہ اسکندریہ سے قاصد  
آیا ہے۔

حضرت عمرؓ نے کہا کہ جاؤ فوراً قاصد کو یہاں پر  
بلا لاؤ۔“  
لونڈی نے جا کر قاصد سے کہا کہ تم کو امیر المومنین  
بلا رہے ہیں۔“

لیکن حضرت عمرؓ حالات جاننے کی جلدی میں قاصد  
کے کہنے کا انتظار بھی نہ کر پائے بلکہ خود چادر سفال کر  
چلنے کے لیے تیار ہوئے۔ اسی وقت معاویہؓ آگئے۔  
حضرت عمرؓ نے فتح کا حال سنا تو زمین پر گر  
پڑے۔ سجدہ ریز ہو کر اللہ کا شکر ادا کیا۔ منادی

کرا کے تمام لوگوں کو مسجد میں جمع کیا۔ حضرت معاویہؓ  
نے فتح کے حالات بیان کیے۔  
اس کے بعد حضرت عمرؓ ان کو اپنے گھر لائے کھانا  
کھلایا۔ کھانے سے فراغت کے بعد امیر المومنین نے  
پوچھا۔

”تم مدینے میں داخل ہو کر سیدھے میرے پاس کیوں  
نہ چلے آئے؟“

حضرت معاویہؓ نے جواب دیا۔ ”چونکہ آرام کا وقت  
ہے اس لیے میں نے خیال کیا کہ شاید آپ سوئے ہوں  
اور میری وجہ سے آپ کے آرام میں خلل واقع ہو۔“  
یہ سن کر حضرت عمرؓ نے فرمایا۔  
”انسوئیں تم میرے بارے میں یہ خیال رکھتے ہو (اگر  
میں دن کو سویا کر دوں) تو خلاف کار بار کون سنبھالے گا؟“

#### موتی مالا

۱۔ جب تم کو یقین ہو کہ اللہ تمہارے ساتھ ہے تو پھر  
اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ کون کون  
تمہارے خلاف ہے۔

۲۔ ان چیزوں کے بارے میں نہ سوچو جو دھمکے یا دھوکے  
اللہ نے نہیں نہیں دیں بلکہ ان چیزوں کے بارے  
میں سوچو جو اللہ تمہیں بن مانگے دیتا ہے۔  
دینا اور دشمنوں۔ کراچی

#### چار علم

حاکم نے کہا۔ میں نے چار علم اختیار کیے اور دنیا  
کے تمام علوم سے جان چھوڑ دی۔“  
کسی نے پوچھا۔ ”وہ چار علم کون سے ہیں؟“  
حاکم نے جواب دیا۔ ”پہلا یہ کہ میں نے سمجھ لیا  
ہے کہ جو مذہب میری قسمت میں لکھا ہے وہ زیادہ

ہونگے نہ کم اس لیے میں زیادہ کی طلب سے ملنے  
ہو گیا۔“

دوسرا یہ کہ اللہ کا جو بھروسہ ہے وہ میرے  
موا کوئی دوسرا ادا نہیں کر سکتا اس لیے میں مشغول  
ہو گیا۔“

تیسرا یہ ہے کہ ایک چیز ہے جو مجھے دھونڈتی  
ہے وہ ہے موت۔ میں اس سے بھاگ نہیں سکتا۔  
اس لیے میں نے کھجور کھا لیا۔  
چوتھا یہ ہے کہ میرا اللہ ایک ہے جو مجھ سے باخبر  
ہے۔ میں نے اس سے شرم رکھی ہے اور برے کاموں  
سے ہاتھ اٹھالیا۔“

#### شیطان و وسوسہ

ایک شخص کثرت سے ذکر الہی کرتا رہتا تھا شیطان  
نے اسے دوسرے میں مبتلا کر دیا۔

”یہ فائدہ ذکر کی کثرت کر رہا ہے۔ تو اللہ اگر تارہا  
ہے جبکہ اللہ کی طرف سے ٹھیک کی آواز ایک بار بھی نہیں  
آئی اور نہ ہی اللہ کی طرف سے کوئی جواب ملتا ہے۔  
پھر یہ کہ طرف محبت سے کیا فائدہ۔ یہ اس بات کی دلیل  
ہے کہ تیرا ذکر الہی اللہ کے ہاں مقبول نہیں۔“

شیطان کی ان پرفریب باتوں سے صوفی نے ذکر کرنا  
چھوڑ دیا۔ شکستہ دل اور افسردہ ہو کر سو گیا۔ آٹھ سو گئی  
اور قسمت جاگ گئی۔

عالم خواب میں دیکھا کہ حضرت خضر علیہ السلام  
تشریف لائے اور انہوں نے دریافت کیا۔  
”ذکر الہی سے غفلت کیوں؟ اسے نیک نحت!  
تو نے ذکر خیر کیوں چھوڑ دیا؟“

اس نے کہا۔ ”بارگاہ الہی سے مجھے کوئی جواب ہی  
نہیں ملتا۔ اس سے دل میں خیال آیا کہ میرا ذکر قبول  
نہیں ہو رہا ہے۔“

حضرت خضر علیہ السلام نے فرمایا۔ ”تمہارے لیے  
اللہ عزوجل نے پیغام بھیجا ہے کہ تمہارا پہلی دفعہ اللہ کو  
قبول ہوتا ہے تب دوسری بار تمہیں اللہ کہنے کی توفیق  
ملتی ہے۔ اسے بندے! حیرا خوف اور میری ذات سے  
تیرا عشق میرا ہی انعام ہے۔ ہر بار اللہ کی یکبارگی

میرا لیک خال ہوتا ہے۔ تیرے ذکر کی قبولیت کی  
نشانی یہی ہے کہ تمہیں ذکر خیر میں مشغول کر دیا ہے۔“  
(حکمت رومی۔ مولانا رومی)  
نخبہ اکرم۔ گاؤں کوٹلی

#### دکھاوا

انسان کو ابھی سوچ ہے وہ انعام ملتا ہے جو اسے  
عمل پر بھی جنس ملتا کیونکہ سوچ میں دکھاوا نہیں ہوتا۔

#### درا

اُس دشمن سے مت ڈرو جو تنہائی میں تم پر وار کرتا  
ہے۔ اُس دوست سے ڈرو جو محفل میں تمہاری عزت  
بردار کرے۔

مدد کھو تو یوں مہک۔ بکرات

#### سائبان

ایک مرتبہ چڑیا رزق کی تلاش میں کافی لمبا سفر  
کرنے کے بعد واپس اپنے گھونسلے میں پہنچی تو اس کے  
پتھوں نے پوچھا۔

”ماں! تم نے اتنا لمبا سفر طے کیا۔ یہیں ذرا بتاؤ  
کہ آسمان کتنا بڑا ہے؟“  
چڑیا نے پتھوں کو اپنے پردوں میں جھپٹے ہوئے  
نہایت اطمینان بھرے انداز میں جواب دیا۔  
”پتھو! یاد رکھنا والدین کے سامنے سے بڑی کوئی چیز  
دنیا میں نہیں۔“

مسترت الطاف احمد۔ کراچی

#### افکار

۱۔ علم چھوٹے آدمی کو توڑ دیتا ہے۔ اگر علم میں غم دینے  
والے کا خیال رہے تو پھر انسان بہت بلند ہوتا  
ہے۔

۲۔ دعا یہ کہہ کر کہ اللہ جو تو نے دینا ہے وہ بغیر  
ملنگے دے اور جو تو نے نہیں دینا اس کے مانگنے  
کی توفیق ہی نہ دے۔

۳۔ مسلمان وہ ہے جو ہندو کی نگاہ میں مسلمان ہو۔

# خدا پیچلائی

شائستہ اکبر گدڑ کا لونی

دن کے ہنگاموں کو بے کار نہ جان

شب کے پردوں میں ہے کیا غم نہ

فوزیہ ٹریٹ بکرات

وہ اور وعدہ وفا کرے

تم بھی ناصحت کمال کرتے ہو

کنیز فاطمہ جڑا نوالہ

نگاہِ دل کو قرار کیسا نشاطِ دہم میں کمی کہاں کی

وہ جب ملے ہیں توان سے ہر یاد کی ہے لغت نے ترے

ثوبیہ قطب کراچی

غم جہاں ہو علم یار ہو کہ تیر ستم

جو آئے تھے کہ ہم دل کشادہ رکھتے ہیں

زیرِ طاہر بہاول نگر

نہ عشقِ بادب رہا، نہ سخن میں حیا رہی

ہوس کی دھوم دھام ہے نگر نگر کی محل

زدنا شیرازی جڑا نوالہ

مرحہ ذخیرہ آداب سے غفلت سب کے کھل گئے

لوگ بیسے لگ رہے تھے ایک بھی ویسا نہ تھا

کاشفات اصغر لونڈا ڈہری

ہر قدم گریزاں تھا، ہر نظر میں وحشت تھی

مصلحت پرستوں کی رہبری قیامت تھی

منزلِ تمنا تک کون ساتھ دیتا ہے

گردِ سعی لاماصل ہر سحر کی قسمت تھی

خلدہ پروین گھاٹوں اٹک

اے کہنا سدا موسم بہاؤں کے نہیں رہتے

سبھی پتے بکھرتے ہیں، ہوا جب دھن کی ہے

نثرِ جاوید بسمِ افر پور

حاصلِ زندگی حسرتوں کے سوا کچھ بھی نہیں

یہ کیا نہیں، وہ ہوا نہیں، یہ ملا جین فہ ما نہیں

لوبیہ مشتاق لاہور

شہرِ وفا میں دُحوب کا ساتھی کوئی نہیں

سوج سروں پر کیا تو سائے بھی گھٹ گئے

گردِ شاہ کبر و پکا

یوں حوصلہ دل نے بار اکب تھا

سرطانِ میسا ستارہ کب تھا

لازم تھا گزرتا زندگی سے

بن زہر پیسے گوار اکب تھا

نسبتِ عیلائی کبر و پکا

بزم میں تیرے نہ ہوئے کسا سوال آیا بہت

تو نہیں تھا تو آج تیرا خیال آیا بہت

دیکھتے ہی دیکھتے شاہی چمن کھٹی !

باکمال لوگوں پر نہ ملنے میں نوال آیا بہت

مدد کو دین بہک بکرات

یہ اور بات کہ وہ چشمِ پوش ہو جائے

کسمبھی تو علم آسے بھی ہمارے حال کا تھا

عجب تو میں، میں بھی قائل تھا نہ کھولنے کا

جواب دین میرے پاس ہر سوال کا تھا

ایہا طارقی گوجرانوالہ

کتابِ زندگی کا میری وہ خوبصورت باب تھا

یوں حرفِ حرف بٹھا جسے وہ شخص میرا غائب تھا

سربراہ مجھے چھوڑ کر وہ جی اوسکے ہمراہ ہو گیا

وہ شخص جیسے چاہا میں نے بے حساب تھا

ایمان جہانی گھاٹوں دریاخان

مانا کہ بہت قیمتی ہے وقت تیرا

ہم بھی نایاب ہیں یہ تو نے ہی کہا تھا

دشمن (اسود غنی) سنے آگ میں ڈالا تھا۔ اسے کوئی

نقصان نہیں پہنچا۔

”وہ واقعہ ابنِ ثوب کے ساتھ پیش آیا تھا۔ ابو مسلم

خولانی نے جواب دیا۔ ابنِ ثوب، ابو مسلم خولانی کا نام

تھا۔

حضرت عمرؓ نے فرمایا: قسم کھا کر بتاؤ، وہ شخص

تم ہی تو نہیں ہو؟

”ہاں وہ میں ہی ہوں، ابو مسلم نے فرمایا۔

حضرت عمرؓ نے یہ سن کر ابو مسلم خولانی کو پیشانی

کو بوسہ دیا اور انہیں حضرت ابو بکرؓ کے پاس لے گئے

اور فرمایا۔

”اللہ کا شکر ہے اس نے مجھے امتِ محمدیہ کے

ایسے شخص کو دیکھنے سے پہلے موت نہ دی جس کے ساتھ

بالکل برابر ایسا معاملہ ہوا“

ابو مسلم خولانی، حضرت معاویہؓ کے عہدِ خلافت تک

زندہ رہے۔ حضرت معاویہؓ ان کا بڑا احترام فرماتے

تھے، یہ حضرت معاویہؓ کو نرم و گرم نصیحتیں کرتے رہتے

تھے اور وہ ان کی باتیں بڑی قند کے ساتھ سنتے تھے۔

نثر، اقرار کراچی

جو اہلِ پارے،

کچھ لوگ اس لیے اپنے پاؤں اٹھائے اٹھائے مچھرتے

ہیں کہ کہیں کسی کی دھکی دھکیں اور اس پر پاؤں

رہیں۔

تعلق بھی رزق کی طرح ہوتا ہے۔ بدینتی آجائے تو

برکت ختم ہو جاتی ہے۔

ان کا بھر و سامت کرو جن کا خیال وقت کے ساتھ

بدل جاتا ہے۔ ان کا بھر و سا کرو جن کا خیال

دیرا ہی رہے جبکہ آپ کا وقت بدل جائے۔

انسان اپنے قد سے نہیں اپنے خوف سے بچ جاتا

جانتا ہے۔

انسان اگر اپنی انگلیوں کا استعمال اپنی غلطیاں گنے

کے لیے کرے تو دوسروں پر انگلی اٹھانے کا وقت

ہی نہ ملے۔

مدد کو دین بہک - برنالی

وہ گناہ ہر وہ عمل ہے جو تمہارے لیے نقصان دہ

ہے۔

وہ جس نے اپنی زندگی کو قبول کر لیا اس نے اللہ

کو مل لیا۔

(واصف علی واصف)

کنیز فاطمہ جڑا نوالہ

آگِ ٹھنڈی ہو گئی،

حق تعالیٰ نے حضرت ابراہیمؑ کے لگے لگے کو ٹھنڈا کرنے کا

نمونہ امتِ محمدیہ کے ایک بزرگ حضرت ابو مسلم خولانیؓ

کے لیے ظاہر فرمایا۔ جس وقت میں کے چھوٹے مدعی

نبوتِ اسود غنی نے انہیں ہلا کر اپنی نبوت کا اقرار لینا

چاہا لیکن انہوں نے حضرت علیؓ علیہ السلام کے بعد کسی

کو نبی تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔

اس پر اسود غنی نے آگ کی ایک زبردست

چتا دہکائی اور حضرت ابو مسلم خولانیؓ کو اس آگ میں

ڈال دیا لیکن رب تعالیٰ نے آگ کو ان کے حق میں

بے اثر بنا دیا اور یہ اس سے صحیح سالم نکل آئے۔

لوگوں نے اسود غنی کو مشورہ دیا کہ اب آپ ان

کو مزید نہ چھیڑیں، البتہ اگر یہ آپ کے ملک میں رہے

تو لوگوں میں آپ کے خلاف فساد چھائیے گے اس لیے

بہاں سے جلا وطن کر دیں، چنانچہ اسود غنی نے حضرت

ابو مسلمؓ کو جلا وطن کر دیا۔ جس سے جلا وطن ہو کر انہوں

نے مدینہ طیبہ کا رخ کیا۔ جب مدینہ پہنچے تو انحضرتؐ

کی وفات ہو چکی تھی اور حضرت ابوبکرؓ خلیفہ بن گئے تھے۔

مسجد نبویؐ کے قریب پہنچ کر انہوں نے اپنی اذنی

کو باندھا اور ایک ستون کی آڑ میں غماز پڑھنے لگے۔

حضرت عمرؓ نے انہیں دیکھا تو پوچھا۔

”کہاں سے آئے ہو؟“

انہوں نے جواب دیا۔ ”میں سے“

اس واقعے کی شہرت مدینے تک پہنچ چکی تھی

کہ اسود غنی نے ایک مسلمان کو آگ میں ڈالا تھا مگر وہ

اللہ کی رحمت سے محفوظ رہا اس لیے حضرت عمرؓ نے

ان سے پوچھا۔

”ہمارے اس دوست کا کیا قصہ تھا جیسے اللہ کے





پڑھتے ہیں۔ لیکن ہمیں کہانیوں اور افسانوں کے لیے بھی تو جگہ چاہیے ہوتی ہے اس لیے آپ لوگوں کے خطوط کے بعد جو جگہ چھتی ہے اس میں آپ لوگوں کی تفریح طبع کا اہتمام کرتے ہیں۔  
امتل آپ کی دعاؤں کے لیے شکریہ کہہ رہی ہیں۔

مبشوش سلیم نے نوشہرہ سے لکھا ہے

”خواب شیشے کا“ میرا فیورٹ کردار مہرہا بہت برا ہوا اس کے ساتھ ”صائمہ اکرم“ ”شہر زاد“ کے ساتھ چھا گئیں ”پیار کا دوسرا شر“ ”فرزانہ کھل بہت پیارا تھا۔ اب آتے ہیں میرے موٹ فیورٹ ”شہر خطا“ کی طرف! اف عینا مری۔ وہ چینی کی گڑیا مر گئی۔ اپنی زندگی میں کوئی بھی خوشی دیکھے بنا وہ اس ظالم دنیا کو چھوڑ کر چلی گئی ”عہد سکوت“ ”سیرا حیدر ویل ڈن بائی تمام افسانے ہٹ تھے۔ جنید جشد کے بارے میں اچھا لگا ”جب تجھ سے ناتا جوڑا ہے“ ”ڈاکٹر ص۔ م پڑھ کر بہت خوشی ہوئی کہ دنیا میں اچھے لوگوں کی بھی کمی نہیں ہے۔ بشری گوندل بجائے ناول ناولٹ کے خط میں نظر آئیں مگر پھر بھی اچھی لگیں۔ پلیز فرحت اشتیاق“ ”فائزہ افتخار“ ”کینز نبوی“ ”مریم عزیزہ سب کہاں ہیں۔ سیدہ حنا بخاری آف دی پائل پور دنیا کی بھیڑ میں گم ہی ہو گئی ہیں پلیز موسم کے پکوان میں سینڈویچ بنانے کا طریقہ ضرور دیں اور پیٹ کمر کرنے کا کوئی طریقہ بھی۔

ج : پیاری بشرہ! خط تو ہم آپ کا جب پڑھتے تاجب وہ ہمیں موصول ہوا اور یہ لکھائی تو کوئی مسئلہ ہی نہیں جب کیمسٹ حضرات ڈاکٹر کی تحریر پڑھ لیتے ہیں تو کیا ہم آپ کی لکھائی نہیں پڑھ سکتے۔ یہ تو ان سے ہزار درجے بہتر ہے۔ آپ کی فرمائش پر سینڈویچ بنانی ترکیب حاضر ہے۔ پرچے کی پسندیدگی اور بھرے کا شکریہ۔ کشمالہ اور ہادیہ گوپیار اور دعائیں۔

آسیہ فرید نے جیوے والا ملتان سے لکھا ہے

پیارے نبی کی پیاری باتیں پڑھیں آپ سے پوچھنا تھا کہ یہ نلبینہ یعنی حریرہ کیا چیز ہے مجھے تھیک سے سمجھ نہیں آئی۔ پلیز اس کے بارے میں بتادیں۔ نیاب جی کا ”شہر خطا“ پڑھا بہت زبردست معنائیہ کے ساتھ اچھا نہیں ہوا۔ اتنی جلدی آخری قسط۔ روایا کہاں گئی؟ خواب شیشے کا بھی بہت اچھا ناول ہے مہرہا کی حالت زار پر بہت دکھ ہوا۔

شہر زاد بے حد خوب صورت ناول بہت خوب صورتی سے آگے بڑھ رہا ہے۔ افسانے ابھی پڑھے نہیں۔ ج : وہ بہن اسیہ! نلبینہ دلیے کو کہتے ہیں۔ یہ گندم سے بننا ہے اور جو سے بھی بنا سکتے ہیں۔

کینز فاطمہ نے جزائوالہ سے لکھا ہے

خواب شیشے کا۔۔۔ بھی عفت آپ نے تو کمال کر دیا۔ زیر لگتا تھا طلال مجھے (بھئی مودہ کا قریب جو ٹھہرا) اچھا ہی ہوا۔ اس کی شادی ترین کے ساتھ ہو گئی۔ سچی بات یہ ہے کہ مودہ کی مشکوک حرکتیں یہی ظاہر کرتی ہیں کہ مہو کا نکاح مودہ سے ہی ہوا ہے۔ اب دیکھو عفت جی یہ راز کب فاش کرتی ہیں۔

اب آتے ہیں ”شہر خطا“ کی طرف۔ نیاب نے جادو کو کچھ زیادہ ہی پرومٹ کیا ہے بھئی ایسے تو نہیں ہوتا کہ جادو سے کسی کی زندگی ہی تباہ ہو جائے انسان کو وہی ملتا ہے جو اس کی تقدیر میں لکھا ہوتا ہے۔ میرے خیال میں ایسی کہانیاں نہیں لکھنی چاہئیں ہم لوگ اپنی خطاؤں اور غلطیوں کا خود ذمہ لینے کے بجائے کہیں اور تھوپنا زیادہ آسان سمجھتے ہیں۔ مثلاً ”سازش“ جادو وغیرہ آپ کے پرچے تو اندھیرے میں چراغ کا کام کرتے ہیں۔ بہت سی زندگیوں کو سیدھے راستے کی طرف لانے کی وجہ بنتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی ذات پر کامل یقین اور یونیوسج کے ساتھ انسان بڑی سے بڑی آزمائش سے با آسانی نکل سکتا ہے۔

باقی دکھ اور تکلیف تو زندگی کا حصہ ہیں۔ اب یہ انسان کی مرضی ہے کہ انہیں جادو سمجھ یا کچھ اور۔

ج : پیاری کینز! آپ نے بالکل صحیح لکھا ہے، جو کچھ ہوتا ہے اللہ کی طرف سے ہی ہوتا ہے۔ جادو یا عمل کچھ نہیں کر سکتے، ہم نے اس ناول کو اسی لیے شائع کیا ہے کہ قارئین کو بتائیں برے عمل کرنے والے لاکھ کو بخش کر لیں، کسی کا کچھ بگاڑ نہیں سکتے بلکہ خود تباہ و برباد ہو جاتے ہیں۔ دیا کا نام و نشان مٹ گیا۔ سارے عملیات کرنے کے باوجود وہ ناکام و نامراد رہی۔ رافع، فاتح اور انابہ بالآخر زندگی کی طرف لوٹ آئے۔ روایا اور افراتیم بھی آخر تک ساتھ رہے۔ انادیہ کے عمل انہیں جدانہ کر سکے۔

عمر عتیق! الرحمن لاہور سے شریک محفل ہیں، لکھا ہے ”رقص بسل“ پھر غائب ہے۔ سب بہنوں کے خط

بہت اچھے لکے۔ خط آپ کے میں تفصیلی اور تنقیدی تبصرے بہت اچھے لگتے ہیں اور سب سے پسندیدہ چیز آپ کے شوخ و چٹپل جوابات ہیں۔ ویسے تو سب جوابات اچھے لگے لیکن ڈاکٹر طاہرہ جیلانی کو دیا جانے والا جواب دلچسپ ترین تھا۔ خط آپ کے کے صفحات برصغیر میں مزید بشری ایمان کا خط بڑھ کر ان کی منفی ذہنیت سے بہت دکھ ہوا۔ ”خواب شیشے کا“ عفت تحریر بہت خوب صورتی سے ناول کو آگے بڑھا رہی ہیں۔

سمیرا جمید کی تحریر اچھی تھی۔ بہت اچھی تھی۔ نسوانی انا، نسوانی غیرت اور نسوانی جذبات کو (اور سچ کو) تو مردانہ بے غیرتی کو (اگر کرتی ایک خوب صورت تحریر ہے۔ ”شہر خطا“ میں اس بار سب کے ساتھ بہت برا ہوا۔ ایک عورت کی منفی ذہنیت نے کتنے دلوں کو اجاڑ ڈالا۔ شبانہ شوکت کا ناول اچھا تھا۔ لیکن ڈاکوؤں کا حملہ، انٹیلی جنس کی نوکری، معذوری سے ہیرو کی ماں کا دل بے بسا وغیرہ فلمی سا لگا۔ ام ایمان قاضی نے بہت خوب صورتی سے اس بات کی وضاحت کی کہ جو انسان کے نصیب میں ہو، وہ اسے ضرور ملتا ہے۔ صائمہ اکرم کا نیا ناول بہت اچھا لگ رہا ہے۔ در شہوار کا کردار بہت بڑا ست ہے۔

فرح بخاری کا ناول اچھا لگا۔ فردوس باجی کا کردار متاثر کن تھا۔ اس طرح کی تحریریں ضرور شائع کیا کریں جس سے سب بیٹیوں کو سبق ملے۔

فرزانہ کھل کی تحریر کا عنوان پڑھ کر بے اختیار چاچا جی (مستضر حسین تارڑ) کا ”ریت کی دیواریوں سے بنا تھا بیاڑ کا پسلا شہر“ یاد آ گیا۔ لیکن ایک بات کہ تحریروں میں تمثیلی انداز بہت بہت برا لگتا ہے۔ اتنی طوالت بری لگتی ہے۔ ہمیں انکلی بات ”اگلا موڑ جانے کی جلدی ہوتی ہے۔“ اور ہریاں رقص کر رہی ہیں تو کبھی سازج رہے ہیں۔ کبھی قافلے کوچ کر رہے ہیں۔ اور پھر بھی ہے کہ کتنی بہنوں کو تو اس کی سمجھ بھی نہیں آتی۔ سب افسانے بھی اچھے لگے۔ مستقل سلسلے ہمیشہ کی طرح زبردست تھے۔ بڑھ کر لطف اٹھایا۔ اس مرتبہ کا نانا پڑھ کر بہت اچھا لگا۔ بھرپور بلکہ کھرے کھرے تبصرے پڑھ کر بہت لطف آتا ہے اور اپنی کم الفاظی کا احساس ہوتا ہے۔

ج : پیاری عزیز اچھے صفحات پر مشتمل آپ کا ”کم الفاظی کے احساس“ پر مبنی خط پڑھا۔ بہت لطف آیا۔ امید ہے،

آپ کی تجاویز ہماری لکھاری خواتین کی نظر سے ضرور گزر رہی گی۔ آئندہ بھی آپ کے تبصرے کے منتظر رہیں گے۔

انادیہ کے بارے میں آپ کی رائے زیادہ ہی خراب ہے لیکن یہ بھی یاد رکھیں گوئی انسان برائیاں نہیں ہوتا۔ حالات اسے برا بنا دیتے ہیں، انادیہ ایسی کیوں بنی؟ اس کا بچپن ظالم اور سفاک دادی، بے حس باب اور ذہنی معذور ماں کے سامنے میں گزرا۔ ماں کو اپنی خبر نہیں تھی۔ بچی یہ کیا توجہ دیتی، ڈاؤی ظالم اور سفاک ہونے کے ساتھ ساتھ چالاک بھی تھی اور باپ بے حس، اپنی بیوی بچوں کے ساتھ اتنا تشدد اور زیادتی ہوتے دکھ کر بھی خاموش رہتا تھا۔

پھر آپ نالی صاحبہ یعنی افراتیم کی والدہ کا کردار دیکھیے، انادیہ کی دادی ان کی بھی ساس تھیں۔ کبھی انہوں نے اپنی ساس کی خبر لی، ان کی کوئی خدمت کی؟ انادیہ کی ماں ظلم و تشدد کا شکار ہو کر مر گئی۔ کبھی انہوں نے اسے اس ظلم سے نہیں بچایا۔ پھر اس کے مرنے کے بعد معذور دادی کی دیکھ بھال بھی انادیہ کے سپرد کر دی جبکہ وہ ایک کم عمر لڑکی تھی۔ سوئی ماں کے مرنے کے بعد سوئی بہن کی پرورش بھی انادیہ نے کی اور وہ بیکے بازا اور افراتیم صاحبہ جنہیں دادی سے بہت ہمدردی تھی۔ وہ انادیہ کو تو تعلقین کرتے۔ کبھی خود دادی کا کوئی کام نہ کیا۔ انادیہ کی ماں کے مرنے کے بعد کم از کم نالی کو اپنی ساس کا خود خیال رکھنا تھا۔ پھر افراتیم جو ایک پڑھا لکھا اعلا افسر تھا اس نے ایک کمزور لڑکی پر ہاتھ اٹھایا۔ بے غیرتی اور بے شری کی انتہا ہے۔ انادیہ نے ایک

بار اپنی غلطی کا احساس ہونے پر کاشف کی والدہ سے معافی چاہی تھی لیکن انہوں نے معافی نہیں کیا حتیٰ کہ ماں باپ اگوتے بیٹے کاشف کی بیٹی پر بھی انادیہ کا تشدد دیکھتے رہے۔ لیکن اسے بچانے کی کوشش نہیں کی بلاشبہ انادیہ بہت خراب تھی لیکن اچھا کردار تو کسی کا بھی نہیں تھا۔ رافع، فالخ، افراتیم، نالی، کاشف کے والدین اور خود کاشف سب ہی نے غلطیاں کیں اور سزا بھی پائی۔

آمنہ زاہد نے (میاں جنوں) سے شرکت کی ہے لکھتی ہیں

اتنے لمبے عرصے سے ہم شعاع سے منسلک ہیں۔ کیا ہمارا اتنا بھی حق نہیں کہ ہم خط لکھیں اور آپ وہ شامل نہ

کریں۔ ہم سروے جیسے تو اس کی طرح نگاہ الفت نہ کی جائے۔ ہم نے سال نو کا سروے بھیجا تھا خط لکھا تھا۔ اس سے پہلے ”جب تجھ سے نانا جوڑا ہے“ میں بھی سروے بھیجا تھا۔ مگر مجھے آپ سے کہنا ہے کہ ”نانا“ والا سروے آپ کو شامل کرنا ہو گا گلے شکوے اپنی جگہ۔ آپ کا اور ہمارا یہ پرچا تو بہت شاندار اور اعلیٰ ہے۔

ج : پیاری آمنہ! اب آپ کا خط لیٹ لے تو ہم کیا کریں؟ خیر اب خواتین کے سالگرہ نمبر کے سروے میں شامل ہو جائے گا۔ اور بھی سچ مائیں تو پرچے پر صرف اور صرف آپ قارئین کا ہی حق ہے۔ ہماری کیا خیال کہ آپ لوگوں کی کسی چیز کو رد کریں مگر بقول شاعر ”انسان کے نصیب میں مجبور یا بھی ہیں۔“

اور نگلی ٹاؤن کراچی سے مہنا یوسف نے شرکت کی ہے۔ لکھا ہے

”خط آپ کے“ بہترین سلسلہ ہے۔  
آئیے آئیے کیا؟ آپ نے مریم فاطمہ کے خط کے جواب میں کیا کہا؟ ”پرچا آپ بے شک پورا نہ پڑھیں لیکن سلسلہ وار ناولوں کی اقطار براہ پڑھ لیا کریں۔“ اللہ الشکیرہ تو آپ نے باقی افسانوں اور ناولوں کے ساتھ سوئی ماں والا سلوک کیا۔ آپ کو سلسلے وار ناولوں کے ساتھ ساتھ کبھی کبھار شائع ہونے والے مہنا یوسف کے افسانے کو پڑھنے کی تاکید لازمی کرنا چاہیے تھی نا۔

ناظمہ زیدی نے مجھے یاد کیا۔ بہت شکریہ۔ اب ناظمہ کو کیا بتاؤں، پچھلے چند ماہ فیس بک کی محبت کی نذر ہوئے۔ فیس بک اپنی جگہ عمر براہ پہلی تاریخ آنے سے قبل شعاع

کے آنے کا انتظار۔ شعاع آنے کی خوشی کا تو کسی سے مقابلہ ہی نہیں ہے۔ سب سے اچھا اور سب سے پیارا ناول اس وقت، خواب شیشے کا ہے عفت تحریر بہت خوب صورتی سے اس ناول کو لے کر آگے بڑھ رہی ہیں۔ ہر قسط نیا موڑ لے لے بے حد دلچسپ ہوتی ہے۔

”شہر خطا“ میں عنایہ کے ساتھ بہت ظلم ہوا۔ سب نے ہی عنایہ کے ساتھ غلط کیا۔ دیا نے، رافع نے، حتیٰ کہ فالخ نے بھی۔ سب سے زیادہ برا فالخ نے کیا۔ عنایہ کی موت سے بہت دکھ ہوا۔

شہزاد بہترین آغاز ہے۔ سمیرا جمید کے لیے کیا کیا جائے لگتا ہے کہ جیسے سمیرا ”اردو افسانے کو نیا موڑ دینے پہلی ہیں۔ بہترین بہت عمدہ ”عمد سکوت“  
”پس آئینہ“ کو دوبار پڑھا جب سمجھ آیا کہ آخر والا حصہ خواب تھا۔ اچھا افسانہ لگا ”پس آئینہ“ فرزانہ کھل سے شکایت ہے کہ وہ ہریا بہروٹ کو جدا کیوں کر دیتی ہیں۔ فرزانہ کی تحریر کا اختتام آنسوؤں کی نمی کے ساتھ پڑھا۔ ”پیار کا دوسرا شہر“ لفظ لفظ سے اس ناول پر کی گئی محنت عیاں تھی۔ بہت بہت داد کی مستحق ہیں فرزانہ کھل۔  
جنید جمشید کا انٹرو پڑھ کر حجاز کے حادثے والے دن کی تکلیف دوبارہ محسوس کی۔ ”اپنے حصے کا دیا“ اور ”پاک دل“ زبردست افسانے۔ ام ایمان قاضی کا ناول بہت خوب۔

پیاری مہنا! یہ شرارتی کارٹون ضرور فیس بک کی کارستانی ہو گی مگر ہمیں دیکھ کر یہ جو اس نے ایک آنکھ بند کی ہے نا... اللہ اللہ... یہ تو آپ ہی کارستانی معلوم ہوتی ہے۔ اے مسٹر کارٹون ”پچھ شرم ہوتی ہے“ کچھ حیا ہوتی ہے۔ اور قارئین! آپ ناولوں کے ساتھ ساتھ مہنا یوسف کا افسانہ ضرور پڑھیں اور ہمیں اپنی رائے بھی لکھیں۔ فرزانہ کھل ہمیشہ ہی تو جدلی برائے اختتام نہیں کرتیں۔ شاید آپ ”چھپا کی جھمی“ کو بھول گئیں۔

خروفاطمہ کبیر والا سے لکھتی ہیں  
میں نے شعاع کا پرانا رسالہ پڑھا، مجھے بہت اچھا لگا۔ میں نے پہلی بار ایسا رسالہ پڑھا ہے۔ پہلے میں بچوں کے رسالے پڑھتی رہی ہوں۔ میں اس رسالے میں اشعار بھی بنا چاہتی ہوں۔

ج : پیاری فاطمہ! آپ ایک صفحے پر مختلف اشعار لکھ کر بھیج سکتی ہیں۔ اور کسی دوسرے سلسلے میں شرکت کرنا چاہیں تو ایک ہی لفافے میں مختلف سلسلوں کے لیے لکھ سکتی ہیں۔

نق نے لاہور سے لکھا ہے  
”جب تجھ سے نانا جوڑا ہے“ میں ڈاکٹر ص۔ م لہ کا سروے پڑھا، یقین ہی نہیں آیا کہ یہ اسی دنیا کے باسی ہیں۔ حقوق اللہ اور حقوق العباد کو ادا کرنے والے۔ انہوں نے اپنے پولیس والے میاں کا حال نہیں لکھا اتنی نیک ماں کا

بنا بھی یقیناً "نیک ہی ہو گا اور پولیس کی برائیوں کی ہستی گنگا میں یقیناً" ہاتھ نہیں دھوئے ہوں گے جب سے ہوش سنبھالا ہے شعل اور خواتین کا ساتھ ہے اب تو بڑھا پے کی دہلیز پر ہوں لیکن خط پہلی دفعہ لکھ رہی ہوں۔

ج : ہمن کن۔ ق! شعل اور خواتین کے ساتھ اتنی لمبی رفاقت میں پہلی بار خط لکھا اور تبصرہ صرف "ناتا جوڑا" پر کیا ہے۔ باقی پرچے کے بارے میں کیا رائے ہے؟ امید ہے فرصت نکال کے ضرور اپنی رائے سے آگاہ کریں گی۔

جویریہ ندیم نے گوجرانوالہ سے شرکت کی ہے لکھا ہے

پیاری جویریہ! ہمیں بھی ڈر ہے کہ بات کہیں واقعی لمبی نہ ہو جائے۔ بشری کے خیالات شائع کیے تھے تو وہ ان کا تجربہ تھا۔ یہ آپ کا تجربہ ہے۔ اور ہمارا تجربہ یہ کہ اس سلسلے کو ہمیں روک دیا جائے۔ کیونکہ تب چل نکل تو پھر بہت دور تک جائے گی۔ ویسے بھی ہم نے بشری کو جواب دے دیا تھا جو ہمارے خیال میں کافی ہے۔

محشر مصطفیٰ نے میانوالی سے لکھا ہے

شعل اور خواتین کی کہانیاں بہت عمدہ اور دلچسپ ہوتی ہیں نیز "جب تجھ سے ناتا جوڑا" کا عنوان بہت زبردست ہے۔ لگ رہا ہے ناول شہزاد بھی یقیناً "ٹاپ" پہ چلے گا۔

"خواب شیشے کا" میں مہراہ کے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔ میرا بھی کہانیوں پر تبصرہ کرنے کو جی چاہتا ہے لیکن یہاں خط پوسٹ کرانے کی سہولت میسر نہیں ہے۔ میں نے آپ کے ادارے کو بہت سے خطوط اور چھ افسانے بھیجے تھے۔ جن میں سے ایک بھی شائع نہیں ہوا۔ اور مجھے یقین ہے، آپ گاؤں اور شہر میں فرق کیے بنا لوگوں کی صلاحیت کو مد نظر رکھتے ہوں گے۔

"جب تجھ سے ناتا جوڑا" میں میری امی جان کی آپ بتی ہے۔ ویسے تو بہت کم رسالے وغیرہ پڑھتی ہیں۔

ج : پیاری محشر! تحریر کو منتخب کرتے ہوئے نہ ہم گاؤں دیکھتے ہیں نہ شہر صرف تحریر کا معیار مد نظر رکھتے ہیں۔ آپ کی تمام کہانیاں ہم نے پڑھی ہیں۔ آپ نے بہت ڈیرسڈ اور نصیحتوں بھری کہانیاں لکھی ہیں۔ آپ میں لکھنے کی صلاحیت ہے۔ کسی ہلکے پھلکے موضوع پر نگلیں اور دیر سو رکنا سوچا کریں جب سہولت ہو ہمیں اپنی رائے سے آگاہ کر دیا کریں۔ آپ کی والدہ صاحبہ کا سلسلہ ضرور شائع کریں گے۔

کئی ایسی تحریریں ہیں جنہیں بڑھ کر دل چاہا کہ تبصرہ کروں لیکن پھر اپنی سوچ کے مطابق "خط آپ کے" میں تبصرہ بڑھ کر دل خوش ہو جا نا کہ میں نے بھی تو ایسا ہی سوچا تھا۔ لیکن آج میں نے جب "خط آپ کے" میں ایک ہمن بشری ایمان کا خط پڑھا تو یقین کریں میرا تو خون کھل گیا۔ مجھے چین نہ آیا اور میں نے قلم اور کلمہ اٹھایا اور خط لکھنے کی جرات کر ڈالی۔ تو میڈم ایمان صاحبہ! جن عورتوں سے تم ملی نہیں جن کے حالات تم جانتی نہیں۔ ان کے آنسوؤں ان کی تکالیف کا تم کیسے مذاق اڑا سکتی ہو۔ ان کو ڈرامہ باز کیسے کہہ سکتی ہو۔ ان کو تم مکار عورتیں کہہ رہی ہو۔ ہم جس معاشرے میں رہتے ہیں وہاں آج بھی مڈل کلاس گھرانوں کی سب سے بڑی سچائی یہ ہے کہ رات بارہ بجے ماں کے پیٹ میں درد ہو اور بیٹیاں کو ہسپتال لے جائے تو وہ نیک اور جنتی ہے۔ ہمن کو لے کر جائے تو فریاد بردار ہے بیوی کو لے کر جائے تو زن مرید ہے (تھلے لگا ہے) بیوی کو ڈرامہ باز کہا جاتا ہے کہ لو بھلا ڈراما پیٹ میں درد ہی تو تھا۔ ترا ڈرامہ اور ایمان جی آپ نے لکھا کہ آج کل کی لڑکیاں

سائیکس ہیں کہ بس میاں مٹھی میں... حقیقت یہ ہے کہ بھائی یا بیٹا بھی یا بہو کے ورغلانے سے پیچھے نہیں ہٹا بلکہ ماں اور بہن کے شکوکوں سے پیچھے ہٹتا ہے۔ شادی سے پہلے تو بڑی سے بڑی خطا میں بھی معاف لیکن شادی کے بعد تو چھوٹی سے چھوٹی غلطی بھی ناقابل معافی سمجھی جاتی ہے۔ ہم رگ دل برا نہیں کرتے جو لڑکی اپنے تمام رشتے چھوڑ کر ایک شخص کی خاطر آتی ہے تو ہم کیوں یہ چاہتے ہیں کہ وہ ایک شوہر کے علاوہ سب کو خوش کرے۔

اقراء الیاس نے مرید کے ضلع شیخوپورہ سے لکھا ہے

مصباح علی اور ایمل رضا ان دونوں رائٹرز کا شمار میری فورٹ رائٹرز میں ہوتا ہے سب سے پہلے سلسلے دار ناول میں سے "خواب شیشے کا" عفت سحر طاہر کا بڑھا، نایاب کا ناول "کوئی چاند رکھ میری شام پر" مجھے آج تک نہیں بھولا "شہر خطا" بھی ان کی بہترین کاوش ہے جس میں نایاب جیلانی بہت اچھے طریقے سے اپنے الفاظ کا جاوہر بکھیر رہی ہیں اور اس ماہ کے سب افسانے بہت اچھے تھے "کمال



ضبط“ اور ”سوچنے کی بات“ ہم قارئین بہنوں کے لیے اچھا سبق تھی۔

ج : پیاری اقراء! افسانہ یا ناول بھجوانے کی کوئی تاریخ مقرر نہیں۔ آپ کو جب بھی سہولت ہو، آپ بلا جھجک ہمیں بھجوا دیں۔ افسانے ای میل کر سکتی ہیں لیکن سلسلوں کے لیے آپ بذریعہ ڈاک اپنی نگارشات بھیجیں۔ صفحے کے ایک طرف لکھنا ضروری ہے۔ دوسری طرف کچھ نہ لکھیں اور جو کچھ ہمیں بھیجیں اس کی ایک کاپی ضرور اپنے پاس رکھیں۔ ہم ناقابل اشاعت تحریریں واپس نہیں کرتے۔

**فوزیہ شمر شاہ، عمران امینہ رئیس گجرات سے شریک محفل ہیں، لکھا ہے**

سورق ناسل سوسولگ۔ ماڈل کا آئی میک اپ بالکل بھی اچھا نہیں تھا۔ سب سے پہلے ہر ”شہر خطا“ پڑھا ایک ناقابل فراموش داستان۔ ہر کردار مجھے تو سائیکو کس لگا۔ تحریر بھی بڑی مفرد۔ دینے بہت ظلم کیا اپنی بہن اور بیٹی کے ساتھ۔ اینڈ کا بے ہماری سے انتظار ہے۔

سلسلے وار دونوں ناول بہت اچھے جارہے ہیں۔ عفت اور صائمہ جی کا مزاج انداز ایک جیسا لگتا ہے۔ عفت جی، کبھی ناظم ملا تو آپ کے گھر میں نے آنا ہے جس ناول نے زیادہ متاثر بلکہ دلچسپی کیا وہ پار کا دوسرا شہر تھا۔ راتیں کی محبت کو سلام، ہر بی کو ایسا ہی ہونا چاہیے۔ ”ہوائے کشت وفا“ معذرت کے ساتھ خاص پسند نہیں آئی۔ کمائی میں تھوڑا ذرا مہمہ اچھا نہیں تھا زندگی کے رنگ بھی سوسو لگی۔ افسانے اچھے تھے۔ ”عہد سکوت“ خوب تر تھا۔ سمیرا حمید کے کسی ناول کے شہر ہیں۔ کسی انوکھی تحریر کے ساتھ آئیں۔

پہلی شعاع مسکرائیں بکیرہ گی۔ بخ نرسہ ہواؤں میں سوا کی نرم دھوپ میں بیٹھ کر جن سوغاتوں کا مدیرہ صاحبہ

نے ذکر کیا ہے۔ کھانے کا پھر منگائی کا اعتراف بھی۔ لطف آیا آئی کی سادگی پر ”پیاری نبی کی پیاری باتیں پیش کی طرح اچھی لگیں۔“

اوکاڑہ کی ڈاکرٹی کو تو آپ کا جواب ہی کر دیا۔ کچھ تو بہر م رہنے دیتیں ان کا اپنے میاں جی کے سامنے۔

نہینہ جی بڑے دل کی بات ہے۔ کہ آپ شعاع دے

ری ہیں۔ ہم ابھی جب نئے گھر شفٹ ہوئے تھے تب عمران صاحب نے کہا تھا کہ رسالے فروخت کر دو۔ اتنی جگہ نہیں۔ میں نے بھی مولا جٹ والی دھک ماری اور کہا جس نے بھی میری جائیداد کو ہاتھ لگایا، میں جھٹ سے کود جاؤں گی میرے ماموں کی، بوسہ شائستہ طیب جب بھی گھر آئی ہے کہتی ہے باپ کچھ ڈانچٹ دو پڑھنے کے لیے۔ میں وضو کر کے پڑھوں گی اور ہاتھ لگاؤں گی۔ میں اسے نہیں دیتی کہ پھاڑ دے گی یا کم کر دے گی۔

آپ سے پوچھا تھا۔ بنت حواریا ستر ہے یا قاری۔ جس خط نے متاثر کیا وہ بشری ایمان کا ہے اور آپ کے جواب نے بھی۔ اس سلسلے کو نندوں کے لیے بھی بتائیں۔

قسم سے چھٹی دل کی دہائیاں ہم بھی سنا چاہتے ہیں قارئین کو آئینہ خانے میں ارشد خاں کے متعلق سن کر جراتی ہوئی۔ تقدیر یوں بھی پلٹا لھا سکتی ہے۔ وہ کیا قسمت پائی ہے۔ اس لڑکے نے۔ اس کا مہمان بنا جوڑا اچھا تھا۔

ج : پیاری فوزیہ! تبصرے تو آپ کے بھی بڑے دلچسپ ہوتے ہیں۔ ویسے فوزیہ ہم اپنی قارئین کو ایک بات بتانا چاہتے ہیں کہ ہمارے جوابات اپنی قارئین سے محض دوستانہ بے تکلفی اور محبت کا اظہار ہوتے ہیں اس سے کسی کی دل آزاری اور دل شکنی ہرگز مقصود نہیں ہوتی۔ بس جیسے دوست آپس میں ہنسی مذاق کرتے ہیں۔ ہم بھی اپنی قارئین کو دوست سمجھتے ہوئے کچھ باتیں کر رہے ہیں۔

نانا جوڑا ہے کا سلسلہ نندوں کے لیے بھی بنانے کی تجویز کچھ ٹھیک نہیں لگتی۔ آپ دیکھیے نا، نندوں کو تو رخصت ہو کر اپنے گھر چلے ہی جانا ہوتا ہے۔ وہ تو مہمان ہوتی ہیں۔ پھر ایک بات اور بھی ہے اگر کوئی بھانج نہند کے ساتھ برا سلوک یا رویہ رکھے ہوئے ہے تو اس کا قصور وار صرف بھائی ہے۔ بھانج اور تو بھانج کی کیا مجال ہے کہ وہ نند کو کچھ کہ سکے۔

سدرہ احسان سمیرا بلو کے سے شرکت کر رہی ہیں، لکھا ہے

آئی ریحانہ کوثر (مدو کے) اپنے گاؤں کا نام اور وہ بھی اب کے کام کے ساتھ خوشی سے اچھیل پڑی۔ قارئین میں بھی اسی گاؤں کی ہوں۔ مجھے شعاع کی ات ریحانہ آئی سے ہی لگی۔ شعاع بالکل پرفیکٹ ڈانچٹ ہے بس راسخڑ سے یہ کہنا ہے کہ پلیر غور کو بہت زیادہ مظلوم نہ

دکھایا جائے۔ ایمل رضا اتنا اچھا ناول لکھنے پر مبارک باد۔ ”خواب شیشے کا“ بہت اچھا جا رہا ہے۔ مجھے جو اناجٹ فیملی والے ناول جہاں بہت سارے کنزربل جل کر رہتے ہیں بہت پسند ہیں۔ اب نایاب جیلانی آپ کی طرف آتے ہیں۔ آپ کے بہت سے ناول پڑھے۔ ہر ایک تحریر انوکھی اور لا جواب ہوتی ہے شہر خطا پڑھتے پڑھتے جنس بھی بڑھتا گیا اور ساتھ ساتھ روٹنے بھی کھڑے ہوتے گئے۔ انادیہ تو مجھے خوب صورت ڈائن لگی جو ہر ایک کا بطور خاص افرامیم کی فیملی کا خون چوس رہی ہے۔

میں نے ایم اے اردو پارٹ ون کے پیپر دے دیے ہیں۔ میرے لیے خصوصی دعا کرنا پس ہو جاؤں فوزیہ عمر آپ اتنا جاندار اور بے لاک تبصرہ کیسے کر سکتی ہیں کوئی ناول افسانہ ہی لکھ ڈالیں۔ میرا تو اتنا دل کرتا ہے لکھنے کو۔

ج : پیاری سدرہ! پیپر آپ نے اردو کا دیا ہے اور خط میں جگہ جگہ انگریزی ٹھونس رہی ہے۔ کیا یہ کھلا نقصان نہیں، اور دعا اس وقت کارگر ہو گی جب آپ نے امتحان میں کچھ کارگزاری بھی دکھائی ہو گی۔ آپ نے اتنے مفت مشورے دیے ہیں، ایک مفت مشورہ ہم بھی دے دیں۔

آپ اردو میں ایم اے کر رہی ہیں تو ٹھوس سی اپنی نگہداشت پر بھی توجہ دے لیں۔ یقین کریں کہ آپ کا خط بہت مشکل سے پڑھا ہے اگر متعجب بھی ہمارے جیسی ”قابلیت“ کا حامل ہو تو آپ سوچ لیں کیا ہو گا۔

**رشیدہ کلثوم نے لکھا ہے**

آج میں کن جذبات سے خط لکھ رہی ہوں۔ میں خود بھی نہیں جانتی۔ بھری ہوئی بھی ہوں۔ اور بالکل خالی بھی۔ کسی کھولے کنوئیں کی طرح۔

ہر احساس سے عاری بھی۔ اور احساس و جذبات کا ایک اڈا تار پلا آنکھ اور دل میں ہے۔ اگر اس ریلے کو اپنے اوپر حاوی کر لوں تو میرے لیے سانس بھی مشکل کر دے۔ بہت رومجی لیا اور دور کے تھک بھی گئی۔ رنج اب بھی ہے۔ درد پھر بھی باقی ہے۔ ہم انسانوں کے پاس اور کوئی چارہ بھی تو نہیں ہوتا۔ ہم کتنے بے بس ہیں۔ اور کتنے با

اختیار۔۔۔ کہ اپنی بے بسی پر ہنسی آتی ہے۔

اس گزرتے سال نے میرے ساتھ بہت برا کیا۔ بہت برا۔ نہ نئے سال آنے کا مجھے ہوش رہا۔ نہ سال بیت جانے کا۔ اس سال نے میرے دادا کو بھی چھینا، نانا کو بھی اور اب جبکہ ان دو اموات سے میں سنبھل بھی نہیں پائی تھی۔ اس کا دسمبر جاتے جاتے میری ماں کو لے کر چلا گیا۔ ٹھیک ٹھاک خوش و خرم ہنسی ماں کو۔

میری تمام قاری بہنوں سے گزارش ہے۔ تین بار درود پاک پڑھ کر ان کے لیے ضروری ایصال ثواب کریں۔

ج : پیاری رشیدہ! اللہ پاک آپ کی والدہ کی مغفرت فرمائے اور آپ کو صبر عطا کرے۔ والدین میں سے کسی ایک یا دونوں کا چلے جانا واقعی بے حد عظیم ساتھ ہوتا ہے۔ مگر رونے دھونے کے بجائے ان کی مغفرت و بخشش کے لیے دعائیں اور اعمال کریں کہ یہ جدائی عارضی ہے۔ ایک روز ہم بھی اپنے پاروں سے جا ملیں گے۔ ان کے لیے اور سب کے لیے دعا کیا کریں۔ ایک بات اور نیا سال آپ کے لیے ایک خوشی بھی تو لایا ہے۔ سیدر رکھیں زندگی میں خوشی اور غم ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔

**نوشین بخاری نے لیہ سے لکھا ہے**

مجھے کچھ ناول درکار ہیں کتنی رقم ارسال کر دیں اور کتابیں مجھے کب تک مل جائیں گی۔

ج : پیاری نوشین! مکتبہ عمران ڈانچٹ کا نمبر لکھ رہے ہیں۔ آپ انہیں فون کر کے جو کتابیں آپ کو درکار ہیں ان کی قیمت اور دیگر معلومات حاصل کر لیں۔ نمبر یہ ہے۔

021 - 3221261

### سورق کی شخصیت

ماڈل ----- تازیہ علی  
میک اپ ----- روزیونی پارل  
فوٹو گرافی ----- مویٰ رضا

ایمانہ خاتون ڈانچٹ اور ادرہ خاتون ڈانچٹ کے تحت شائع ہونے والے رچوں ایمانہ شعاع اور ایمانہ کرن میں شائع ہونے والی ہر تحریر کے حقوق محفوظ ہیں۔ کسی بھی فرد یا ادارے کے لیے اس کے کسی بھی حصے کی اشاعت یا کسی بھی ذریعہ پر ڈراما، ڈرامائی، نقلی اور سلسلہ وار قطعہ کے کسی بھی طرح کے استعمال سے پہلے پیشتر سے تحریری اجازت لینا ضروری ہے۔ بصورت دیگر ادارہ قانونی چارہ جوئی کا حق رکھتا ہے۔



## انکشاف

اداکارہ ایمان علی کا کہنا ہے کہ انہوں نے 2016ء میں سات فلمی آفرز مسترد کر دیں اور ان سب سے معذرت بھی کی۔ جو فلمیں مسترد کیں ان میں ہمایوں سعید کی فلم بھی ہے۔ ایمان علی کا کہنا ہے کہ میں ہمایوں سعید کی فلم میں ہیرو کے گرد ڈانگ ہیروئن بننے کو ہرگز تیار نہ تھی۔ ایمان علی کا کہنا ہے کہ اگر انہیں اچھی فلمیں نہ ملیں تو وہ خود لکھنا شروع کر دیں گی۔ (پوری فلم یا صرف اپنا کردار۔؟) اور ان دنوں وہ سنجیدگی سے ایک ناول لکھنے کے بارے میں سوچ رہی ہیں (ہائیں! ناول، فلم نہیں؟) ایمان علی نے کہا کہ ماہ میر میں انیم شہزاد سے دوستی کی وجہ سے انہوں نے ایک چھوٹا کردار بھی قبول کر لیا تھا (ایمان علی! کردار چھوٹا بڑا نہیں ہوتا بلکہ۔؟)



کیف کو لینا چاہتے ہیں۔ (بہن! ہم۔؟) رمیز راجا اس میں اداکاری کے ساتھ ساتھ معاون ہدایت کار بھی ہوں گے۔ (ہاں کی۔؟)

## محب وطن

پاکستان فلم انڈسٹری کے اداکار شان نے حکومت سے مطالبہ کیا ہے کہ بھارتی فلموں کو اگر پاکستان میں نمائش کی اجازت مل رہی ہے تو پھر پاکستانی فلموں کو بھی بھارت میں برابری کی سطح پر نمائش کی اجازت ملنا چاہیے (شان! آپ کی تجویز ایک محب وطن پاکستانی کی۔ لیکن کیا ہماری فلمیں اس قاتل ہیں؟ اگر ایسا ہوتا تو بھارتی فلموں کی یہاں نمائش نہ ہوتی۔) حکومت کو برابری کی سطح پر اس معاملے پر بات کرنا چاہیے۔ (ایک محب وطن فنکار اسی طرح کی بات ہی کر سکتا ہے شان! اگھر۔؟)

## ساماجی تعلقات؟

اداکارہ بلورہ حسین آج کل ایک ٹی وی ڈرامے "ہمی" میں اپنے کردار کے بارے میں کہتی ہیں کہ "اب ہمارے ڈراموں کے ذریعے ساماجی پخلمت زیادہ



## ادھر ادھر سے

☆ امریکی شہر شکاگو کے بارے میں بارک اوبامہ نے کہا تھا میرا تعلق شکاگو سے ہے، تم مجھے نہیں توڑ سکتے، اس شہر کے لیے یہ بھی مشہور ہے کہ شکاگو سے محبت کرنے کا مطلب ہے اس عورت سے محبت کرنا جس کی ناک ٹوٹی ہوئی ہو۔

(عجاز منگی۔ آواز حق)

☆ عمران خان کا عدالت میں بیان کہ اپوزیشن کا کام الزامات لگانا ہے، حمایت کرنا عدالت کا کام ہے انتہائی مضحکہ خیز ہے۔ عمران خان شاید کیلی فورنیا کی ایک عدالت کے فیصلے کو بھول گئے ہیں۔ (میاں منیر احمد۔ پکری)



## اودھ کی بیگمات

نواب ملکہ زانیہ کا عروج ابتدائے سلطنت نصیر الدین حیدر میں زیادہ تھا۔ جنرل مسلمین ریڈیڈنٹ لکھنؤ اپنی کتاب میں (جو حقیقتاً باعث انتزاع اودھ ہوئی) اس بیگم کو اصلی فرماں روئے اودھ قرار دیتے ہیں۔ انہوں نے لکھا ہے کہ یہ بیگم اصل میں ایک کرمی کی لڑکی تھی۔ ایک شخص فوج مراد نے اس کو اپنے قرضے کے عوض میں اس کے باپ سے لے لیا تھا۔ فوج مراد کی بہن کرامت النساء نے اس کو اپنی بیٹی بنا کر پرورش کیا۔ جب ولاری (ملکہ زانیہ کا پہلے ہی نام تھا) سن شباب کو پہنچی تو اس کی رستم نامی ایک شخص سے شادی کر دی۔ ان دونوں نے آخر میں رستم نگر میں بودباش اختیار کی۔ کیونکہ رستم خاں نواب مجیب خاں کے یہاں جو اس وقت ایک افسر فوج تھے ملازم تھا۔ اسی زمانہ میں ولاری کے دو اولادیں ہوئیں، ایک بیٹا تھا جس کا نام محمد علی رکھا گیا اور دوسری بیٹی جس کا نام زینت النساء تھا۔

ولاری کی اس زمانہ میں نہایت عسرت کے ساتھ بسر ہوتی تھی۔ آخر اس کے نصیب نے کڑھ بدلی اور نصیر الدین کے محل میں ایک لڑکا پیدا ہوا۔ یہ لڑکا وہی مناجان تھا، جس کی تخت نشینی پر بیگموں جانیں ضائع ہوئیں اور وہ مدت العرجنار گڑھ کے قلعہ میں بادشاہ بیگم کے ساتھ قید رہا۔ کچھ لوگ دایہ کی تلاش میں نکلے۔ خوش نصیبی نے ان کو ولاری کے گھر پہنچایا۔ جب ولاری محل سرائے شاہی میں داخل ہوئی۔ بادشاہ بیگم نے اس کو پسند کیا اور اطباء نے بھی اس کے دودھ کو مفید بتایا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ولاری ملازم ہوئی۔ کچھ دنوں کے بعد اس کی قدرتی خوبیوں نے بادشاہ کو بھی اپنا گریدہ بنالیا۔ اس نے بادشاہ بیگم سے

نصیر الدین حیدر شاہ اودھ کا عہد دولت، عیش و عشرت کے لیے ضرب النشل ہے۔ اس کے زمانے میں اپنی سے لے کر اعلا طبقے تک کے لوگ خوش حال تھے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ علاوہ حاصل سلطنت کے چودہ کروڑ روپیہ نواب سعادت علی خاں کاڑک خزانے میں جمع تھا۔ علاوہ بریں ملک اس زمانے میں قحط وغیرہ سے پاک تھا۔ اسی دولت اور خوش حالی کی وجہ سے لکھنؤ کمال اور متلاشیان روزگار کامرگز بنا ہوا تھا۔ اس وقت اکثر اہل یورپ و شہر لاگان دہلی لکھنؤ آتے تھے اور بادشاہ کی فیاضی سے فائز المرام ہوتے تھے۔ اس وقت لکھنؤ میں جو بڑے بڑے عالی شان محل ہیں وہ اسی عہد کے تعمیر کردہ ہیں۔ اگر تحقیق کریں کہ ان کے بانی کون تھے تو معلوم ہوگا کہ وہ اپنی درجہ کے لوگ تھے اور ان کی تنخواہیں اتنی قلیل تھیں کہ مشکل سے آج کل دو تین آدمی اس میں زندگی بسر کر سکتے ہیں۔ نصیر الدین حیدر کی فیاضی نے کچھ دنوں کے لیے اودھ میں غنیمت کا لفظ بے معنی بنالیا تھا اور اس کے دریائے جود و سخا سے سب چھوٹے بڑے سیراب تھے۔

بادشاہ نصیر الدین حیدر کی بیویوں کی تعداد تو سنی سو تک تھی۔ لیکن وہ اپنی دو بیگمات سے بہت زیادہ محبت رکھتا تھا۔ چنانچہ ان دونوں نے لکھنؤ کی تاریخ میں نمایاں حصہ لیا اور اس زمانے کی سیاست کی کئی ان ہی دونوں کے اشاروں پر چلتی تھی۔ اس میں شک نہیں کہ ان دونوں بیگمات کا نام تاریخ اودھ میں قیامت تک بانی رہے گا۔

ان دونوں کے نام یہ ہیں۔ اول ملکہ زانیہ بیگم دوسری نواب قدسیہ بیگم۔

اجازت لے کر اس سے نکاح کیا اور نواب ملکہ زانیہ کے خطاب سے سر بلند کیا۔

یہ بیگم بڑی عاقلہ اور دور اندیش تھی۔ کچھ دنوں تک لکھنؤ کی قسمت اس کے ہاتھوں میں رہی۔ ہر ہر پروا کا کل علاقہ اس کو جاگیر میں ملا، جس کی تحصیل چھ لاکھ روپے کی تھی۔ اس کے علاوہ بادشاہ کے انعام و عطا کی کوئی انتہا نہ تھی۔ اس کا بیٹا محمد علی۔ جاہ کے خطاب سے سرفراز ہوا اور بادشاہ نے اس کو ولی عہد بنانے کی حتی الامکان بہت کوشش کی، لیکن گورنمنٹ نے منظور نہیں کیا۔ اس کی بیٹی زینت النساء کی شادی نواب ممتاز الدولہ سے ہوئی جس میں تیس لاکھ روپے صرف ہوئے تھے۔

ایک مرتبہ بادشاہ نے حکم دیا کہ سب عزیز و اقربا بیگم کی خدمت میں حاضر ہو کر نذر دوس۔ سب نے طوعاً و کرہاً حکم شاہی کی تعمیل کی۔ لیکن نواب نصیر الدولہ (یعنی محمد علی شاہ) کی دونوں آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے اور بادشاہ کا یہ حکم وہ بجا نہ لاسکے۔ جب نصیر الدولہ تخت نشین ہوئے، بیگم بقید حیات تھی۔ اس کو اپنی سہ ماہی قرار دیا اور بہت مرتبہ اپنے یہاں بلایا، لیکن اس نے علالت کا پیشہ بمانہ کر دیا۔

حاصل یہ کہ اس بیگم کا انتہا درجہ عروج ہوا۔ یہ قدر تا بہت فیاض تھی۔ سیکڑوں ہزاروں آدمیوں کی اس کے ذریعے سے پرورش ہوتی تھی۔ اس کی سخاوت اور سیر چشمی لکھنؤ میں ضرب النشل ہو گئی۔ زندگی بھر وہ بادشاہ سے جتنی اولاد رہی۔ اس لیے ہر نوچندی کو درگاہ حضرت عباس جانی تھی اور وہاں دس ہزار روپے صرف دسترخوان و نذر نیاز میں صرف کرتی تھی۔

اس بیگم کا 22 دسمبر 1843ء میں انتقال ہوا۔ لکھنؤ میں اس کا عالی شان امام باڑہ مسجد باب تک موجود ہے۔

ملکہ زانیہ کا یہ عروج بہت تھوڑے دنوں تک رہا۔ کیونکہ نواب قدسیہ بیگم کے آفتاب اقبال نے اس کے نصیب کی چمک کو ماند کر دیا۔ یہ بیگم بھی کوئی اعلا خاندان سے نہ تھی۔ یہ نواب ملکہ زانیہ کے یہاں اول

اول بطور کنیز کے ملازم ہوئی تھی اور فراغ نفس پر ستاری ادا کرتی تھی، لیکن اس وقت ملکہ زانیہ کو کیا معلوم تھا کہ یہ ایک دن بادشاہ کی خوشی و مسرت کی روح رواں بن جائے گی اور عزت کی اس قدر بلندی پر پہنچے گی کہ وہاں سے میرا مرتبہ بھی بہت چھوٹا نظر آئے گا۔

بادشاہ نصیر الدین حیدر سے اس کے تعلق کا بلاچہ یہ ہے کہ وہ ایک روز نواب ملکہ زانیہ کے محل میں آئے گرمی کا موسم تھا۔ کچھ پیاس محسوس ہوئی اور آب خاصہ طلب کیا۔ اس وقت قدسیہ محل میں موجود تھی۔ فوراً زریں پیلہ میں آب سرد حاضر کیا۔ بادشاہ نے پانی پی کر چند قطرے قدسیہ پر ڈال دیے۔ قدسیہ

نے بھی تری یہ تری جواب دیا۔ بادشاہ کو اس بے باکانہ حرکت پر غصہ آیا اور کہا۔

”بادشاہ وقت سے یہ گستاخی؟“

اس نے فوراً جواب دیا۔ ”کھیل میں بادشاہی اور غریبی کا ذکر کیا؟“

بادشاہ اس جواب معقول سے ساکت ہو گئے اور اس کی شوخی اور حاضر جوابی سے بہت خوش ہوئے۔ اس کے بعد سے جب اس محل میں جانے کا اتفاق ہوتا۔ اس سے ضرور باتیں کرتے تھے۔ آخر کچھ زمانے کے بعد اس سے شادی کر لی۔

قدسیہ محل انتہا درجہ کی حسین اور بہت سخت تھی۔ بادشاہ نے بیس لاکھ روپے صرف اس کے زیورات وغیرہ کے لیے عطا کیے تھے۔ چھ لاکھ روپے کی جاگیر تھی۔ اس کو پڑھنے لکھنے کا بھی بہت شوق تھا۔ ایک مغربی بیگم اس کی اتالیق تھی جو بہت لیاقت رکھتی تھی اور درسی تعلیم کے ساتھ اس کو امور خانہ داری اور کفایت شعاری وغیرہ کا بھی سبق دیتی تھی۔ حاصل یہ کہ یہ بیگم بڑی تعلیم یافتہ تھیں۔ قسم و فرست بھی اس کو بہت زیادہ ولعت کی گئی تھی۔ اسی وجہ سے یہ سیاست میں بھی بہت زیادہ دخل دیتی تھی۔ وزراء اور اعلا عہدہ داروں کا منزل اور ترقی وغیرہ اسی کے ہاتھوں میں تھا۔ سلطنت کے اہم امور میں اس کی

رائے بہت زیادہ اثر رکھتی تھی۔ بادشاہ اس بیگم سے خاص محبت رکھتا تھا۔ شادی کے بعد اس نے ایک روز بادشاہ سے کہا کہ۔

”میں نے تین لاکھ روپے نہیں دیکھے ہیں۔“

اس نے فوراً حکم دیا کہ مبلغ مذکورہ خزانہ عاموسے لایا جائے۔ آخر اس حکم کی تعمیل ہوئی اور تین لاکھ روپے کا ایک چوترا بنایا گیا۔ اس پر بیگم نے جلوس کیا۔ بادشاہ نے حکم دیا کہ یہ روپیہ غریبائیں خیرات کر دیا جائے۔

اس بیگم کے مصارف بہت زیادہ تھے، کیونکہ شاہانہ ساز و سامان سے بسر کرتی تھی اور ہزاروں لاکھوں روپے ادنی باتوں میں خرچ کر دیتی تھی۔ نواب ظفر الدولہ اکثر

کہا کرتے تھے کہ اگر وزیر اعظم معتد الدولہ اور نواب قدسیہ بیگم کچھ اور جیتے تو سلطنت اودھ ان کی فضول خرچیوں سے بیک جاتی۔

قدسیہ بیگم بہت تند مزاج اور غصیل عورت تھی۔ اگرچہ بادشاہ اور اس میں انتہا درجہ کی محبت تھی، مگر کبھی کبھی لڑائی بھی ہو جاتی تھی۔ آخر اس کا یہی غصہ و غضب باعث ہلاکت ہوا۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ بادشاہ اور قدسیہ محل بعد انقضائے ایام چہلم تفریح طبع کی غرض سے کوشی دل کشا میں گئے ہوئے تھے۔ ایک روز بادشاہ بارہ دری میں بیٹھے ہوئے تھے۔

دیکھا کہ کچھ بندر درختوں پر بیٹھے ہوئے ہیں۔ اندر سے بندوق طلب کی۔ راجہ بختاور سنگھ بھی موجود تھا۔ اس نے بادشاہ کو اس حرکت سے منع کیا کہ بے وجہ کسی جان دار کو مارنا موجب نزول بلائے آسمانی ہوتا ہے۔ بادشاہ نے ہنس کر دو چار بندر شکار کیے اور محل سرا میں چلے گئے۔ وہاں جاتے ہی قدسیہ بیگم سے لڑائی ہوئی، بیگم نے کہا۔

”ان شاء اللہ یہ صورت صفحہ ہستی سے مٹ جائے گی۔“

بادشاہ نے غصہ میں جواب دیا۔ ”قول و فعل مختلف چیزیں ہیں۔“

بیگم نہایت درجہ غیور اور تند مزاج ثابت ہوئی، سکھیا ہیکل میں رکھی ہوئی تھی، فوراً کھالی۔ اس پر آب شورہ لیموں پی لیا اور چند دانے بھنے ہوئے بھنے کے بھی کھالیے۔ تھوڑی دیر بعد خوشی استفرار ہوا، جس میں چند لذت جگر بھی نکل آئے۔ اسی کے ساتھ محل میں قیامت برپا ہو گئی۔ بادشاہ بھی دوڑے ہوئے محل میں آئے اور انک حسرت و یاس برسانے لگے اور کہا کہ ”مے بانے وفا“ آخر تو نے اپنا کام تمام کیا۔“

اس نے جواب دیا۔

”ہاں! جو کچھ کہا ہے اسے کر کھایا۔“

بادشاہ شرت غم سے وہاں دیر تک نہ ٹھہر سکے۔ چکر والی کو بھی میں جو لکھنؤ سے کچھ فاصلہ پر واقع ہے، چلے گئے۔

فوراً اطباء حاذق جمع ہوئے اور علاج میں حتی الامکان بہت کوشش کی گئی، لیکن کچھ فائدہ نہ ہوا۔ آخر بیگم نے چوبیس سال کی عمر میں 15 ربیع الثانی 1250ھ میں انتقال کیا۔ اس خبر کے ساتھ شہر میں ہڑتل مچی۔ چالیس روز تک بادشاہ سے لے کر فقیر تک سیاہ پوش رعبہ ارکان دولت، اقربائے شاہی، سب خاک بر سر تھے۔ بہشت لکھنؤ ماتم سرا ہو گئی۔ رات کے وقت جنازہ نہایت تزک و احتشام کے ساتھ اٹھا اور کر بلائے نو قید دفن بنایا گیا۔

بادشاہ بیگم کو بھی حد درجہ افسوس ہوا اور بوجہ جوش محبت ماری بغیر سیاہ لباس کے بادشاہ کے پاس چلی آئیں اور بہت تسکین دہنی دی اور کہا کہ ”خدا تجھ کو سلامت رکھے، ایسی سو بیگم تجھ کو مل جائیں گی۔“ اس سے بادشاہ کے غصہ کی آگ بھڑک اٹھی اور کہا۔

”اگر آپ کو کچھ غم ہوتا تو سیاہ پوش ہوتیں۔“

بیگم نے جواب دیا ”میں لباس سیاہ فقط عداوتی جناب سید الشہداء علیہ السلام کو پہنتی ہوں۔“ اور یہ کہہ کر چلی گئیں۔

بادشاہ کے اب تمام باقی جذبات غصے میں بدل گئے اور بیگم کو حکم دیا کہ وہ فوراً محل سرا کو چھوڑا لباس باغ

میں قیام کریں۔

انہوں نے جواب دیا کہ۔ ”یہ عطیہ میرے شوہر کا ہے میں خالی نہیں کر سکتی۔“

آخر نوبت یہاں تک پہنچی کہ سپاہ بادشاہ پہنچی اور نیل داروں کے ذریعہ سے محل کھدوانا شروع ہو گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ طرفین سے گولیاں چلنے لگیں اور دیر تک یہ طوفان بد مزیزی رہا۔ بیگم کی طرف کی حبشی عورتیں اور لوندیاں ماری گئیں اور شملی فوج کی بھی متعدد جاہیں ضائع ہوئیں۔ حاصل یہ کہ اس سانحہ سے بادشاہ کو بہت صدمہ پہنچا۔ وہ اکثر بیگم کے مدفن پر جایا کرتے تھے اور اس پر قطرا اشک کے پھول چڑھاتے تھے۔ کبھی کبھی ریڈیفنٹ صاحب بھی ساتھ ہوتے لیکن وہ قبر سے دور کھڑے ہوتے تھے۔ کئی مہینے تک بادشاہ کا یہی حال رہا اور امور سیاست کی مشین تو بالکل بند ہو گئی۔

اقربائے شاہی، بادشاہ کی یہ حالت دیکھ کر بہت غمگین ہوئے اور سمجھے کہ جب تک اسی بیگم کی صورت اور سیرت میں مشابہ عورت نہیں ملے گی۔ بادشاہ کی حالت درست نہ ہوگی۔ آخر صلاح یہ نصیری کہ اس کی بہن سے جو نواب الدولہ کی بیوی تھی، طلاق دلو اور بادشاہ کی شادی کر دی جائے، مگر وہ عورت بھی بہت با وفا ثابت ہوئی اور اس نے اپنے شوہر کی مفارقت قبول نہ کی۔ میر سید علی اس مہم محظیم کا بیڑا اٹھا کر روانہ کانپور ہوئے۔ آخر یہ ہزار جدوجہد نواب الدولہ سے طلاق دلو اور اس کو لکھنؤ لائے۔ لیکن تب بھی وہ راضی نہ ہوئی۔ پھر اس کے بعد اسے قید کیا، لیکن وہ قید خانے سے بھاگ کر کانپور اپنے شوہر سے جا ملی۔ (آفریں)

آخر یہ ہزار کوشش، بادشاہ کی نسبت شادی پختہ ہوئی اور رجب 1250ھ میں نائن عقد معین ہوئی۔ رسم حنا بندی ادا کی گئی۔ اس کے بعد محفل شاہانہ آراستہ ہوئیں۔ پریم کے گراں ہما ساز و سامان سے آنکھیں خیرہ ہوئی تھیں۔ روپے کے مصارف کی

کوئی انتہا نہ تھی۔ عروس کو خطاب ”نواب بادشاہ جہاں ممتاز الدہر“ عنایت ہوا۔

اس شادی کے بعد بھی بادشاہ کی کچھ حالت متغیر نہ ہوئی، کیونکہ ممتاز الدہر نو عروس سے ان کو نفرت ہو گئی۔ اس کی وجہ مورخین نے یہ لکھی ہے کہ بادشاہ نے کئی لاکھ روپے اور پینتالیس بدیاں، دو شالے و رومال و جامہ دار اور تھان ہائے لباس گرما۔ بیگم کو عنایت کیا کہ وہ اپنے متوسلین وغیرہ میں تقسیم کر دے۔ بیگم تو دلہن تھی۔ یہ کام اس کی ماں کا تھا۔ لیکن اس نے اس میں نال کیا۔ بادشاہ نے ایک روز جو اس کے متعلق پوچھا تو بیگم نے جواب دیا۔

”حضور! ہم آپ کا گھر بنانے کو آئے ہیں نہ کہ لگاڑنے کو۔“ اس پر بادشاہ کو بہت طیش آیا اور یہ کہہ کر کہ ”تو کنگلی ہے، ہنسی کو کیا دے گی۔“ اٹھ کھڑے ہوئے۔

بیگم نے دامن پکڑا، لیکن نہانے اور باہر آکر راجہ غالب جنگ سے کہا کہ ”ہم نے اس محل کو خطاب، ”کھنگلا محل“ کا دیا۔“ چنانچہ آج تک وہ اس نام سے مشہور ہے۔ یہ تھیں شاہان اودھ کی فیاضیاں جس کی یہ ادنی مثال ہے۔

اس کے بعد پھر بادشاہ نے نواب تاج محل سے شادی کی، اس کی جاگیر بہت بڑی تھی۔ اس کے ساتھ چھ ہزار ہمار بھی جیب خرچ کو ملتے تھے۔

